وارداتِ

یعنی

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفیؔ کے منظوم کلام کا مجموعہ

جو

گویا اُردو شاعری کی پچھلی آدھی صدی کی تبدیلی اور ترقی

کی مختصر تاریخ ہے

سنہ ۱۹۴۱ء

ناشر:-

میسرز رام لال سوری اینڈ سنز۔ انارکلی۔ لاہور

پہلا ایڈیشن

قیمت تین روپے

فہرست مضامین

کیفیات

...یات نامہ سنہ ۱۹۲۶ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک

دورِ چہارم سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک

دور سوم سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک

مصنّف کی طرف سے

اس مجموعے کی ترتیب اور طباعت میں بہت دیر لگی
نظموں پر جو نوٹ ہیں ان میں سے بعض صاحب زادہ محمد عمر
اور اکثر عزیز منصور احمد کے لکھے ہوئے ہیں۔ آج یہ عزیز
ہمارے پاس ہوتا تو کتنا خوش ہوتا۔

۱۲ر فروری ۱۹۴۱ء

کیفی

تعارف

از مولوی سیّد ہاشمی صاحب فریدآبادی

امیرخسرو رح نے تغلق نامے میں ایک حکایت لکھی ہے کہ کسی بادشاہ نے اپنی انگوٹھی پر نیلا نگینہ جڑوایا اور امتحان کے لیے شہر کے بڑے جوہری کو دکھایا کہ اس کی قیمت آنکو۔ جوہری نے عرض کیا کہ یہ پتھر اتنا گراں بہا ہے کہ اس کی قیمت اداکرنی محال ہے۔ بادشاہ بگڑ گیا اور چاہا کہ جوہری کو سزا دے۔ جوہری نے جان کی امان مانگی اور ہاتھ باندھ کر کہا کہ اے بادشاہ اس نگینے کی حقیقت جو ہے سو ہے۔

یکے آں کہ۔ کہ ایں ہست آنچہ خود ہست
گہر شد، چوں بدستِ شاہ پیوست

پھر جب آپ کی انگوٹھی میں جڑا گیا تو اس کے بے بہا ہو جانے میں کیا شک رہا؟

اردو ادب کی دنیا میں بھی جو چیز کیفی صاحب سے منسوب ہو گی اس کی قیمت کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی ...... لیکن یہ جواہر پارے جو "کیفیات" کے نام سے نور افزائے بینش ہیں بذات خود رتبۂ گزیں اور بہائے بریں رکھتے ہیں۔ ایک گہر سنج نے لکھا ہے کہ اگر انہیں بن باس ملے اور صرف ایک کتاب رکھنے کی اجازت ہو تو وہ اسی رنگین مجموعے کو اپنے ساتھ لے جائیں گے!

کلام کی عروضی جامعیت بہ یک نظر واضح ہے۔ پان سو صفحات کے ذخیرے میں مثنوی قصیدہ، غزل، ترکیب بند، رباعی —— غرض کسی صنف سخن کی کمی نہیں۔ قصائد مدح کا زمانہ گزر گیا۔ بقول کسی عربی شاعر کے، ایسے ممدوح ہیں کہاں جن کی مدح کی جائے —— مگر ایک عزیز کے اصرار سے کیفی صاحب نے بھی شاہ جورج پنجم کے دربار تاج پوشی پر قصیدہ تیار کیا تھا جس کا مطلع ہے۔

آمدِ شاہِ بہاری کا سنا شور جو کل
باغِ عالم میں پڑی ایک سرے سے ہل چل

سرکاری ناظروں نے اسی کو سب سے بہتر اردو قصیدہ قرار دیا اور صلے میں یک قطعہ تمغۂ سیمیں بھی عطا فرمایا۔ لیکن اس کے بعد کیفی صاحب کو پھر کبھی ایسی مدح سرائی کی ترغیب نہیں ہوئی۔ کشمیر کی ملازمت کے زمانے میں خود مہاراجہ بہادر کا ایما ہوا، تب بھی آپ نے دعائیہ مسدس لکھ کر ممدوح کی خوشی پوری کر دی۔

معنوی اعتبار سے بھی یہ مجموعہ نفسی اور خارجی دونوں رنگ کی شاعری کا جامع ہے فطرت کی صناعیاں اور قوم و وطن کے مسائل کچھ مدت سے ہماری شاعری کا موضوع بن چکے ہیں۔ لیکن کیفی صاحب کو اس باب میں امتیاز حاصل ہے۔ وہ دونوں رنگ ساتھ ساتھ نباہتے ہیں اور دونوں کو اس خوبی سے سموتے ہیں کہ معاصرین کے کلام میں اس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔

ترتیب کتاب میں ایک جدت یہ کی گئی ہے کہ ابتدائی زمانے کے کلام کو آخر میں جگہ دی ہے۔ اس دور اول میں ۱۸۸۴ء یعنی اٹھارہ سال کی عمر تک کی غزلیں ہیں۔ دور دوم ۱۹۰۰ء سے ۱۹۲۱ء تک اور پھر دور چہارم ۱۹۳۰ء تک آیا ہے۔ لیکن دیوان کا آغاز عہدِ حاضر یعنی ۱۹۳۱ء سے کیا گیا ہے اگرچہ یہ چاروں حصے جملہ اصنافِ سخن کا مجموعہ ہیں اور ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا مشکل ہے۔ "عہدِ حاضر" کا ایک ضمیمہ یات نامہ ہے جس میں روحانیات، موسیقیات، ملّیات، نسائیات وغیرہ عنوانوں پر نظمیں ہیں اور جا بجا زمانے کی بے عنوانیوں پر ظریفانہ پیرائے میں رائے زنی کی گئی ہے ــــ غرض اس بارہ ہزار شعر کے گلدستے میں ہر شوق و مذاق کے پھول گندھے ہوئے ہیں کیفی صاحب کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ اگر غزل میں غالبؔ و دردؔ کا رنگ ہے تو مسدس و مثنوی، ترکیب بند و رباعی آزادؔ و حالیؔ سے ہم آہنگ ہے حتٰی کہ بعض نوخیز معاصرین کا اثر لیتے اور ہنگامِ شباب کی نوا جوانیوں میں نے ملاتے ہیں۔ جیسے :-

برسات کی بہاریں...

دھومیں مچا رہی ہیں　　　دل کو لبھا رہی ہیں

برسات کی بہاریں

انگریزی نظموں کے ترجمے اور نظمِ عاری کے نمونے بھی موجود ہیں۔ لیکن دیکھنے کی بات اور شاعر کے صاحبِ طرز ہونے کی دلیل یہ ہے کہ کسی صنفِ سخن اور کسی رنگ میں شعر کہیں، زبان و

و بیان کے اُس معیار کو کہیں ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے جسے اردو میں میر درد اور میر و سودا نے قائم کیا اور مومن و غالب، حالی و داغ نے اسے قبولِ عام اور بقائے دوام کی سند دلوائی۔

اس مجمل تعارُف میں کلام کے انتخاب اور اس کے ادبی محاسن پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں لیکن ایک صاحبِ نظر نے دو نادر غزلوں کی طرف اشارہ کیا جنہیں حضرت کیفی نے فارسی طرز پر سوال و جواب اور صنعت تکرار سے مرصع کیا ہے۔

۱

کہا بخشی ہے مجھ کو ہجر کی تم نے مصیبت کیا
تو فرمایا کہ ناداں وصل کی ہے ہجر لذت کیا

کہا یہ دل سی شے کیا مفت اُڑا لے جاؤ گے صاحب
تو فرمایا یہ جنس بے بہا ہے اس کی قیمت کیا

کہا اب ہجر میں جاں لب پہ آئی ہے، تو فرمایا
جو ہر دم دل میں ہو کیا اس کا وصل اور اسکی فرقت کیا

. . . .

۲

اندوہ گیں نہ ہو جو دل عافیت پسند
وہ شکوہ سنج گردش چرخ بریں نہ ہو

چرخ بریں نہ ہو تو نہ ہو عرش کا وجود
رب العلا کی ذات بھی کرسی نشیں نہ ہو

کرسی نشین نہ ہو جو سر عرش نور پاک
اس ساری کائنات کی ہستی کہیں نہ ہو

ہستی کہیں نہ ہو تو عدم ہی عدم ہو پھر
ساقی و رند و بادہ، خم و ساتگیں نہ ہو

. . . .

اور ان دو غزلوں کی نشان دہی کئے بغیر مجھ سے نہ رہا گیا جنہیں میں بیان کی قدرت و تازگی اور تخیل کی رفعت و پاکیزگی کا نمونہ سمجھتا ہوں۔

۱

جس کو ظاہر نہ کیا شعلۂ سینائی نے
راز وہ فاش کیا حُسن کی رعنائی نے

چشمِ دل وا ہوئی، اے حُسنِ محبت بیدار
طرفہ جادو یہ جگایا تری انگڑائی نے

. . . . ۲ . . . .

پردہ دار ہستی تھی ذات کے سمندر میں
حُسن خوب کھُل کھیلا اس صفت کے منظر میں

عشق محشر آرا کی طور پر گری بجلی
حُسن لن ترانی کی رہ سکا نہ چادر میں!

آمدِ شاہِ بہاری کا سنا شور جو کل
باغِ عالم میں پڑی ایک سرے سے ہلچل

سرکاری ناظروں نے اسی کو سب سے بہتر اردو قصیدہ قرار دیا اور صلے میں یک قطعہ تمغۂ سیمیں بھی عطا فرمایا۔ لیکن اس کے بعد کیفی صاحب کو پھر کبھی ایسی مدح سرائی کی ترغیب نہیں ہوئی۔ کشمیر کی ملازمت کے زمانے میں خود مہاراجہ بہادر کا ایما ہوا، تب بھی آپ نے دعائیہ مسدس لکھ کر ممدوح کی خوشی پوری کر دی۔

معنوی اعتبار سے بھی یہ مجموعہ نفسی اور خارجی دونوں رنگ کی شاعری کا جامع ہے فطرت کی صناعیاں اور قوم و وطن کے مسائل کچھ مدت سے ہماری شاعری کا موضوع بن چکے ہیں۔ لیکن کیفی صاحب کو اس باب میں امتیاز حاصل ہے۔ وہ دونوں رنگ ساتھ ساتھ نباہتے ہیں اور دونوں کو اس خوبی سے سموتے ہیں کہ معاصرین کے کلام میں اس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔

ترتیب کتاب میں ایک جدت یہ کی گئی ہے کہ ابتدائی زمانے کے کلام کو آخر میں جگہ دی ہے۔ اس دَور اوّل میں ۱۸۸۴ء یعنی اٹھارہ سال کی عمر تک کی غزلیں ہیں۔ دَور دوم ۱۹۰۰ء سے ۱۹۲۱ء تک اور پھر دَور چہارم ۱۹۳۰ء تک آیا ہے۔ لیکن دیوان کا آغاز عہد حاضر یعنی ۱۹۳۱ء سے کیا گیا ہے اگرچہ یہ چاروں حصے جملہ اصناف سخن کا مجموعہ ہیں اور ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا مشکل ہے۔ "عہدِ حاضر" کا ایک ضمیمہ یات نامہ ہے جس میں روحانیات، موسیقیات، ملّیات، نسائیات وغیرہ عنوانوں پر نظمیں ہیں اور جا بہ جا زمانے کی بے عنوانیوں پر ظریفانہ پیرا ے میں رائے زنی کی گئی ہے — غرض اس بارہ ہزار شعر کے گلدستے میں ہر شوق و مذاق کے پھول گندھے ہوئے ہیں۔ کیفی صاحب کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ اگر غزل میں غالب و درد کا رنگ ہے تو مسدس و مثنوی، ترکیب بند و رباعی آزاد و حالی سے ہم آہنگ ہے حتٰی کہ بعض نوخیز معاصرین کا اثر لیتے اور ہنگام شباب کی نواخوانیوں میں لے ملاتے ہیں۔ جیسے :-

برسات کی بہاریں...

دھومیں مچا رہی ہیں
دل کو لبھا رہی ہیں
برسات کی بہاریں

انگریزی نظموں کے ترجمے اور نظم عاری کے نمونے بھی موجود ہیں۔ لیکن دیکھنے کی بات اور شاعر کے صاحب طرز ہونے کی دلیل یہ ہے کہ کسی صنفِ سخن اور کسی رنگ میں شعر کہیں، زبان و

و بیان کے اُس معیار کو کہیں ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے جسے اردو میں میر درد اور میر و سودا نے قائم کیا اور مومن و غالب، حالی و داغ نے اسے قبولِ عام اور بقائے دوام کی سند دلوائی۔

اس مجمل تعارف میں کلام کے انتخاب اور اس کے ادبی محاسن پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں لیکن ایک صاحبِ نظر نے دو نادر غزلوں کی طرف اشارہ کیا جنہیں حضرت کیفی نے فارسی طرز پر سوال و جواب اور صنعت تکرار سے مرصع کیا ہے۔

۱

کہا بخشی ہے مجھ کو ہجر کی تم نے مصیبت کیا
تو فرمایا کہ ناداں وصل کی بے ہجر لذت کیا

کہا یہ دل سی شے کیا مفت اُڑا لے جاؤ گے صاحب
تو فرمایا یہ جنس بے بہا ہے اس کی قیمت کیا

کہا اب ہجر میں جان لب پہ آئی ہے، تو فرمایا
جو ہر دم دل میں ہو کیا اس کا وصل اور اسکی فرقت کیا

. . . .

۲

اندوہ گیں نہ ہو جو دل عافیت پسند
وہ شکوہ سنج گردش چرخ بریں نہ ہو

چرخ بریں نہ ہو تو نہ ہو عرش کا وجود
رب العلا کی ذات بھی کرسی نشین نہ ہو

کرسی نشین نہ ہو جو سر عرش نور پاک
اس ساری کائنات کی ہستی کہیں نہ ہو

ہستی کہیں نہ ہو تو عدم ہی عدم ہو پھر
ساقی و رند و بادہ، خُم و ساتگیں نہ ہو

. . . .

اور ان دو غزلوں کی نشان دہی کئے بغیر مجھ سے نہ رہا گیا جنہیں مَیں بیان کی قدرت و تازگی اور تخیل کی رفعت و پاکیزگی کا نمونہ سمجھتا ہوں۔

۱

جس کو ظاہر نہ کیا شعلۂ سینائی نے
راز وہ فاش کیا حُسن کی رعنائی نے

چشمِ دل وا ہوئی، اے حُسن محبت بیدار
طرفہ جادو یہ جگایا تری انگڑائی نے

. . . . ۲ . . . .

پردہ دار ہستی تھی ذات کے سمندر میں
حُسن خوب کھُل کھیلا اس صفت کے منظر میں

عشق محشر آرا کی طور پر گری بجلی
حُسن لن ترانی کی رہ سکا نہ چادر میں!

بڑی نظموں میں ساقی نامہ بسنت، کیول کٹیا، ہفت بند کیفی، عالم آشوب، مثنوی آئینہ ہند، ترکیب بند، شوکت ہند، قصیدہ ترقی اردو اور روپ چالیسا۔ (یا محسن فطرت) بار بار پڑھنے اور لطف اٹھانے کے لائق ہیں۔ قطعات یا چھوٹی نظموں میں دلّی کی بزم ادب کی جوبلی، الہ آباد کا تاریخی مشاعرہ، ہندو مسلم فساد، سخنوری کی بہترین مثالیں ہیں جن میں کیفی صاحب کا زور قلم، فکری اجتہاد اور ترکیبوں کی جدت دیکھنے اور تقلید کرنے کے قابل ہیں۔ ذرا سی تلاش کی جائے تو اس مخزن سے بیسیوں خنجر و نشتر برآمد ہوں گے جو ہماری زبان کی متاع بیش بہا بن گئے ہیں اور آئندہ بھی اس کے جوہر حیات میں شمار کئے جائیں گے۔

حضرت کیفی کی شاعری اور زندگی دونو میں ایک اور سبق آموز جامعیت ہے جسے اربابِ بصیرت نے ہمیشہ سراہا اور ہمیشہ سراہتے رہیں گے —— وہ اُس عہد کے تربیت یافتہ ہیں جب کہ ہندو مسلمانوں کے سنجوگ نے تہذیب و اخلاق کا ایک عطر مجموعہ تیار کیا اور سارے ملک میں اس کی خوشبو پھیلادی تھی۔ بعد کی فصلوں میں نفاق کی آگ بھڑکی اور فساد کی بہت سی آندھیاں چلیں جن کا ابھی تک زور بندھا ہوا ہے۔ لیکن ہمارے ممدوح نے آج تک اپنی روش نہ چھوڑی۔ احساس قوی و ذکی کا تقاضا تھا کہ وسوسے آئیں اور خطرات ستائیں۔ ان موقعوں پر وہ یہ کہہ کر ادبیات کے دامن میں پناہ لیتے ہیں کہ ؎

ادب و شعر کا عالم ہے وہ وحدت آئیں
کہ جہاں کافر و دیندار کا مذکور نہیں۔

اگر ان کی کثیر تصانیف کا ہر ورق حب وطن کی منادی ہے تو اس کا کوئی حاشیہ اتحادِ اہل وطن کی پکار سے خالی نہیں۔ وہ جس جوش و خروش سے سامعین کو قوم کی فلاح کا راستہ دکھاتے ہیں، اسی قوت و دردمندی سے باہمی نفاق کی مذمت اور اتفاق و آشتی کی برکتیں سمجھاتے ہیں۔ ان کی ذات اس تعلیم کی سچی مثال ہے اور ان کی زندگی کے ہر پہلو پر یہ جذبات ایسے غالب ہیں کہ زمانۂ ناسازگار کی کوئی ترغیب و تربیت انہیں مغلوب نہیں کر سکی ہے —— زیر نظر کتاب میں جس عقیدت مندی سے کرشن جی، رام چندر جی اور پھر راجہ سیوا جی اور سوامی دیانند جی وغیرہ ہندو مشاہیر کا ذکر آتا ہے، وہی تعظیم و رتبہ شناسی مسلمان بزرگوں کے مناقب میں نمایاں ہے۔ جابجا ہندو مسلم احباب کو یکساں محبت و تپاک سے یاد کرتے اور ان کے لئے حسب تقریب شعر لکھتے ہیں۔

اس مجموعے میں ہمیں سب سے پُر جوش مرثیہ بھی حکیم اجمل خاں مرحوم کی وفات پر ملتا ہے!

مگر ان مسلمہ اوصاف و اخلاق سے بھی بڑھکر جس بات نے پنڈت جی کو دُنیائے اردو میں محترم و مغتنم ٹھیرایا وہ یہ شاندار لسانی خدمت ہے کہ وہ خالص ہندی یا ہندو روایات و عقائد کو نہایت خوبی اور بے تکلفی کے ساتھ اردو شاعری میں کھپا دیتے ہیں اور بالواسطہ اس الزامی کمی کو دُور کرنے میں ساعی ہیں جس کی بنا پر تعلیم یافتہ ہندؤوں کا ایک طبقہ زبانِ اردو ہی کو چھوڑ دینے پر کمربستہ نظر آتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مسلمان اہل قلم نے طبعاً اسلامی تخیلات اور تلمیحات کو ادبِ اردو کا جُز بنا دیا اور ابتدائی ہندو مصنفین کی طرف سے اپنی قومی روایات کے باب میں ایسی کوشش نہیں کی گئی۔ اس دور میں ہندو مذہب و معاشرت کے نقشے کھینچے بھی تو ایک مُسلمان شاعر نظیر اکبرآبادی نے ...... لیکن جو لوگ ہندو اسلاف کو نام دھرتے ہیں وہ ذرا گرد وپیش پر نظر ڈال کر انصاف سے بتائیں کہ آج بھی اعلیٰ درجہ کے کتنے ہندو ہیں جو کسی مخلوط یا ہندی زبان کی بجائے خالص انگریزی زبان میں اپنی انشا پردازی اور جریدہ نگاری کے جوہر دکھاتے ہیں ؟ علوم و فنون کے کتنے ماہر ہیں۔ جن کو اپنی بولی میں اظہار خیال کرنا دشوار ہے اور کتنے قومی ادارے ہیں جنہیں قومی زبان سے کام لینے میں عار ہے ؟

عقل سلیم کا تقاضا بہر حال یہ ہے کہ ادبیات کے جو پہلو اگلوں نے تشنہ چھوڑے تھے، پچھلے ان کی تکمیل فرمائیں اور خوشی کی بات ہے کہ زمانۂ حال میں اردو ادب کی مشتہرہ کمزوری کو، جو اُوپر بیان ہوئی، دُور کرنے کی کوششیں بھی کی گئی ہیں۔ لیکن غالباً ان میں سب سے زیادہ کامیابی کیفی صاحب کے نصیب میں آئی ہے اور بجائے خود یہی اتنا بڑا اور دیرپا احسان ہے جسے اردو زبان جلتے جی کبھی فراموش نہ کرسکے گی۔

تقریظ اور تبصرے کی اجازت نہیں مگر میں اس مختصر تحریر کو ایک خاص امر کے ذکر کے بغیر ختم نہیں کرسکتا۔ وہ ہے ان کا اجتہاد عملی جدت فکر اور اخلاقی جرات۔ جن نادر اوصاف کا زندہ ثبوت کیفی صاحب کی تازہ تصنیف مثنوی جگ بیتی ہے۔ یہ مثنوی مختلف البحور ہے۔ اسمیں کسرۂ اضافت سے احتراز ہے۔ قافیہ میں ت۔ ط اور ز۔ ظ کے ساتھ برابری کا سلوک کیا گیا ہے قصّہ کا پلاٹ واقعیت پر مبنی ہے۔ جب یہ مثنوی نکلی تو دنیائے ادب میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اس بارے میں زیادہ لکھنا غیر ضروری ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ یہ مجموعہ ایک اور شان بھی رکھتا ہے یعنی اس کا مطالعہ اردو نظم کی پچھلے ساٹھ برس کی ادبی تاریخ کا مرقع پیش کرتا ہے۔ غالباً اسی نقطۂ نظر سے انھوں نے

اپنے ابتدائی اور وسط عمر کے کلام کی نظرِ ثانی سے صاف انکار کر دیا یہ کہہ کر کہ یہ ادبی بد دیانتی ہو گی۔

۳۱، جنوری ۱۹۴۱ء سیدہ ہاشمی (فرید آبادی)

(از منصور احمد مرحوم اڈیٹر ادبی دنیا)

تقریباً دس برس گزرے جب مجھے پہلی دفعہ علامۂ محترم پنڈت برجموہن صاحب دتاتریا کیفی سے شرف ملاقات حاصل ہؤا۔ لیکن حاصلِ ملاقات صرف آخری دو تین برس ہیں جن میں مجھے ان کے علمی ادبی کمالات اور ان کی الوالعزمانہ سیرت سے آشنا ہونے کا موقع ملا۔ ایک سچے ادیب کی زندگی اور ادب میں ہمیشہ گہرا تعلق ہوتا ہے اور بلند پایہ کتابوں کا ماخذ ہمیشہ زندگی اور سیرت ہوتی ہے۔ چونکہ "کیفیات" میری رائے میں ایک بلند پایہ کتاب ہے اس لئے میں اس کے دیباچے میں کیفی صاحب کے اُن حالات کو بھی لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں جو مجھے معلوم ہو سکے، تاکہ پڑھنے والوں کو اُن تاثرات سے زیادہ مانوس کر دوں جو ان کی تخلیق کا باعث ہوئے۔

خاندانی حالات

حضرتِ کیفی کے بزرگ خطۂ جنت نظیر کشمیر سے بادشاہ فرخ سیر کے عہد میں ہندوستان آئے اور دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ چونکہ فارسی میں طاق اور سیاق و سباق میں کامل تھے حکومت کے مرکزی دفاتر میں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز ہو گئے انیسویں صدی عیسوی کے ربع اول میں بوجہ انتزاعِ سلطنت ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی اور اس وقت کے اعلیٰ عہدوں پر سرفراز ہوئے۔ ان کے والد پنڈت کنہیا لال راجہ بھرپور سنگھ کے عہد میں شہر نابھہ کے کوتوال تھے۔ کیفی صاحب کی ولادت ۱۳ر دسمبر ۱۸۶۶ء کو بمقام دہلی ہوئی۔ جس مکان میں یہ پیدا ہوئے وہ بازار سیتارام میں واقع ہے۔ اس کے ایک طرف گلی ٹکسالی جاتی ہے اور دوسری طرف تین چار دوکانوں کے بعد سر بلند خاں کے کوچہ کا دروازہ ہے۔ ضمیر دہلوی بھی اسی مکان میں پیدا ہوئے اور عمر بھر رہے۔ کیفی ابھی بہت صغر سن تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ فرماتے ہیں کہ والد کی شکل ہم کو یاد نہیں۔ ہم مہینوں کے تھے کہ وہ جنت کو سدھارے۔ سنا ہے کہ مدھر اقد، خوش پوش اور خوش باش جوان تھے۔ نابھہ میں کوتوال تھے۔ عین جوانی میں ہیضے سے انتقال کیا۔

والدہ کی عمر چھوٹی تھی۔ بیوگی کی حالت نے ان کی صحت بھی بگاڑ دی۔ اِن حالات نے کیفی کے قلب کو بہت متاثر کیا۔

حلیہ

حضرتِ کیفی کا قد چھوٹا یعنی کل پانچ فٹ ہے۔ رنگ پہلے خاصا گورا ہو گا اب کھلتا ہوا گندمی ہے۔ بدن متناسب، سر ذرا بڑا ہے۔ جوانی کی کسرت کا نشان اب بھی بازوؤں میں ملتا ہے۔ صحتِ جسمانی سے کوئی شکایت اب تک پیدا نہیں ہوئی۔ عمر کا تقاضا تو اٹل ہے ہی۔ کلین شیو یعنی ڈاڑھی مونچھ کا صفایا رکھتے ہیں۔ آپ خط بناتے ہیں۔ باہر کی پوشاک سر سے پاؤں تک انگریزی ہے یعنی مع ہیٹ کے لیکن فرشی نشست کے موقع پر جسے وہ مغلئی نشست کہتے ہیں بالکل دیسی پوشاک میں ملبوس ہوتے ہیں۔

تعلیم

جناب کیفی کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ بازار سیتا رام میں گھر کے قریب ہی حکیم بوریے والے کا مطب تھا اور ان کے ہاں مکتب بھی تھا۔ اس میں اِن کو داخل کیا گیا۔ اور پرانے طریق کے مطابق میاں جی سے فارسی کی تعلیم شروع ہوئی۔ کہتے ہیں کہ مکتب میں ہجا بازی پر اتنا زور نہیں دیا جاتا تھا جتنا آج کل لوئر پرائمری میں دیا جاتا ہے۔ الف بائے فارسی میں میاں جی نے ہجے کرائے ہوں گے لیکن کریما اور خالق باری میں نہیں کرائے نہ ان کی ضرورت ہی پڑی۔ فارسی کی تکمیل گھر پر اپنے نانا صاحب سے ہوئی جو اس زبان کے جید فاضل تھے، اور انگریزی کی تعلیم سینٹ سٹیفن کالج دہلی میں۔

شاعری کا ذوق

شاعری کا مذاق آپ نے اپنے ایک بزرگ پنڈت نرائن داس ضمیرؔ دہلوی سے ورثے میں پایا۔ بچپن ہی سے اس طرف جبلّی رغبت تھی۔ ابھی آپ مکتب میں میاں جی سے کریما اور خالق باری پڑھتے تھے کہ کسی موقع پر پلول جانا ہوا جہاں ان کے چچا تحصیلدار تھے۔ ان کے ہاں "کوہِ نور" اور "انجمن پنجاب" اخبارات آیا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں اخباروں کے کالم دوہرے جدولی خطوں سے الگ کئے جاتے تھے جیسے خطوط عموماً دیوانوں میں دیکھے جاتے ہیں یا یوں کہئے کہ جیسے کیفی صاحب کے کریما اور خالق باری میں تھے۔ یہ سمجھے کہ ان پر شعر چھپے ہوئے ہیں۔ اخباروں کو پڑھ تو نہ سکے مگر ان کو اشعار کا مجموعہ سمجھ کر اپنے بستے میں باندھ لیا واپسی کے وقت جب والدہ نے بستے کی چیزوں کی پڑتال کی تو وہ اخبار ان کو کھٹکے کہ یہ کیا ردّی باندھ رکھی ہے بستے میں۔ انھوں نے جواب دیا اس میں بڑے بڑے شعر لکھے ہیں۔ وہ مسکرا کر چپ ہو گئیں۔ کہتے ہیں کہ اخبار کے وہ متفرق کاغذ مدتوں ان کے بچپن کے قیمتی اندوختے میں رہے۔

پہلا شعر

نو دس برس کی عمر میں فیض آباد جانا ہؤا۔ وہاں ان کے ننھیال کے ایک رشتے دار تھے۔ ان کا ایک لڑکا جو کیفی صاحب کا ہم عمر تھا ان کا دوست ہو گیا تھا۔ واپسی کی تیاریاں تھیں۔ سامان کچھ بندھ چکا تھا کچھ بندھ رہا تھا۔ اُس زمانے میں ٹرنک اور سوٹ کیس وغیرہ نہیں چلے تھے۔ پٹارے یا منجھولے لکڑی کے صندوق قیمتی چیزوں کے لئے اور جامدانیاں ہوتی تھیں جن کو اجمیر سے خصوصیت تھی۔ یا پھر چھوٹی بڑی گٹھڑیاں اور گٹھڑ۔ ان کی صورت یہ تھی کہ فرش کی ہلکی چیزیں ان کا بالائی غلاف تھا۔ دوسروں کی درزیں سی دی جاتی تھیں اور اوپر سے کچھ ایک جال کی طرح رسی لپیٹ دی جاتی تھی۔ کل فیض آباد سے روانگی ہوگی کہ آج اِن دونوں معصوم دوستوں کی تاش میں جھوڑ ہوگئی۔ اُس دوست لڑکے نے کیفی کو ایک نیزے کا قلم تحفہ دیا تھا۔ اس پر لاکھ پوت کر پتے کا گنگا جمنی لہریا چپکایا ہؤا تھا۔ چنانچہ جب کُٹّی ہوگئی تو حساب کیوں نہ چکایا جاتا۔ ادھر سے تقاضا ہوا "لا میرا قلم"۔ کیفی دوڑے ہوئے ماں کے پاس گئے اور قلم مانگا۔ انھوں نے ایک بنڈل کی طرف اشارہ کیا کہ اس میں بندھا پڑا ہے نکل نہیں سکتا۔ یہ اپنا سا منہ لے کر واپس آئے اور چپ بیٹھ گئے۔ اس نے پھر قلم مانگا۔ یہ ایک منٹ بھی اس قلم کو رکھنے کے روادار نہ تھے لیکن مجبور تھے۔ غیرت اور غصے کا شکار تھے کہ پھر تقاضا ہؤا۔ اُس وقت یہ شعر بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا۔

اب تو وہ بندھ گیا پلندے میں
اور وہ پھنس گیا ہے پھندے میں

یہ کیفی کا پہلا شعر تھا۔ بعض لڑکوں نے اس شعر کو اٹھالیا اور جیسی کہ بچوں کی عادت ہے ہر بات میں کھیل کی بات نکال لیتے ہیں اس شعر کو دہرانا شروع کیا۔ غل سے بڑوں کو خبر ہوئی۔ کیفی کی طباعی کی داد دی گئی اور قلم کے دعویدار کو مٹھائی۔ فرماتے تھے کہ وہ قلم مدتوں ان کے پاس رہا۔ بعد میں پنڈت رتن ناتھ سے اکثر ملاقاتیں ہوئیں اور ہر بار اس تاریخی قلم کا تذکرہ ہوتا اور دونوں خوب محظوظ ہوتے۔

شاعری کا آغاز

گلستاں، بوستاں، دستور الصبیان وغیرہ کتابیں جلد ہی مکتب میں ختم کرلیں کہ اسکول میں بٹھایا گیا۔ اس زمانے میں دوسری جماعت ہی سے انگریزی کی تعلیم شروع کرا دیتے تھے۔ یہ نصاب سینٹ سٹیفنس کی شاخ یعنی لوئر پرائمری کا تھا۔ یہاں سے فارغ ہو کر ان کو شاہ جی کے چھتے کے سرکاری سکول میں داخل کیا گیا۔ مولوی رحیم بخش جواب

لے ان کا نام پنڈت رتن ناتھ کول اتپات تھا جو بعد میں مہاراجہ کشمیر کے اے ڈی کانگ ہوگئے تھے۔

نواب سر رحیم بخش بہادر ہیں ان کے فارسی کے استاد تھے۔ کیفی گھر پر اپنے نانا سے انوار سہیلی وغیرہ پڑھا کرتے تھے۔ اس لئے مولوی صاحب کو عزیز ہونے ہی ٹھیرے۔ ایسا شاگرد پرائمری سکول میں انھیں کہاں ملتا تھا جو گھر پر انوار سہیلی اور یوسف زلیخا پڑھتا ہو۔ اب یہ وہ زمانہ تھا کہ شعر کہنا شروع ہو گیا تھا۔ کیفی نے مولوی رحیم بخش کو ایک غزل اصلاح کے لئے دی۔ انھوں نے یہ کہہ کر لوٹا دی کہ انگریزی تعلیم سے فارغ ہو کر اس خبط میں پڑنا۔ ان کو معلوم ہوا کہ مولوی انعام اللہ بیگ انعام جو اسی مدرسے کی لوئر جماعتوں کے استاد تھے شاعر بھی ہیں۔ ان سے رجوع لائے اور غزل ان کو دے آئے۔ انھوں نے غزل ابھی واپس نہیں دی تھی کہ ان کی غزل دہلی کے اخبار "خیر خواہِ ہند" میں چھپی دیکھی وہ انھیں بہت سست اور بے کیف معلوم ہوئی۔ مولوی صاحب نے کئی بار کہا بھی کہ غزل دیکھ لی ہے لے جانا لیکن انھوں نے اُن کی طرف رُخ نہ کیا۔

حضرت مجروح سے معاملہ

دہلی میں ایک کوچہ ہے جسے پنڈت کا کوچہ کہتے ہیں۔ اس کا راستہ لال کنوئیں کے بازار سے ہے۔ دوسری طرف شاہ تارا کی گلی سے ملحق ہے۔ ادھر سے گاڑی جا سکتی ہے۔ اس کوچے میں خان بہادر نظام الدین خاں گورنمنٹ پنشنر اور آنریری مجسٹریٹ رہا کرتے تھے۔ ان سے اور کیفی کے دادا[1] صاحب سے مخلصانہ اور برادرانہ تعلق تھے۔ وہ جب دہلی آتے اپنے قدیمی مکان واقعہ کوچہ سربلند خاں میں نہیں بلکہ پنڈت کے کوچے میں خانصاحب ہی کے پاس ٹھیرا کرتے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے ایام میں دونوں بزرگ ساتھ رہے تھے اور ضلع سرسہ کو جو جھجر کی جھپٹ میں آنے والا تھا انھیں دونوں نے بچایا تھا۔ اس کے صلے میں گورنمنٹ نے ان دونوں افسروں کی آخری پوری تنخواہیں پنشن میں بحال رکھیں۔ یعنی خاں صاحب کو پرمٹ کی افسری کی اور پنڈت صاحب کو تحصیلداری کی۔ پنڈت جیون رام ان کا نام تھا۔ خان صاحب شاعر بھی تھے اور بیخود تخلص کرتے تھے۔ پنڈت صاحب مہمان تو اپنے دوست کے ہوتے لیکن کھانا پینا الگ رہتا۔ کیفی نہایت حسرت سے یہ ذکر کرتے ہیں کہ دیکھو وہ ایک زمانہ تھا کہ پرہیز اور احتیاط خواہ وہ کسی نوعیت کی تھی اتنی

---

[1] کیفی کے دادا تو ان کی اوائل عمر میں ہی انتقال کر چکے تھے، یہ ان کے دادا کے چھوٹے بھائی تھے۔ پرانی تہذیب میں کنبہ پروری اور ہمدردی اتنی تھی کہ کیفی کو جوان ہونے کے بہت بعد معلوم ہوا کہ آن کے دادا فوت ہو چکے ہیں اور یہ ان کے بھائی ہیں چچا کا ذکر بھی آتا ہے۔ یہ سگے چچا نہ تھے بلکہ انہیں بزرگ کے بیٹے تھے۔ کیفی کے سگے چچا کوئی نہ تھے کیفی کے سرپرست یہی دادا اور نانا تھے۔

اتنی شدید ہونے کے باوجود خان صاحب اور پنڈت صاحب میں جو محبت اور دلی یگانگت تھی. اب سگے بھائیوں میں کم پائی جاتی ہے. خیر اب سنئے، میر مہدی مجروح کا مکان خاں صاحب کے مکان کے پاس ہی تھا۔ وہ اکثر شام کو خاں صاحب کے ہاں آ بیٹھتے تھے. سب اُن کی عزت کرتے تھے. ایک دن وہ پوچھ بیٹھے کہ پنڈت صاحب یہ لڑکا کون ہے جو آپ کے پاس آیا کرتا ہے۔ انہوں نے کہا میرا پوتا ہے. میر مجروح نے کہا کہ اسے یہاں کیوں رکھ چھوڑا ہے شہر میں سکول کے لڑکوں کی صحبت خراب سنی جاتی ہے. پاٹودی کے ساوات میں سے ایک صاحب میر امید علی تھے جو پھکیتی اور بنوٹ کے فن میں نامی گرامی تھے. وہ اس فن میں کیفی کے استاد تھے اور ان سے بیٹوں کی طرح محبت کرتے تھے۔ انھوں نے مجروح کو جواب دیا کہ حضرت وہ لڑکا نہایت سعید ہے اور شعر بھی کہتا ہے. بہت ہونہار شاعر ہے. یہ میر امید علی کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ کیفی جس کی عمر اسوقت پندرہ برس کے قریب تھی شعر بھی کہتا ہے. میر مجروح نے ایک انگریزی سکول کے لڑکے کے شاعر ہونے پر استعجاب کا اظہار کیا اور امید علی سے فرمایا کہ اس کا کوئی شعر یاد ہو تو سنائیں. کیفی نے اُن دنوں ایک غزل کہی تھی جو میر امید علی کو خاص کر اس شعر کی وجہ سے بہت پسند تھی.

سر اُڑا یا اور الٹا پھر گیا
ہاتھ ہلکا ہے مرے جلاد کا

میر مجروح نے نہ صرف یہ کہ اس شعر کی داد نہ دی بلکہ اس کو مہمل بتایا. دونوں میر صاحبوں کی بے تکلفی تو تھی ہی، اس پر میر امید علی اپنے فن کے تاثر سے ذرا گرم مزاج کے تھے انھیں غصہ آ گیا اور بولے کہ آپ قلم چلانے والے ہیں تلوار کے فن کو کیا جانیں. شمشیر زنی کا یہ انتہائی کمال ہے کہ ہاتھ پر اتنا قابو ہو کہ جس نقطے سے چاہیں واپس آجائے تاکہ دوسرے وار کے لئے تیار رہے. یہ اناڑی پن ہے کہ ہاتھ وائرہ بنا کر اپنی ضرب کی جگہ پر واپس آئے. آپ نے اس شعر کو مہمل کہہ کر شاعر کی جگر کاوی کا خون کر دیا ہے. پنڈت جی تو خاموش رہے مگر خاں صاحب نے میر امید علی کی زور سے تائید کی حتیٰ کہ میر مجروح کو اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی اور انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اس لڑکے (کیفی) کو دیکھکر خوش ہوں گے. اتفاق سے دوسرے دن جب کیفی حسب معمول سلام کو آئے تو میر مجروح اور میر امید علی بھی تشریف رکھتے تھے. خاں صاحب نے ہنستے ہوئے کہا کہ تو نے کل دو سیدوں کو لڑوا ہی دیا تھا۔ وہ غزل تو سنا صیاد کا، ناشاد کا. کیفی نے وہی تشریح کی جو کل ہو چکی تھی، اور دو ایک غزلیں جو یاد تھیں فرمائش پر سنائیں. سب نے بالخصوص میر مجروح نے بہت شاباش دی. اور خاں صاحب نے

اپنی گھڑی جیب سے نکال کر انعام میں دی کیفی فرماتے ہیں کہ وہ برسوں اس جلادی گھڑی کو احتیاط سے رکھتے رہے۔

ہم مشق شعرا پنڈت امرناتھ مدن ساحر، بابو رام رچھپال سنگھ شیدا، پنڈت جواہر ناتھ ساقی اور نواب حیدر مرزا قلندر خلف مرزا سالک اگرچہ مشقِ سخن میں اور عمر میں بھی کیفی سے زیادہ تھے مگر سب ہم مشق تھے۔ ایک جگہ بیٹھ کر ایک دوسرے کے کلام کی بے رحمی سے تنقید کرتے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ رہا پھر وہ گلدستہ بکھر گیا۔ کوئی کدھر چلا گیا، کوئی کدھر چلا گیا۔

خواجہ حالی سے ملاقات پچاسی چھیاسی میں اور اس کے قریب یہ معمول رہا کہ کیفی روز خواجہ حالی کے مکان پر جاتے۔ حالی شام کو جلدی ہی غسل کرتے اور کھانا بھی جلدی کھا لیتے پھر دونوں ٹلیا محل میں ننھے خاں صاحب شیدا کے ہاں جاتے جو خواجہ صاحب کے بڑے دوست تھے۔ گھنٹہ بھر کے قریب وہاں بیٹھتے ادبی گفتگو ہوتی واپسی پر کیفی اور خواجہ صاحب قاضی حوض سے الگ ہو کر اپنے اپنے گھر کو چلے جاتے۔ کیفی نے صرف دس بیس شعر حالی کو دکھائے تھے ویسے زبان اور ادب کے متعلق گفتگو ہمیشہ رہتی تھی اور حالی کی صحبت سے انھوں نے بہت فائدہ اٹھایا لیکن شاعری میں جس کا نام استادی شاگردی ہے وہ رشتہ ان کے درمیان نہ تھا۔ جو خردانہ عقیدت کیفی کو حالی سے تھی اور جو رائے کیفی کی ان کے کلام کے متعلق تھی اس کا اظہار ان رباعیات سے ہوتا ہے جو کیفی نے حالی کی وفات پر کہیں دو رباعیات یہاں دی جاتی ہیں۔

۱
وہ سرورِ ملکِ خوش مقالی نہ رہا — سجادۂ میرزا کا والی نہ رہا
ماتم ہو نہ کیوں ملک سخن میں کیفی — افسوس کہ آج خواجہ حالی نہ رہا

۲
کوئی یہ مسیحائی دکھائے تو سہی — ان مردہ دلوں کو جلائے تو سہی
کرتا ہے جو اعتراض شعروں پہ ترے — دو شعر وہ ایسے کہہ کے لائے تو سہی

آزاد سے ملاقات جب حضرتِ کیفی پہلی دفعہ لاہور آئے تو حضرتِ آزاد دہلی دروازے کے باہر باغ کے سرے پر کتب خانہ تعمیر کرا رہے تھے۔ ایک کمرہ بالکل تیار ہو گیا تھا اور حضرتِ آزاد خود اپنے ہاتھوں سے الماریوں میں کتابیں سجا رہے تھے[1]۔ فرماتے تھے کہ اسی سفر میں ایک شام راجہ نریندر ناتھ کے مکان پر گئے ہوئے تھے کہ حضرتِ آزاد تشریف لے آئے۔ شعر و شاعری کا جو چرچا چھڑا تو دس بج گئے۔ راجہ صاحب اس وقت اپنے شہر کے مکان میں رہتے تھے جو دہلی دروازے کے اندر ہے۔ ہم سب ان کو ڈیوڑھی تک چھوڑنے آئے۔ وہی تذکرہ

---

[1] یہ مکان اب تک موجود ہے۔ اخبار "آبزرور" شیخ (اب آنریبل سر) عبدالقادر کی ادارت میں مدت تک اس مکان سے شائع ہوتا رہا۔ آجکل وہاں میونسپل ریڈنگ روم ہے۔

برابر چلتا رہا۔ آزاد کی گفتگو میں وہ لذت تھی کہ بامذاق آدمی کبھی سیر نہ ہوتا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سنتے سناتے ہم سب یکی دروازے تک پہنچ گئے۔ تب کہیں خود ہی آزاد نے کہا کہ بھئی اب جاؤ، مشایعت کی حد ہو چکی۔ حضرتِ کیفی فرماتے ہیں کہ زبان کی تحقیق میں جو کمال انھوں نے آزاد اور مولوی سید احمد میں دیکھا وہ دوسرے شخص میں نہیں پایا۔

آزاد سے آخری ملاقات

فرماتے ہیں کہ حالی عربی سکول سے فارغ ہو کر پانی پت چلے گئے تھے، اور دہلی میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس پہلی دفعہ ہونے کو تھا۔ غازی الدین کا مدرسہ جو اجمیری دروازے کے باہر واقع تھا پولیس لائین سے خالی ہو کر واگذار ہو چکا تھا اور وہاں عربی سکول اٹھ آیا تھا۔ اس مکان میں کانفرنس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ آزاد کا دماغ بگڑ چکا تھا اور سنا تھا کہ وہ دہلی آئے ہوئے ہیں۔ حالی کانفرنس کی تقریب کے لئے پانی پت سے آئے ہوئے تھے۔ حالی اور کیفی دونوں سر سیّد کی ملاقات کو اس مدرسے میں گئے۔ پھاٹک کی یک جانب ایک بڑا کمرہ تھا جس کے دروازے باہر کے رُخ بھی تھے جو کھلے ہوئے تھے۔ اس ہال میں کئی میزیں لگی تھیں، جن پر لوگ کام کر رہے تھے۔ ادھر سے حالی اور کیفی اس ہال میں داخل ہوتے ہیں اور سر سید جس میز پر کام کر رہے تھے اس کے پاس جا کر کھڑے ہی ہوئے ہیں کہ باہر کے دروازے سے ایک شخص فرفر فارسی بولتا ہوا مجنونانہ اندر داخل ہوتا ہے۔ یہ حضرتِ آزاد تھے۔ سب لوگ اپنے اپنے کاغذ اور کتابیں محفوظ کرنے لگے۔ خوف تھا کہ وہ کاغذوں پر نہ گریں۔ اسی مکان میں "قفس کی تیلیاں، نفس کی تیلیاں" والے معرکے کے مشاعرے ہو چکے تھے اور استاد شاگرد یعنی شاہ نصیر اور شیخ ذوقؔ کی آپس میں چوٹیں چلی تھیں۔ آزاد سر سید کی میز کے قریب آکر ذرا کھٹکے کہ اُن کی نظر کیفی پر پڑی۔ بے تحاشا چیخ کر کہا کہ تو ان کافروں میں کہاں آگیا۔ اِن کو وقت کی خوب سوجھی۔ فوراً جواب دیا کہ حضرت میں تو وہ کمرہ دیکھنے آیا ہوں جہاں استاد ذوقؔ کے وہ تیلیوں والے مشاعرے ہوئے تھے اور پاس آکر کہا کہ حضور اس چشمۂ آبِ حیات تک لے جانے کو خضرِ راہ بنیں۔ آزاد چپ چاپ ساتھ ہو لئے۔ کیفی چلتے چلتے حالی کے کان میں کہہ گئے "پھاٹک پر سواری"! سارے مکان کی گشت شروع ہوئی۔ آزاد کو باتوں میں لگائے رکھا۔ آخر پھاٹک پر لا کر گاڑی پر سوار کیا اور جامع مسجد کے پاس لا کر چھوڑ دیا۔

آزاد جیلی قبر کے کسی محلہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

علامۂ شبلی سے ملاقات

علامۂ شبلی کی ایک مثنوی "صبحِ امید" علی گڈھ کے کالج کی حمایت میں ہے۔ اس میں اہلِ عرب کی عہدِ ماضی کی علمی ترقیوں کی ذیل میں یہ شعر آتا ہے۔

جو فلسفیانِ ہند و چیں تھے
خرمن سے اسی کے خوشہ چیں تھے

کیفیؔ فرماتے ہیں کہ عرب سے ہند، اور چین کا فلسفہ سیکھنا ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ تلاش اور تحقیق کے باوجود جب اس کا ثبوت نہ مل سکا تو علامۂ موصوف سے استصواب کا خیال پیدا ہُوا۔ حسنِ اتفاق سے شبلی ہوشیارپور میں اسلامیہ سکول کی افتتاحی رسم کی صدارت کے لئے آئے اور جالندھر میں خان نیاز محمد خاں صاحب وکیل کے مکان پر ٹھہرے۔ کیفیؔ شبلی سے ملنے گئے اور سوال پیش کیا۔ انھوں نے اور باتیں شروع کر دیں کہ اتنے میں ایک نہایت خوبصورت ایرانی نوجوان چائے کا طشت لے کر آیا، اور اسے دونوں کے بیچ میں رکھ کر چلا گیا۔ مولانا نے پوچھا آپ کے لئے پیالہ بناؤں؟ انہوں نے مسکرا کر کہا کہ اگر لانے والا کوئی اور ہوتا تو شاید اس سوال کی ضرورت تھی آپ بھولتے ہیں میں شاعر بھی ہوں۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے اور وہ ہند و چین کا سوال قہقہوں اور خوش گپیوں میں غائب ہو گیا۔

مولوی سید احمد

مولوی سید احمد مولف فرہنگِ آصفیہ سے ان کا تعلق دہلی کے گورنمنٹ ہائی سکول میں ہُوا جہاں وہ فارسی کے مدرس تھے۔ مختصر یہ کہ جماعت میں مولوی صاحب تو ارمغانِ دہلی کے مسودے ٹھیک کیا کرتے تھے اور پنڈت صاحب اپنی جماعت کو فارسی میں سبق دیا کرتے تھے۔ بعد میں ان دونوں کے محض دوستانہ تعلق ہو گئے جس کا اظہار مولوی صاحب نے اپنے رسالہ "محاکمۂ مرکزِ زبانِ اردو" میں کیا ہے۔

اور ادیبوں سے تعلق

مولوی سیف الحق ادیبؔ تلمیذ غالب اور مرزا ارشد گورگانی شاگرد مرزا صابرؔ سے اکثر صحبتیں گرم رہتیں اور علم و ادب کی گفتگو چلا کرتی۔

نواب سائل اور گرامی

کہتے ہیں اسیوں کے اوائل میں نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ دہلوی سے ملاقات ہوئی۔ گرامیؔ بھی وہاں موجود تھے۔ فرماتے ہیں کہ

یہ اوّل موقع تھا کہ نواب سائل کو ترنم میں شعر پڑھتے سنا۔ اس سے پہلے کسی کو ترنم سے شعر پڑھتے نہیں سُنا تھا۔ ان کی رائے میں یہ طرز نواب سائل کا ایجاد ہے۔

لالہ سری رام

لالہ سری رام مولف "خمخانۂ جاوید" سے اور ان سے نہایت مخلصانہ تعلق تھے۔ اکثر آدمی ان کو لالہ صاحب کا بڑا بھائی سمجھتے رہے۔ ان سے کیفی کی ملاقات کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ لالہ سری رام جو اس وقت سکول میں پڑھتے ہوں گے اپنے والد آنریبل رائے مدن گوپال بہادر کے ساتھ دہلی میں رائے بابو مل کے مکان پر لاہور سے آئے ہوئے تھے۔ لالہ سری رام کو شقیقہ کی شکایت ہوئی۔ ڈاکٹر بنس گوپال سنگھ جو اپنے وقت میں دہلی کے مشہور ڈاکٹر ڈ ل میں تھے بلائے گئے۔ کیفی صاحب اس وقت ڈاکٹر صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ساتھ چلو۔ نئی سڑک میں ایک مریض کو دیکھ کر قاضی کے حوض کی طرف بھی جانا ہے۔ وہاں سے تم اپنے گھر چلے جانا۔ یہ ان کے ساتھ گاڑی پر سوار ہوئے اور گاڑی ہی میں بیٹھے رہے جب ڈاکٹر صاحب لالہ سری رام کو دیکھنے مکان میں گئے۔ وہاں ان کو دیر لگی۔ ان کو اندر بلا لیا گیا۔ اس سے کچھ پہلے کیفی نے بابو مدن گوپال کی شان میں ایک نظم لکھی تھی۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ پہلے بیرسٹری کے امتحان میں رومن لا کی سٹوڈنٹ شپ کا ایک ضمنی امتحان بھی ہوتا تھا۔ جو اس میں اوّل رہتا کئی سو پونڈ کا انعام پاتا رائے مدن گوپال اس امتحان میں اوّل نکلے تھے۔ اس خوشی اور مبارک بادمیں انہوں نے ایک نظم لکھی تھی جو اخباروں میں شائع ہو چکی تھی۔ ان کے بیمار کے کمرے میں جانے سے پہلے ان کا غائبانہ تعارف وہاں ہو چکا تھا۔ جب یہ پہنچے تو بابو مدن گوپال نے ان سے سوال کیا کہ بھئی میں نے تو تمہیں کبھی نہیں دیکھا نہ ہمارے تمہارے خاندانی تعلق ہے پھر تم کو اس نظم کا کیسے خیال آیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ محض ایک ہندوستانی کی کامیابی کا سنکر خوشی نے جوش کیا اور یہ نظم لکھی گئی۔ یہ بات سب کے دل میں بیٹھ گئی رائے صاحب نے ہنس کر کہا کہ اب سری رام کی تکلیف ہٹ جائے گی۔ اسے ایک شاعر مل گیا ہے۔ اور ہُوا بھی ایسا ہی۔ کیفی روک لئے گئے اور لالہ سری رام نے ایک دن کے فاقے کے بعد کیفی کے ساتھ سیر ہو کر کھانا کھایا۔

کیفی کے ادبی احباب

حضرت کیفی کے احباب کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ اس میں ذکر کے قابل یہ حضرات ہیں۔ مرحومین میں مولوی سیف الحق ادیب، مرزا ارشد گورگانی، مولوی عبدالرحمٰن راسخ، پنڈت جواہر ناتھ ساقی، مرزا محمد تقی بیگ مائل، پنڈت رتن ناتھ سرشار پنڈت بشن نرائن در آبر، مسٹر حامد علی خاں لکھنوی، مولانا اشہری، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، بابو دوارکا پرشاد افق، منشی نوبت رائے نظر اور چھوٹے بھیا اور پنڈت برج نرائن چکبست، مولوی سید احمد، پنڈت پدم سنگھ

شعرا، مولانا غلام قادر گرامی، خان بہادر ناصر علی خاں۔ ان میں عمر، فضیلت اور شہرت کی کمی بیشی یگانگت اور آزادانہ ادبی مباحث میں مانع نہ ہوتی۔ حضراتِ موجودہ میں خصوصیت سے یہ نام گنائے جا سکتے ہیں مولوی عبدالحق ناظم انجمن ترقی اردو، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، نواب سراج الدین احمد خاں سائل۔ پنڈت امرناتھ ساحر۔ یہ حضرات کیفی کے نہایت پیارے دوست ہیں۔ خان بہادر مولوی رضا علی وحشت مولانا صفی، حضرات آرزو، ظریف، حکیم آشفتہ، سراج، منظر، قدیر، حکیم آزاد انصاری، حسرت موہانی دیا نرائن نگم، افسر الشعرا آغا شاعر، مولانا تاجور، مولانا شاداں بلگرامی، پروفیسر اکبر حیدری، چودھری خوشی محمد ناظر، میر نیرنگ، صاحبزادہ محمد عمر، پنڈت منوہر لال زتشی، مولوی مہیش پرشاد۔

شاعری کا رنگ بدلتا ہے فرماتے ہیں کہ ہماری شاعری اپنی بساط بھر زور پر تھی۔ اس وقت کشمیری پنڈتوں میں یہ رواج تھا کہ شادیوں میں کھانے کے بعد لڑکے اور نوجوان نوشہ کے سامنے سہرے اور اردو فارسی کی غزلیں سنایا کرتے تھے۔ ہم نے ایک ایسے موقع پر اپنی تازہ غزل سنائی، جس کا مطلع یہ ہے۔

کبھی جو پاس بھی بیٹھے تو کسمسائے ہوئے
دبے جھکے ہوئے سمٹے ہوئے لجائے ہوئے

اس میں ایک شعر یہ تھا۔

گئی نہ شرم شبِ وصل میں بھی تو ان کی
مری بغل میں وہ آئے بدن چرائے ہوئے

اس غزل کی بے انتہا داد ملی۔ اس موقع پر کپتان پنڈت شام نرائن تکو بھی موجود تھے۔ یہ بزرگ فارسی کے عالم، اردو کے شاعر اور ہمارے رشتہ دار تھے۔ جے پور میں فتح پلٹن کے کپتان یعنی کمانڈنگ افسر تھے۔ وہ سوامی دیانند سرسوتی کے پرانے چیلوں میں تھے، اور ایک مذہبی کتاب سندھیا کی تشریح پر شام چراغ کے نام سے لکھ بھی چکے تھے۔ پرانے ہندیرانی کلچر کے بہترین نمونوں میں سے تھے۔ ناخن سے موم کاغذ پر خوب لکھتے اور گل بوٹے بناتے۔ خطاط بھی اعلیٰ درجے کے تھے۔ لیکن اب سوامی جی کی صحبت سے وہ قدیم رنگینی ثقاہت اور سنجیدگی سے بدل گئی تھی۔ اس صحبت کے بعد الگ لے جا کر فرمانے لگے کہ تم اپنے نانا صاحب سے کیا پڑھتے ہو۔ جواب ملا ابو الفضل۔ فرمایا میں سمجھا بہارِ دانش پڑھتے ہو گے۔ جواب دیا وہ پڑھ چکا ہوں مگر ان کا بہارِ دانش والا فقرہ مجھے کھٹکا۔ عرض کیا آپ کچھ فرمانا چاہتے ہیں اور رُکتے ہیں۔ انھوں نے ارشاد کیا کہ جو غزل تم نے ابھی سنائی اگر اپنے نانا صاحب کو سناؤ تو وہ تمہاری گت بنے کہ یاد رکھو۔ میں نے

تامّل کے بعد کہا کہ ایسے شعر تو سب غزلوں میں آتے ہیں، کیا فارسی کیا اردو۔ فرمایا جب ہی تو ہماری شاعری مر رہی ہے۔ غرضکہ انہوں نے شاعری اور اخلاق پر ایک لکچر دے ڈالا۔ ان کی باتیں میرے دل میں بیٹھ گئیں۔ پھر مسدس حالی دیکھنے میں آیا، اور خواجہ حالیؔ کی خدمت میں جانا شروع ہو گیا غزل کہنا تو اب شاذ و نادر ہو گیا، لیکن جو کچھ بھی اب کہتا خود مجھے بھی روکھا پھیکا معلوم ہوتا۔ غزل کو بالکل چھوڑ دینا بھی گوارا نہ تھا اور کلام کا روکھا پن بھی پسند نہ آتا تھا۔ مدت تک یہی شش و پنج رہا۔ آخر وہ رنگ ہاتھ آ گیا جو اس وقت میری غزل اور عام کلام میں ہے۔ یعنی تغزل کے رنگ کو کلام میں سمونا اور ہندو ویدانت اور اسلامی تصوف کو شیر و شکر کرنا، جس کا رستہ اوّل اوّل شاہزادہ دارا شکوہ نے بتایا تھا۔

ملیات

ملّی الجھیڑے میں کیفیؔ کبھی نہیں الجھے۔ اور کیسے الجھتے جب ان کی روزانہ زندگی ملّی خرخشوں سے پاک ہے تو اُن کے کلام میں ملّی کثافت کیونکر آ سکتی تھی۔ انہوں نے ۱۹۰۵ء میں ایک مسدس لکھا تھا جس کا نام بھارت درپن رکھا۔ اس میں ہنود کے عہدِ ماضی و حال و مستقبل سے بحث تھی سر اقبال اس وقت بیرسٹری کے لئے ولایت گئے ہوئے تھے۔ آپس میں دوستانہ تعلق تھا۔ ایک نسخہ بھارت درپن کا ولایت بھیجا گیا۔ سر اقبال نے کتاب کی رسید دیتے ہوئے علاوہ اور باتوں کے لکھا کہ کاش بھارت درپن کُل اہل ہند سے متعلق ہوتا۔ کیفیؔ نے جواب میں لکھا کہ یہ اوّل اور آخری کتاب ہے جو محض ہندوؤں سے تعلق رکھتی ہے۔ کیفیؔ آج تک اس پر عامل رہے۔ یات نامہ میں جو اس مجموعے کا ایک حصہ ہے کئی ٹکڑے ملیات کی مذمت میں ہیں۔ کیفیؔ کی عملی زندگی ان کے اعلان کردہ اصول کی آئینہ دار ہے۔ اس سے نہ صرف اُن کا خاص مقامی حلقۂ احباب اثر پذیر ہوا بلکہ وہ بھی جو کسی نہ کسی وجہ سے ملّی جنگ کے مردِ میدان ہیں آپ کی عزت کرتے ہیں اور آپ کے شعار و کردار کے مدح گستر ہیں۔

لکھنؤ میں شادی

پنڈت اجدھیا ناتھ شوپوری لکھنؤ کے قدیم باشندے فیض آباد میں ملازم تھے۔ ان کی صاحبزادی سے کیفیؔ کی شادی ہوئی تھی۔ اردو شاعری اور ادب کے حق میں یہ جوڑ میل بہت مبارک ہوا۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ بیگم کیفیؔ اچھی لکھی پڑھی تھیں جس زمانے میں کیفیؔ نے آنکھیں کھولیں دہلی اور لکھنؤ کا مقابلہ اور ان کے لسانیاتی اختلاف خاص و عام کے زبان زد تھے۔ لیکن حضرت کیفیؔ نے ابتدائی زمانے سے ان بحثوں میں حصہ نہیں لیا۔ گلزارِ نسیم سے متعلق معرکہ چک بست و شرر میں اظہار رائے کے لئے جب کیفیؔ سے کہا گیا تو انہوں نے جواب دیا۔

چو کارے بے فضولِ من بر آید — مرا در وے سخن گفتن نہ شاید

اسی سلسلے میں راقم کے مفصل جواب کے تقاضے پر فرمایا کہ بھئی میں اس وجہ سے اس مباحثے میں شریک نہ ہوا کہ آخر تک چک بست مباز رز اصلی کے سوا کوئی ہندو ادیب اس مناظرے میں شامل نہیں ہوا اگر اس میں شریک ہوتا تو ممکن ہے اور کوئی ہندو صاحب بھی میری تقلید کرتے۔ خوف تھا کہ مباحثہ ملی رنگ نہ اختیار کرلے۔ پھر کہنے لگے خوشی کی بات ہے کہ اول سے آخر تک یہ مباحثہ ادبی حیثیت ہی پر قائض رہا۔

اولادیں

بارہ سال کے قریب ہوئے کہ رفیقۂ حیات نے انتقال کیا۔ اولادیں کئی ہوئیں۔ اس وقت دو صاحبزادے ہیں جو برسرکار ہیں۔ بڑے صاحب پنڈت پیارے موہن دتاتریہ بی اے ایل ایل بی، لاہور کے نامی انگریزی روزنامہ "ٹریبیون" کے فرسٹ اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں اور پبلک میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اِن کے چھوٹے بھائی پنڈت سریندر موہن دتاتریہ ایم اے، بی ٹی، لائلپور کے گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہیں۔ بزرگ والد کی خوش نصیبی کہیے یا والدین کا حسنِ تربیت کہ دونوں صاحبزادے نہایت سعید اور صالح جوان ہیں۔ بڑے صاحب تو انگریزی تصانیف کے علاوہ ایک اردو کی کتاب کے بھی مصنف ہیں۔ یہ تصنیف "بھول کماری" جو اردو میں نئے طرز کا ڈرامہ ہے ملک میں نہایت پسند ہوئی ہے ؎

بڑھاپے کی جوان شاعری

اکثر دیکھا گیا ہے کہ جید استادوں اور بڑے بڑے کہنے والوں کا کلام بلحاظ عمر کے ساتھ بوڑھا ہوتا جاتا ہے۔ اُن کے تخیل میں اور زورِ بیان میں وہ قوت باقی نہیں رہتی جو پہلے تھی۔ بعض صورتوں میں تو شاعر سے پہلے اس کی شاعری مرجاتی ہے۔ کیفی اس سال کے ساتھ اپنی عمر کے ستر برس ختم کردیں گے، لیکن میں دیکھتا ہوں اور مجھ سے پرانے اُن کے جاننے والے کہتے ہیں کہ کیفی جوں جوں بوڑھا ہوتا جاتا ہے اس کی شاعری جوان ہوتی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں بے عملی اور یاس کا نشان تک نہیں۔ جوشِ عمل اور رامیہ ہر جگہ کارفرما ہے۔

مدح

ہمیشہ رئیسوں اور ریاستوں کی ملازمت کی لیکن کسی کی مدح نہیں کہی۔ یہ کشمیر میں اسسٹنٹ فارن سکرٹیری تھے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے وقت میں دستور تھا کہ دوپہر کو تمام گزٹڈ افسر "جے دیا" کو دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ کشمیر کی ملازمت سے پیشتر مہاراجہ کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔

؎ یہ عزیز ۱۹۳۶ء کے دسمبر میں جوان مرگ ہوا۔

ایک روز مہاراجہ نے فرمایا تم شعر کہا کرتے تھے؟ جواب نفی میں نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر ارشاد ہؤا کوئی سناؤ۔ یہ عجیب شش و پنج میں آ گئے۔ آخر عرض کیا دربار میں سنانے کے لائق اس وقت تو کوئی شعر یاد نہیں آتا، حکم ہو تو کل عرض کروں۔ خیریت گزری کہ مہاراجہ نے یہ عرض منظور کر لی اور فرمایا اچھا کل سنانا۔ دربار برخاست ہؤا تو ان کے دوست افسروں نے کہا کہ کل ضرور کچھ لیتے آنا ورنہ سرکار ناراض ہو جائیں گے۔ رات کو قصیدۂ دعائیہ کہا اور اگلے دن دربار میں سنایا جسے مہاراجہ نے اور دربار نے نہایت پسند کیا۔

دہلی کا شاہی دربار

ہاں بادشاہ جارج پنجم کی مدح انہوں نے کی ہے۔ لیکن فرماتے ہیں کہ اس موقع پر قصیدہ کہنے کو لالہ سری رام نے مجبور کیا۔ کہنے لگے ہندوستان بھر کے شاعر اور ہر زبان کے شاعر اس دربار سے متعلق نظمیں اور قصیدے لکھیں گے تم کیوں نہیں لکھتے۔ حضرتِ کیفی کہتے ہیں میں نے خیال کیا صلے اور انعام کا الجھیڑا تو ہے نہیں آؤ ہم بھی لکھیں۔ چنانچہ انہوں نے مشہور لامیہ زمین میں سوا سو شعر کا قصیدہ لکھا جو تمام اردو نظموں میں بہترین قرار دیا گیا۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی نظم کو دوسرا درجہ ملا۔ کیفی اس کا ذکر کسی سے نہیں کرتے نہ وہ تمغہ جو اس موقع پر ملا تھا کبھی لٹکاتے ہیں۔ قصیدہ اس مجموعے میں موجود ہے۔

مطالعہ

حضرتِ کیفی نے تمام علوم کا خاصا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے حافظے اور مطالعے کا یہ عالم ہے کہ خواہ کسی موضوع پر گفتگو ہو وہ اس کے متعلق پورے معلومات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ انڈولوجی یا ہندیات میں آپ کا مطالعہ مکمل اور الی الآن ہے یہی حال آثارِ عتیقہ یعنی آرکیالوجی کا ہے۔ فرماتے ہیں ادب ہمہ اوست کی شان رکھتا ہے۔ اس کی خدمت کے لئے سبھی کچھ پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں ان کے مقالات اور خطبے اس کی قطعی شہادت ہیں۔

سنسکرت اور عربی

زبانوں کا مطالعہ بھی آپ نے دقیق نظر سے کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ سنسکرت اور عربی مجھے اتنی آتی ہے کہ کتابوں اور عالموں کی مدد سے اپنا کام نکال لیتا ہوں تحقیق کا ڈھنگ ان کا بالکل نیا اور سائنٹفک ہے۔ کبھی ایسی طباعی کا ثبوت دیتے ہیں کہ جید عالم حیران رہ جاتے ہیں۔ ایک روز چمچہ کی نسبت بحث ہو رہی تھی۔ سب یہی کہتے تھے کہ یہ لفظ فارسی ہے۔ ایک سنسکرت کے عالم بھی موجود تھے وہ چپ رہے۔ کیفی نے کہا کہ گلستان میں یہ لفظ ضرور آیا ہے لیکن یہ آخری ثبوت نہیں ہو سکتا۔ پنڈت جی آپ وہاں دیکھئے جہاں پوجا اور یگیہ کے سامان کا ذکر آیا ہے۔ اگلے موقع پر وہ نروکت اٹھا لائے جس کے دسویں ادھیائے کے چودھویں

کھنڈ میں چمہ کا لفظ تھا۔ اب صاف ہوگیا کہ سنسکرت چمہ سے ہمارا چمچہ بنا۔ سب عش عش کرنے لگے۔

ہندی فرماتے ہیں میں ہندی کا شاعر یا مصنف نہیں لیکن طالب علم اور نقاد ہوں۔ کئی چیزیں آپ کی ہندی زبان میں ہیں اور کئی نکھار اردو میں یعنی جس میں کوئی فارسی، عربی یا ترکی لفظ نہیں آیا۔

کتب خانہ آپ کا کتب خانہ ادبی عجائبات کا کمیاب ذخیرہ ہے۔ ہندوستان کی قدیم السنہ مثلاً پرانی پراکرت، اپ بھرنش اور سنسکرت و عربی گرامر سے لے کر انگریزی کی تازہ ترین کتب لسانیات و ادب تک آپ کے ہاں موجود ہیں۔ اور ان سب پر جگہ جگہ نشان اور نوٹ اور اردو سے متعلق حواشی اور حوالے ان کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جو شاید اور کہیں دستیاب نہ ہوسکیں۔ مثلاً آخری بادشاہ دہلی کے روزنامچہ (سراج الاخبار) کی اولین اور بعد کی جلدیں۔ اوّلین اردو رسالہ جو پنجاب سے جاری ہوا۔ کئی پرانے اخباروں کی جلدیں۔ انگریزی کتاب ہندو تھیئٹر جو مونیسر ولیمس پرنسپل مرحوم ایسٹ انڈیا کالج لنڈن سے مسٹر پرنسپ کو انعام میں ملی۔ غالب اور ذوق اور آتش کے دیوانوں کے اوّل ایڈیشن اور دکنیات اور فارسی کے قدیم مخطوطات وغیرہ۔ تقریباً دو سال ہوئے حضرتِ کیفی نے اپنے کتب خانے میں سے پانچ سو سے زیادہ فارسی اور اردو کی کتابیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو عطیہ کے طور پر عنایت کیں۔ جو وہاں کیفی کلکشن کے نام سے الگ الماریوں میں رکھی ہوئی ہیں۔ ان میں ایک سو کے قریب مخطوطات ہیں جن میں سے کئی کمیاب ہیں۔[1]

تصانیف نثر میں حضرتِ کیفی کی تصانیف یہ ہیں۔ عورت اور اس کی تعلیم۔ علاج الشمس۔ پریم دیوی۔ راج دلاری۔ مراری دادا۔ نہتا رانا اور منشورات۔ ان میں سے پہلی تین کتابیں میری نظر سے نہیں گذریں۔ راج دلاری اور مراری دادا اصلاحی معاشرتی ڈرامے ہیں جن میں فاضل مصنف نے سماج کے بعض نہایت اہم اور نازک مسائل کو چھیڑا ہے۔ نہتا رانا ایک نیم تاریخی ناول ہے جس میں ملّی اتحاد کا سبق نہایت مصوّرانہ پیرائے میں پیش کیا ہے۔ منشورات اردو زبان و ادب کی تاریخ و تنقید پر مشتمل ہے، اور تحقیق کا ایک گرانمایہ خزانہ ہے۔ نثر میں سلجھا ہوا اسلوبِ بیان اور انشا کا زور و قوت کیفی کی خصوصیات ہیں۔

نظم کی مطبوعہ کتابیں مراتِ خیال۔ آئینۂ ہند۔ شوکتِ ہند۔ صدائے کیفی۔ بھارت درپن

---

[1] اب ان کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی ہے۔

پریم ترنگنی۔ جنگی نظمیں اور خمخانۂ کیفی ہیں۵۔

تلامذہ حضرت کیفی کا خیال ہے کہ آج کل کسی کو اپنا شاگرد کہنا مناسب نہیں۔ لوگ کسی کا بھی شاگرد مشہور ہونا گوارا نہیں کرتے۔ آج کل ہر شعر گو استاد ہے۔ واقعی ہے بھی ایسا ہی۔ عام اس سے کہ کیفی کی ذات اہل پنجاب کے لیے چشمۂ فیضِ عام ہے، اصحابِ ذیل خصوصیت سے آپ کے مشورۂ سخن سے فیض یاب ہوئے۔ مسٹر رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم اے آکسن آئی ای ایس، پرنسپل بھاگلپور کالج۔ خواجہ عبدالسمیع پال اثر صہبائی ایم اے ایل ایل بی وکیل جموں وکشمیر۔ پنڈت نند لال صاحب کول طالب ایم اے ایم او ایل پروفیسر سری نگر کالج۔ سید ذوالفقار علی رضوی نسیم بی اے تحصیلدار جموں۔ پنڈت دینا ناتھ چکن مست کاشمیری، ملک حبیب اللہ حبیب وغیرہ۔

اخلاق وعادات حضرتِ کیفی کے اخلاق نہایت وسیع ہیں۔ کھلی ہوئی پیشانی، چمکتی ہوئی آنکھیں اور مسکراتا ہوا چہرہ اُن کے ملنے والوں کو ان کا گرویدہ کرلیتا ہے۔ ان سے مل کر ہمیشہ دل کو خوشی ہوتی ہے اور بار بار ان سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کی گفتگو ہمیشہ پاکیزہ اور شگفتہ ہوتی ہے اور ان کے مزاج سے کبھی کسی کی دل شکنی نہیں ہوتی۔ ان کے احباب کا حلقہ بہت وسیع ہے لیکن محض شہرت کی خاطر عوام سے واقفیت رکھنے کو ضروری خیال نہیں کرتے۔ ان کی اس عادت کے باعث بعض لوگ انہیں مغرور بھی خیال کرنے لگتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ محض کیفی کی وضعداری ہے اور غرور ان کو چھو تک نہیں گیا۔

تواضع اور مروت ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ تواضع میں وہ مشرقی اصول کے پابند ہیں۔ ہندوستان کے کسی گوشے میں بھی ان کے کوئی دوست لاہور میں وارد ہوں تو یہ اُنکی دعوت ضرور کریں گے۔ مروت ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ ابتدائی زمانے کے متعلق فرمایا کرتے ہیں کہ فارغ البالی کا منہ ہم نے کبھی نہیں دیکھا، اور تنگدستی کا احساس اس وقت تکلیف دیتا تھا جب میں کسی مصیبت زدہ کو امداد کا مستحق سمجھتا اور اس کی خدمت نہ کرسکتا۔ یا کوئی کتاب لینے کو دل چاہتا اور اس کی قیمت جیب میں نہ پاتا۔ اپنی مروت کی وجہ سے وہ اس درجہ مجبور ہیں کہ تقاضائے عمر کے باوجود اور انتہائی مصروفیت کے عالم میں بھی لوگ ان سے اپنی نظم ونثر کی اصلاح کی درخواست کرتے ہیں تو وہ اسے رد نہیں کرسکتے۔ کیفی بڑی سخت قسم کے نقاد ہیں اور شاذونادر ہی کسی کے کام کی

---

۵ جگ بیتی ایک مختلف البحور مثنوی اس تذکرے کی تحریر کے بعد شائع ہوئی۔

داد دیتے ہیں لیکن اگر کوئی نو آموز ادیب بھی ان سے اپنی تصنیف پر دیباچہ لکھنے کو کہے اور یہ سمجھیں کہ اس سے اُس کو کچھ فائدہ پہنچ سکے گا تو دریغ نہیں کریں گے۔

کیفی کی دوستی رسمی دوستوں سے بہت بالا ہے۔ ان کے دل میں اپنے دوستوں کے لئے خلوص، مہر و محبت اور دردمندی ہے۔ وہ حاضر و غائب ہر صورت میں دوستی کی حفاظت کرتے ہیں۔ دوستوں کی کوتاہیوں پر اُن سے قطع تعلق نہیں کرتے اور اُن کے سلوک پر ممنونیت کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ رنج میں دوست کی غمخواری اور راحت میں مسرت محسوس کرتے ہیں۔ ان کی دوستی کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ وہ اُن لوگوں سے بھی جو آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں نباہ کی ایک صورت نکال لیتے ہیں۔

ان کا چلن ہمیشہ صالحانہ رہا۔ بھری جوانی تھی۔ پورے تیس برس کے تھے جب وہ پنجاب میں آئے۔ ان کے پرانے دیکھنے والے ان کے دامنِ شہرت پر کسی داغ کا نشان نہیں بتا سکتے۔

مادیت اور روحانیت

فرماتے ہیں کہ ہماری طالب علمی کے آخری زمانے میں اُنیسویں صدی میں سائنٹفک فلسفے کی کتابیں بہت پڑھی جاتی تھیں۔ مثلاً جان سٹوارٹ مل، ہربرٹ سپنسر، ہکسلے، ٹنڈل اور ڈارون وغیرہ۔ امریکہ کے کرنل انگرسول اور انگلستان کے چارلس بریڈلا اور اُس وقت کی مسز بسنٹ کی تحریریں بھی جاذب توجہ تھیں۔ یہ اعلیٰ تعلیم یافتوں کی کیفیت تھی۔ باقیوں کو آریہ سماج سمیٹ رہا تھا۔ مسلمانوں کے ذہن پر علی گڑھ کی تحریک حاوی تھی۔ اس وقت پنجاب اور شمال مغربی ہند میں مسلمانوں کا مذہب ایک عجیب رنگ لئے ہوئے تھا۔ مادیت اور شکوکیت نے اعتقاد کی جگہ لے لی تھی۔ پھر کانگریس کی بدولت اس کا رنگ بدلا۔ اب جو اپنے آپ کو ہندو یا مسلمان کہتے ہیں وہ قومی یا ملی نقطۂ نظر سے ایسا کہتے ہیں۔ اعتقاد و عقیدتِ اصلی سے عموماً بے واسطہ ہیں۔ حضرتِ کیفی کا قول ہے کہ ہم خدا کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں لیکن ہماری زبان اور شاعری خدا کے بغیر سلامت نہیں رہ سکتی۔

امید و یاس

یاس و قنوط سے حضرتِ کیفی کو دشمنی ہے۔ کوئی تحریر، کوئی شعر، کوئی بات جس میں یاس کا پہلو ہو کیفی اس کی اتنی شدید مخالفت کرتے ہیں کہ سننے والے کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید وہ اسے غلط کہہ رہے ہیں۔ کچھ دن ہوئے ہمیں "دیوداس" فلم یکجا دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کیفی اس کے تباہی خیز منظر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اضطراری طور پر اس کے پلاٹ میں مختلف تبدیلیاں کرنے لگے۔ میں نے عرض کیا پنڈت جی، کہانی بنانے والا جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ گیا۔

اب جو اضافہ آپ فرما رہے ہیں یہ ایک نئی کہانی ہے۔ ذرا سے تامل کے بعد کہنے لگے یہ صحیح ہے، لیکن دیکھتے نہیں یہ عالمگیر تباہی دنوں پر کیا اثر ڈالے گی۔

ایک دن یاس و قنوط کے متعلق ہی کچھ تذکرہ تھا۔ کہنے لگے "بتاؤ اب ہمارے لئے مایوس ہونے کی کون سی وجہ ہے۔ جب ہم دنیا میں آئے تھے ہم تنہا تھے۔ آج ہم پانچ ہیں، دو بیٹے، دو پوتے اس ننھے بچے کی طرف دیکھو مجھے اس میں کیفی کی روح سانس لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

آزادی نسواں زندگی کے بعض مسائل کے متعلق اوّل اوّل مجھے حضرتِ کیفی کا نقطۂ نظر معلوم کرنے میں بہت دقت پیش آیا کرتی تھی۔ کیونکہ ان کی رائے نہ پرانے خیال والوں سے مطابقت رکھتی تھی اور نہ نئے خیال والوں کے ساتھ جاتی تھی۔ ایک دن آزادئ نسواں پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کیفی نہ بے علم اور پردہ نشین لڑکیوں کے حامی معلوم ہوتے تھے اور نہ موجودہ زمانے کی تعلیم یافتہ اور نئی وضع کی لڑکیوں کو پسند کرتے تھے۔ میں کچھ ضغطے میں پڑ گیا اور دریافت کیا کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ اس کے جواب میں انہوں نے بھی ایک سوال کیا "تم نے میرے ڈرامے "راج دلاری" اور "مراری دادا" پڑھے ہیں"؟ میں نے عرض کیا افسوس کہ مجھے ان کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ فرمایا لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کیسی ہونی چاہئے؟ میں اس کا ایک عملی نمونہ پیش کرنا چاہتا تھا۔ اس کے محرک میری زندگی کے دو المناک حادثات ہوئے۔ یعنی میری والدہ اور ایک چچازاد بہن کا عین عالمِ شباب میں بیوہ ہو جانا۔ میں نے عہد کر رکھا تھا کہ اگر خدا نے مجھے ایک بچی دی تو میں اس کی تربیت اپنے خاص انداز پر کروں گا۔ چنانچہ ایک بچی پیدا بھی ہوئی، لیکن وہ زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکی اور اپنی ذہانت و فطانت سے ہمیں متاثر کرتی ہوئی جنت کو سدھاری، اس کے بعد میں نے مثالی نسائیت کا ایک خیالی پیکر تخلیق کرنے کی کوشش کی، اور وہ "راج دلاری" ہے مغربی تعلیم اور طور طریق اختیار کرنے میں کیا قباحتیں ہیں۔ یہ آپ کو میرا ڈراما "مراری دادا" پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ چنانچہ اسی وقت انہوں نے اپنی یہ دونوں کتابیں مجھے مرحمت فرما دیں۔ ان میں کیا لکھا ہے؟ اس کی تشریح کے لئے ایک دفتر چاہئے لیکن مختصراً ان کا مدعا یہ ہے کہ ہمیں اپنے مشرقی تہذیب و تمدن اور چال ڈھال کو قائم رکھتے ہوئے مغربی محاسن کو اخذ کر لینا چاہئے، اور اندھا دھند تقلید سے بچنا چاہئے جس میں ہزاروں نقصانات ہیں۔

مزاح حضرتِ کیفی نے اگرچہ نہایت متین طبیعت پائی ہے لیکن وہ ثقہ مزاح سے عاری نہیں۔ جب ۱۸۹۴ء میں پہلی دفعہ مسٹر حامد علی خاں سے لکھنؤ کی ایک صحبت میں ملاقات ہوئی تو

انہوں نے خاں صاحب سے شعر کی فرمائش کی۔ انہوں نے بہت عذر معذرت اور تکلف کے بعد ان کے کان میں کہا۔ ؎

اکہتر، بہتر، تہتر، چوہتر
پچھتر، چھہتر، ستتر، اٹھتر

یہ ہنسی سے بے تاب تھے مگر بے انتہا تعریف کی اور خاں صاحب کی زندہ دلی اور موزونیٔ طبع کی داد دی۔ جب ان کی باری آئی تو انہوں نے یہ شعر اسی طرح اُن کو سُنایا ؎

اکاسی، بیاسی، تراسی، چوراسی
پچاسی، چھیاسی، ستاسی، اٹھاسی

خان صاحب پھڑک گئے اور کہا کہ وہ اپنے شعر کو لاجواب سمجھ رہے تھے جو غلط تھا۔ یارانِ صحبت نے دونوں شعروں کو اٹھالیا اور دیر تک ان کی رٹ لگی رہی۔ لیکن بقولِ خواجہ آتش۔

ع یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا

تذکیر و تانیث بڑھاپے کی زندہ دلی ملاحظہ ہو۔ سال ڈیڑھ سال کی بات ہے کہ کیفی اردو سبھا میں تذکیر و تانیث پر ایک محققانہ لکچر دے کر باہر آئے۔ دوستوں کی ہمراہی میں مکان کی طرف آرہے تھے کہ ایک نوجوان نے جو بائیسکل لئے ہوئے تھے اس کی جنسیت کی نسبت سوال کیا۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ جواب دیا آپ دیکھتے ہیں کہ بغل میں لئے چل رہا ہوں۔ پوچھا اس کے سوا اور کیا برتاؤ اس کے ساتھ ہوتا ہے؟ کہا اس پہ سوار ہوتا ہوں۔ مسکراتے ہوئے فرمایا آپ کو اپنے سوال کا جواب اپنی زبان سے مل گیا۔ گھر جاکر سوچیئے گا۔ ایک منٹ کے بعد لوگ سمجھے اور نہایت محظوظ ہوئے۔

گرگ عشق کا لطیفہ ایک روز فرمایا کہ شعرائے متاخرین میں صبا بہت پسند تھا، لیکن جب اس کے ہاں یہ شعر دیکھا ؎

گرگِ عشق افسوس پہلو سے اٹھا کر لے گیا
گوسپندِ دل کی مدت سے خبر ملتی نہیں

اور کہتے ہیں اب بیت الوحوش یا چڑیا خانہ کا ضلع پورا ہوگیا۔

دم کا پہلو ایک دن کیفی صاحب اور ہم کچھ علمی کام کر رہے تھے۔ گرمی کے دن تھے۔ بجلی کا پنکھا چل رہا تھا۔ کیفی صاحب کا خُرد سال پوتا بار بار اسے آکر چھیڑتا تھا۔ کیفی صاحب کئی بار کہہ چکے تھے

کہ اسے ہاتھ مت لگاؤ، یہ گر پڑے گا، ٹوٹ جائے گا، تمہیں بھی چوٹ آجائے گی۔ لیکن وہ نہ مانتا تھا۔ آخر تنگ آکر وقت اور ماحول کی مناسبت سے خالص علمی لہجے میں بولے "تم باز نہیں آؤ گے؟ کہہ جو دیا اس میں ذم کا پہلو ہے اسے مت چھیڑو"۔ نہ معلوم اس کے بعد بچے کا رجحان ہی دوسری طرف ہوگیا یا اس نے یہ سمجھا کہ کہیں پنکھے میں سے ذم کا پہلو نکل کر کاٹ نہ کھائے کہ اس نے پھر اس کی طرف رخ نہیں کیا۔

فُردا و دُی کا تفرقہ

حضرتِ کیفی ہر وقت کسی نہ کسی ادبی کاوش میں مصروف رہتے ہیں۔ ایک دن سیر میں ملے تو فرمایا کہ بھئی اس وقت ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ جیسے انگریزی اور فارسی میں گزرے ہوئے اور آنے والے کل کے لئے دو امتیازی الفاظ موجود ہیں اسی طرح اردو میں بھی ہونے چاہئیں۔ کوئی تجویز بتاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ "ادبی دنیا" کی ادارت کے سلسلے میں یہ ادبی جھمیلے پہلے ہی کیا کم ہمارے حصے میں آئے ہیں کہ آپ اختراع و ایجاد کی یہ نئی چاٹ ہمیں لگا رہے ہیں؟ اس کے بعد انہوں نے ایک اور لفظ Antonomopia ترجمے کے لئے پیش کیا۔ میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا "یہ کوئی مرض ہے کیا"؟ اس پر وہ مسکرائے اور موضوع کو تبدیل کر دیا۔ جب دوسرے دن ملاقات ہوئی تو وہ نہ صرف فردا و دی کے تفرقے کی وضاحت کر چکے تھے بلکہ اس کے ساتھ ماضی و مستقبل کے متعدد عقدے بھی حل کر چکے تھے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

گزرا ہوا	آج	آنے والا
کل	....	اکل
پرسوں	....	اپرسوں
ترسوں	....	اترسوں
نرسوں	....	انرسوں

لباس

لباس کے معاملے میں کیفی صاحب کا مذاق نہایت سلجھا ہوا ہے۔ وضع قطع، رنگ، میل موزونیت ہر چیز کو وہ جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک روز بازار سے نئی عینک خرید کر لائے تو میں نے کہا کہ اب بڑے شیشوں کا رواج ہے اس کے شیشے بڑے ہونے چاہئیں۔ کہنے لگے ہاں اس سے کچھ بڑے، لیکن نہ اتنے بڑے کہ ہمارے چہرے کے تناسب سے بڑھ جائیں۔ ایک سیاہ فام شخص کو سیاہ لباس پہنے ہوئے دیکھا تو کہا کہ کیسا بد مذاق ہے، اسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ ایسا لباس صرف سفید رنگ کو زیب دیتا ہے۔ ایک دن ہم برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے سڑک پر سے

ایک نہایت زرق برق لباس والی عورت گزری۔ پنڈت جی کہنے لگے "کتنا بھڑکا ٹانک رکھا ہے اس نے ساری میں۔ انسان کو چاہئے کہ لباس ایسا پہنے جس میں اپنی شخصیت گم نہ ہو جائے بلکہ نمایاں نظر آتی رہے"۔ میں نے عرض کیا "بات تو ٹھیک ہے مگر اس کے دیکھنے کے لئے بھی ایک نگاہ کی ضرورت ہے، اور نگاہ شباب کی ہے۔ کیا آپ اپنا وہ شعر بھول گئے۔

جو جھلک آپ کے بھڑکا ٹنکے آنچل میں ہے
کب بھلا ایسی چمک بجلی کی جھل بل میں ہے"

کہنے لگے "ہاں، یہ جوانی کی بدمعاشی ہے"۔ اپنی ابتدائی شاعری کی نسبت یہ ان کی مستقل رائے ہے۔

کمرے لاہور میں ان کے کمرے کی عجیب ہیئت کذائی تھی۔ ایک مربع چوکی یا چھوٹے تخت سے لگی ہوئی ایک میز تھی۔ بائیں طرف اور پشت پر ایک ایک الماری جن میں کتابیں چنی ہوتی تھیں داہنی طرف ایک گھومنے والی الماری وہ بھی کتابوں سے بھری ہوئی۔ کمرے کی دوسری طرف ایک کھلی الماری تھی اس پر اردو اور انگریزی کے رسالے رہتے تھے۔ اس کے پاس ایک میز کتابوں وغیرہ سے لدی ہوئی تھی۔ ایک بڑا گرانڈیل بکس کتابوں سے بھرا اس سے لگا رکھا تھا جس کے اوپر بھی کتابیں تھیں اس کمرے کو وہ اپنا ورک شاپ کہا کرتے تھے۔ اب ماڈل ٹون میں اپنی کوٹھی بنالی ہے۔ بہت سی کتابیں لائبریری کی الماریوں میں چلی گئی ہیں لیکن موجودہ "ورک شاپ" کی میزیں اور الماریاں بدستور کتابوں اور لکھنے پڑھنے کی چیزوں سے اٹی ہوئی ہیں۔

کام شہر میں تخت پر بیٹھ کر کام ہوتا تھا۔ لیکن یہاں عموماً میز کرسی یا تپائی اور آرام کرسی استعمال کرتے ہیں۔ اس پر بھی فرشی نشست کا موقع آجائے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ مجھے ان کے کتب خانے سے کچھ مسودات دیکھنے تھے۔ میں اپنے دیسی لباس ہی میں چلا گیا۔ جب وہاں پہنچا تو دیکھتے ہی فرمانے لگے۔ ارے بھئی تم نے خوب کیا "ادھڑ ونچا" کرکے آگئے، اب فرش پر بیٹھیں گے۔ فرماتے ہیں کہ چار زانو بیٹھنا دماغی کام میں بہت مدد دیتا ہے۔ کیونکہ اندر کی بجلی اپنے پورے دائرے میں دور کرتی ہے اور اس کا اثر ضائع نہیں ہوتا۔ اس عمر میں چودہ گھنٹے کے قریب کام کرتے ہیں۔ فرماتے تھے دو ایک سال سے گرمیوں میں رات کا لکھنا پڑھنا بند کر دیا ہے۔

حقہ اور سگار ویسے تو رات دن میں چھ سات چلمیں پیتے ہیں لیکن اہم تحریر اور تصنیف کے وقت حقہ برابر چلتا ہے۔ سگرٹ پسند نہیں۔ سفر اور سیر میں سگار کا استعمال کرتے ہیں۔ اس میں بھی برما کے چرٹ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی اختراعات میں ایک لفظ Smokard

بھی ہے۔ چند ماہ ہوئے میں نے "ادبی دنیا" میں "اختراعاتِ کیفی" پر مضمون لکھتے ہوئے یہ بھی لکھ دیا کہ اس لفظ کے اختراع کی ضرورت غالباً یوں محسوس ہوئی کہ حضرتِ کیفی خود بڑے حقہ نوش ہیں۔ یہ مضمون پڑھنے کے بعد ملے تو فرمایا کہ واقعی وہ لفظ میں نے اپنے لئے وضع کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ قیامِ انگلستان کے زمانے میں ایک دن میں ریل گاڑی میں سفر کر رہا تھا، اور جس کمرے میں بیٹھا تھا وہاں میرے علاوہ ایک میم صاحبہ بھی تھیں۔ اب میم صاحبوں کے سامنے سگریٹ پینا تہذیب کے خلاف ہے اس لئے میں بہت مجبور ہو رہا تھا۔ اتنے میں خوش قسمتی سے انہوں نے اپنا سگریٹ کیس نکالا اور مجھ سے پوچھا کیا آپ سگریٹ پیتے ہیں؟ میں نے جواب دیا پینے کے کیا معنی میں تو smoke کرتا ہوں۔ اس پر وہ بہت محظوظ ہوئیں اور میں بھی سگریٹ پینے لگا۔

کھانا پینا صبح سویرے ہی چائے پیتے ہیں جس میں دودھ بہت تھوڑا ڈالتے ہیں۔ کھانے کی کوئی چیز ساتھ نہیں ہوتی۔ شام کی چائے بھی لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ناشتے کی مختصر چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ کھانا نہایت سادہ کھاتے ہیں۔ صبح ایک ترکاری اور خشک چپاتی۔ گرمیوں میں تھوڑا دہی۔ شام کو گوشت جس میں کوئی سبزی پڑی ہو اور چپاتی۔ چاول چند برسوں سے بند کر دیئے ہیں کہ بلغم پیدا کرتے تھے۔ میووں میں آم اور خربوزہ بہت استعمال کرتے ہیں۔ مٹھائی کو کہتے ہیں اس عمر میں بہت کم کھانی چاہیے۔ کھانے کی دعوت سے بہت گھبراتے ہیں۔ چائے کی دعوت میں زیادہ زور دیا جائے تو چلے جاتے ہیں۔

سیر اور استراحت شام کو تین میل کے قریب ہوا خوری ضرور کرتے ہیں اور آج کل یہی ورزش رہ گئی ہے۔ دن کو کسی موسم میں بھی استراحت نہیں کرتے رات کو گیارہ بجے پلنگ پر چلے جاتے ہیں۔ نیند کے متعلق اب تک کوئی شکایت نہیں۔

پڑھنا جلسوں یا مشاعروں میں صاف آواز سے تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ اس میں رنگینی اور تباوا تو نہیں ہوتا لیکن ایک ایک لفظ ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ جب کوئی غزل یا نظم کہتے ہیں تو گھر پر ترنم کے ساتھ خوب گنگناتے ہیں اور خاص دوستوں کی صحبت میں پورے ترنم سے بھی کام لیتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ محض تفنن طبع کی بات ہے۔ ترنم شعر کے حسن و قبح پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ ایک دفعہ انہوں نے ایک غزل لکھی۔ دوستوں کو از حد پسند ہوئی۔ ایک پیشہ ور گویے کو یاد کرا کر گوائی۔ ایک شعر میں پتھر کا لفظ آیا تھا۔ گانے والے نے اسے پاتھر گایا۔ دوستوں نے مارواڑی کی پھبتی جڑی۔ کیفی نے اس شعر کو پھر گوایا اور کہا کہ گویا صحیح ہے۔ اس لفظ میں ایک حرفِ علت

پوری آواز کا ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ اس مصرع کو بدل دیا۔ جب سے غزلوں اور جن فرمائشی نظموں کی نسبت احتمال ہو کہ گائی جائیں گی کسی نہ کسی لے اور سُر میں گنگنا لیا کرتے ہیں۔

ایک خاص عادت

لیکچر کو، انگریزی میں لکھا ہو یا اردو میں، اور چھوٹی نظموں کو کسی دوست سے پڑھوا کر نہایت غور سے سن لیتے ہیں اور جگہ جگہ تبدیلیاں کرتے جاتے ہیں، تب اطمینان ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب میں دوسرے سے سنتا ہوں تو ذہن اس پر قادر ہو جاتا ہے کہ گویا وہ دوسرے کی چیز ہے اور تنقید و اصلاح خوب ہوتی ہے۔

انجمن یادگار غالب اور یوم غالب

علامہ کیفی کے ادبی اور تاریخی کارناموں میں یہ دو ادارے یادگار رہیں گے۔ مزار غالب کو بہتر حالت میں لانے کی کئی بار کوششیں ہوئیں اور مولانا محمد علیؒ مرحوم جیسے شخص کی عالی ہمتی کے باوجود بار آور نہ ہو سکیں حضرت کیفی یہ سب کچھ جان کر اس کام کے لئے آمادہ ہو گئے اور دہلی میں انجمن یادگار غالب مدوّن کی جس کے وہ صدر منتخب ہوئے برس دو برس بہت سرگرمی سے کام ہوتا رہا۔ زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جو مزار سے ملحق تھا خرید اگیا۔ لوگوں نے مالی امداد کے کھلے دل سے وعدے کئے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب ان سب کوششوں میں شریک کار تھے۔ لوگوں کو امید ہونے لگی تھی کہ اب کے مزارِ غالب دہلی اور اہل مزار کی شان کے شایاں بن کر رہے گا۔ کہ دور دکن کی طرف سے ایک صاحب نے حکام کو شکایت نامے بھیجے کہ ہم مزار کے وارث ہیں اور کسی کو حق اور اختیار نہیں ہے کہ مزار کو انگلی لگائے۔ غرض کہ مزار کا کام تو رہ گیا لیکن "غالب ڈے" (یوم غالب) جو حضرت کیفی نے دہلی میں شروع کیا تھا وہ چل نکلا اور اب ۱۵ر فروری کو جو مرزا مرحوم کی رحلت کی تاریخ ہے تمام ہندوستان اور اکثر ریڈیو سٹیشنوں میں منایا جاتا ہے۔
عرض کیا گیا کہ انگریزی تاریخ کیوں پسند کی گئی۔ فرمایا کہ یہ تاریخ موسموں کے تغیر و تبدل سے مبّرا ہے اور سب کو یاد رہے گی اور کہ مرزا صاحب اپنے خطوں میں انگریزی تاریخیں بھی لکھا کرتے تھے۔ کیفی صاحب کو نہایت افسوس ہے کہ مزارِ غالب کا کام رُک گیا لیکن ہم خوش ہیں کہ ہمیں یوم غالب یاد دلایا گیا۔

کیفیات

شاعر وہ نہیں جس کی آنکھوں کو حُسن کی کسی معمولی سی جھلک نے چوندھیا دیا اور اس نے ایک وقتی جوش اور جذبے کے ماتحت چند خوبصورت الفاظ مرتب کر لئے بلکہ شاعر وہ ہے جسے ایک مستقل اور پائدار شعور حاصل ہوا جس کے حُسنِ نگاہ نے ہر مرئی شے کو حسین بنا دیا اور جس نے ہمیشہ چھوٹے سے چھوٹے مظاہر میں بڑے سے بڑے حُسن کو دیکھا۔ کیفیات کے مسودات جو اس وقت میرے زیرِ نظر ہیں نصف صدی سے زیادہ کی شاعری کے سرمایہ دار ہیں، اور جو قوت اور حسن اس

شاعری میں اوّل سے آخر تک موجود ہیں وہ مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں حضرت کیفی کو اپنے زمانے کا بہت بڑا اُستاد مانوں۔

یہ کہنا کہ حضرتِ کیفی نے شعر کے جملہ اصناف پر نہایت قدرت کے ساتھ قلم اٹھایا ہے ایک ایک رسمی بات ہے، اور پھر ان اصناف کی خوبیوں کا بیان مجھے کچھ قدامت پرستی سی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے میں اُن کے کلام کو صرف شعر کی حیثیت سے جانچوں گا۔ اس کے علاوہ حضرت کیفی کی غزل اور نظم میں بہت زیادہ امتیاز قائم نہیں کیا جا سکتا تخیّل کی یکجہتی اور مضمون کے تسلسل کے لحاظ سے اُن کی غزلیں نظمیں معلوم ہوتی ہیں اور وسعتِ ذوق کو اِس صنفِ شعر پر ایک تنگنائے ہونے کا گلہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح اُن کی نظمیں بے رنگ مناظر اور بے رس جذبات تک محدود نہیں بلکہ ان میں ایسی رنگینی اور کیف بھرا ہوا ہے جو تغزل کو بھی آنکھ دکھاتا ہے۔ کیفی بلاشبہ اُن شعرا کی صفِ اوّل میں ہیں جنہوں نے نئی شاعری کی خشک رگوں میں تغزل کا خون بھرا اور جنہوں نے غزل کی حدود کو اتنی وسعت دی کہ زندگی کے اہم سے اہم موضوع بھی اس کے دائرۂ عمل سے باہر نہ رہ سکے۔ وہ خود فرماتے ہیں

غزل نے پائی ہے کیفی نئی نرالی شان
یہ ظرف تنگ نہیں ہے مرے بیان کیلئے

حضرتِ کیفی سے پہلے بھی بعض اساتذہ نے نئے طرز کی نظموں میں تغزل کا رنگ بھرا ہے، لیکن ایسا کرنا اور اسے نباہے جانا جہاں تک میرا مطالعہ ہے اور کہیں پایا نہیں جاتا۔ میری دانست میں یہ شرف کیفی ہی کا حصّہ ہے۔ آزاد کا طرز کچھ اور تھا، لیکن نیچرل شاعری کے دوسرے نمائندوں نے جن میں اکثر ثقات شامل ہیں غزل اور پرانی شاعری کے دلدادوں کو سیدھی گالیاں دی ہیں حضرتِ کیفی کا دستور العمل ایسا نہیں۔ شاعری اور ادب میں اُن سے زیادہ جدت آفریں کون ہوگا لیکن اس موضوع پر اُن کا کلام معاندانہ مخالفت سے پاک ہی نہیں دلاویز ہے اور اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ نئے طرز کو رائج کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے یہاں تک کہ مشاعرے کی طرح میں بھی نئے طرز کی وکالت کر جاتے ہیں۔ ایسی نظمیں (قصیدے کہیے) چند در چند اس دیوان میں موجود ہیں۔ قصیدہ ترقیٔ اردو (صفحہ ۱۲۳) اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو میں اولین نظم ہے۔ اس کا استدلال کتنا بانکا اور دلنشیں ہونے کے باوجود کس قدر مسکت ہے شہر آشوب متقدمین کے زمانے سے چلے آئے ہیں، آپ نے اسے عالم آشوب کی شکل میں ارتقا بخشا۔ یہ ایک طویل قصیدہ ہے جس میں ملک ہند کی آبادی کے مختلف اہم طبقوں کی اقتصادی اور معاشی حالت کا خاکہ کھینچا ہے۔

کیفی کی شاعری سالکانہ اور مجتہدانہ ہے۔ تصوف اور اخلاق کے وہ اصول اور باتیں جو ان کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہیں اُن کے کردار اور عمل کی آئینہ بردار ہیں۔ جیسا کہ مقدمے کے پہلے حصے میں بھی لکھا گیا ابتدا ہی سے اُن کے مدنظر دو باتیں تھیں، یعنی تغزل کے رنگ کو کلام میں سمونا اور ہندو ویدانت اور اسلامی تصوف کو شیر و شکر کرنا۔ شاعری کا آغاز رسمی روحانیت سے ہُوا، اگرچہ اس میں بھی وہ عناصر ہیولا کی شکل میں نمایاں ملتے ہیں جو آگے چل کر مستقل وجود کی شکل میں بلوغ پذیر ہوئے۔ اس کے بعد صوفیانہ رنگ کلام پر غالب ہی نہیں حاوی کل دیکھنے میں آتا ہے پھر طبیعت مظاہرِ قدرت کی طرف رجوع کرتی ہے۔ آخر میں فلسفۂ حیات و فلسفۂ عمل کا سلسلہ ہوتا ہے جو عالمگیر عشق اور جہانگیر حسن پر ارتقا پذیر ہوتا ہے۔ یہی حضرتِ کیفیؔ کی شاعری کا پیغام ہے۔

ابتدائی کلام میں عام رندانہ و عاشقانہ مضامین ہیں۔ کہیں کہیں تصوف و اخلاق کی جھلک بھی ہے۔ لیکن اس میں زبان اور محاورے کا لطف، بیان کی شوخی اور بانکپن اور اس کے ساتھ وہ درد و اثر ہے جو دہلی کا خاص رنگ تھا۔

زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں ہندی الفاظ اور ترکیبیں اور مقامی رنگ اور اثر ابتدا میں بہت نمایاں اور آخری کلام میں اعتدال کے ساتھ موجود ہے۔ اس کی ایک روشن مثال یہ دو شعر ہیں:-

جو جھلک آپ کے لچکا ٹنکے آنچل میں ہے   کب بھلا ایسی چمک بجلی کی چھل بل میں ہے
بکھری ہیں تیری نہاتے ہوئے زلفیں منہ پر   یا کہ ساون کا چھپا چاند یہ بادل میں ہے

ایک ہندی تشبیہ دیکھئے:-

جس طرح سے کنول ہو پانی میں   ہو کے دنیا میں پھر جدا ہوں میں

اردو شاعری میں تصوف فارسی سے آیا۔ اس قسم کے بلند تصوف کا تقاضا تھا کہ اس کے لئے فارسی الفاظ اور فارسی تخیل مستعار لیا جائے، لیکن کیفیؔ نے پانی میں کنول کی مانوس ترین تشبیہ دے کر اور پھر تشبیہ کی مناسبت سے آئندہ مصرعے کو نہایت سادہ الفاظ میں ادا کر کے اپنے استادانہ کمال کی انتہا کر دی ہے۔

کیفیؔ محاورے کا استعمال اس خوش اسلوبی سے کرتے ہیں کہ ان کا شعر پڑھنے والے کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ مثلاً

پینے کو انہیں ابھارتے ہیں　　شیشے میں پری اتارتے ہیں

ایک غزل کے تین شعر لکھتا ہوں۔ دیکھئے وہ کس طرح پے بہ پے محاورے استعمال کرتے چلے گئے ہیں اور اس کے باوجود کوئی شعر کہیں کمزور نہیں ہوا۔

کیوں ہاتھ پاؤں میرے خوشی سے نہ پھول جائیں　　انگلی چھبودے ہاتھ میں جب وہ ملا کے ہاتھ
انگلی پکڑتے پکڑا ہے پونچا یہ تم نے خوب　　دل ہی اڑا کے لے گئے ایسے ملائے ہاتھ
کیفی نہ ناز کی پہ تم اس بت کی بھولنا　　دیکھے نہیں ابھی کسی نازک ادا کے ہاتھ

ایک اور شعر ہے۔

ہے مہر و ماہ کا فیض ایک سا ہر اک شے پر　　یہ راہ باٹ کے دیوے ہیں کل جہاں کیلئے

یا یہ شعر جس کے ایک ہی مصرعے میں دو محاورے کہہ دیئے ہیں۔

ہوش کی لیں کس ہوا میں حضرتِ زاہد ہیں آپ　　ہم کہیں ہوتے ہیں رسوا آپ کے رسوا گئے

مندرجہ ذیل شعر شوخی اور بانکپن کی بہترین مثال ہیں۔

کبھی جو پاس بھی بیٹھے تو کسمسائے ہوئے　　دبے جھکے ہوئے سمٹے ہوئے لجائے ہوئے
اگر انہوں نے چرایا نہیں ہے دل میرا　　تو کیوں وہ بیٹھے ہیں آنکھوں کو یوں چرائے ہوئے

امنگوں کی کسک بے چین کرتی ہے انہیں لیکن　　نزاکت روک دیتی ہے ارادہ نوجوانی کا

خدا جانے وہ کیا شے ہے کہ دم میں توڑ دیتی ہے　　مری توبہ کو، زاہد کے وضو کو، تیرے پیماں کو

درد و اثر جسے میں نے دہلی کی خصوصیت کہا تھا اُس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

یوں سسکتا مجھے تم چھوڑ نہ جاؤ آؤ　　آخری وقت ہے اے جانِ من آؤ آؤ
صحبتِ خاص میں تو نام نہ غیروں کا کبھی　　دل میں عاشق کے نہ تم آگ لگاؤ آؤ
کیفی چھوڑ دو بھی کہیں کوئے بتاں کی یہ دھن　　چین آرام دل و دیں نہ گنواؤ آؤ

یا

آہ وہ شعلہ ہے جو جی کو بجھا کے اٹھے　　درد وہ فتنہ ہے جو دل کو بٹھا کے اٹھے
آپ کی یاد میں ہم اے صنمِ غفلت کیش　　ایسے بیٹھے کہ قیامت ہی اٹھا کے اٹھے
ایک دزدیدہ نظر سے مرا دل چھین لیا　　تم کدھر کو مری جاں آنکھ بچا کے اٹھے

دلنشیں رحمتِ حق جب سے ہوئی ہے کیفیؔ داغ غمِ دل سے مرے روزِ جزا کے اٹھے

ذیل کے شعر اپنی شگفتگی اور شوخی کے باوجود اپنے بین السطور میں ایک سوزِ پنہاں لئے ہوئے ہیں۔

سارے عشاق سے ہم اچھے ہیں ہاں ترے سحر کی قسم اچھے ہیں
الجھا ہی رہنے دو زلفوں کو صنم جو نہ کھل جائیں بھرم اچھے ہیں
بحث ہو جائے تو سب پر کھل جائے ہیں بھلے آپ کہ ہم اچھے ہیں
خوب ہے وقت جو کٹ جاتا ہے جو گزر جاتے ہیں دم اچھے ہیں

پوچھتے کیا ہو مزاجِ کیفیؔ
آپ کا لطف و کرم، اچھے ہیں

اس عہد کے رندانہ مضامین بھی خوب ہیں۔ حضرت کیفیؔ نے شراب کی عزت و توقیر سے اپنے نام کی لاج رکھ لی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

یہ کوئی بات ہے کیونکر مہرباں ہوں اے شیخ کہ ہو گا بادۂ کوثر مئے مغاں کا سا

یا

پی بھی لو، رہنے دو کوثر کی کہانی زاہد ایسی بے پر کی نہ یاروں سے اڑاؤ آؤ

یا

تلخ کہتے تھے لو اب پی کے تو بولو زاہد ہاتھ آئے اِدھر اُستاد مزا ہے کہ نہیں

اور

اس میں کیفیؔ کب برانڈی سے سوا ہو گا مزا سادہ دل زاہد ہے جو مشتاقِ کوثر ہو گیا

لیکن یہ سب نام ہی کا پاس ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے کیفیؔ صاحب کو پیتے پلاتے نہیں دیکھا! اور اگرچہ ذیل کا شعر انہوں نے تعریفاً کہا ہے تاہم ہمارے خیال میں اصلیت پر مبنی ہے۔

توبہ توبہ میں اور مے نوشی اجی کیفیؔ تو نام کا ہوں میں

نیچرل شاعری

اس میں شک نہیں کہ کیفیؔ اُس دور میں پیدا ہوئے جسے نیچرل شاعری کے دور سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس لئے اُن کا اس تحریک سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ لیکن اُن کی شاعری کا رخ پلٹنے کے لئے صرف بیرونی اثرات نے کام نہیں کیا بلکہ ان کی اپنی طبیعت میں ایک ایسی وسعت تھی جو ہر نئی صنعتِ ادب کے ذریعے سے اپنے اظہار کا راستہ ڈھونڈ رہی تھی۔ انھوں نے تقلید کے طور پر فطرت کی قصیدہ خوانی نہیں کی بلکہ خود محسوس کیا کہ کائنات ایک

سمندر ہے جس میں حسن کا طوفان برپا ہے۔ انسان اس بحرِ حسن کا صرف ایک قطرہ ہے اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ قدیم کوتاہ بینی کو چھوڑ کر دوسرے مظاہر کی طرف بھی نگاہ نہ کی جائے انہیں کے الفاظ میں

حسن کیا ہے انساں کا ایک قیدی زندانکا | ایک قطرہ طوفاں کا اس میں آسمایا ہے
اس کی آنکھ کی تشبیہ کیوں ہے چشم نرگس سے | آدمی ہی خلقت میں حسن کا جو پُتلا ہے
کیوں مماثلت ہے یہ گل سے ایک چہرے کی | حسن کا اگر مرکز صرف جسم زیبا ہے
تم میں لالہ رخ کوئی اور سیم تن کوئی | کوئی مہر طلعت ہے کوئی ماہ سیما ہے
آنکھ نرگسی ٹھہرے زلف عنبریں ٹھہرے | اور پھر کہے جاو حُسن آدمی کا ہے

ہاں انہوں نے محسوس کیا کہ

دمن دمن چمن حسن ہے کوئی دیکھے | چراغِ طور کی جگنو میں روشنی دیکھے
دہانِ تنگ نہیں قید خانہ جس دل کا | ہر ایک شے میں وہ انداز دلکشی دیکھے

اُن کو کشادہ دلی اور رواداری میں حسن نظر آیا اور انہوں نے کہا۔

حدِ جغرافیہ سے شعر کی دنیا ہے جدا | دُور کیلاس سے دوگز بھی یہاں طور نہیں

اور انہوں نے کیا کیا؟

موڑ کر منہ اُن سے راہِ حق پہ سیدھا ہو لیا | کیا نہ شیخ و برہمن کیفی کو بہکا یا گئے

ان کو عشق و الفت میں حسن نظر آیا اور انہوں نے کہا۔

الفت زدہ دل کو شیخ تو کیا سمجھا | وحشت کا جنوں کا اک کھلونا سمجھا
جو داغ ہے اس کا عرش کی ہے قندیل | تو زعم میں اپنے جوشِ سوا سمجھا

اور

جاہل کا ہے قول عشق ہے اک کھٹراگ | آنند سے اور خوشی سے ہے اس کو لاگ
ہے عشق جو شمع تو ہے دل اس کا لگن | دل ہے جو دلہن تو عشق ہے اسکا سہاگ

اس الفت و راحت نے عالمگیر ہمدردی کی صورت اختیار کرلی اور اس کا اظہار ایسے شعروں سے ہوا جنہیں اخلاق کا منتہائے کمال کہا جا سکتا ہے۔

غم رہا اُن کا جو دوزخ میں پڑے جلتے ہیں | میرے خوش ہونے کا جنت میں بھی ساماں نہ ہوا

پھر انہیں اصلاحِ قوم اور وطنیت میں حسن نظر آیا، اور انہوں نے کہا۔

رہنے دے ذکرِ خمِ زلفِ مسلسل کو ندیم | اس کے تو دھیان سے بھی ہوتا ہے دلکو الجھاؤ

ناخدا بن کے خدا پار کر اس کا بیڑا
بے طرح پھنس گئی ہے ہند کی منجدھار میں ناؤ

غرب ہے مشرقِ خورشیدِ علوم و حکمت
اب یہ لازم ہے کہ لو اپنی اُدھر ہی کو لگاؤ

جو قدامت پہ اڑے بیٹھے ہیں وہ ہیں گمراہ
ان سے بچنا، ہیں غضب ان کے اتار اور چڑھاؤ

الغیا کے تو تمہیں نام سے لہنا ہی نہیں
وہی صورت ہے اسے کتنا ہی الٹو پلٹاؤ

رسم و مذہب سے نہ تم غیر بنو آپس میں
ہو چلت میں کوئی یا ٹھاہ میں سم پر مل جاؤ

اور انہوں نے امید و عمل میں حسن کو دیکھا اور کہا:۔

رکھ یاد یہ کارخانہ ہے قدرت کا
یہ دارِ فنا نہیں یہ ہے دارِ بقا

ملتے دیکھا ہے تخم کو مٹی میں
یہ بھی دیکھ اس سے کیا ہوا ہے پیدا

خوابِ غفلت سے قوم والو اٹھو
رفتارِ زماں کو دیکھو بھالو اٹھو

کرنا ہے سو کر لو ورنہ پچھتاؤ گے
یہ وقت ہے کام کا نہ ٹالو اٹھو

غرض کہ انہوں نے ایک سچے صناع (آرٹسٹ) کی طرح ہر چیز میں حسن کا جلوہ دیکھا اور پھر جو کچھ خود دیکھا تھا دوسروں کو بھی دکھا کر اس بات کا ثبوت دیا کہ:۔

یہاں دیکھنے کی ہے جو بات اس کو
بہت دیکھنے والے کم دیکھتے ہیں

یہ کیا دیکھنا ہے جو تم دیکھتے ہو
وہی دیکھنا ہے جو ہم دیکھتے ہیں

یہ تو تھا حضرت کیفی کا فطری رُجحان، اب ذرا انسانی رنگ بھی ملاحظہ ہو۔ اگرچہ ابتدائی کلام کے ضمن میں بھی میں نے اس کی مثالیں دی ہیں لیکن بے محل نہ ہوگا اگر اس دوسرے حصے میں سے بھی اُن کے کمالِ فن کی طرف چند اشارات کروں، کیونکہ اس میں چند اور ایسی خصوصیات ہیں جن کا ذکر نہایت ضروری ہے۔

حضرتِ کیفی کی فضیلتِ علمی اور وسعتِ معلومات کا ذکر ان کے حالات میں ہو چکا ہے۔ اس کا ثبوت اُن کے کلام سے بھی جا بجا ملتا ہے۔ وہ جگہ جگہ مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات و محاورات استعمال کرتے ہیں اور پھر اُن کو شعر میں اس طرح کھپاتے ہیں کہ اُس کی شعریت میں قطعاً فرق نہیں پڑتا۔ یہ شعر مثال کے طور پر انتخاب کیے جا سکتے ہیں۔

نجوم

ہم کیا کہیں زائچے میں کیا لکھا ہے
ہاں ہاں اس سر میں کرم کی ریکھا ہے

عالی ہے دماغ فیضِ تعلیم سے گر — تو اُپج کا گرہ دوسرے گھر بیٹھا ہے

موسیقی

رسم و مذہب سے نہ تم غیر ہو آپس میں — ہو چلت میں کوئی پاٹھ میں سم پر مل جاؤ

حضرتِ کیفی کی طبیعت میں جدت اور اپج بہت ہے۔ وہ اُس زمانے سے نئے نئے اسلوب پر شعر لکھ رہے ہیں جب یہ جدتیں غالباً بہت ہی نامانوس معلوم ہوتی ہوں گی کیونکہ ایک مدت کی کوششوں کے باوجود اب تک شعرا اجنبی اسالیب کو اپنے ہاں رائج کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ مثلاً انہوں نے ۱۸۹۳ء میں ایک بے قافیہ نظم "شعر کی شان" لکھی جس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

قولِ عقلائے حال و پیشیں — بھرتے ہیں دفاتر اس سخن سے

ہے صبر ستودہ، جرات احسن — برداشت بھلی، مصیبتوں میں

اس عرصۂ زیست میں ہر اک چیز — حرفِ تسکیں ہے پیش کرتی

مصنوعی دلائل اور ترغیب — غم تاکہ غلط ہو آدمی کا — وغیرہ وغیرہ

بے قافیہ نظموں میں صرف تسلسل ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے دلچسپی قائم رہتی ہے اور اہل نظر سے پوشیدہ نہیں کہ یہ اس نظم میں بوجہ احسن موجود ہے۔

اس کے بعد تراجم ہیں۔ کیفی صاحب نے سنسکرت، انگریزی اور فارسی سے کئی تراجم نہایت خوش اسلوبی سے کئے ہیں۔ ایک انگریزی نظم کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ یہ آزاد ترجمہ ہے اور کیفی صاحب کے تصرفات نے یقیناً اسے اصل کا روکش بنا دیا ہے۔

جدائی

سوتے دریاؤں سے مل جاتے ہیں سب آ آ کر — اور پھر بحر سے مل جاتے ہیں دریا جا کر

نکہتِ غنچہ سے ملتی ہے صبا ناز کے ساتھ — اور نیاز آ کے لپٹ جاتا ہے انداز کے ساتھ

بوئے گل بلبلِ پُر نغمہ کو سُر دیتی ہے — قمری اب سرو کی قید اپنے گلے لیتی ہے

دور دور اب نظر آتے نہیں چاند اور چکور — رعد سے ملتے ہیں جھنکار کی نسبت سے مور

کہربا کاہ سے آہن سے ملا مقناطیس — پھول ہنس ہنس کے بناتا ہے عنادل کو جلیس

دور دیپک سے دکھائی نہیں دیتا ہے پتنگ — گل سے لپٹے ہوئے آتے ہیں نظر بو اور رنگ

دیکھو گنٹھ جوڑ ہیں منجدھار میں چکوا چکوی　　عرصۂ دہر سے معدوم ہوئی ہے دوری
کوئی شے عالمِ تکوین میں نہیں ہے تنہا　　ایک کا ایک سے رشتہ ہے خدا نے باندھا
جب یہ قدرت کے ہے قانون کی تاکید کمال
پھر یہ ممکن ہی نہیں تجھ سے نہ میرا ہو وصال

اس کے بعد طرزِ بیان اور اسلوبِ ادا کی وہ صنعتیں ہیں جو فارسی میں تو کثرت سے ملتی ہیں لیکن اردو میں چند مثالوں کے سوا ناظرین کی نگاہ سے ایسی چیزیں نہیں گزری ہوں گی۔ ذیل کی نظم میں جو سوال وجواب کے طریقے پر ہے، جوابات کی برجستگی، تغزل اور مضامین کی بلندی قابلِ داد ہے:-

کہا بخشی ہے مجھ کو ہجر کی تم نے مصیبت کیا　　تو فرمایا کہ ناداں وصل کی بے ہجر لذّت کیا
کہا یہ دل سی شے کیا مفت اڑا لے جاؤ گے صاحب　　تو فرمایا یہ جنس بے بہا ہے اس کی قیمت کیا
یہ کی عرض آپ پر مرتے ہیں ہم اور آپ غیروں پر　　ہؤا ارشاد اے ناداں محبت میں رقابت کیا
کہا اب ہجر میں جاں لب پر آئی ہے تو فرمایا　　جو ہر دم دل میں ہو کیا اس کا وصل اور اسکی فرقت کیا
کہا مرتا ہے تیرے عشق میں کیفی تو فرمایا
میں کیا جانوں کسے کہتے ہیں عشق اور ہے محبت کیا

اسی طرح ایک اور صنعت یہ ہے کہ پہلے شعر کے آخری کلمات سے دوسرے شعر کے ابتدائی کلمات ترتیب پائیں۔ اس کام کو اگر کوئی عام شاعر کرتا تو یقیناً الفاظ کے جھمیلے میں الجھ کر رہ جاتا لیکن کیفی صاحب نے اس میں بھی ایسے شعر پیدا کئے ہیں جو شاعری اور مابعد الطبیعات کی زینت ہیں۔

اندوہگین نہ ہو جو دلِ عافیت پسند　　وہ شکوہ سنجِ گردشِ چرخِ بریں نہ ہو
چرخِ بریں نہ ہو تو نہ ہو عرش کا وجود　　رب العلا کی ذات بھی کرسی نشیں نہ ہو
کرسی نشیں نہ ہو جو سرِ عرش نورِ پاک　　اس ساری کائنات کی ہستی کہیں نہ ہو
ہستی کہیں نہ ہو تو عدم ہی عدم ہو پھر　　ساقی و رند و بادہ خم و ساتگیں نہ ہو

حضرتِ کیفی کی شاعری ہمیشہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلتی ہے بلکہ بعض اوقات دو قدم آگے ہی رہتی ہے انہوں نے ایسی نظمیں بھی کہی ہیں جو مصرعوں کی ترتیب اور صورت کے لحاظ سے بالکل نئے زمانے کی پیداوار ہیں۔ انہیں میں سے اُن کی ایک کامیاب تریں نظم "برسات" بھی ہے جس کے تین بند یہاں نقل کئے جاتے ہیں:-

برسات کی بہاریں　　موروں کی وہ چنگھاریں
وہ جانفزا پھواریں　　وہ گائیں آبشاریں
پُرجوش جوئباریں
دھومیں مچا رہی ہیں

برسات کی بہاریں　　دل کو لبھا رہی ہیں

اک دھوم سی مچادی　　گھنگور چھا رہی ہیں
دنیا کی نیند اڑادی　　سوتے جگا رہی ہیں
امرت کی لے کے دھاریں
کیا اُمڈی آرہی ہیں
برسات کی بہاریں　　دل کو لبھا رہی ہیں

کوثر ہو پانی پانی　　جھرنے کی وہ پھبن ہے
پائے نئی جوانی　　جو اس میں غوطہ زن ہے
امرت کی ہیں یہ دھاریں
مردے جلا رہی ہیں
برسات کی بہاریں　　دل کو لبھا رہی ہیں

حضرت کیفیؔ نے طول طویل نظمیں کثرت سے لکھی ہیں۔ اِن میں اُن کا رنگ شروع سے لے کر آخر تک ایسا قوی اور یکساں ہے کہ عجزِ بیان کا کہیں شائبہ تک نہیں ہوتا، اور پڑھنے والا اُن کی قادرالکلامی کا قائل ہو جاتا ہے۔ صبح بہار، آغازِ عشق، شاعر سے خطاب وغیرہ وہ نظمیں ہیں جو اردو شاعری کی تاریخ میں ایک عہد قائم کرتی ہیں۔ پھر جو نظمیں ہنگامی اور واقعاتی ہیں جیسے سرخ ساڑی، تمغے کے کارنامے وغیرہ وہ بھی لطافت میں بے نظیر ہیں۔ دیکھئے کہاں دل اور آغازِ عشق اور کہاں 'بچوں کا ہفتہ' والی نظم کہاں اعلیٰ درجے کی تخیلی صناعی اور کہاں

روزمرہ کی سادھارن باتیں۔ قادر الکلامی اصل میں اس کا نام ہے۔
دیوانِ کیفی کا ایک دلچسپ باب "یات نامہ" ہے۔ آج کل اردو میں علوم اور مسالک کے نام اور ایسے کلمات کثرت سے استعمال ہوتے ہیں جن کی جمع ا ت یا ی ا ت سے بنتی ہے۔ چونکہ اس معاملے میں بہت مبالغہ کیا جاتا ہے، اس لئے علاّمہ کیفی نے تعریفاً اِن ٹکڑوں کے نام "یاتی" رکھ دیئے ہیں اور ان کے مجموعے کو "یات نامہ" کا نام دیا ہے۔ اس میں مزاح، طنز اور تنقید سبھی کچھ ہے اور ظریفانہ پیرائے میں بڑی بڑی کام کی باتیں کہی ہیں۔ "ادبیات" میں ایک قطعہ ہے۔

کل یہ شاگرد سے استاد نے جھنجھلا کے کہا — تو پڑھے گا نہ کبھی ہٹ مرا بھیجا مت کھا
کُند ہے ذہن ترا ٹھس ہے طبیعت تیری — کچھ نہ آئے گا تجھے قوم کا شاعر بن جا

"موسیقیات" کا ایک قطعہ سنیئے۔

شعروں کے ساتھ گانا — گانے میں ہے بتانا
ہے یاد قول دانا — یک تیر دو نشانا

"نسائیات" میں تین ہندی شعر ہیں:-

دیوی جی جب سیر کو چل دیں بامن دیوتا کہنے لگ — کرپا کرا ے کرنا ساگر ہے منجدھار میں میری نیاّ
پُتری ٹیڑھی مانگ نکالے، پیر پٹے سوڈا اور سگرٹ — ہائے انرتھ ہوا یہ کیسے ان میں ہی مل گئی ان کی میاّ
گرہست اُس کو سارا بھولا، جب دیکھو لکچر جلسوں میں — گاڑی یہ کس طرح چلے گی، رہ جائے جب ایک ہی پہیا
یہ بڑ سن کر اُن کی میں نے اُن سے کہا اے برہما مورت
ست جُگ کی باتیں نہ کرو تم اب تو یہاں کلجگ ہے بھیا

عام رواج ہو گیا ہے کہ ایک شاعر کے کلام پر لکھتے ہوئے لوگ حاضر و غائب شعرا کا کلام مقابلے میں لاتے ہیں۔ کیفی اس کو پسند نہیں کرتے۔ اُن کا قول ہے کہ ایک پھول کا مقابلہ دوسرے پھول سے نہیں ہو سکتا۔ مدار اور ستیاناسی کے پھول میں بھی ایک کیفیت ہے گلاب کا عطر قیمت میں سب عطروں سے زیادہ اور گل کا عطر سب سے کم ہوتا ہے لیکن دونوں کی بو اپنی اپنی جگہ دل پسند ہے۔ یہی حال شاعروں کا ہے۔ لوگ جو شعرا کے مطلعے اور شعر لڑاتے ہیں یہ ناواجب بات ہے۔ کون سی غزل ہے جس میں کوئی شعر بھی سست نہ ہو، اور کون سی غزل ہے جس میں کوئی شعر بھی داد کے قابل نہ ہو۔ کسی کا سست شعر لے کر اپنے ممدوح کے اُسی قافیے کے چست شعر سے مقابلہ کرنا منصفانہ موازنہ نہیں کہا جا سکتا۔ جب اُن کا یہ یقین اور

مسلک ہے تو میں کس طرح اس کے خلاف چل سکتا تھا۔

حیران ہوں کہ حضرتِ کیفیؔ کے قول کو مانوں یا نہیں۔ وہ فرماتے ہیں "میں فارسی کا شاعر نہیں۔ دو تین سو شعر کہے ضرور ہیں"۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ زور اور تازگی اور فصاحت و بلاغت میں اُن کا فارسی کلام اردو کلام سے ہرگز کم نہیں۔ ویسا ہی جان دار اور رواں دواں ہے اس سراپا بہار کلام کی کہاں تک تعریف کروں، دامانِ نگاہ تنگ ہے اور پھول زیادہ ہیں۔ مضمون کو اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ خدا اُس ذات والا صفات کو خدمت ادب کے لئے تا دیر سلامت رکھے جس نے اس قدر زخار اور گوناگوں طبیعت پائی ہے۔

۲۷ر دسمبر ۱۹۳۵ء

منصور احمد
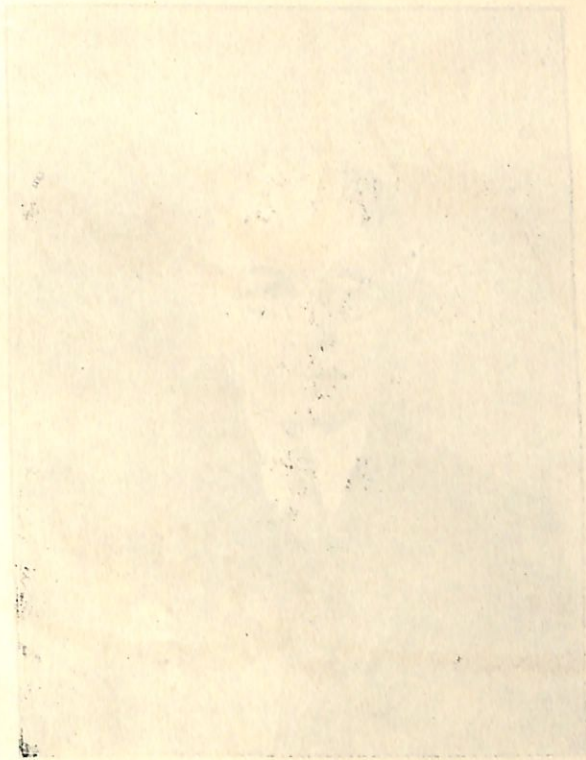
عہد حاضر
۱۹۳۱ء سے

عہد حاضر

۱۹۳۱ء سے

قومی ترانہ

(ماڈل ٹاؤن ۳۰ دسمبر ۱۹۳۵ء)

بھارت کے ہم ہیں شیشی۔ بھارت وطن ہمارا
قربان اس کی پت پر یہ جان و تن ہمارا

ہیں ولولے ہمارے اونچے ہمالیہ سے
باغ امید سینچے گنگ و جمن ہمارا

دل سے سمندروں کے اٹھتی ہیں جیسے لہریں
یوں جوش سے بھرا ہے۔ الفت کے بن ہمارا

قسمت کا رنگ بدلیں ہم جذبۂ عمل سے
جو ہو سخن ہمارا وہ ہو چلن ہمارا

ست جن ہو یا ہری جن سب انگ قوم کے ہیں
پیارا ہے شیخ جیسا ہے برہمن ہمارا

ہندوستان والے ہیں آن بان والے
کوئی جہاں میں ہوگا کیا خندہ زن ہمارا

ہمت کبھی نہ ہاری ہم نے مصیبتوں میں
تاریخ سے نمایاں ہے بانکپن ہمارا

قربانیاں جو کی ہیں تاریخ کا ہیں زیور
سرتاج حریت کا ہر مرد و زن ہمارا

وہ شوق ہو دلوں میں وہ جوش ہو سروں میں
حیران جو دیکھے سوزِ وطن ہمارا

وہ انقلاب کردیں بدلے یہ چال اپنی
کیا ہے اگر ہو دشمن دورِ زمن ہمارا

آؤ کہ خونِ دل سے سیراب اس کو کردیں
پھولے پھلے جہاں میں دائم چمن ہمارا

ہندوستان کی ہو آزادی اور ترقی
کیفی یہی دعا ہے یہ ہے بھجن ہمارا

شاعر سے خطاب

(دہلی - ۲۵ دسمبر ۱۹۳۵ء)

چاہتا ہے آج جی میرا کہ دِل کو چیر کر　　تیرے آگے ڈال دوں اے نکتہ پرور ذی ہُنر
دِل میں جو ہے صاف کہدوں بے تکلّف بے خطر　　کیونکہ میں سمجھا ہوں تجھ کو اہلِ دِل صاحب نظر

ہے یہی تو قول تیرا بے بدل شاعر ہے تُو
رمزِ حسن و عشق کا واقف ہے اور ماہر ہے تُو

سوزِ غم سے لختِ دِل آتش کا پر کالا نہ تھا　　لب پہ ذکرِ آہ برق افگن نہ تھا۔ نالا نہ تھا
آنکھ میں ڈورے تھے لیکن تیر اور بھالا نہ تھا　　چاہ لاوارث تھی کوئی چاہنے والا نہ تھا

تُو نے بخشے حُسن کو عشوہ۔ ادا۔ انداز و ناز
تُو نے بخشا عشق کو بے آگ جلنا اور نیاز

عرش فرسا تیری آہ آتشیں کا ہے دھواں　　کانپتا ہے تیرے نالوں کی دھمک سے آسماں
درد کی تیرے کھٹک سے زلزلے میں ہے جہاں　　عرش و کُرسی تک ہے لرزے میں وہ ہے تیری فغاں

آگ دُنیا بھر کی تو کہتا ہے تیرے دل میں ہے
سوزِ عشق و جاں نثاری تیرے آب و گِل میں ہے

آسماں کو اپنے نالوں سے ہلا دیتا ہے تُو　　جوشِ گریہ سے پہاڑوں کو بہا دیتا ہے تُو
آہِ سوزاں سے زمانے کو جلا دیتا ہے تُو　　دھجیاں دامانِ محشر کی اُڑا دیتا ہے تُو

ایک اعجوبہ زمانے کی ہے یہ ہستی تری
کیوں نہ ہو کشّاف رازِ دہر ہے مستی تری

ہیں ترے کیا کیا نہ احساں عالمِ ایجاد پر　　لاکھ ایماں صدقے تیرے کفر اور الحاد پر
تیری گردن سے ہے صیقل خنجرِ جلاد پر　　زخم ہنستے ہیں ترے جرّاح اور فصّاد پر

ہے مداوا سے ترے معذور جالینوس تک
چُپ ہے لفّاظی سے تیری صاحبِ قاموس تک

زندگانی ہے تری بے موت مرنے کے لئے　　ماسوائے عشق ہرگز کچھ نہ کرنے کے لئے
دِل کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے ہیں بکھرنے کے لئے　　غوطہ زن ہے تو بھنور میں پار اُترنے کے لئے

اپنی کشتی کو نہیں لاتا کبھی ساحل کے پاس
لے کے خود تیغ و کفن جاتا ہے تو قاتل کے پاس

زخم پر دل اور جگر کے خود چھڑکتا ہے نمک — تیری ایذا طلبیوں سے چرخ کو بھی ہے جھجک
تیر جب آ کر لگے تو اس کو دیتا ہے تھپک — تجھ سا زحمت آشنا پیدا نہ ہوگا حشر تک
رقص بسمل ہے تجھے رقص پری سے خوشگوار
تو ہے جانبازی کے فن میں انتخاب روزگار

ہے جگر چورنگ تیرا اور دل تیرا دو نیم — کالے کوسوں دُور تجھ سے ہو گئے اُمید و بیم
ہے یہ تیرے دم قدم کا دہر میں فیضِ عمیم — جو قلوب انبساط آگیں بھی ہوتے ہیں الیم
دم میں ہنسنے کو رُلا دینا ترا اعجاز ہے
دردمندی سے سخن کو تیرے سوز و ساز ہے

گو رہی تجھ سے ہمیشہ دُور یہ خانہ خراب — تو مگر آٹھوں پہر رہتا ہے بدستِ شراب
گلستانِ عمر کا تو نے پڑھا پنجم نہ باب — پھر بھی تو تھکتا نہیں کرتے ہوئے ذکرِ شباب
کیوں نہ ہو حیران عقل اس قوتِ احساس پر
حسّ نامحسوس، جذباتِ عمل نشناس پر

دل نہیں کھینچا کبھی تیرا درم اور دام نے — بے حقیقت دولتِ دُنیا ہے تیرے سامنے
عمر بھر تجھ کو ستایا چرخ دشمن کام نے — دل ترا افسردہ رکھا گردشِ ایام نے
جب نہ تب عیش و طرب کا نغمہ گا جاتا ہے تو
نقش کو تصویر کے بھی وجد میں لاتا ہے تو

بے حقیقت آپ کو سمجھا ہے۔ یہ تیری ہے بھول — تو نہ ہے ساون کا اندھا اور نہ ہے اپریل فول
روضۂ رضواں کو شرمائیں ترے کاغذ کے پھول — شاہ عاد و زرک نخشب تیرے آگے ہیں جھول
چاہے جب سرسوں ہتیلی پر جما دیتا ہے تو
اور ریگستان میں کشتی چلا دیتا ہے تو

جاگتے جیتے دلوں کو آنجہانی کر دیا — غازۂ روئے بقا کو تو نے پانی کر دیا
تو نے اس تمثیل یزدانی کو فانی کر دیا — کام کی باتوں کو بس قصہ کہانی کر دیا
ان طلسم آرائیوں سے وہ ستم ڈھائے گئے

جو رہے ابلیس سے معشوں وہ بہکائے گئے

اک غزل میں بارہا جیتا ہے اور مرتا ہے تو   جیتے جی تو کیا خطابت مر کے بھی کرتا ہے تو
معصیت کارہ کے خود معصوم دم بھرتا ہے تو   فتنے اٹھتے ہیں جہاں۔ شاعر! قدم دھرتا ہے تو

جھوٹ کو سچ کر دکھانا ایک تیرا کھیل ہے
ہو کے خاکی ناریوں سے ربط ہے اور میل ہے

راندواں۔ ناصح کہ شیخ و زاہد لعنت نصیب   سب سے تو نافر ہے پھر کیا محتسب کیسا رقیب
یہ تو یہ آجائے درماں کو اگر تیرے طبیب   تو وہ لتّے لے کہ پھر پھٹکے نہ وہ تیرے قریب

اے سڑی سودائی وہ تجھ سے اماں پائے کہاں
بس خدا دے بندہ لے۔ آئے تو پھر جائے کہاں

روح فرسا ہے جہاں کو خامہ فرسائی تری   دشمنِ صبر و سکوں ہنگامہ آرائی تری
ہے سمومِ جانگزا یہ بادپیمائی تری   ہو نہ کیوں ننگِ شرافت ہے شناسائی تری

بیشتر اس سے کہ پہنچائے زمانہ تجھ کو رنج
تو سنبھل جا، چھوڑ دے یہ بدعتیں اے نکتہ سنج!

یہ نہیں کہتا ہوں میں تخریب عالم تجھ سے ہے   عافیت کا قُل ہے اور نیکی کا ماتم تجھ سے ہے
یہ نہیں الزام جو دنیا میں ہے غم تجھ سے ہے   ناک میں خلقِ حمیدہ کا مگر دم تجھ سے ہے

تیرے کلکِ فتنہ زا سے ہیں اہرمن سینکڑوں
تر کئے ہیں رہ کے خود لے لوٹ دامن سینکڑوں

سامعیں پر ہے جو اس جادو بیانی کا اثر   قارئیں پر ہے جو یہ سحر آفرینی کارگر
تیری بڑ جو کام کر جاتی ہے قلبِ سادہ پر   اے مکرم خاک بھی تجھ کو نہیں اس کی خبر

بیٹھے بیٹھے تو نے ساحل پہ ڈبو دیں کشتیاں
خود امر رہ کر فنا کر دیں ہزاروں ہستیاں

یہ ظریفانہ ستم تیرا غضب ہے بے پناہ   غمزۂ معصوم نے تیرے کئے لاکھوں تباہ
سحر بے پروا کی تیرے پڑ گئی جس پر نگاہ   مرتے دم تک پھر ملی اس کو نہ آزادی کی راہ

تو نے جب جادو جگایا قسمتیں تک سو گئیں
قوتیں افعالِ حسنہ کی معطّل ہو گئیں

واہمہ ہے بر قدم تیرا تخیل تیز ہے — تیری سیدھی بات بھی گویا قیامت خیز ہے
بلبلِ تصویر کو نغموں سے تیرے ریز ہے — تو عمل میں خاک گویائی میں حشر انگیز ہے

بالقوائے سب کچھ ہے تو بالفعل لیکن کچھ نہیں
تیرے آگے غیر ممکن اور ممکن کچھ نہیں

تیرے منظومات کو کہنا غلط ہے واہیات — تو جو چاہے کر دکھائے رات کو دن، دن کو رات
حدِّ موجودات سے باہر ہے تیری کائنات — مانندِ دُنیائے تخیل سے ہیں تیرے، عادیات

ہونی انہونی ہے یکساں تجھ کو اے شعری شعار
تیرے آگے ہے معاذ اللہ معطل کردگار

ہیں یہ ملفوظات تیرے سب خیالی چٹکلے — دلنشیں تیرے تصوف کے ہوں کیونکر مسئلے
معرفت کی یہ ترنگیں یہ جنونی ولولے — ہو گئے گمراہ جو اس تیرے مسلک پر چلے

ہاں مگر تلقین میں رندی کی تو استاد ہے
کیونکہ نسیاں اور خطا النسان کی بُنیاد ہے

اک نگاہِ غیر و غائر ڈال ان ابیات پر — فخر ہے جنکی بدولت تجھ کو اپنی ذات پر
تو کبھی تو غور کر اے سحر کار اس بات پر — کیا اثر ہوتا ہے ان کا قوم کے جذبات پر

شعر تیرا نفسیاتی زندگی کو زہر ہے
کشتئے اخلاق کے حق میں فنا کی لہر ہے

چونکہ ہستی ہے تری مافوق عادت ہر بسر — تجھ پہ ہو سکتی نہیں نغز یہ رسمی کارگر
دیکھ کر یہ اور قدرت نے بہت کچھ سوچ کر — ایک فرمان خصوصی وضع پر رکھی نظر

پیشتر اس سے کہ وہ فرمان ہو زیبِ نفاذ
تو بدل دے بلغرِ خامہ کا اے شاعر محاذ

وقت ہے تو اب یہ جہلِ عارفانہ چھوڑ دے — ساحری فن! یہ طلسمی کارخانہ چھوڑ دے
شعبدوں سے آگ پانی میں لگانا چھوڑ دے — سچ کو سچ کہہ جھوٹ کو سچ کر دکھانا چھوڑ دے

آہ جو دل سے نہیں نکلے رسا ہوتی نہیں
جو فغاں ہے اوپری جذب آشنا ہوتی نہیں

جذبہ تیرے کلک میں تیری زباں میں ہے اثر — پھونک دیتا ہے زمانے کو ترا سوزِ جگر

شادی و غم کو ترے یکساں ہے دُوری و حضر　　خرق عادت گر تجھے کہدے۔ تو کہدے بیخبر

میں تو سمجھا ہوں تجھے ما فوق علم نفسیات
ہے یہی باعث کہ کہنا چاہتا ہوں ایک بات

۲

حُسنِ عالمگیر کا ہو گر ترے دِل میں شرار　　گُل سے بڑھ کر نوک کی لینے لگے پھر تجھ سے خار
ہو خزاں میں بھی تجھے محسوس اک شانِ بہار　　ہو تجھے دستِ حنائی سے سوا برگِ چنار

حُسن کا چسکا ہے تو آ حُسنِ عالمگیر دیکھ
حُسنِ معنی، حُسنِ فطرت دیکھ مت تصویر دیکھ

دِل کی گہرائی میں تو غوطہ لگائے گا اگر　　حُسن و رعنائی کا ایسا منظر آئے گا نظر
ہستئ ذہنی تری پائے گی اک تازہ ڈھچر　　دُودھ پانی سا الگ ہو جائے گا عیب و ہنر

وہ فریبِ چشم تھا یہ سُرمۂ تحقیق ہے
وہ جنُونی کی لکیریں تھیں یہ نستعلیق ہے

بے پئے سرشار جامِ بادۂ صہبا نہ بن　　سب کہیں ناکارہ جس کو اے عزیز ایسا نہ بن
اشرف المخلوق ہو کر وحشئ صحرا نہ بن　　محفلِ علم و عمل کی شمع کا پروانہ بن

چھوڑ بزم آرائی میدانِ دل آسائی میں آ
محو حُسنِ وہم اس دُنیائے رعنائی میں آ

تُو تو ہے مالک تصور کا تخیّل کا دھنی　　کونسی شے ہے جہاں کی تیری نظروں سے چھپی
اک اُچٹتی سی نظر جب تم نے اس پر ڈالدی　　واقعاتِ دہر کی تجھ پر حقیقت کھل گئی

وہ ضرورت کونسی ہے تجھ پہ جو ظاہر نہیں
علم اپنی قوّتوں کا تجھ کو اے شاعر نہیں

کونسے مُنصف کو اس کے ماننے میں ہے کلام　　تجھ سے پاتی ہے فصاحت اور بلاغت انصرام
ناطقہ کو ہے تری شیوا بیانی سے قیام　　ہے اثر اور جذب کا دم سے ترے دُنیا میں نام

تجھ سے بس کہنا یہی ہے اب خدا کا نام لے
اور اس جادُو بیانی سے حقیقی کام لے

کب تک اس گلشن کو خارستاں کہے جائیگا تو　　اور ادائے ناز کو پیکاں کہے جائیگا تو

بوالہوس کو بندۂ جاناں کہے جائے گا تُو   اور نقلی کُفر کو ایماں کہے جائے گا تُو

کہہ تو کس مصرف کی ہے یہ فتنہ سامانی تری
ہے کفن کس لاش کا پوشاکِ عُریانی تری

جب تری گندم نمائی ایسی پُر تاثیر ہے   جب تری یہ ہرزہ گوئی داعیٔ توقیر ہے
تیری فرضی بات میں جب یہ شکر اور شیر ہے   تیرے مفروضات ذہنی میں جو یہ تسخیر ہے

کیا قیامت تو نہ کر دکھلائے اے مُعجز بیاں
گر حقائق کی پرستش کو بنا لے حرزِ جاں

آ کمر باندھ اور میدانِ عمل میں کود پڑ   تو نہ جھگڑا کر فلک سے اور قسمت سے نہ لڑ
ہے ترا پندار ہی تیرا رقیب اس سے جھگڑ   ہے عدو تیرا یہ تیرا واہمہ اس سے بگڑ

دل میں تیرے واقعی احساس کا گر سوز ہے
کل جو سنگِ راہ تھا وہ آج شمعِ طور ہے

ہے زباں میں تیری اے شاعر بھرا ایسا فسوں   تو اگر چاہے نکالے قیس کے سر سے جنوں
دیکھنے میں آئے دُنیا میں بہت سے ذوفنوں   تجھ میں اعجاز زباں جو ہے بیاں کیونکر کروں

غور سے سُن تجھ کو پہنچاتا ہوں پیغامِ عمل
کاش دے توفیق تجھ کو ایزدِ عزّ و جل

اپنے ان جذبات مزمن کی ذرا کر روک تھام   کر مُوکّد اُن پہ یہ آئینِ فطرت کا پیام
قلب کے احساس اصلی کا زباں کو کر غلام   دے نہ اس دُنیا کو تُو بازیچۂ اطفال نام

زندگی کو عارضی اور چند روزہ مان کر
ہو عوارض سے نہ بے پروا موانع سے نہ ڈر

کھول کر آنکھیں ذرا اپنے وطن کا حال دیکھ   حال دیکھ اہلِ وطن کا اُن کے تو اعمال دیکھ
زندگانی کی کشاکش اور اضمحلال دیکھ   تُو زمانے کی ہوا دیکھ اور اس کی چال دیکھ

یہ نہیں کہتا ہوں میں تجھ سے یہ کر تُو وہ نہ کر
خود سمجھتا ہے تو کرنا ہے جو اے اہلِ نظر

تجھ میں ہمدردی کا جوہر ہے کر اب اس پر عمل   منتقل کر دے اخوت میں اسے تو بے دغل
ہے جو یہ ہر بو نگ ہم آہنگی اس کا ہو بدل   خلق کی خدمت میں ہے خلاق کی طاعت کا پھل

راز یہ عشقِ الٰہی کا بتانا تھا تجھے
مست خوابِ لاابالی بس جگانا تھا تجھے

دیکھنا ہے جانگزا کتنا ہے دردِ بغض و کیں
ہے یہ وہ سم جس نے بس قوموں کی قوتیں ختم کیں
یہ سمجھ دو ناکسوں میں جب کبھی چوٹیں چلیں
موردِ الزام یا دونوں ہیں یا کوئی نہیں
جو شدائد و اقعاتِ عہدِ حاضر کے ہیں دیکھ
جو نتائج اور عواقب اُن کے ہو سکتے ہیں دیکھ

میں نے مانا تو کوئی قاضی نہیں مفتی نہیں
قول لوگوں کو ترا آیت نہیں شُرتی نہیں
ہاتھ میں تیرے رفاہِ خلق کی کنجی نہیں
ذات پر تیری فلاح انس و جاں مبنی نہیں
لیکن اے شاعر تجھے وہ قوتیں قدرت نے دیں
چاہے تو کر دے وطن کو رشکِ خلدِ بریں

ہو جہاں لعنت کا موقع اور نہ استغفار کا
ہو نہ اک کو دوسرے سے دغدغہ آزار کا
نام رکھا جائے عاصی جس جگہ بیکار کا
کام میں ہو ہاتھ ہر دم اور دل ہو یار کا
وہ مقام پاک ہے اے دوست دنیا میں بہشت
شہر یا جنگل ہو وہ، کعبہ ہو یا دیر و کنشت

تو کرشمہ اپنی اس جادو بیانی کا دکھا
گمرہوں کی رہبری کر سیدھے رستہ پر لگا
جس سے بہبودی خلائق کی ہو وہ راہیں بتا
باندھ یہ نیت مدد پر ہے تری فضلِ خدا
تیرے قبضہ میں ہے فن جس کو کہیں سحرِ حلال
انقلابِ قلب میں شاعر دکھا اپنا کمال

ایک ہے تیری نظر میں تو خدائی اور خودی
تجھ کو یکساں ہے زمانے کی بھلائی اور بدی
تو نے جُزو و کُل میں کب تمیز اور تفریق کی
فرق شخص و عکس اے شاعر نہ تو سمجھا کبھی
بحرِ جمعیت میں کر دے جذب موجِ فرد کو
تاکہ یکرنگیٔ وحدت جلوۂ کثرت میں ہو

ہاں وطن کو یہ نویدِ ارتباط آہنگ دے
افتراق و ضدیت کو پھر پیامِ جنگ دے
پھونک وہ منتر کہ اک سُر ہیں، بربط چنگ دے
انفرادی زندگی کو اجتماعی رنگ دے
فرد بے مصرف ہے گر نظمِ جماعت میں نہیں

لفظ ہے ٹکسال باہر گر عبارت میں نہیں

پھٹ گئے ہیں دل جو آپس میں انہیں تو جوڑ دے
چل رہے ہیں جو گمراہ ان کی تو باگیں موڑ دے
باہمی جنگ اور نزاعوں کا تو بھانڈا پھوڑ دے
پڑھ وہ دوا کچھ کہ ہر اک بغض و کینہ چھوڑ دے

فرق تجھ کو تو ذرا شیخ و برہمن میں نہیں
سبزۂ بیگانہ ہرگز تیرے گلشن میں نہیں

مسکراتی سر سنتی سن کر مدھر بانی تری
گل کھلاتی دشت و صحرا میں حُدی خوانی تری
کشور دل پہ مسلّم تھی قلمرانی تری
اب بھی ہے دل کی قلمرو میں جہانبانی تری

کیوں بھلایا ہے وہ تو نے نغمۂ ہند و حجاز
دے رہا ہے آس ابھی تک یہ ترا خاموش ساز

درد تیرے دل میں ہے ایثار گھٹی میں تری
اشک حسرت، خاک ارماں جذب مٹی میں تری
ہے کلید باب نصرت بند مٹھی میں تری
ہاں ہے ابھی تک بادۂ شیراز بھٹی میں تری

کر دے اک چھینٹے سے ان مُردہ دلوں کو شور بور
عشق کے جھنڈے کے نیچے ان بھٹکتوں کو بٹور

بجلیاں بھر دے دلوں میں ہاں جو حسرت انتما
سرد مہری سے جگر میں آگ اُلفت کی لگا
بھر دے ہر اک سر میں خودداری و غیرت کی ہوا
پھونک دے وہ آگ تن من میں جو ہے طور آشنا

اس طرح کایا زمانے کی تو اے شاعر پلٹ
اور تاریخ گزشتہ کے ورق کو دے اُلٹ

ورنہ پھر کس کام کی ہے یہ گہرباری تری
اور کس گوں ہے یہ دانش اور فسوں کاری تری
کس دن آڑے آئیگی یہ حسّ غمخواری تری
آخر اے شاعر ہے کس مصرف کی طراری تری

وقت ہے اب شاعر شیوا بیاں لب کھول تو
راست اور ناراست میزان عمل میں تول تو

چھوڑ کر ماضی کی رٹ رکھ حال کو مدِّ نظر
کیونکہ اسکا ہی اثر پڑتا ہے استقبال پر
ترجمانی واقعی احساس کی عالم میں کر
یہ صداقت کر لے اپنے دل پہ کالنقش الحجر

خلق کی خدمت میں ہے خالق کی طاعت اے عزیز
سروری اک قوم کی ہے اُس کی خدمت اے عزیز

سُن لیا تو نے جو کچھ ہے عہدِ حاضر کا پیام — ہو چکی ہیں تجھ پہ واضح اس کی تفصیلیں تمام
صاف نیت اور ہمت سے یہ سر ہونا ہے کام — غیر ممکن واپسی ہے تیری بے نیلِ مرام
یاد رکھ تو ہے یہاں حب اور احساں کے لیئے
فرضِ اولیٰ خدمتِ النساں ہے النساں کے لیئے

وطن کے نوجوانوں سے خطاب

(۲۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء)

۱

تو ہی تو ہے اے نوجواں تعبیرِ خوابِ قوم ہے — قوتِ بازوئے ہستی ہے شبابِ قوم ہے
زندگانی کے قصیدے کی تو ہی تشبیب ہے — حریت کی تو وطن کے واسطے تقریب ہے
نوجواں یہ یاد رکھ تمہیدِ مستقبل ہے تو — قوم گویا جسم ہے اس کا دماغ و دل ہے تو
ہے عروسِ زندگی کا تو ہی سرتاج اور سہاگ — تو ربابِ ہستئ النساں کا ہے کلیان راگ
کیا فقط ماں باپ ہی کی آنکھ کا تارا ہے تو — ہے وطن کا نورِ چشم اور قوم کا پیارا ہے تو
کارگاہِ دہر میں ہے تو اک ایسی خوردبیں — جس سے آئینہ ہوں اسرارِ فلک، رازِ زمیں

۲

طعن کی باتیں بھی سنتے ہیں جوانوں کے خلاف — کچھ کنایہ میں کہی جاتی ہیں تو کچھ صاف صاف
جاؤ بیجا لوگ کہہ اٹھتے ہیں تم کو دیکھ کر — تم میں نسوانی ادائیں آ رہی ہیں بیشتر
بن سنور کر کالجوں کو اس طرح جاتے ہو تم — اپنی زیبائش سے دولھے کو بھی شرماتے ہو تم
وقت ٹائی اور برش کنگھے میں ہو جاتا ہے صرف — اس سے جو بچتا ہے پڑھ لیتے ہو اس میں چار حرف
زیب و زینت اور خوش قمیضی کا ہے تم کو مرض — یہ بدیسی ہے کہ دیسی چیز؟ اس سے کیا غرض
دم سے چلتی ہیں تمہارے یہ دکانیں مال کی — جان ہو تم ہی تھیٹر اور سنیما ہال کی
ہوسٹل، لکچر کے کمرے، کھیل کے میدان میں — یوسف اس کو بھول جائے دیکھ پائے جو تمہیں
زیب و تزئیں کے ہو بندے، سادگی سے دور ہو — تم خود آرائی کے نشہ میں ہمیشہ چور ہو
پاس ہونے کی خوشی ہوتی نہیں اتنی تمہیں — جتنی کالج چھوڑ کر ہوتی ہے مایوسی تمہیں

اور کچھ باتیں بھی ہیں کہہ جاتے ہیں جو نکتہ چیں
ذمہ دار اُن کا مگر ہیں تم کو ٹھہراتا نہیں

تھوپے جاتے ہیں جو تم پر عیب یا ہیں واقعی
متہم ان کے لئے تم ہو نہیں سکتے کبھی

کہتے کہہ جاتے ہیں، لیکن بھولتے ہیں خوردہ میں
یہ سب اخلاقی وراثت کے سوا کچھ بھی نہیں

مغربی یا مشرقی۔ ہو کچھ بھی ان کی نوعیت
ان میں اسلاف اور بزرگوں کا عطیہ ہے بہت

ذمہ دار اس کے سلف ہیں کب تمہاری ذات ہے
ثمرہ ہے سوشل وراثت کا یہ سچی بات ہے

اس تعلق میں بہت ردِّ عمل در کار ہے
یہ جو ہو جائے تو پھر اک دم میں بیڑا پار ہے

٣

امرِ حق کو کچھ ضرورت استعارے کی نہیں
ہو جو نیت نیک تو حاجت اشارے کی نہیں

مجھ کو کہنا ہے یہ تم سے اس کو سُن لو نوجواں!
آنکھ اُٹھائے تم پہ ہے اس وقت کُل ہندوستاں

جو بڑے ہیں تم سے ان کے نقص سے تم لو سبق
تم اولوالعزمی کا ان کوتاہیوں کو دو سبق

'ہو وطن آزاد' اس کی لاکھ ہم باتیں کریں
ہے غلامی حاوی ساری ہماری ذات میں

ہم اُٹھاتے ہیں قدم تو پھونک کر اور تول کر
یہ ہماری چال تستعلیق اور لمبا سفر

دیکھتے ہیں جب جوانی کا کہیں جوش و خروش
تو یہ کہہ اُٹھتے ہیں، کھو بیٹھے وہ سب عقل و ہوش'

مغز فرسودہ میں ہے زعمِ بزرگی اس قدر
تیز چلنے میں نظر آتا ہے گرنے کا خطر

قومیت اپنی جو ہے اک ملّیت کا نام ہے
ملّیت بھی کیا کہ اک فرقہ سے ہے جو کام ہے

تجزیہ ہو ذہنیت کا ان بزرگوں کی اگر
تو جگہ دی جائے اس کو اک صدی سے بیشتر

تجربہ بیچارگی، ناکامیوں کا ہے ہمیں
آزمودہ کار ہیں ہم صابر ہیں اور شاکر ہیں

ہے ہماری عاقبت بینی کا یہ کچھ ماحصل
وقت آیا ہے کہ تم لو ہاتھ میں تیغِ عمل

کام وہ ہو جس سے نکھرے کچھ وطن کا رنگ و رُوپ
اہلِ عالم کو دکھا دو تم ہو بھارت کے سپوت

٤

جو نہ آیا تھا کبھی وہ انقلاب آنے کو ہے
عالمِ تہذیب کو روزِ حساب آنے کو ہے

دیکھتے ہو کُل جہاں کس کام کو تیار ہے
جانتے ہو تم کہ کیا اس عزم میں اسرار ہے

تم عصا ہو اے جوانو! اپنی قوم پیر کا
رنگ بدلو اس کی تم بگڑی ہوئی تقدیر کا

مدّتوں صبر و سکوں کی شعبدہ بازی رہی
عقل کی عشقِ عمل سے حیلہ پردازی رہی

فرقہ بندی سے بہت مجروح ہے حُبِّ وطن
جل رہا ہے تفرقہ کی آگ سے اپنا چمن

۵

سوچ کا اور فکر کا تو اب زمانہ ہو چکا
بند صبر و شکر کا وہ کارخانہ ہو چکا

مصلحت اندیشیوں سے کام چلنے کا نہیں
یہ شجر آہوں کی گرمی سے تو پھلنے کا نہیں

ہیں بنے مانا کام بے سوچے کوئی اچھا نہیں
سوچ ہی میں کاٹ دینا عمر بھی اچھا نہیں

کاٹ دی ہے سوچنے میں ہم نے جو عمر عزیز
استفادہ تم کرو اس سے کہ ہو صاحب تمیز

یہ جوانی تو نہیں بس حظ اُٹھانے کے لیئے
رکھو محفوظ اس کو آئندہ زمانے کے لیئے

باغ کی رونق سجاوٹ جو ہے وہ پھولوں سے ہے
غور سے دیکھو تو ہنستی پھول کی کلیوں سے ہے

پھول تو کچھ دن میں مُرجھا اور کُمھلا جائیں گے
ہیں وہ غنچے ہی تو جو گلزار کو مہکائیں گے

تم سے آئے گی بہارِ بیخزاں گلزار میں
جلوہ گر ہوگا ارم اس وادئے پُرخار میں

تم وطن کے کام میں مصروف ہوگے جس گھڑی
خضر و نارد بنکے آئینگے بہت سے آدمی

ہادیوں کے بھیس میں بہکانے والے آئیں گے
تم کو راہِ راست سے بھٹکانے والے آئینگے

لے کے تسبیح اور سُمرن بھی بہت آئینگے لوگ
ڈاڑھیوں اور چوٹیوں سے تم کو دہلائینگے لوگ

اِک بھیانک نرک اک دوزخ دکھایا جائیگا
محشر کبریٰ کا منظر آگے لایا جائے گا

ایک بھی اُن کی نہ سُننا وہ ریاکاری ہے سب
وہ تو چادر اور تختہ کی اداکاری ہے سب

چل چُکا صدیوں وہ جادو اُن کا اپنی قوم پر
ان کی لوری کام دے سکتی نہیں وقت سحر

فتنہ پردازی سے ان کی بچ کے رہنا نوجواں
آ پھنسے جو دام میں ان کے تو آزادی کہاں

ان کو ماضی جان کر مُطلق نہ رکھو ان سے کام
تم ہو مستقبل، کرو آئندہ کا حُسنِ نظام

ہے یہ میدانِ عمل آجاؤ تم سر جوڑ کر
دو وطن کے فرض کو انجام تم جی توڑ کر

اِسقدر خود رفتہ ہو جاؤ طلب کی راہ میں
منزلِ مقصود ڈھونڈے دوڑ کر خود ہی تمہیں

جب یہ جوشِ کامیابی اور ہو جذبِ عمل
ایک دم میں ہند کی قسمت ہی جائے گی بدل

جب تمہارا جذبۂ پنہاں عیاں ہو جائے گا
نوجواں! بختِ وطن بھی پھر جواں ہو جائیگا

صُبحِ وطن

(دہلی - جنوری ۱۹۳۲ء)

آنکھ سورج کی سرِ شام جھپک رہتی ہے — شب کے آتے نہ چمک ہی نہ دمک رہتی ہے
زینتِ بزمِ قمر رات ہی تک رہتی ہے — منہ اندھیرے نہ وہ رونق نہ چمک رہتی ہے

چاند سورج کے لئے رکھا ہے قدرت نے گہن
ماند ہوگی نہ کبھی روشنئ صبحِ وطن

صبح یہ وہ ہے کہ ہے رو کشِ صد نصف النہار — رنجِ غربت کی چمک اٹھتی ہے اس سے شبِ تار
یہ ہے وہ پھول کہ پہلو میں نہیں جس کے خار — یہ ہے وہ نشۂ جاوید نہیں جس کو خمار

یہ صبوحی جو پئے تا بہ ابد کیف رہے
لاکھ غم اس سے مٹیں حرفِ غلط حیف رہے

صبح ہر روز جو ہوتی ہے تو کیا ہوتا ہے — دشت و گلزار پہ احسانِ صبا ہوتا ہے
غنچۂ گل ہوتا ہے۔ گل تختۂ سا ہوتا ہے — باغ نغموں سے عنادل کے بھرا ہوتا ہے

دل کھلے صبحِ وطن سے بندھے الفت کی ہوا
نغمہ ہو دیس کا ہر تارِ نفس سے پیدا

کیا لئے بیٹھے ہو تم صبحِ بنارس کا یہ راگ — دل پہ جادو کئے کیوں شامِ اودھ کا ہے سہاگ
راگ خالص نہیں وہ، اس کو سمجھتا کھڑا اگ — اور ہے یہ جو سہاگ۔ اس کی بقا سے ہے لاگ

نہ سحر کوئی سحر ہے نہ کوئی شام ہے شام
ہے وہ اک صبحِ وطن جس کو ہے منشورِ دوام

ہے مناسب جو کہیں اس کو عروسِ ہستی — موجِ کوثر نے بھری آنکھ میں جس کی مستی
شاد و آباد اسی سے ہے دلوں کی بستی — عزم ہیں جن کے یہ آنے نہیں دیتی پستی

ہے یہ وہ صبح تعاقب میں نہیں جس کے رات
دامِ ظلمات کا قیدی نہیں یہ آبِ حیات

غزلِ زیست کا ہے مطلعِ روشن بھی یہی — بر لبِ روح کی آسا یہی ایمن بھی یہی
ساکنِ قلب یہی قلب کا مسکن بھی یہی — نورِ ایماں بھی یہی جلوۂ ایمن بھی یہی

نہیں اوقاتِ زمن میں کوئی وقت اس سے سعید
یہی نوروز محبانِ وطن کا، یہی عید

روح پرور ہے ضیا اس کی دلآرا ہے پھبن — اس کو کہنا ہے بجا خاورِ ہستی کی کرن
کیوں نہ انسان کا قربان ہو اس پر تن من — کہ ہے نورِ نظر روزِ ازل صبحِ وطن

یہ وہ خورشیدِ منوّر ہے نہیں جس کو غروب
شرق و غرب اس پہ ہیں حاوی نہ شمال اور جنوب

نور وہ صبحِ وطن کا ہے چھپائے نہ چھپے — آگ وہ دل میں ہے اسکی کہ بجھائے نہ بجھے
نقش وہ اس کا ہے دل پر کہ مٹائے نہ مٹے — کوئی بھی بات بغیر اس کے بنائے نہ بنے

ماہِ کنعاں کو کرے جو مہِ کامل ہے یہی
بندۂ حرص کو لیکن چہِ بابل ہے یہی

شامِ غربت میں غریبوں کا سہارا ہے یہی — دہر کا نظم و نسق جس نے سنوارا ہے یہی
قرۃ العین تمدّن ہے دلآرا ہے یہی — روحِ تہذیب کی اور آنکھ کا تارا ہے یہی

عذر لنگ اس سے ہوئی ابلقِ ایام کی چال
گردشِ لیل و نہار اس پہ مؤثر ہو ۔ محال!

دلِ مردہ کو ہوا اس کی جِلا دیتی ہے — خوفِ فنا کو بھی یہ پیغامِ فنا دیتی ہے
من کو چیٹک یہ محبت کی لگا دیتی ہے — آخر اللہ سے بندے کو ملا دیتی ہے

برکتیں صبحِ وطن کی کوئی کیا جانے گا
جو وطن، اہلِ وطن پر ہو فدا جانے گا

چمک اٹھتا ہے نصیبوں کا ستارا اس سے — دامنِ شامِ غریباں ہے دو پارا اس سے
قلبِ مایوس کو ملتا ہے سہارا اس سے — کشتیِ امید کی پاتی ہے کنارا اس سے

خود غرض قلب کو آئینۂ محشر ہے یہ
دلِ پُر درد کو فردوس کا منظر ہے یہ

ہے یہی نورِ بصیرت ۔ ہے یہی نورِ بصر — اسی صیقل سے جلا پاتے ہیں جذباتِ بشر
یہی چمکاتی ہے احساسِ دلی کے جوہر — وصف اس صبح کے ہیں حدِ بیاں سے باہر

ایک تفسیر جلی سورۂ والنور کی ہے

یا ضیا شمع دل افروز سرِ طور کی ہے

یا خدا صبح وطن حبّ وطن ہو کے رہے
اور یہ حبّ وطن حبّ زمن ہو کے رہے

شیخ اور برہمن اک جان و دو تن ہو کے رہے
ثانیٔ باغ ارم اپنا چمن ہو کے رہے

ہو بھی اس صبح کا گر دَورِ تسلسل سے مآل

تو وہ تیرے کرم و فضل سے ہو شامِ وصال

عشق کا آغاز

(دہلی ۵ رجنوری سنہ ۱۹۳۲ء)

آئینہ تھا کوئی لیکن دیکھنے والا نہ تھا
چاند تھا لیکن چکوروں کا پڑا ہالا نہ تھا

لب تو تھے لب پر مگر آہوں کا تبخالا نہ تھا
دل تھا دل میں حزن تھا۔ لیکن کوئی چھالا نہ تھا

حسن تھا لیکن نہ سیکھا تھا وہ انداز اور ناز

قلب تھا بے بہرۂ تعلیم ایثار و نیاز

باغ تھا اور باغ میں غنچہ۔ صبا تھی اور نسیم
پردۂ گلبرگ میں روپوش تھی لیکن شمیم

سرو تھا قمری مگر اہلِ عدم کی تھی ندیم
گھٹ رہے تھے شاید اسکا طوق گردوں کے مقیم

جی گھٹا جاتا تھا غنچہ کا تبسّم کے لئے

مضطرب تھی عندلیب اذنِ ترنّم کے لئے

آنکھ نرگس کی تھی بند اور بند سوسن کی زباں
لالہ کے دل سے نہیں تھا داغِ سودا کا عیاں

مصر میں تھی بند ابھی جلوہ فروشی کی دکاں
لے رہا تھا طور پر نورِ ازل انگڑائیاں

شمع کا دل انجمن میں حسن کی لگتا نہ تھا

ابتک آغوشِ عدم کے چین میں پروا نہ تھا

جانے پائی تھی نہ بلبل تک ابھی بادِ چمن
یار تھا شاپور کا اب تک نہ کوئی کوہ کن

نجد کے صحرا سے اٹھی تھی نہ آوازِ حزن
انتظارِ گردنِ حق گو میں تھے دار و رسن

دیکھنے پایا نہ تھا کوئی کنارِ نیل خواب

روشناسِ پیرِ کنعاں تھیں نہ چشمانِ پُر آب

دُور تھی اب تک کلی سے چاند سُورج کی کرن — سرمہ تھا کھائے ہوئے گویا پپیہے کا دہن
برج میں اب تک نہیں گونجی تھی مرلی کی بھرن — دل کی گہرائی سے تھی نا آشنا اب تک لگن

تھا وہ سنّاٹے کا عالم دہر میں چھایا ہوا
سازِ ہستی تھا نراس اور سخت بھرّایا ہوا

حُسن کی تزئین کا سامان بھی موجود تھا — طبلۂ عطار گلبن تھا مگر بے سود تھا
کیونکہ اس منظر میں اک نظارگی مفقود تھا — مختصر یہ ہے جہاں بے شاہد و مشہود تھا

سوچ میں ہر شے تھی پیدا تھے تامّل کے نشاں
فطرتِ عالم کی چپ پر تھا تعطّل کا گماں

دیکھکر دنیا کو یوں سُنسان یہ سُونا سماں — لے کے اک معصوم اُٹھا چرخ پر انگڑائیاں
مسکرا کر اس نے پہلو سے لیا تیر و کماں — سر کیا اک تیر پھر چلّہ چڑھا کر ناگہاں

وہ سری ناوک کہو اس کو کہ پھولوں کی چھڑی
سینۂ فطرت میں کھب کر دل کے اندر جا گڑی

چھُوٹنا چٹکی سے اس معصُوم کی سوفار کا — کائنات دہر میں وجہ تلاطم ہو گیا
بجلیاں تڑپیں فلک پر رعد کا کڑکا ہوا — ابر گرجا۔ لڑکھڑائی جیسے مستی میں ہوا

دل میں فطرت کے نئے جذبات مچلے جوش سے
نغمے بنیا بانہ اُٹھے بربطِ خاموش سے

ایک رستا خیز کی تھی کیفیت چھائی ہوئی — تھی تہیّج میں زمانے کی فضا آئی ہوئی
طبع انسانی تھی اس ہیجان سے گھبرائی ہوئی — تھی نقابِ ضبط و تمکیں رُخ سے سرکائی ہوئی

گونج اُٹھی گلشنِ عالم میں بلبل کی پکار
لیں بلائیں چٹ چٹ اور کلیاں ہوئیں اسپر نثار

دِل ملائک کے ہوئے بے چین پارے کی طرح — آنکھ حوروں کی چمک اُٹھی ستارے کی طرح
رُوح شہ رگ میں تڑپتی تھی شرارے کی طرح — شوق گھوڑے پر ہوا کے تھا چکارے کی طرح

مسکرائی قدرت اک بار دل کی چادر تان دی
بارشِ رحمت ریاضِ دہر پر نازل ہوئی

خدا سے عشق کی فریاد

(دہلی ۴؍ جنوری ۱۹۳۳ء)

حضورِ قدس میں یہ عشق نے سوال کیا — کہ اے خدا مجھے کیوں غم کا پائمال کیا؟
جہاں میں ہر کہیں تیرا کرم ہے ارزانی — ہے زندہ لطف سے تیرے یہ عالم فانی
تری عطا۔ تری دریا دلی کا ہے یہ ظہور — کہ بحر و بر کو ملے ہیں جواہر پُر نور
عطا کیا ہے سمندر کو گوہر شہوار — بھرا ہے پنّے سے ہیرے سے دامن کہسار
کیا ہے خار کو ہمسایہ پھول کا تُو نے — نثار پھول پہ کیا رنگ و بُو کیا تُو نے
عقیق و لعل جو ڈھونڈیں تو پتھروں میں ملیں — جو موتیوں کی ہو خواہش سمندروں میں ملیں
ہے ذرّے ذرّے پہ مبذول تیری بخشش و جُود — ہے قطرہ قطرہ میں تیری عنایتوں کی نمود
جو سرکش اور ہے اک کُندہ ناتراشیدہ — گل اور برگ و ثمر سے اسے نہال کیا
بڑا ہے سب سے تو اور تیری کائنات بڑی — میں چھوٹے منہ سے ہوں کہنے کو آج بات بڑی
پڑے ہیں داغ جو سینے میں کیا دکھاؤں میں — جو میرے دل میں ہے کیونکر زباں پہ لاؤں میں
نہ شوخ چشم نہ حدّ ادب کو بھولا ہوں — تو میرا خالق و مالک میں تیرا بندہ ہوں
پر آہ کیا کروں دل کی تڑپ سے ہوں بے چین — ہے رات دن مرے حصے میں یاس و شیون و بین
ہے کیا کمی ترے بھنڈار میں مرے داتا! — ہوں ایک میں ہی جو اس میں سے کچھ نہیں پاتا
کرم سے ہے تری مخلوق ساری مالا مال — مگر ہے ایک مرے واسطے ہی رنج و ملال
سمجھ میں بندہ کی عقدہ یہ آ نہیں سکتا — اسی سبب سے ہوں گستاخ بن کے یہ بکتا
کہ اے علیم و خبیر آخر اس کا کیا ہے سبب — ہے فضل خلق پہ لیکن مجھی پہ قہر و غضب
ہے میرے نام پہ لکھا ہوا اسیر وفا — کیا عطا جو مجھے تو خزانہ حرماں کا
ہے گریۂ سحری اور نالۂ شبگیر — یہ میرا بخت، یہ قسمت، یہ ہے مری تقدیر
کوئی نہیں کہ نہ ہو شاد کام اور خرسند — ہے میرے منہ پہ ہی دنیا میں در خوشی کا بند
جو روتے دن تو کٹے رات تارے گن گن کر — میں کس زباں سے کہوں کیا یہ عدل ہے داور
جو غم ہے کھانے کو تو خون دل کا پینا ہے — تُو ہی بتا کہ یہ جینے میں کوئی جینا ہے
طبیب نے مجھے مزمن مرض قرار دیا — گلہ ہو کس سے جو تقدیر کا مری لکھا

ہوں تنگ زیست کہ مُردوں میں زندہ شامل ہوں | عجیب زندگی میری ہے۔ نیم بسمل ہوں
ہے مرقد آرزوؤں کا کہ خانۂ دل ہے | بنا با کیوں جو اُجڑنے ہی کے یہ قابل ہے
یہی گذارش احقر ہے ذاتِ باری سے | کہ مجھ کو رکھا ہے کیوں ذلت اور خواری سے
چمن میں دشت میں پھلتے ہیں پھولتے ہیں شجر | نہیں ہے نخل تمنا مرا ہی بار آور
ہے رنج و غم مری خاطر میں رنج و غم کیلئے | الم ہے میرے لئے اور میں الم کے لئے
نہ لطف زیست ہے مجھ کو نہ موت آتی ہے | گھڑی گھڑی اسی صورت سے کٹتی جاتی ہے
جسے میں چاہوں نہ دیدار بھی ہو اسکا نصیب | میں جس پہ جان دوں آنے نہ دے وہ مجھ کو قریب
اسے خبر نہیں جبتک کہ مر چکا ہوں میں | غرضکہ ایک مصیبت میں مبتلا ہوں میں
غم فراق میں رات اور دن تڑپتا ہوں | کسی کی یاد میں روتا ہوں اور کلپتا ہوں
کبھی جو بھول کے ہوتا ہے وعدۂ فردا | تو اس کا ہوتا ہے مفہوم دن قیامت کا
خوشی سے کوئی بھی مخلوق میں نہیں محروم | مگر جو ہے تو ہے بس ایک عشق ہی مغموم
جہاں میں عشق کی ہونی تھی گر یہی تعزیر | تو کس لئے اسے پیدا کیا ہے ربِ قدیر؟
یہی تھا اس سے تو بہتر مجھے فنا کرتا | نہ جھیلتا یہ مصائب نہ میں گلہ کرتا
ہے بارگاہِ مقدس میں یہ مری فریاد | ہو میرے ساتھ بھی مولا مرے عنایت و داد

جواب

یہ تیز کلمے زباں سے جو عشق کے نکلے | جلال سے وہیں تیوری چڑھائی گرما کے
مگر تھی شان جمالیہ آشتی و لطف آمیز | وہ سادگی پہ ہوئی عشق کے تبسم ریز
ملا یہ عشق کو فریاد حسن کے اُسکی جواب | کہ بوالہوس ہے تو بر خود غلط ہے خانہ خراب
غرض کا تو ہے پرستار اور ہوس بندہ | اسی لئے تو ترا حال ہے پراگندہ
جنوں کے جوش میں ہے تیرا ہاتھ دامن پر | کبھی نہ چاک ہوا دل نہ ٹکڑے ٹکڑے جگر
اِدھر تو دھوم مچاتا ہے دل ہوا گھایل | اُدھر ہیں چلتے۔ تو تسخیر اور حُب کا عمل
تجھے تو نفس پرستی نے آ کے گھیرا ہے | جو تیرے دل پہ ہے قابض تو میر تیرا ہے
ہے زندگی جو تری تو فقط غرض کے لئے | ہمیشہ ساعی تدبیر ہے مرض کے لئے
تو موت کا نہیں طالب ہے عیش و عشرت کا | اسی لئے تو نشانہ ہے تیر حسرت کا
تو خود غرض ہے تو خود ناشناس ہے احمق | ترا نیاز نہیں خالص نہ بے خودی مطلق

عبودیت تری فخر اور عیش ہے ایثار
تری نگاہ کا محور ہے تنگ و نیرہ و نار

جو ہے تو نفس کا حظ ہے فقط ترا محبوب
اگر ہے تجھ کو تو اک وصل ہی ہے بس مطلوب

نہ کوئی فعل ترا کوئی مدعا ہے بری
ہے گرد نفس پرستی کی تیرے دل میں بھری

قناعت اور نہ ہمت نہ حوصلہ ہی ہے
نہ تجھ میں جذبۂ صادق نہ ولولہ ہی ہے

شکست پر تجھے ضد، فتح پر تعلّی ہے
نہ تجھ میں نام کو بھی صبر اور توکل ہے

نہ استوار ہے تو اور نہ تجھ میں استقلال
اسی لئے تو ہے پامال یاس و حزن و ملال

تو رو پڑے جو پڑے آکے تجھ پہ کوئی کڑی
تو گننے لگتا ہے وعدہ کی ساعت اور گھڑی

ہے وعدہ کیسا؟ ارے وعدہ کس کا؟ اے ناداں!
جو تیرا وعدہ تھا مجھ سے ہے اس کا بھی کچھ دھیان

ترے حواس میں کوئی گناہ شامل ہے
جسے تو سمجھا ہے سوزش وہ شورش دل میں ہے

جو حظِّ نفس سے ہوتے بری ترے جذبات
تو تیرے قلب کو سچی خوشی تھی کھیل کی بات

ہو پاک حرص و ہوا سے اگر ترا احساس
تو کس لئے ہو اسیر ملال و حسرت و یاس

ہے طمع خام کا بندہ ترا دماغ اور دل
اسی لئے تجھے ہوتی نہیں خوشی حاصل

لگاوٹ اس کو سمجھ کہہ رہا ہے جس کو لگن
بناوٹ اس کو سمجھ کہہ نہ اس کو بھولا پن

ہے بیخودی میں خودی سوز میں ہے تیرے ساز
نہیں ہے ناز سے خالی یہ تیرا عجز و نیاز

نصیب کا نہیں تو تو کرم کا پیٹا ہے
وہ تیرا فعل ہے جس نے تجھے لپیٹا ہے

پڑا ہے تجھ کو تو لپکا وہ موہ کے رس کا
فنا کسی کے لئے ہو یہ کب ترے بس کا

ملا جو خاک میں دانہ وہ پھول پھل سے لدا
چھپا جو بحر میں قطرہ کبھی ہوا نہ فنا

تو ہے زمانہ کے نیرنگ کا تماشائی
نہ رنگ وحدت مطلق کا ہے تو شیدائی

تو مجھ کو بھول گیا اس سرود خانے میں
نہ ڈھونڈا اسم کو کبھی تو نے اس ترانے میں

سمجھ کہیں ہی گل و غنچہ میں سمایا ہوں
کبھی میں بو ہوں کبھی رنگ بن کے چھپا ہوں

تری سمجھ میں نہ اب تک یہ گر کی بات آئی
کہ بُت ہیں کس سے؟ نہیں وہی ہے کس نے رعنائی

خیال کوزہ میں تو کوزہ گر کو بھول گیا
فروغ جلوہ میں تو جلوہ گر کو بھول گیا

بطون سے کر کے کنارہ ہوا ظہور میں غرق
مجاز اور حقیقت کا تو نہ سمجھا فرق

جو حسن تجھ کو دکھائی دیا وہ میرا ہے
تو بھول جا کہ وہ تیرے لئے ہے تیرا ہے

سنگار ماہ و شما کا اگر نہ ہوتا تو
تو اپنے دل کے سکوں کو کبھی نہ کھوتا تو

الگ ہوسِ عرض سے تو بزم حسن میں آ　　جو سچا عشق ہو تو حسن کا ہے پیارا

کلام پاک جو یوں اختتام کو پہنچا　　تو ایک گوشہ سے کھنکار کی سی آئی صدا
تھی اس میں رمز جبیں اور ادا تبسّم کی
رہی مجال نہ پھر عشق کو تکلّم کی

تجدید عمل کا بانی راجہ رام موہن رائے

(لاہور ۲۰ مئی ۱۹۳۳ء)

راجہ رام موہن رائے کی وفات پر ایک صدی گذر جانے کی تقریب میں جو جلسے
لاہور میں ہوئے تھے ان میں پڑھا گیا ؀

ہوا مشرق کی تھی مغرب کے جھکڑ سے تصادم میں　　تخیّل کا تہیّج یا سمندر تھا تلاطم میں
پڑی تھی آ کے گڑ بڑ اپنی تعلیم و تعلّم میں　　پرانی باتیں بھولی جا رہی تھیں اس تلازم میں
دل اہل ہند کے اپنے دھرم سے پھٹتے جاتے تھے
قدیم اطوار اور شائستگی سے ہٹتے جاتے تھے

نرالی روشنی سے سب کی چندھیائے لگیں آنکھیں　　یقینی جن کو سمجھا تھا خیالی ہو گئیں باتیں
نظر آتی نہ اب خوبی پرانے دین و مذاہب میں　　گرہیں آنکھوں سے اچھی یا بری جیسی بھی تھیں رسمیں
کمربستہ وطن کایا پلٹ ہونے کو بیٹھا تھا
پرانی کلچر اور تہذیب کا گھر ڈھنے والا تھا

نظر خیرہ ہوئی سب کی چکا چوند ایسی چھائی تھی　　نئی تعلیم ترک کہنہ کی ترغیب لائی تھی
ظفر نے علم نو کے حسن کی رونق بڑھائی تھی　　خیالات قدیم و تازہ میں جنگ آزمائی تھی
غضب کا انقلاب اپنے وطن میں آنے والا تھا
نشاں تک ہر پرانی چیز کا مٹ جانے والا تھا

ادھر یہ تھا۔ اُدھر ماضی کی پوجا تھی کہ جاری تھی　　کرہتی اور بدعت جو تھی اس سے دوستداری تھی
دلوں میں ان کے نفرت کل نئی باتوں سے ساری تھی　　ضعیف الاعتقادی اور زبردستی سے یاری تھی

جماعت پر یہ استبداد تھا ان سخت جانوں کا
کہ دم آنے لگا تھا ناک میں اصلاح والوں کا

وطن کو ایسے نازک وقت میں اس کی ضرورت تھی — یہی اس کی ضرورت اور یہی حاجت بہ شدت تھی
کہ جو پچھلے زمانہ کے توہم اور بدعت تھی — نہ جس میں نفع دنیا کا نہ کچھ دین کی ہی دولت تھی

کوئی ایسا نکلتا رطب و یابس کو جدا کرتا
ہر اک کے دلنشیں دَعْ ما کدر خذ ما صفا کرتا

ضرورت تھی کہ ہر عیب اپنے گھر کا دور ہو جائے — کوئی یہ گرم و سرد شرق و غرب آ کر سمو جائے
جو داغ اپنے تمدن کے ہیں چہرے پر وہ دھو جائے — نہ ہو قیدی قدامت کا نہ وہ جدّت میں کھو جائے

ضرورت تھی کوئی مردِ خدا ہوتا یہاں پیدا
جو ہندی رہ کے ہوتا ہند کی بہبود کا شیدا

یہ حالت تھی کہ راجہ رام موہن رائے نے اٹھ کر — دکھایا ملک کو اصلاح اصلی کا نیا منظر
جو اس ہربونگ اور ہلچل میں تھے حیران اور ششدر — وہ ان بھٹکے ہوؤں کے حق میں ہادی اور بنا رہبر

بچایا ان کو گرنے سے جو ٹھوکر کھانے والے تھے
لگایا ان کو رستے پر جو گم ہو جانے والے تھے

بیاں کو اسکے دفتر چاہئے جو کام اس کا ہے — یہاں اک کارنامہ صرف مصلح کا دکھانا ہے
پریس، اخبار، جسکا آج یہ زور اور چرچا ہے — جو خار اک آنکھ کا اور دوسری کا جو کہ تارا ہے

جو دیکھا قید و بندِ ناروا عائد ہوئے اس پر
جو کی جنگ اُسنے لنڈن تک۔ وہ ہے تاریخ کا زیور

وہ تجدید عمل، اصلاح علم و دیں کا رہبر تھا — وہ علم و عقل اور اخلاق حسنہ کا سمندر تھا
نہ تھا دل اسکا صدق و حبّ انسانی کا مندر تھا — وطن کے عشق اور خدمت سے وہ سینہ منوّر تھا

جبھی تو سَو برس گزرے پہ اس کو یاد کرتے ہیں
وہ زندہ ہے دلوں میں کیونکہ سب دم اسکا بھرتے ہیں

شعرائے دہلی

(لاہور ۱۵ دسمبر ۱۹۳۳ء)

ساحر صاحب کی بزم سخن کے سالانہ مشاعرے میں پڑھا گیا یہ قطعہ مشاعرہ کی طرح میں

ہے اس قدر پسند ہؤا کہ کئی بار پڑھوایا گیا :

کہتے ہیں دہلی وہ اب پہلی سی دہلی نہ رہی ۔۔۔ کہ فضا شعر و سخن سے یہاں معمور نہیں

اس میں کچھ سچ ہے تو کچھ وہم کا عنصر بھی ہے ۔۔۔ خالی احساس محبّت سے یہ مذکور نہیں

میر و مرزا نہیں دہلی میں نہ مظہر ہیں نہ درد ۔۔۔ دُور کی بات ہے یہ گرچہ بہت دُور نہیں

نہ رہے شاہ ظفر شیفتہ اور عیش و نصیر ۔۔۔ ذوق و مومن نہیں اب غالب مغفور نہیں

اب نہیں انور نہ ظہیر اور نہ سالک مجروح ۔۔۔ میرزا داغ نہیں حالی مبرور نہیں

واقعی امر یہ ہے اس سے ہو کس کو انکار ۔۔۔ جسم دہلی اب ان ارواح سے پُر نُور نہیں

ادب اور شعر کی ان روحوں کے نغموں سے مگر ۔۔۔ یہ تو ہرگز نہیں دِل دلّی کا معمُور نہیں

یہ مسلّم ہے وہ تھے چرخ سخن کے انجم ۔۔۔ دَورِ تاریک ہے اب قول یہ منظور نہیں

باکمال اب بھی یہاں کے ہیں وحیدِ دَوراں ۔۔۔ کون کہتا ہے وہ کُل ہند میں مشہور نہیں

نام باقی ادب و شعر کا ہے اب ان سے ۔۔۔ کون ان کے اثرِ فیض سے ماثور نہیں

نیّر چرخ ادب کی وہ درخشندہ شعاع ۔۔۔ پرتو فکر سے کب اس کے یہاں نُور نہیں

ہند میں حضرتِ سائل کی فصاحت کی ہے دھوم ۔۔۔ جن سے گر فن و زباں کا کوئی مستور نہیں

بھول سکتا ہے کہیں حضرت بیخود کا نام ۔۔۔ ان کی تشریف سے گو بزم یہ پرنور نہیں

قطب و بنائے سخن غوث ملک سیرت ہیں ۔۔۔ نشۂ شعر سے اُن سا کوئی مسرور نہیں

برق وش برق کے اشعار کی ہے وہ تخئیل ۔۔۔ جس کی توصیف کا ہر ایک کو مقدور نہیں

زینتِ بزمِ ادب رونق و شیدائے سخن ۔۔۔ بادۂ شعر سے کس وقت وہ مخمور نہیں

حضرت زار ہیں دراصل نزیمان سخن ۔۔۔ آپ کب معرکۂ شعر میں منصور نہیں

نام کس کس کا لیا جائے یہاں ہیں سب فرد ۔۔۔ آپ کے سامنے موجود ہیں کچھ دُور نہیں

بانیٔ بزم کے ہے نام پہ اب ختم کلام
کون ہے سحر سے ساحر کے جو مسحور نہیں

آپ کے دم سے ہوئی بزم سخن کی قائم
فیض بخش آپ کی کب کوشش مشکور نہیں

شعر ساحر کا مقام اتنا ہے اعلیٰ کہ جہاں
بُت پیمان شکن و عاشق مہجور نہیں

دیکھتے ہو جنھیں - ہیں مغتنمات دوراں
عمر خضر ان کو ملے! دن وہ مگر دُور نہیں

کہ ان اصحاب کے درشن کیلئے ترسینگے
جن کو خود رائی سے اب مشورہ منظور نہیں

ان ادیبوں کے قدم لو۔ یہ فصاحت کی ہیں جان
رازِ شعر و ادب ان سے کوئی مستور نہیں

یہی دِلّی ہیں۔ انھیں سے تو ہے دِلّی کا نام
دِلّی والوں سے جُدا دِلّی کا مذکور نہیں

اب نئے دُور۔ آئیگا وہ وقت بھی اک روز کہ جب
بائی رٹ پور، کہیں لوگ بھرت پور نہیں

لوگ پوچھینگے کہ یہ سائل و ساحر تھے کون؟
سیکلو پیڈیا میں اپنے تو مسطور نہیں

بولی ٹھولی بھی نئی۔ ہونگے پہیرو بھی نئے
'کپ کرسٹل'، جو کہیں ساغرِ بلور نہیں

اب ہیں باقی جو نفوس ان سے اٹھا لو تم فیض
شکوہ محرومیٔ قسمت کا جو منظور نہیں

دہلی و لکھنؤ ہیں مہر و مہ چرخ سخن
اب کسوف اور خسوف ان کے مگر دور نہیں

چپ ہو کیفی کہ جو ہونا ہے رہے گا ہو کر
نوحۂ یاس سے تو دِل کوئی مسرور نہیں

معرکۂ کرناٹک

(لاہور۔ ۱ مئی سنہ ۱۹۲۳ء)

جب شہنشاہ اورنگ زیب کی دکن پر چڑھائی کی خبر سُنی تو بہمنی سلطنتوں نے باہم مشورہ کیا۔ سیواجی کے نمائندے بھی شریک تھے۔ قرار یہ پایا کہ کورومنڈل کے قلعہ دہلو پر قبضہ کیا جائے تاکہ ضرورت کے وقت وہ جائے پناہ کا کام دے۔ سیواجی (چھترپتی) اس کام کے لئے منتخب ہؤا۔ گولکنڈہ اور بیجاپور وغیرہ نے روپیہ، اسلحہ اور فوج سے امداد کی۔

ٹاپ سے گھوڑوں کی کانپ اُٹھا تھا کوہ رومنڈل ڈھلوا والوں کے تھے ہوش دہل سے مختل
پہنچے جب چھتر پتی کے وہاں افواج کے دَل شبیر خاں کی تھیں جو فوجیں پڑی ان میں ہلچل
جب سنا لشکر یورش میں ہے خود سیوا جی
کون کرناٹکی تھا جسکا نہیں چھوٹا جی

کہتے ہیں ڈھلوا کا گڑھ تھا نہایت سنگیں گرد کھودی ہوئی تھی اسکے جریبوں ہی زمیں
اس میں پانی بھرا اور بیٹھے کئے کر کے تسکیں اہل قلعہ کی یہ خندق ہے حفیظ اور امیں
شعلۂ تیغ کو کیا کر سکے ٹھنڈا پانی
اس کی گرمی سے تو البرز بھی ہوتا پانی

توپیں جو قلعہ پہ تھیں چلتی تھیں غراتی تھیں حملہ آور جو تھے رُخ ان کی طرف لاتی تھیں
اپنے لیکھے تو وہ کم آگ نہ برساتی تھیں وہ مگر جائے عدو مورچے کو ڈھاتی تھیں
مثلاً چاٹ کے رنجک ہوا ان کو ایسا
بھولیں وہ شبیر کی بولی وہیں گولا اُگلا

ہے یہ تاریخ میں وہ جنگ کئی ماہ رہی کیفیت ساری بیاں ہو نہیں سکتی جس کی
حملۂ فتح کی رُوداد جو ہے تفصیلی اس سے لے کر یہاں کرتا ہوں رقم تھوڑی سی
دیکھنے سے یہ تواریخ کے ثابت ہو تمھیں
جنگ ایسی نہ ہوئی تھی کبھی کرناٹک میں

شست باندھے تھیں فصیلوں کی وہ توپیں ساری تھی وہ برق افگنی یارب کہ تھی گولہ باری
تیر گردوں کی بھی آنکھ اس سے ہوئی تھی بھاری تھے جو جنگاہ میں گویا وہ بنے تھے ناری
شتلکیں تھیں کہ اگن جھاڑ کے بھنکارے تھے
گولے توپوں کے دہکتے ہوئے انگارے تھے

گولا جو توپ سے نکلا وہ پرافشاں نکلا اب وہ کھل کھیلا کہ دل کھول کے ارماں نکلا
شعلۂ برق پئے خرمن صد جاں نکلا بُرج اور مورچہ بازیچۂ طفلاں نکلا
کیا ٹھہرتا کوئی اس قلعہ شکن کے آگے
ہوش جن کے رہے وہ جان بچا کر بھاگے

قدر انداز تھے اس پایہ کے وہ گولنداز کام سے اپنے تھا اس درجہ انھیں سوز و ساز

تیز بجلی سے زیادہ تھے سب اُن کے انداز   جاں‌ستانی میں تھے یکتائے زماں وہ جانباز

روئی کی طرح سے انسان دُھنے جاتے تھے

بھاڑ تپتا تھا چنے جیسے بھُنے جاتے تھے

غُل جو جنگاہ میں توپوں کی دنادن کا تھا   کس کو سُدھ سر کی وہاں ہوش کسے تن کا تھا

چت ہُوا جو صفِ دشمن سے ذرا منکا تھا   دانۂ سبحہ کی مانند ڈھلا منکا تھا

جب وہ چلتی تھیں تو بھونچال بھی چکراتا تھا

روزِ محشر کا سماں آنکھوں میں پھر جاتا تھا

توپ کو مطلعِ خورشید قیامت کہئے   تھیں وہ دھرتی دھمک اک زلزلہ آیا اُن سے

دُھس سلامت رہے ان سے نہ سلامت کوچے   وہ فصیلیں کہ تھیں اس حصنِ حصیں کو گھیرے

ہوئیں صد چاک سخن گو کے گریباں کی طرح

درزیں منہ کھولے ہوئے تھیں درِ دالاں کیطرح

اور بھی اس پہ سرنگوں نے قیامت ڈھائی   فعل کی ان کے مزاحم نہ ہوئی وہ کھائی

ضربِ بُنیاد میں قلعہ کی سراسر آئی   تو فصیلوں نے بھی منہ کھول کے لی انگڑائی

فاتحوں کے لئے اب کوئی نشانہ نہ رہا

ایسا ستھراؤ کیا کوئی ٹھکانہ نہ رہا

چڑھ گئے مرہٹے ٹوٹی ہوئی دیواروں پر   تھے جو محصور لگے لوٹنے انگاروں پر

رکھ لیا فاتحوں نے بس انہیں تلواروں پر   بجلیاں ٹھنڈی برسنے لگیں بیچاروں پر

توڑ کر قلعے کے در ہو گیا لشکر داخل

جو چڑھا ہتے ہُوا تیغِ اجل کا بسمل

کیا ہو لفظوں میں سروہی کی روانی کا بیاں   یہ تڑپ شعلہ میں بجلی میں یہ تیزی ہے کہاں

کھیل تھا اس کیلئے تن کو بنانا بیجاں   گھاس کی طرح کٹے جاتے ہزاروں انساں

نقش تھی سینہ پہ دشمن کے صفائی اس کی

یوں گئی سر پہ عدو کے۔ کہ تھی آئی اس کی

اس کی خونخواری سے شیروں کا بدن کانپ اُٹھا   کیا بدن جنگ کے ہیروں کا بھی من کانپ اُٹھا

اسکے گھمسان سے خونریزی سے رن کانپ اُٹھا   کیا زمیں کانپ گئی چرخِ کہن کانپ اُٹھا

بجز تھا اندر کا یا چھتر پتی کی تلوار
سامنے اسکے ٹھہرتا کوئی یہ تھا دشوار

چمکی تلوار تو دشمن کو کچھ آیا نہ نظر   ایک بجلی سی گئی کوند بدن کے اوپر
ریزے ریزے ہوئے چار آئینہ ٹوٹے بکتر   ذکر کیا خود کا بے سر ہوئے کتنے خودسر

زعم تھا جن کو شجاعت کا جوانمردی کا
ان کے ماتھے پہ لکھا لفظ جوانمرگی کا

نال بندوق تھی نال قلم عزرائیل   اس سے پیادے نہ سوار اور نہ جانبر ہوئے فیل
توپ کے سینکڑوں تو اسکے ہزاروں تھے قتیل   ہوتے کیا خود و زرہ ان کی حفاظت کے کفیل

بجلی اس کی ہلی جان لبوں پہ آئی
آگ سے سرد صفوں کی یہ صفیں کر آئی

جنگ کی آکے کچھ اس طرح پڑی تھی افتاد   سننے والوں کو بھی لرزاتی تھی جس کی رُوداد
لب کھلے اور تھا دم بند- یہ تھا بست وکشاد   رن کو جائز ہے کہے کوئی جو آہن آباد

آہن سرد اگر جسم کو ٹھنڈا کرتا
آہن گرم اسے خاک کا تودا کرتا

ہوا اس جنگ کا جو آپ نے دیکھا انجام   قابلِ ذکر خصوصی تو اب آیا ہے مقام
سب سنیں غور سے اس بات کو حضارِ کرام   اس کی سچائی میں ہوگا نہ کسی کو بھی کلام

خافی خان جیسے مورّخ کو ہے اس کا اقبال
حرمتِ مذہب و عورت تھی سیواجی میں کمال

لکھتے ہیں مال غنیمت میں جو آئے قرآن   "مسجدوں میں انہیں پہنچا دو" ہوا یہ فرمان
اور ارشاد ہوا جو ہیں عبادت کے مکان   ان کو حملے سے جو پہنچا ہو ہمارے نقصان

صرف سے خاص کے ہو ان کی مرمت فوراً
ہم عدو کے ہیں۔ نہیں دین عدو کے دشمن

نافذ احکام یہ سب کر چکے جب سیواجی   قیدیوں کے کسی جرگے پہ نظر ان کی گئی
دیکھتے کیا ہیں کہ سہمی۔ دبی۔ گھبرائی۔ جھجکی   ہے کھڑی ایک مسلمان پری رو لڑکی
تھا جری ابن جری آنکھ اُٹھائی نہ گئی

اس گُل اندام کو انگلی بھی لگائی نہ گئی

ہند میں فاتحوں نے گرچہ بہت زن بچّے پکڑے اور لونڈی غلاموں کی طرح بیچ دئے
تھی نہ یہ بربریت خُلق میں سیواجی کے لے کے اس لڑکی کے گھر در کا پتا لوگوں سے

جو دیا حُکم ہدایت جو وہاں فرمائی
غور سے سُن لیں جو تہذیب کے ہیں شیدائی

"ابھی ماں باپ کے گھر اپنے یہ لڑکی جائے فرق عزت میں نہ ناموس میں اس کے آئے
ہاتھ کوئی اسے ہرگز نہ لگانے پائے" پھر دیا حکم قماش اور زر و زیور لائے

دئے لڑکی کو۔ سپاہی کئے اُس کے ہمراہ
کہئے تاریخ میں ایسا کوئی گذرا ہے شاہ

اس قدر نیک سیر ہو جو شہ ذی صَولت خلق کے دل میں نہ کیوں اسکی ہو عزت، اُلفت
اب اُسے 'سگ' کہے کوئی کہ فرشتہ خصلت اپنے دل سے وہ "جہنم" اسے دے یا جنّت

ایسے 'سگ' ہوتے ہیں تو کاش سبھی سگ ہوتے
دوزخی یہ ہے تو ہم بھی وہیں لگ بھگ ہوتے

یہ رواداری یہ عصمت کی پرستش یہ سبھاؤ شفقت اور رحم کا بے مثل یہ سُندر برتاؤ
ساتھ دُشمن کے بھی ہو نا تعصّب کا لگاؤ جو بہادر ہیں چلے نفس کا ان پر نہ دباؤ

مالک ان وصفوں کے تھے چھتر پتی سیواجی
شاہ ظاہر میں تھے۔ باطن میں ولی سیواجی

جب اور اب

(۱۹۳۲ء)

دہلی کے مُشاعرے کی طرح میں

ہے کل کی بات دِل مرا شوریدہ کار تھا یہ خوشگوار تھا اسے وہ ناگوار تھا
اچھے بُرے کے علم و توازن کا تھا گھمنڈ سر پہ عذاب اور ثوابوں کا بار تھا
کاوش جو تھی کسی سے تو سازش کسی سے تھی تھا غیر کوئی گر یہاں تو کوئی یار تھا

سمجھے ہُوا تھا رازِ جہاں کا بزعمِ خود — پندار تھا خودی کا کہ سر پر سوار تھا
بیم و رجا میں تھا گلِ بازی بنا ہُوا — صرفِ غرض مرا دلِ ہنگامہ زار تھا
محبس میں سنگ و خشت کے رہتا تھا میں اسیر — پامالِ دورِ ابلقِ لیل و نہار تھا
کیا کچھ کیا نہ ہستیٔ دوروزہ کیلئے — ہستی۔ کہ جو دراصل عدم کا خمار تھا
جذبات کا غلام تمنّاؤں کا مُرید — دل تھا کہ آرزوؤں کا زندہ مزار تھا
خُلدِ نظر جو تھا وہ محلِّ نظر بنا — تحقیقِ حق کا زعم پہ دار و مدار تھا
تھیں تنگیٔ نظر کی یہ وسعت طرازیاں — پہنائے دہر زاویۂ تنگ و تار تھا
عین الیقین کا مرتبہ ملتا تو کس طرح — برخود غلط میں وہم و گماں کا شکار تھا

آنکھیں کھلیں جو بیچ سے پردہ سرک گیا — یعنی کہ چھنٹ گیا جو خودی کا غبار تھا
فانوس کی نفی شمعِ ازل کو نہ تاب ہے — وہ میں تھا نورِ حُسن کا جو پردہ دار تھا
نورِ جمال ہو گیا سینے میں جلوہ ریز — اب گل ہے میری آنکھ میں جو پہلے خار تھا
تحقیقِ حق کا گُر اسے اب جانتا ہوں میں — معراج سے جو پوچھتے تھے رن میں پارتھا[۱]
ثابت ہوا عدم مجھے رشکِ ہزار ہست — مٹنے سے میرے نورِ ہدیٰ آشکار تھا
دامِ ہوس اب اس کو سمجھتا ہوں سربسر — مرکوزِ دل جو طرّۂ مشکِ تتار تھا
میں مٹ گیا تو سرمۂ چشمِ دروں بنا — دل میں بھرا ہوا جو خودی کا غبار تھا
محبوب اور محب کہاں جب میں ہی تو نہیں — وہ دن گئے کہ کوئی کسی پہ نثار تھا

مستِ الست کہتے ہیں کیفیؔ کو اہلِ دل
اہلِ زمانہ سمجھے کہ اک بادہ خوار تھا

۱؎ پارتھا ارجن کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ جن سے گیتا میں کرشن جی نے اُسے خطاب کیا ہے۔

بھارت ماتا کی فریاد

(لاہور ۲۰ ستمبر ۱۹۳۲ء)

حال کے ہندو مسلم فساد سے متاثر ہو کر یہ نظم کہی گئی اور اخباروں کے رام نومی نمبر میں شائع ہوئی۔

(۱)

ان بن سے مر رہے ہیں ہندوستان والے
اپمان کر رہے ہیں آپس کا مان والے
بپتا سی بپتا آئی
ہے اب تری دُہائی تیر و کمان والے

(۲)

غم کی شکار ہوں میں گھر پر مصیبت آئی
باہر کی کیا کہوں میں گھر میں پڑی لڑائی
سُدھ لیجیے راگھورائی
ہے اب تری دُہائی تیر و کمان والے

اے رام جی تمھیں کیا حال اپنا میں سناؤں
مجھ پر جو آئی بپتا وہ کس طرح بتاؤں
جاں تک لبوں پہ آئی
ہے اب تری دُہائی تیر و کمان والے

(۴)

کتنے کے ہیں جو سارے دل اور جگر مرے ہیں
آنکھوں کے میری تارے چھوٹے ہیں یا بڑے ہیں
پھر کیوں یہ کج ادائی
ہے اب تری دُہائی تیر و کمان والے

(۵)

سمجھاؤں ہائے کیونکر　　اک ماں کے پوت ہو تم
ان کے تو ہیں پھرے سر　　ہوش و حواس ہیں گم
لڑتے ہیں بھائی بھائی
ہے اب تری دوہائی　　تیر و کمان والے

(۶)

اب رنگ ڈھنگ سارے　　ان کے بگڑ رہے ہیں
پیارے مرے دلارے　　آپس میں لڑ رہے ہیں
کر دُور یہ لڑائی
ہے اب تری دوہائی　　تیر و کمان والے

(۷)

یہ دُکھ - یہ غم - رنڈاپا　　چپ چاپ سہہ رہی تھی
بھولی تھی اپنا آپا　　پر ماما بڑی تھی
اس پر بھی ہو چڑھائی
ہے اب تری دوہائی　　تیر و کمان والے

(۸)

ہے ہے کن آنکھوں دیکھوں　　ہے جان کپکپاتی
کس دن کو جی رہی ہوں　　دیکھی نہیں ہے جاتی
بچوں کی یہ ڈھٹائی
ہے اب تری دوہائی　　تیر و کمان والے

(۹)

دم ہے لبوں پہ میرا　　اب آخری گھڑی ہے
ان میں ہے میرا تیرا　　اور جنگ آپڑی ہے
مت ان کی گرڈ بڑائی
ہے اب تری دوہائی　　تیر و کمان والے

(۱۰)

لاچار ہو گئی ہوں کیا آس اب مجھے ہو
بیزار ہو گئی ہوں خواہش یہی ہے مجھ کو
آجائے ان کی آئی
ہے اب تری دُہائی تیر و کمان والے

(۱۱)

تجھ کو نہیں سناؤں تو میں بتا کروں کیا؟
جا کر کسے بتاؤں چپ دیکھتی رہوں کیا؟
ہوتی ہے جگ ہسنائی
ہے اب تری دُہائی تیر و کمان والے

(۱۲)

بے موت مر رہی ہے بھارت کی دیکھ ماتا
بنتی یہ کر رہی ہے سیوری کے مان داتا
سدھ میری کیوں بھلائی
ہے اب تری دُہائی تیر و کمان والے

(۱۳)

وہ اک سپوت میرا ہے پریم جسکے من میں
سچا وہ بھگت تیرا اس دکھ سے ہے مرن میں
ہو اس کا تو سہائی
ہے اب تری دہائی تیر و کمان والے

(۱۴)

لے جان یا جلا دے ہوں میں ترے حوالے
اک تیر ہی لگا دے اے بجر بان والے
دُکھ سے تو ہو رہائی
ہے اب تری دہائی تیر و کمان والے

(۱۵)

بھارت کا حال خستہ   اور دکھ بھری بتھا ہے
کیفی کی دست بستہ   تجھ سے یہ التجا ہے

دکھیا کی ہو سنائی

ہے اب تری دہائی   تیر و کمان والے

(۱۶)

بھارت دکھی بہت ہے   اب رحم کی نظر ہو
میں کیا کہوں جو گت ہے   کرپا تری اگر ہو

پربت ہو پل میں رائی

ہے اب تری دہائی   تیر و کمان والے

لکھنؤ میں شاعری

(لکھنؤ ۲۵ر فروری ۱۹۳۳ء)

حضرت کیفی تذکرہ خمخانۂ جاوید سے متعلق دہلی میں تھے بعض شعراء کے حالات وغیرہ کی تکمیل اور فراہمی کی غرض سے اواخر فروری ۱۹۳۳ء میں لکھنؤ تشریف لے گئے ۲۶ر فروری کو وہاں جوبلی کالج میں سالانہ مشاعرہ ہوا۔ آپ کو صدارت کیلئے انتخاب کیا گیا منتظموں کی درخواست پر پہلے آپ نے اُردو زبان پر ایک پر مغز تقریر کی اور پھر یہ قطعہ مشاعرہ کی طرح میں پڑھا۔ مصرع طرح تھا "خندہ زن ساقی ہے ساری انجمن بیہوش ہے" حضرات صفی، آرزو، مرزا جعفر علیخان اثر۔ افسر میرٹھی۔ بیخود موہانی اور سراج وغیرہم لکھنؤ کے تمام استاد اور سربرآوردہ شعرا شریک مشاعرہ تھے۔ جناب عزیز بوجہ محمود آباد کے قیام کے تشریف نہ لاسکے ؎

کوئی کہتا تھا ہے اب سنسان گلزار سخن   بلبل شیوا زبان لکھنؤ خاموش ہے
کیا ہوئے شعر و سخن کے جلسے اور اُستاد فن   جن کا اب تک ملک کو احسان بار دوش ہے

مسکرا کر یہ کہا میں نے۔ تو ہے مسحور یاس
سن جواب اس کا یہ تیرا وہم حسرت کوش ہے

میر و مرزا۔ مصحفی۔ انشا کو تو کہہ دیگا تو
اس کو رہنے دیجئے یہ داستان دوش ہے

یاد ناسخ ذہن کب منسوخ کرسکتا ہے۔ کیا
شمع شعر آتش شعلہ زباں خاموش ہے

مست کر رکھا ہے گر سحر البیاں نے خلق کو
کیا نہیں شعر نسیم ایک ایک خم بردوش ہے

کیا تعشق نے نہ جذبہ عشق کا بھڑکا دیا
لکھنؤ کے دل میں اب تک جس کا از حد جوش ہے

بر ہدف تیر قضا کی طرح ہر شعر اسیر
جسکا اک اک مصرع گو با صد کماں بردوش ہے

ذکر شاہ دیں ہیں جو مرزا دبیر اور میر انیس
کہہ گئے اب تک سخن کے حق میں خلد گوش ہے

خدمتیں سرشار ادب کی اور شرر جو کر گئے
آج تک اردو زباں دونوں کی مدحت کوش ہے

تھے وحید عصر بیشک کیا امیر اور کیا جلال
ہے کلام ان کا کہ اک پیمانۂ سرجوش ہے

شعر ہے چکبست کا یا ہے اثر کا خمکدہ
جس میں اہل ذوق کو سامان نوشا نوش ہے

سرور ملک سخن جو لکھنؤ میں ہو گئے
نام کیا لوں ان کے تو خود سوچ گر ذی ہوش ہے

یہ نہ کہہ وہ ہو گئے۔ وہ ہو چکے اے سطح بیں
ان کے ہی دم سے تو اس بحر سخن میں جوش ہے

جو خدا کے خاص بندے ہیں نہیں ہوتے فنا
عالم فانی انہیں سے آب حیواں نوش ہے

ضد جو تاریخی کلنڈر کی ہے تو آ اور سن
حق نیوشی سے جو گوش ہوش ہم آغوش ہے

باکمالوں سے نہیں ہے اب بھی خالی لکھنؤ
گر نظر آئیں نہ تجھ کو تو یہ کس کا دوش ہے

یہ منزلت جو لکھنؤ میں ناسخ و آتش کی تھی
آج اس سے رتبۂ حضرت صفی ہمدوش ہے

آرزو کی نغز گفتاری زباں کی مقدرت
آجکل کی بات یا ذکر حدیث دوش ہے

حضرت ثاقب، اثر، اور وہ عزیز خوش کلام
جنکے اک اک لفظ سے جان سخن ہمدوش ہے

بھول بیٹھا کیوں سراج۔ آنند اور آشفتہ کو
حسن معنی جنکے ہر ہر لفظ میں روپوش ہے

محشر و عشرت۔ قدیر و منظر و حسرت کو دیکھ
مست جن کے لطف خوش گوئی سے ہر ذی ہوش ہے

یہ علمدار ادب ہیں شاعری کے ہیں امیں
مستفید ان سے ہو گر طبع افادت کوش ہے

بند کر اب یہ نوا مستانہ کیفی دیکھ تو
"خندہ زن ساقی ہے ساری انجمن بیہوش ہے"

تمغے کے کارنامے

(لاہور ۲۵ مئی ۱۹۳۳ء)

۲۰ مئی ۱۹۳۳ء کو لاہور کے ایک کالج کی کئی لڑکیاں ایک استانی کے ساتھ تفریح کو شالامار باغ میں گئیں۔ ایک لڑکی کے سر پر دو شہد کی مکھیاں آ بیٹھیں۔ ساتھ کی لڑکی نے یہ دیکھا اور انھیں رومال سے اڑانے لگی کہ اتنے میں مکھی ڈل کا ڈل ہی آ پڑا۔ جس نے سب لڑکیوں کو پریشان کر دیا۔ یہ چیخ چہاڑ سن کر چند لڑکے جو باغ کے دوسرے حصے میں پھر رہے تھے۔ لپک کر آئے اور ان بیچاریوں کو مکھیوں کے خونی حملے سے بچایا۔ ۲۵ مئی کے ٹریبیون اور ۲۴ مئی کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں اس حادثہ کی خبر نکلی ۔

فن کی کتب میں آپ نے دیکھا ہے مہرباں
تمغا بھی ایک مد اسی ذیل و قبیل کی
کہتے ہیں ایک بار جو مضمون بندھ گیا
مضمون ایک شعر میں شاعر جو باندھ جائے
مانا بلند اور ہو مضموں وہ بے بدل
میں سوچتا کہ اس میں کہاں ابتذال ہے
مضموں کا گو اسیر نہیں ہے مرا کلام
ہرگز وہ ادّعا نہیں آیا مجھے پسند
کہتا تھا جس کو کہتے ہیں تمغا وہ سخت گیر
قدرت نے رنگ گل کو جو خلد نظر دیا
آنکھوں کی دلفریبیاں جو ہیں غزال میں
وہ موتیوں کی آب سہانی چمک دمک
خوش قامتی جو سرو کی ضرب المثل ہوئی
کب تک کہاں تک ایسی نظیریں گنائے جائے

آیا **توارد** اور **سرقہ** کا جہاں بیاں
مرقوم ہے۔ وہ کیا ہے؟ بتاتا ہوں میں ابھی
اسکا اعادہ اپنے ہی شعروں میں ہے بُرا
بہتر ہے اور شعروں میں اُس کے وہ پھر نہ آئے
تکرار سے وہ کہتے ہیں ہوتا ہے مبتذل
اس میں تو سقم ہی ہے نہ نقص کمال ہے
موضوع و اقتضا کا مرے ہاں ہے التزام
ہے **شاعرِ حقیقی** تو نیچر پہ کاربند
فطرت میں ہم کو ملتی ہے اسکی بہت نظیر
وہ عارضوں میں بعض حسینوں کی جھر دیا
ملتی نہیں وہ کیا کسی صاحب جمال میں
ہے غنچۂ دہاں میں بھری بے گمان و شک
سرو رواں میں کیا نہ وہ قدرت نے ڈالدی
نیچر جو ہے وہ سامنے ہے کوئی کیا دکھائے

مذہب مرا یہی تھا مگر اب بدل گیا — تمغے کے بارہ میں جو شبہ تھا نکل گیا
ذاتی مشاہدے کی ہو خواہش اگر تمھیں — تو آؤ میرے ساتھ ذرا شالا مار میں

گلگشت میں ہیں دیکھو وہ چند اک سہیلیاں — معصومیت کی حسن کی ہیں وہ پہیلیاں
گل خار کھائیں دیکھیں جو چہرے کا آب و رنگ — وہ نور شمع حسن کہ جل جل مریں پتنگ
وہ کیا ہیں؟ کیا نہیں گی؟ یہ ان کو خبر نہیں — گل بوٹوں پر ہے۔ اپنے پر ان کی نظر نہیں
پھرتی ہیں ہنستی کھیلتی وہ سب اِدھر اُدھر — اس واقعہ کی ان کو نہیں ہے مگر خبر
گلشن میں ان سے آگیا اک گلشن رواں — معصوم ہیں دلوں میں یہ احساس ہو کہاں
آئیں نظر وہ جن کو ہوئے باغ باغ وہ — منظر تھا وجہ فرحت روح و دماغ وہ
تھا شاد اُن کو دیکھ کے ہر ایک خوش نہاد — بیٹی اسے تو آئی بہن اپنی اُس کو یاد

دنیا۔ یہ قول سچ ہے کہ مایا کا جال ہے — ہر جانور کا مختلف النساں سے حال ہے
رہتی ہے اصل کنہ پر انساں کی نظر — قیدی مگر فریب نظر کا ہے جانور
سرگرم سیر باغ دو مدھکھیاں بھی تھیں — گل رُخ میں اور گل میں نہ وہ فرق کرسکیں
گلبن کا۔ گل کا۔ ہو کے رُخ و قد پر احتمال — مایا کا روپ چل گیا ان مکھیوں پہ چال
تمغے کی کوئی اس کو کہے عشوہ بازیاں — یا حسن فطرتی کی کہے فتنہ سازیاں
اُن گلرخوں کو پھول ہی سمجھیں وہ پرہوس — آئیں لپک کے مکھیاں لینے کو پھول رس
سر پر وہ اک جمیلہ کے بیٹھی ہی تھیں ابھی — اُس کے جو ساتھ تھی نظر اس کی ادھر گئی
ہے آج کل تحفظ ذاتی کا جو مرض — اس سادہ دل کے ذہن پہ حاوی تھا الغرض
سمجھی کہ اس سہیلی کو وہ کاٹ کھائینگی — سر پر ہیں، پر ابھی رُخ و عارض پہ آئینگی
رہتی وہ چپ تو نام کو بھی فرخشانہ تھا — مدمکھیوں کے ڈنک کا خدشہ ذرا نہ تھا
جب دیکھتیں یہ گل ہے مگر اور قسم کا — چُپ چاپ لیتیں آپ ہی وہ اپنا راستا
لیکن جنوں تحفظ ذاتی کا تھا ادھر — رومال آئی جیب سے ساتھن نکال کر
رومال آکے سر پہ ہلایا کہ بھاگ جائیں — ایسا نہ ہو کہیں وہ سہیلی کو کاٹ کھائیں
پہنچی تھی کشمکش کی اگرچہ ابھی نہ حد — جھلّڑ کا جھلّڑ اُٹھا اُدھر سے پئے مدد

دیکھا کہ دو پہ ہم ہیں سے آفت کا ہے سماں
ان لڑکیوں پر آپڑیں وہ ساری مکھیاں
پھر سدھ انھیں نہ سر کی رہی اور نہ پیر کی
زن بھوم بن گئی وہ جگہ تھی جو سیر کی
معصوم بچیوں کو نہ سوجھا کہ کیا کریں
پھیلی ہوئی تھی چیخ پکار اُن کی باغ میں
بھاگیں مگر وہ بھاگ کے جائیں بھی تو کہاں
اُس دل سے وہ پناہ جو پائیں بھی تو کہاں
بیچاریوں پہ چھتے کا چھتا ہی آپڑا
تدبیر خاک سوجھتی تھا وقت ہی کڑا
ننھے نوجوان بھی کئی اس وقت باغ میں
یہ پُرخطر نظارا جو آیا نظر اُنھیں
آئے لپک کے بہر مدد رزمگاہ میں
بیچاریوں کو لے لیا اپنی پناہ میں
زخمی ہوئے ہیں وہ۔ ان کو بھی زہر آ کے کچھ چڑھا
لیکن نہ اس سے آگے کو وہ حادثہ بڑھا
دیکھو کرشمے ایسے فریب نظر کے ہیں
یہ عشوے مایاجال کے سحر و اثر کے ہیں

اس واقعے سے آپ کو ملتے ہیں کیا سبق
بتلا دوں ہو جو رغبتِ تحقیق امرِ حق
سُنئے کبھی فریب نظر کا نہ کھائیے
مایا میں رہ کے جال میں اس کے نہ آئیے
کُچھ حادثے ہیں ایسے۔ تامّل سے لو جو کام
فرضی تحفظات کے گر ہو نہ تم غلام
تو حادثے وہ جاتے ہیں بس اپنے آپ ٹل
عقدے کچھ اپنے آپ ہی ہوجانے کو ہیں حل
جب ہو مقابلہ تو اسے پہلے جانچ لیں
اپنے خلاف کتنے ہیں؟ کیا ان کی طاقتیں؟
ہے ایک بات اور بھی وہ گومگو کی ہے
کہنے میں ہچکچاتا ہوں صورت ہی ایسی ہے
جنسِ دوگانہ جبکہ خُدائے قدیر نے
کی خلق، تو غرض تھی رہیں میل جول سے
یہ دونوں۔ دونوں مصرعے ہیں قدرت کے شعر کے
مربوط ہو گئے ہیں جو مضمون وزن سے
ہم قافیہ نہیں نہوں، مضمون تو ہے چُست
اسلوب اور ادا میں نہیں ہے یہ شعر سُست
اب کوششیں ہیں فرد کو مطلع بنائیے
ممکن نہیں یہ۔ کس لئے پھر سر کھپائیے

زن۔ زن رہیگی دوستو اور مرد۔ مرد ہی
مطلع نہ ہوگا شعر رہے گا یہ فرد ہی

تُو چور

(لاہور۔ ۲۶ر جون ۱۹۳۳ء)

یہ نظم نئے اور نہایت دلکش انداز کی ہے۔ خواہ اسے معشوق کا سراپا کہئے خواہ عاشق کا رونا جھینکنا۔ اس میں کسرۂ اضافت نہیں ہے ؛

تُو چور۔ اور تجھے چوری کی اوّل[1] دن سے عادت ہے
چوری اس پر سینہ زوری۔ آفت پر یہ آفت ہے
یوں دیکھو تو کیسی نمانی۔ بھولی بھالی صُورت ہے
اور کرتُوت۔ کہے کیا کوئی۔ جو بولے تو شامت ہے
آج بھرا بیٹھا ہے بندہ۔ راز کو افشا کرتا ہے

خار اب تک گُل کے پہلو میں چُبھ چُبھ کر رہ جاتا ہے
وہ رنگ اسکا۔ باغ کے مُنہ کی جو لالی کہلاتا ہے
اک جھپکی میں اس کو تیرا چہرہ اُڑا لے جاتا ہے
جسکے غم میں گُل بیچارا خار ابھی تک کھاتا ہے
رنج یہ اسکے دل کی کلی کو کھِلنے دے۔ کب ممکن ہے

مُنہہ پر اس کے ٹھِرا تھا تالا دم تک بھی نہیں مارا تھا
پاس سگندھی کا تھا خزانہ۔ مشک اور عنبر سارا تھا
غنچہ دم سادھے تھا لیکن بد قسمت اور بیچارا تھا
زُلف نے تیری شبخوں مارا غنچہ اس میں ہارا تھا
پھاڑ کے دامن وہ شبنم سے روز یہ رونا روتا ہے

قُدرت نے جادو جو بھرا تھا مست غزالی آنکھوں میں
دیکھ کے جسکو حیرت چھائی تھی نرگس کی آنکھوں میں
تُو نے اُڑا لی چھب مستانی اسکی آنکھوں ہی آنکھوں میں
کھوج ملا جو ہرن کو اسکا تیری رسیلی آنکھوں میں
دیوانہ سا ہو کے وہ بن میں مارا مارا پھرتا ہے

دانت ترا اس پر ہے۔ اس کو رہتا اس کا سانسا تھا
بحر کی تہ میں جا کر موتی ماں کی بغل میں چھپتا تھا
آب اس کی دانتوں نے اڑا لی اب وہ کیا کر سکتا تھا
طنز سے تیرا خندۂ نمکیں اسکا دِل برماتا تھا
شورِ اختر ہونے پر اپنے پانی پانی ہوتا ہے

لعل نے اس چوری کے ڈر سے کہساروں کو بسایا تھا
رنگ کو اپنے لاکھ جتن سے سَو پردوں میں چھپایا تھا
اُس پہ وہاں بھی چور پڑینگے دھیان اسکا نہیں آیا تھا
تیرے لبوں نے لُوٹ لیا ہے اسکا جو سرمایا تھا
بے بس ہے چُپ ہے۔ چھاتی پر اب وہ پتھر رکھتا ہے

سیمتنی پر اپنی چنبیلی ناز نہ کیا کیا کرتی تھی
گیندا کیا چمپا تک اُس کے حسن کا کلمہ بھرتی تھی

---

[1] روزِ ازل سے

اول دن کی اُجلی فضا تک اس کی صفا پر مرتی تھی   اسکی صباحت گل تک کی آنکھوں میں خار گزرتی تھی
چھین لی سب وہ گات نے تیری زردی اسپر چھائی ہے

سُنبل نے اپنی خوبی کو ڈھانپے رکھا پردے میں   بھول بھلیاں پیچ و خم کی ڈالتی سب کو ضبطے میں
نفاوہ معمّا حل سے جس کے خلقت تھی الجھیڑے میں   کھلے خزانے گیسو تیرے لے اڑے اسکو لحظے میں
الجھن اب سنبل کو بھی ہے غلطاں پیچاں رہتا ہے

سرو نھا گویا میخ قدم۔ کہیں جاتا اور نہ آتا تھا   قامت پر تھا ناز اسے کیا کھچتا تنتا جاتا تھا
سنگ ہے نگیں اپنی جگہ پر۔ اس پہ یقیں وہ لاتا تھا   قد نے تیرے وہ بات اڑا لی جس پر وہ اترا تا تھا
دیکھ کے تجھ کو اب وہ زمیں میں شرم سے گڑ گڑ جاتا ہے

طوطی اپنی میٹھی بھرن سے سوتے دل کو جگائے کیا   سحر نوائی سے اسکی اب گلشن میں جان آئے کیا
بلبل بھی سنگیت کی پالی میں اس سے گھبرائے کیا   تیری صدا نے اس کو اڑایا اب وہ کس کو سنائے کیا
اس کے لب پر مُر لیدھر کی اب گلشن میں دُہائی ہے

بجلی اس دنیا کے سر پر کیا کیا دُند مچاتی تھی   اسکی چھل بل امبر اور پاتال کو بھی چمکاتی تھی
چاند اور سورج ڈر کر چھپتے جب وہ چمک کر آتی تھی   اب وہ چھل بل اس میں کہاں ہو جس پر وہ اتراتی تھی
تیرے تبسم نے ہتیا لی۔ اب وہ تڑپا کرتی ہے

آنکھوں سے تو نیند اڑا لے دل سے چین نکالے تو   چین تو کیا انداز و ادا سے دل کو صاف اڑا لے تو
خون ارمانوں امیدوں کا اک دم میں کروا لے تو   تو بادی چور۔ اور چوری سے گھر لاکھوں کے گھالے تو
تنگ ہے خلقت اب خالق سے تیرا شکوہ کرتی ہے

یارب یہ انصاف ہے کیسا؟ نیاؤ یہ کیسا تیرا ہے   سوئی کسی کی کوئی چرا لے تو وہ کچہری چڑھتا ہے
لیکن یہ سب کچھ جو چرا لے ساہ بنا وہ رہتا ہے   یہ تو یہ جو دل بھی چرا لے اسکو نہیں کچھ خدشا ہے
دُنیا کا درگاہ میں تیری اے داور! دعویٰ ہے یہی

تو ڈاکو

(لاہور - ۱۲ ستمبر ۱۹۳۳ء)

یہ "تو چور" کا ایک قسم کا جواب ہے اس میں کسرۂ اضافت نہیں آیا ؛

تو ڈاکو۔ ڈاکو بھی ایسا جس سے ٹھگ بھی مانگے پناہ — جسکے آگے بھولے پنڈارا لوٹ مار اور قتل کی راہ
کوئی چھل سے کوئی بل سے لوگوں کو کرتا ہے تباہ — تن من کا سکھ لوٹ لے تو پڑ جائے جو تیری ایک نگاہ
چور کہا تھا مجھ کو۔ سن لے اب اپنی تعریفیں تو

مارے اور نہ رونے دے تو ایسا ظالم کٹّر ہے — تو ہے کٹھور ترا من پاپی۔ دوزخ تیرے اندر ہے
اپنا دل کہتا ہے جس کو وہ اسپات ہے پتّھر ہے — کوئی کرے کیا اس کو چپا کر گن ہے نہ اس میں جوہر ہے
تو وہ دل لوٹا کرتا ہے جو معصوم نمانا ہے

ہیں خفتنی تیری وہ ساری ٹھگ بدیا کی باتیں ہیں — باتوں اور اشاروں میں بھی خودغرضی کی گھاتیں ہیں
کٹتے جنکے رو کر دن اور تڑپ تڑپ کر راتیں ہیں — دل کے داغ اور چاک جگر کے جن کو تیری سوغاتیں ہیں
جانے وہی تیری ٹھکرائی پالا جس کو تجھ سے پڑا

دور ہی رہنا تجھ سے اچھا ملنے میں تو گھاٹا ہے — سانپ ہے تو۔ انگلی جو دکھائی۔ پونچا پکڑا۔ کاٹا ہے
کہتے ہیں افلاس جو آئے تو پھر گیلا آٹا ہے — سوکھ کے ہو جائے کوئی کانٹا تو تاتے کاٹا تا ہے
کام سے کام اپنے ہے تجھ کو۔ کوئی جئے یا کوئی مرے

اپنے مزے سے کام ہے تجھ کو کوئی جئے یا کوئی مرے — جینے جی کی قید ہے اس کو بھول کے تیرا دم جو بھرے
خود پہ بھی پاپی من تیرا شک اور شبہ کرے ہی کرے — دے جو خدا توفیق تو انساں دور رہے اور تجھ سے ڈرے
سیدھے رستے سے بھٹکا دے ایسا بڑا بٹ مار ہے تو

اپنے کو سمجھا ہے تو نے دنیا بھر کا دانا ہے — تجھ سے زیادہ جو سیانا ہو اصل میں وہ دیوانا ہے
کیا مظلوم بنا بیٹھا ہے جانے سخت نمانا ہے — کیوں مانگا تھا مجھ کو خدا سے جو منظور نبھانا ہے
مونس کی تھی چاہ تجھے یا لونڈی اور کنیزک کی

ڈاکو بھی بہروپیا بھی ہے اور غضب کا میٹھا ٹھگ — عیّاری میں پہنچے تو شیطان ہی پہنچے گا الگ بھگ
جس کو جان ایمان ہو پیارا تجھ سے رہے لازم ہے الگ — خون ہیں تیرے مکر و دغا ہے۔ کاٹنے کے قابل رگ رگ
تجھ سے وفا کی آس جو رکھے وہ کیوں پھر مایوس نہ ہو

بھنگی بلّی بن کر پہلے سوانگ نہ کیا کیا لاتا ہے — رحم آجائے تجھ پر جسکو دونوں جہاں سے جاتا ہے
کھاکے ترس شربت جو پلادے زہر اسے کھلواتا ہے — شامت آجاتی ہے اُسکی جو تیرے جال میں آتا ہے

جان ہی لے کر چھوڑے تو، وہ ظالم، ایسا ڈاکو ہے

تو اور عشق، ایثار اور عاشق، اِنمیں نہیں ہے ربط کہیں — تو سمجھا ہے تیری ہی خاطر خلق کئے ہیں چرخ و زمیں
حُور ہے تیری، غلماں تیرے۔ تیرا ہی ہے خلد بریں — کوثر اور تسنیم بھی تیرے۔ تجھ سے کوئی شے دُور نہیں

یہ سب ہو میری خوشی سے۔ مجھ کو تو ہے اجیرن تو

جس نے تجھ کو دل کا چین اور سمجھا دھرم اور ایماں بھی — دل سے کہا سرتاج تجھے اور سمجھا تجھ کو نگہباں بھی
اور قدم پر تیرے نچھاور کر دئے تن، من اور جاں بھی — جسکا دل بھی صاف رہا اور پاک رہا ہے داماں بھی

تو نے اسی سے کی ہے دغا۔ اور جان گھلائی ہے اسکی

تو ہر دیگی چمچہ ہے اور اپنے مزے سے کام تجھے — کام سے اپنے کام تجھے، کیوں اور کسی کی فکر کرے
تجھ کو غرض پیزار سے تیری کوئی مرے یا کوئی جیئے — لیکن تجھ کو ہوسناکی کا۔ نفس پرستی کے بندے

تو نے نباہی ہے کس سے جو تجھ سے رکھے آس کوئی

پاس محبت اور وفا کا تجھ سے کوسوں دُور رہا — ایک کا ہو کر کب یارہ سکتا۔ تو دس کا بھی تو نہ بنا
تجھ کو کبھی یہ یاد نہ آیا مجھ سے ہے روشن گھر کا دیا — تو نے دیا بھی بھول کے جو کچھ وہ اپنی عزت کو دیا

بے غرضی سے کام کوئی تیرا نہ بری ہے اور نہ ہو

میرے لئے تو فقہ ہے تیرا۔ شرع کا سخت شکنجہ ہے — میرے لئے ہی ہے جو خدا کا احد نبی کا کوڑا ہے
میرے لئے ہی ساری سمرتی شاستروں کا فتوائے ہے — قید و بند نہیں کچھ تجھ پر۔ تو تو سانڈھ خدا کا ہے

کڑوا کڑوا تھو تھو تجھ کو میٹھا میٹھا ہپ ہپ ہے

نفس کا حظ الفت کو سمجھنے والے۔ یہ کوئی اُلفت ہے — کر کے وفا کا خون تو خود اوروں سے وفا کی چاہت ہے
ظالم خود ہے معصوموں پر ظلم و ستم کی تہمت ہے — محکمہ وہ اللہ میاں کا جس کا نام قیامت ہے

یاد رکھ اُس دن کو اے ظالم۔ بوجھ گناہوں کا نہ بڑھا

جانوروں، بیجانوں سے چوری کا اُٹھایا تھا طوفاں — سمجھا تھا تو ریجھ پڑیگا کوئی نویسں کے بیاں
اب اپنی تعریفیں سُن کر کیا کہنا ہے؟ اے ناداں! — تیری ڈکیتی اور ٹھگی کا رونا جاکر روؤں کہاں

تنگ ہے خلق، اب اپنے خدا سے، تیری شکایت کرتی ہے

اسکے ڈاکے اور ستم سہنے کی اب تو تاب نہیں — یا یہ کوتک اسکے نہیں یا خورشید اور مہتاب نہیں

اے خالقِ عادل سے بڑھکر کوئی تیرا القاب نہیں رحم اور عدل تیرا دُنیا میں نایاب اور کمیاب نہیں
عدل ہو میرے ساتھ بھی مالک تُو تو سب کا داتا ہے

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی وفات پر

(ماڈل ٹاؤن ۱۱ مئی ۱۹۳۶ء)

ہوتے ہیں قوم کے سرتاج پرستارِ وطن ہوں جو خدّامِ وطن۔ ہیں وہی سردارِ وطن
قوم کی جان ہُوا کرتے ہیں انصارِ وطن محسن خلقِ خُدا ہوتے ہیں احرارِ وطن
تھی وہ توفیقِ عمل ڈاکٹر انصاری میں
پھونک دی جان نئی جس نے وطن داری میں

غمِ ابنائے وطن روح کا سوہاں نکلا جان کے ساتھ ہی جو دل میں تھا ارماں نکلا
دل کے دکھ کا مرضِ قلب ہی درماں نکلا دردِ دل راحتِ جاوید کا ساماں نکلا
زندہ تھا تو وطنِ پاک پہ مرنے کے لیئے
جان تھی تجھ میں۔ فدا قوم پہ کرنے کے لیئے

مرگِ اجمل پہ یہ کلمہ تھا زباں پر جاری[1] "شیر دل جتنے ہیں ہو جاتے ہیں اس سے عاری
خدمتِ ملک کا ہے بوجھ بہت ہی بھاری کِس سے اُٹھتا ہے۔ اٹھائیں بس اسے انصاری"
جانگزا حد سے سوا اک تو ہے تیرا ماتم
کون لے تیری جگہ تیرے وطن کو ہے یہ غم

ہو قتیلِ غمِ ابنائے وطن دل۔ قاتل کیسے اُمّید تھی بن جائے گا بسمل قاتل
اُسکا ہو جائے گا یہ مُضغۂ عاطل۔ قاتل بن سکے جسکے نہ وہ طوق سلاسل قاتل
اپنی تقدیر۔ قصور اسمیں نہیں کچھ دِل کا
سوز اخوانِ وطن اسکو پھنکا رکھتا تھا

وطنیّت تھی فدا اُس پہ وطن پر وہ فدا حرّیت پر وہ فدا حرّیت اس کی شیدا

---

[1] اگلے تین مصرعے مصنف نے اپنے اس نوحہ سے لئے ہیں۔ جو مسیح الملک حکیم اجمل خان کی وفات پر لکھا تھا

جلد آزاد وطن ہو یہی اک ارماں تھا — تھا یہی دین۔ یہی مذہب۔ یہی مسلک اس کا

جان تھی قوم کی تحریک میں اسکے دم سے
جذبۂ حسن عمل۔ عزم فلک توام سے

گرچہ تھا احمد مختار کا وہ دل سے غلام — حق پسندوں کو مگر اس میں نہیں جائے کلام
ایک تھے مسلم و ہندو اسے گو تھے دو نام — اسکا تمیز ملل سے کہیں اونچا تھا مقام

باغ میں اسکے نہ تھا سبزۂ بیگانہ کہیں
ایک خالق کی تھی مخلوق اسے ہر ملت و دیں

جس میں تھے جوہر ملکوت وہ انساں نہ رہا — دیس پر اپنے جو تھا جان سے قرباں نہ رہا
دردمندوں کے جو تھا درد کا درماں نہ رہا — وہ سلیمان وطن۔ عیسئے دوراں نہ رہا

ہے سیہ پوش وطن آج اسی ماتم میں
مادر ہند بلکتی ہے اسی کے غم میں

کمان والے

(ماڈل ٹاؤن ار اکتوبر ۱۹۳۶ء)

کرتے ہیں یاد تجھ کو ہندوستان والے — سرتاج آریوں کے۔ اے ست کا مان والے
اُن آریوں کو تو نے تھا آریہ بنایا — کر آج آریوں کو اے دھرم گیان والے
وہ ذات پات کا ہے طوفان ہم میں برپا — ہنستے ہیں ہم کو سارے دنیا جہان والے
مرجاد وید کی تھی دھرم اور گن پہ مبنی — سب بھول بیٹھے اسکو اشنان دھیان والے
اپنے کو نیچ کہنا تحقیر خود ہے اپنی — اُنہاں کس کا کرتے مان اور گمان والے
نفرت بُری بلا ہے۔ یہ اونچ نیچ کیا ہے — جا پہنچیں بلندی اپنی اونچے سنگھان والے
پیشہ کو نیچ کہنا ہے نیچ اپنی بدھی — اپنا تو امتحاں ہیں وہ امتحان والے
عقلیں سدھار سب کی اور دے سبق عمل کا — عامل نہیں یقیں پر وہم و گمان والے
سنسار کی ہمیشہ امداد تو نے کی ہے — دل سخت ہم سے کیوں ہے اے جگ پران والے
چکر میں دہر آئے۔ ہاں وہ گھما سدرشن — کر انقلاب ایسا چونکیں جہان والے

ہو تیرا اگر اشارا سب کام ہو ہمارا
بن جائیں دیش بند ہو سب جھوٹی آن والے

سیوڑ ہی کے مُکت داتا سنسار کے بدھاتا
ہم بھی ہیں داس تیرے اور خاندان والے

تیرِ نظر تمہارے۔ ابرو کے وہ اشارے
کیفیؔ کے دلنشیں ہیں۔ تیر و کمان والے

یادیں

(۲۰ رجنوری ۱۹۳۷ء۔ ماڈل ٹاؤن)

ہے رسم خط جو غلط ہوں بنائے جاتے ہیں
درست نقش جو ہیں کیوں مٹائے جاتے ہیں

جو نَو فروغ تھے ہونے کو شمع بزم عمل
وہ شام ہی سے دئے کیوں بجھائے جاتے ہیں

جوان کو ہونا ہے کھلنے کے ساتھ پژمردہ
تو غنچے باغ میں پھر کیوں کھلائے جاتے ہیں

جو فرط ضعف سے اُٹھ سکتے تھے نہ بستر سے
وہ سوئے خلد قدم اب بڑھائے جاتے ہیں

ستم ظریفیاں غیب و حضور کی دیکھو
وہ چھپ کے آنکھ سے دل میں سمائے جاتے ہیں

یہ کون کس سے کہے ان کو کس پہ چھوڑا ہے
غم فراق میں جو بلبلائے جاتے ہیں

وہ "امر ربّی ہے" "لافانی ہے" یہ مان لیا
یہ داغ مسلکوں سے کب مٹائے جاتے ہیں

حیات و موت کا ہے فلسفہ ہمیں معلوم
خواص قلب کے کس سے گنوائے جاتے ہیں

دل و جگر ہیں بالا عمل سے فطرت کے
جبھی تو لخت دل اشکوں میں پائے جاتے ہیں

ہو جن دلوں میں محبت تمام خلقت کی
وہ ایسے حال میں پتھر بنائے جاتے ہیں

عمل سے کیفر کردار کے ہیں ناواقف
جو آسمان کسی کو بنائے جاتے ہیں

جگر کے دل کیلئے راہ چشم کیا تھی تنگ
یہ قتلے حلق تلک کیسے آئے جاتے ہیں

کسے ہے حشر سے اِنکار، کیا قیامت ہے
سمے جو روز جزا کے دِکھائے جاتے ہیں

غم وطن تھا مگر کم شرر فشانی کو
پھنکے ہوئے ہیں جو دل کیوں جلائے جاتے ہیں

جو آپ ہی غم اہل جہاں میں ہے صد چاک
اسی جگر پہ یہ آرے چلائے جاتے ہیں

ربوبیت کی ہی اک شان یہ بھی کیا کہیے
کسی کو دُکھ نہیں جن سے ستائے جاتے ہیں

بنایا تھا سو بگاڑا۔ یہ حکم اب ہے سنبھال
یہ چوٹ دے کے ٹھوکے لگائے جاتے ہیں

یہ سچ ہے جلوہ بھی تیرا حجاب بھی تیرا
یہی کرشمے تو جی کو جلائے جاتے ہیں

مجال کس کی ہے پوچھے۔ بگاڑنا ہے اگر
تو پھر یہ کس لئے ساماں بنائے جاتے ہیں

یہ رحم خاص ہے کھا کر اسے تمام کریں
یہ غم وہ ہیں کہیں انساں سے کھائے جاتے ہیں

جسے مٹایا ہے یاد اسکی بھی مٹا دل سے
الٰہی توبہ! گلے لب تک آئے جاتے ہیں

یہ غم دیا تو اُٹھانے کی اسکے طاقت دے
یہ بوجھ بے مدد غیب اٹھائے جاتے ہیں

نہ سہل دوست نہ کم دل ہیں آپ اگر کیفی
تو روکے یاروں کو پھر کیوں رُلائے جاتے ہیں

دِل کی حالت

(ماڈل ٹاؤن ۳ر مئی ۱۹۳۷ء)

کچھ دن سے طبیعت مُردہ ہے اور جی میں کڑھن سی رہتی ہے
سینہ میں چبھن سی رہتی ہے آنکھوں میں جلن سی رہتی ہے

جو شغل مرے معمولی تھے جی ان سے بہت اُکتاتا ہے
خالی بیٹھے رہنا بھی اُتنا ہی مجھ کو ستاتا ہے

صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں دل کو آگ لگاتی ہیں
رات کی خواب آغوش فضائیں جی میں شور مچاتی ہیں

تارے گن کر ختم ہوئے یا تکتے تکتے چاند ہوئے
داغ بھڑکتے تھے جو دل میں وہ نہ کسی ڈھب ماند ہوئے

دن ہیں وُہی اور راتیں ہیں وہ ہی۔ صبح وہی اور شام وُہی
میں ہوں وہی اور دِل بھی وہی ہے یاد وُہی اور نام وُہی

دنیا وُہ ہے یہ بھی دانا کوئی جو ایسا بے چین رہوں
جیسے جی کا مَرن ہے یہ تو۔ کیونکر یوں دن رین رہوں

ترانۂ وطن

(ماڈل ٹاؤن ۳ رمئی ۱۹۳۷ء)

راحت کہاں نصیب تھی جو اب کہیں نہیں — وہ آسماں نہیں ہے کہ اب وہ زمیں نہیں
ہو جوش صدق دل میں تو راحت بغل میں ہے — قائم پھر آسمان رہے یا زمیں نہیں
حُبِّ وطن کو ہمت مردانہ چاہئے — درکار آہ سینۂ اندوہگیں نہیں
خونِ دل و جگر سے اسے سینچ اے عزیز — کشت وطن ہے یہ کوئی کشتِ جویں نہیں
حق گوئی کی صدا تھی نہ رُکنی نہ رُک سکی — کب دار کی سنائیں گلوں میں چبھیں نہیں
داغ غم وطن ہے نشان عزیز خلق — دل پر نہ جس کا نقش ہو یہ وہ نگیں نہیں
جنگِ وطن میں صدق کے ہتھیار کا ہے کام — درکار اس میں اسلحۂ آتشیں نہیں
گھر بار تیرا، پر تو کسی چیز کو نہ چھیڑ — یہ بات تو حریفوں کی کچھ دلنشیں نہیں
جس بات پر عزیز اڑے ہیں اڑے رہیں — کہنے دیں ان کو اونچے گلے سے نہیں نہیں
کیا جانے دل جگر کو مرے جو یہ کہہ گیا — دامن بھی تار تار نہیں آستیں نہیں
معبود ہے وطن ہوں پرستار اسی کا میں — دَیر و حرم میں جو جھکے یہ وہ جبیں نہیں

کیفی اسی سے حریت ہند میں ہے دیر
حُبِّ وطن کا جوش کہیں ہے کہیں نہیں

نوحۂ منصور

(ماڈل ٹاؤن ۱۰ رمئی ۱۹۳۷ء)

رسالہ ادبی دنیا (لاہور) کے قابل ایڈیٹر کی بیوقت وفات پر

داغ سینہ میں کہ دل میں کوئی ناسور نہیں — پھر یہ کیا سنتا ہوں افسوس کہ منصور نہیں
کون منصور خلوص اور محبت کی شبیہ — ایسے اوصاف تو اس دور کا دستور نہیں
کون منصورِ وہ دنیائے ادب کا خورشید — اب صحافت کی فضا دھندلی ہے پر نور نہیں
پیکرِ نیکی و اخلاق تھا منصور احمد — کونسا دل ہے کہ اس صدمہ سے جو چور نہیں

پدرِ پیر کی حالت نہیں دیکھی جاتی | دِن قیامت کا مگر آج سے کچھ دُور نہیں
وہ مرض لگ گیا جو جان کو لے کر ہی گیا | ورنہ کس دکھ کی دوا علم میں مذکور نہیں
تھا جو ممکن وہ کیا اس کے بچانے کے لئے | موت کو روکے کسی کا بھی یہ مقدور نہیں
بدلی گو آب و ہوا۔ ہائے نہ بدلی قسمت | کہہ سکے کون اب انسان کو مجبور نہیں

کیفیؔ غمزدہ کا ساتھ دیا اور ایسا
بھائی[۱] الفت کا تو کچھ خوب یہ دستور نہیں

شاعر کی تمنّا

(لائل پور ۲ر جون ۱۹۳۷ء)

بزم میں آئے ہیں آج اک بات کہہ جانے کو ہم | ایک گُر بھولا ہُوا ہیں پھر سے بتلانے کو ہم
یہ نہ سمجھے کوئی۔ ہیں جذبات بھڑکانے کو ہم | وہ نہیں جو یاس کے لے بیٹھیں افسانے کو ہم

ہم نہیں وہ جن کی امّیدوں کا مرقد دل میں ہے
ہم کو حاصل منفعت ہر سعیٔ لاحاصل میں ہے

السلام اے نکتہ سنج۔ اے شاعرِ شیوا بیاں | ایکہ نغموں سے ترے معمور ہے سارا جہاں
اے تخیل کے دھنی۔ اے والئے علم و زباں | آج کرنی ہیں تری خدمت میں کچھ گستاخیاں

ہم تمنّا پر تری اک تبصرہ کرنے کو ہیں
آج تیری آرزو کا تجزیہ کرنے کو ہیں

سب سے پہلے تو یہی ہے ایک تیرے دل کی چاہ | مشعرے میں شعر پر تیرے ہو شور واہ واہ
سب کہیں مضمون نیا۔ اسلوب کی دلکش ہے راہ | درد ہو تو اس قدر۔ ہو سامعیں کے لب پر آہ

تیرا ایک ایک لفظ بیٹھے دل میں اہلِ بزم کے
تذکرے ہوں بزم کے یا معرکے ہوں رزم کے

پھر یہی ہے۔ نا۔ تمنّا تیری اے معجز رقم | ہو رسالوں پر ترا اور تجھ پہ ہو ان کا کرم
اور پھر یہ چاہتا ہے تو، مرے اہلِ قلم | صاحبِ دیوان بھی ہو جائیں کہیں جلدی سے ہم

---

[۱] مرحوم کے والد کی طرف خطاب ہے۔

جب تلک پڑیوں میں بندہ جاتا نہیں تیرا کلام
تو سمجھتا ہے کہ ہے محروم البقائے دوام

داعیہ تیرا بلند۔ اونچا ہے تیرا حوصلہ — یہ تمنا ہے ترے دل میں یہی ہے ولولہ
ہر کہیں دنیا میں ہو تیرے سخن کا غلغلہ — مات چورن والے کی بانی ہو جس سے برملا
تجھ سے سنا کے ستاروں کی بھی شہرت ماند ہو
چرخ پر تشہیر کے تو چودھویں کا چاند ہو

تجھ کو اٹھتی ہے تصوّف کی ٹھرک بھی گاہ گاہ — اولیاء اللہ کا بن بیٹھتا ہے خضرِ راہ
جو سنا ہے یا پڑھا۔ کرتا ہے خوب اس کا نباہ — تو خدائی اور خودی دونوں کو کرتا ہے تباہ
مادّیت کی ترے پیروں میں گو زنجیر ہے
پر سخن دیکھو تو قرآں وید کی تفسیر ہے

حُسن جس کا راگ تو گاتا رہا شام و سحر — عشق گھائل جس سے تو کہتا ہے دِل ہی اور جگر
ہجر جس نے کر دیا ہے تجھ کو مُردہ سے بتر — وصل جسکے پیچھے سرگرداں رہا تو عمر بھر
اصلیت ان کی ہے جو کچھ سب ہمیں معلوم ہے
تو نہیں مجنوں۔ جنونی عاجلے معصوم ہے

تو غلو سے کام لے اے دوست یا مطلق نہ لے — راہ پر تو واقعیت کی۔ کہ فطرت پر چلے
گائے یا دکھلائے تو کتھک کے فن کے چونچلے — یہ جو کچھ بھی ہیں۔ فقط ہیں ابتدائی مرحلے
ابتدا ناقص ہے تیری انتہا بھی نادرست
مبتدا بے ربط ہو تو ہو خبر کس طرح چست

وہ تمنا کیا ہے۔ جو ہو فرض سے ناآشنا — برق رفتاری وہ کیا جب بوجھ کندھے سے گرا
نغمہ وہ کیسا ہے۔ بادی سر ہو جسکا بے پتا — کیا وہ نقاشی ہے جب ہو کارٹون اسپر فدا
تو ہی کہہ وہ کیفیت جو تجھ پہ وارد ہی نہیں
کیا سروکار اسکی عکاسی سے تجھ کو۔ نکتہ بیں!

یہ ترے افعال اور تیری تمنائیں فضول — تجھ کو ٹھہرا کر رہیں اس جون میں اپریل فول
ایک ہی چھینٹے میں بہہ جائینگے یہ کاغذ کے پھول — کام کی اک بات بتلاتے ہیں۔ سن اس کو نہ بھول
تجھ کو حاصل ہے وہ فن جس میں ہے جادو کا

چھوڑ وہ وہمی تمنا آ ادھر کچھ کام کر

تجھ کو تو تخئیل عالی پر بہت کچھ ناز ہے　　سر ستی کا در ترے منہ پر ہمیشہ باز ہے
جذب اور تاثیر سے بھی تجھ کو سوز و ساز ہے　　چھیننے میں دل کے تیرا کلک سحر انداز ہے

اُٹھ یہ میدانِ عمل ہے دوست تیرے سامنے
قوتوں سے اپنی خدمت میں وطن کی کام لے

حرّیت قطعاً سیاسی اور مُلکی ہی نہیں　　حرُّیت دنیاوی آزادی و دینی ہی نہیں
حرّیت ایمان کی اور اعتقادی ہی نہیں　　حرُّیت خود اختیاری اقتصادی ہی نہیں

حرُّیت تخئیل کی بھی اِک حقیقی چیز ہے
اس کو حاصل کر اگر تجھ کو ذرا تمئیز ہے

یہ تمنا جب ترے سینے میں گھر کر جائے گی　　جو تشخص کی تجھے حسرت ہے وہ مر جائے گی
کل فضا اپنے وطن کی امن سے بھر جائیگی　　جو بُری ساعت وطن پر ہے مفر ہو جائے گی

کاش یہ دُھن ہو تجھے۔ یہ ہی تمنا دل میں ہو
جوشِ اخوت اور حُبِ دیس کی محفل میں ہو

سچ تو یہ ہے سچے شاعر کی تمنا ہے یہی　　کردے کوثر سے جو مستغنی وہ صہبا ہے یہی
جس سے روشن ہو جہاں وہ طورِ سینا ہے یہی　　مست کردے انس و جاں کو وہ ترانہ ہے یہی

اُٹھ ہلا وے تو عزیزوں کے دلِ بے جوش کو
صورِ اسرافیل کر دے بربطِ خاموش کو

دہلی کی بزم ادب کی جوبلی

(ماڈل ٹاؤن ۱۰ر دسمبر ۱۹۳۶ء)

پچیس برس ہوئے۔ دہلی میں پنڈت امرناتھ صاحب مدن ساحر دہلوی نے ایک انجمن قائم کی۔ جسکا نام **بزم ادب** ہے۔ جو اب تک قائم ہے اور برابر ادبی خدمت انجام دے رہی ہے اس کی نقرئی جوبلی کا مشاعرہ بڑے اہتمام سے ۳۰، ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو دہلی میں ہوا۔ طرح کا مصرع تھا۔ اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے۔ حضرت کیفی اپنے صاحبزادہ کی علالت کی

وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ اور اُردو، فارسی طرحی غزلوں کے ساتھ یہ قطعہ مناسب موقعہ بھی بھیجدیا ؛

قطعہ

جلسے تو بہت شعر و سخن کے ہوئے ہونگے — یہ بزم مگر ان سے فضیلت میں سوا ہے
اس بزم کی وہ شان ہے۔ وہ اسکی افادت — جس کے لئے ہر اہل ادب مدح سرا ہے
وہ بزم ادب شہرہ ہے کل ملک میں جسکا — اجلاس اُسی بزم کی یہ جوبلی کا ہے
سحر ادب حضرتِ ساحرؔ کا کرشمہ — پچیس برس سے یہاں اعجاز نما ہے
اس پیر کی دیکھو تو جواں حوصلگی کو — کیا شعر کو انداز شباب اُسنے دیا ہے
یہ درس عمل کا ہے جوانان وطن کو — اک سیف نبرد ان کو یہ پیری کا عصا ہے
خدمت میں ادب کی یہ لگاتار توغل — ہم نے تو کہیں اور نہ دیکھا نہ سنا ہے
میں ہی نہیں۔ دِلّی نہیں کل ہند ہے مداح — وہ شعر پر احساں مرے ساحرؔ نے کیا ہے
یہ بزمِ ادب حریت شعر کا مرکز — ہمت سے تری حلقۂ ارباب صفا ہے
وہ رنگ مجاز اہل سخن پر جو چڑھا تھا — وہ رنگ حقیقت میں بدل تو نے دیا ہے
اے پیر جواں بخت وہ ہے پیرِ مغاں تُو — زاہد تری اک نگہ سے رندوں میں ملا ہے
مشاطۂ نظم اے سخن آرا تجھے کہئے — دم سے ترے چہرے پہ سخن کے وہ جلا ہے
کیفیؔ ہی نہیں روح اسکی ہے اس بزم میں حاضر — یہ وصل کا اور فصل کا انداز نیا ہے

ہو جوبلی الماسی ترے ہاتھ سے اس کی
کیفیؔ کی خلوص اور تہ دل سے یہ دعا ہے

سپاہی مرتے دم بھی سپاہی ہے

(ماڈل ٹاؤن ۳۰ اگست ۱۹۳۵ء)

قدیم انگلینڈ کے لوگوں کی حالت — یہ بتلاتی ہے تاریخی روایت
کہ تھے کم ان میں تہذیب و تمدن — مگر وہ سُور بیر اور تھے بہادر
نہ تھا چرچا مہذب زندگی کا — مگر وصف ان میں تھا مردانگی کا

جری، جیوٹ تھے وہ اور جنگجو تھے — وہ اپنے ہمسروں میں سرخرو تھے
قوی ہیکل تھے وہ اور تھے جوانمرد — تھے بے جگری سے لڑنے مرنے میں فرد
یہ تاریخی کتابوں کا بیاں ہے — یہ سچی واقعاتی داستاں ہے
صدی تھی گیارھویں جب کی ہے یہ بات — گواہ اس کی ہیں تاریخ اور روایات
کہ تھا اک شخص، سیجورڈ اور لقب تھا — ڈیوک آف نارتھمبر لینڈ، جس کا
دلاور تھا بہت وہ اور بہادر — تھا مشہور اس کا ملکوں میں تہوّر
وہ تھا جنگ آزمودہ اور وغاکار — تھا انگریزوں میں اک نامی سپہدار
تھے مشہور اُس کے جنگی کارنامے — شجاعت اور جرأت کے فسانے
مگر عاجز ہیں آگے موت کے سب — کسی کا وار اس پر چل سکا کب
سپہ نے موت کی جب اس کو گھیرا — تو ڈالا آکے بیماری نے ڈیرا
پڑا پیچش کا ایسا پیچ اس پر — کہ جس سے ہو نہیں سکتا تھا جانبر
دوا اُس کو نہ آتی تھی کوئی راس — غرض جاتی رہی جینے کی جب آس
جو دیکھا یہ مرض ہے جان لیوا — نہیں اب زندگی کا کچھ بھروسا
لگی جب جان گھُل گھُل کر نکلنے — نہ پائے زندہ رہنے کے قرینے
بہادر تھا، وہ تڑپا اور مچلا — کہا: "ہے شرم اس صورت سے مرنا
ہے کیسا ظلم، کتنی شرم کی بات — پڑا مر جاؤں یوں۔ ہیہات ہیہات!
جو تلواروں کی بجلی سے بچا ہو — نشانہ اس طرح وہ موت کا ہو
میں کر سکتا نہیں گو موت سے جنگ — مگر اس طرح مرنا بھی تو ہے ننگ"
عزیزوں سے کہا "تم ہو جو غمخوار — تو لاؤ جنگ کے سب میرے ہتھیار"
جو شمشیر و سپر پاس اس کے آئی — تو اک روحانی اسکے منہ پہ چھائی
زرہ، خود اور چار آئینہ سج کر — کسا پھر پر تلا۔ پیٹی کمر پر
لگایا اس میں تیغہ اور تبر بھی — سرھانے اپنے رکھوا لی سپر بھی
اِدھر گرز اور اُدھر رکھا تھا بھالا — یہ سب کچھ دیکھ کر وہ مسکرایا
کہا: "لو اب ہوں میں مرنے کو تیار — نہیں اب ہارنے میں موت سے عار

SIGEWARD THE GREAT DUKE OF NORTHUMBERLAND ۵۱

نہیں ممکن جو مرنا رن میں لڑ کر — ہے ممکن جان دینا اس طرح پر
سپاہی جو نہ رن میں دے سکے جان — مسلّح جان دے یہ اسکی ہے آن
نہ چھوٹے مرد سے جنگ آزمائی
سپاہی مرتے دم بھی ہے سپاہی

یکدلی کے کرشمے

(ماڈل ٹاؤن - ۴ر جنوری ۱۹۳۵ء)

لاہور کے روزانہ اخبار ٹربیون کی ۱۷ر دسمبر ۱۹۳۴ء کی اشاعت میں دارالسلام کی یہ خبر چھپی کہ وہاں ایک حبشن کو جڑواں بچے ہوئے۔ جنکے دھڑ جڑے ہوئے تھے۔ ان کے دو سر، چار بازو اور چار ٹانگیں تھیں۔ ڈاکٹروں نے عمل جرّاحی سے ان کو الگ الگ کر دینا چاہا لیکن عکس ریزی سے معلوم ہُوا کہ ان دو جسموں میں دل ایک ہی ہے۔ اسلئے عمل جراحی غیر ممکن ہو گیا۔ یہ بچے نومبر کے وسط میں پیدا ہوئے تھے۔ ابھی تک زندہ ہیں اور مقامی شفاخانے میں ان کی دیکھ بھال ہو رہی ہے۔ یہ واقعہ اس نظم کا محرک ہُوا۔

تنوّع آپ زمانے کا دیکھتے ہیں روز — ہے اتفاق بھی اضداد کا جزو افروز
کبھی ہے کچھ تو کبھی کچھ ہے رنگ اور شعار — مگر ہے قابل توصیف اس کا استقرار
اسی طرح کبھی فطرت میں بھی تفنّن ہے — اصول اگرچہ تناسب ہے اور توازن ہے
ہر پائے بندئے قانون قدرت اس پر بھی — ہر اختلاف میں بھی اک ادا توافق کی
وضاحت اور ہو تشریح اسکی گر درکار — اُٹھاؤ اور پڑھو تم ولائتی اخبار
وہ ایک شہر ہے دارالسلام جس کا نام — وہاں کے حادثۂ نادرہ کا ہے اعلام
خبر ہے تازہ وہاں کی کہ ایک حبشن نے — جنے ہیں جڑ بلے جو اعجوبہ ہیں بہت بچے
وہ لڑکیاں ہیں دو سر کی جڑا ہے دھڑ جنکا — ہیں چار بازو اور اتنی ہی ٹانگیں، دست و پا
یونہی یہ خلقت اعجوبہ تھی عجیب و غریب — جو دیکھا ڈاکٹروں نے تو ٹھہری اور عجیب
جو عکس ریز کے آلہ سے امتحان کیا — تو صرف ایک ہی دل ان میں مشترک پایا

ہوئی یہ کوششیں ان کو الگ کر دیں ۔۔۔ نہ کام آئیں مگر سحر جری کی تدبیریں
وہ دل جو اس فنِ اعجوبہ کو ملے ہوتے ۔۔۔ کبھی کے ایک سے دو ان کے کر دیئے ہوتے
یہ دیکھی آپ نے نیرنگ میں بھی یکرنگی ۔۔۔ نہیں ہے کوئی بھی نیچر کی بات بے ڈھنگی
یہ اختلافِ عوارض میں یکدلی کا وجود ۔۔۔ ہے کارگاہ میں فطرت کی حاوی و مسعود
ہے کاربند وہی اس پہ قوم ہے جو سعید ۔۔۔ معاشرت کو بھی فطرت کی پیروی ہے مفید
یہی اصول ہے قدرت کو اور خدا کو پسند ۔۔۔ سبق لو اس سے اگر تم ہو قوم دانشمند
ہو نسل، دھرم میں، ملت میں اختلاف تو ہو ۔۔۔ معاملات میں دنیا کے ایک ہو کے رہو
ہو اتحاد عمل تو تضاد ہے کیا چیز ۔۔۔ ہے اسکے سامنے نیرنگئ جہاں نا چیز

جو مثل توام دار السلام ہو یک دل
تو دوستو نہیں بہبودئ وطن مشکل

سُرخ ساڑھی

(لاہور ۔ ۳۰ ۔ اگست ۱۹۳۳ء)

۶ اگست ۱۹۳۳ء کو ایک پسنجر ٹرین جام نگر سے دوارکا کو جا رہی تھی۔ بارش بہت زور کی ہوئی تھی ایک ندی کا پل بہہ گیا۔ اس کنارے مزدوروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ مرد سب دور کام پر تھے۔ عورتوں نے پل کا حال دیکھا۔ اور ریل جو اس پر سے گزرنے کو تھی۔ اسے اپنی سرخ ساڑھیوں کے سگنل سے روک کر تباہی سے بچایا۔

تھی فضائے چرخ پر کالی گھٹا چھائی ہوئی ۔۔۔ دل میں فطرت کے تھی ہیجانی چہل آئی ہوئی
وہ کڑاکے رعد کے اور وہ ہوا کی سائیں سائیں ۔۔۔ اور مینہہ وہ موسلا دھار اور اسکی دھائیں دھائیں
کالے کالے بادل ان میں وہ گرج اور وہ چمک ۔۔۔ بجلیوں کی وہ چکاچوند اور قیامت کی کڑک
مینہہ یہ کہتا اب برس کر پھر نہ برسوں گا کبھی ۔۔۔ برق کہتی ہیں اندھیرے کی مٹا دوں زندگی
اس اندھیرے گھپ کے اندر کوندتیں جب بجلیاں ۔۔۔ رات دن کے ایک ہم ہونے کا بندھتا تھا سماں
جھونپڑیاں چند اک لب جو تھیں بہت خستہ خراب ۔۔۔ جو نظر آتی تھیں اس عالم میں مانندِ حباب

مرد سب کے سب لگے تھے دور اپنے کام میں | تھا اُس آبادی میں کوئی تو فقط تھیں عورتیں
اُن گھروں کے نیچے بہتی تھی پہاڑی اک ندی | کثرتِ بارش سے وہ گویا سمندر بن گئی
ریل کے رستے میں تھی اور اُس پہ تھا اک پُل بنا | ڈالدی تھی سیل نے پانی پر اب اس کی بنا
جھونپڑی والے ڈرے جب کھل گئی افتاد یہ | ریل آنے کو تھی۔ اس کو گر نہ دے برباد یہ

کرشن جی کی راجدھانی وہ مقدس دوارکا | ہے زیارت کا مقام اب تک جو ہر دیندار کا
اُس طرف کو جا رہی تھی جام نگری ایک ریل | دیکھیگا ساتھ اُس کے جو ہُوا قدرت کا کھیل
جام نگری جا رہے تھے جم کی نگری کو۔ مگر | آنچ تک آنے نہ دی ان عورتوں نے ریل پر
کیا کیا ان عورتوں نے آپ سُننے جائیے | اُن کے اوسان اور اولوالعزمی کی قسمیں کھائیے
ساڑیاں جس جس کی جتنی سُرخ اس بستی میں تھیں | دُور اس ٹوٹے ہوئے پل سے وہ سب لائی گئیں
کچھ سڑک پر ریل کی ان دیویوں نے دیں بچھا | تان دیں پیڑوں سے کچھ پردہ سا آگے کر دیا
جس گھڑی کے واسطے یہ باندھنو تھے۔ آ گئی | ریل کی سیٹی گرج سے ابر کی ٹکرا گئی
غُل مچایا عورتوں نے لہلہائیں ساڑیاں | نکلا ایک انجن سے سر اور ساتھ اسکے گالیاں
یہ نہ سمجھیں گالیوں کو وہ نہ سمجھا ان کی بات | زندگی اس ملک میں ایسی ہی کچھ ہے واہیات
آخر اُترا ہی ڈریور بڑبڑاتا۔ گھورتا | بولا غُصے میں اُٹھالو کپڑے اور دو راستا
جب یہ حد وقت بتایا بہہ گیا ہے نصف پل | تو وہ عقدہ ساڑیوں کا ہو گیا حل اُس پہ کُل
گارڈ بھی اتنے میں پیچھے سے اُتر کر آ گیا | اب چلے خود دیکھنے وہ سب پل کی حالت کہ تھا
ریل میں جو تھے مسافر وہ بھی سب حیرت میں تھے | بے جگہ رُکنے سے اندیشہ میں اور دہشت میں تھے
مستعد بیٹھے تھے لیکن ان میں جو تھے نوجواں | تھے کہیں ہاتھوں میں چاقو اور کہیں تھیں لاٹھیاں
اس طرح بچوں کو بغلوں میں لئے تھیں عورتیں | جان دیدینگے۔ گھر پہنچ آنے نہ دینگی وہ آنچیں
سیٹھ جی بھی ایک ان میں تھے جو تھے ازبس مہین | تھا منوں میں وزن جنکے جسم کا دو جمع تین
ہر رہا تھا وہ اُگاہی کر کے پچھلے گانو سے | ساتھ تھے نوٹوں۔ روپیوں۔ زیور کے دو اک پوٹلے
نام وہ لیتا گیا بند آنکھ کر کے سیکڑوں | منتیں مانیں نہ کیا کیا عاجزی سے سیکڑوں
ناک رگڑی۔ کان پکڑے۔ رو دیا اور چیخا بہت | ساتھ جو نوکر تھا اس کو گود میں بھیجا بہت
ساہ جی کی آ گئی تھی آخری گویا گھڑی | توند سے گر آنکھ اُٹھی پوٹلے پر جا پڑی

رحم کے قابل تھا وہ پر ہے یقیں اس کا ہمیں — گھر پہنچ کر بھول جائیگا وہ ساری منتیں
ایک بھی پوری نہیں کریگا اس کو مان لو — سو گھنٹائیں ریل میں سب چھوڑ دیگا جان لو

ڈاکوؤں کا تھا جو پچھلے درجوں میں ڈر تھا کوئی — اونچے درجوں میں مگر تھی کیفیت ہی دوسری
کوئی کہتا یہ کسی والنٹیئر کا کام ہے — چھین کھینچی۔ کانگرس ہی قابلِ الزام ہے
ڈال رکھا تھا جو پالیٹکس نے سر میں فتور — دل میں کہتے ہو نہ ہو یہ ست گراہی ہے ضرور
دیکھتا شاخِ شجر پر کوئی توپ اور کوئی بم — تھا نہ امپائر کا۔ اپنا اپنا تھا اب ان کو غم
ان کو ہوتا تھا طمنچوں کا گماں بن پھول پر — انحصار تعلق تھا بس 'ڈیم' اور 'فول' پر
"ام سمجھتا۔ ہے یہ گاندھی والا۔ بم والا کوئی — کالا لوگ اس ٹرین میں جو ہے مرے کا ام ابھی"
آخر اترے وہ تنے چند از گروہِ حکمراں — ہاتھ میں لے کر طمنچے اور منہ میں گالیاں
گالیاں بیرا مشلچی میں سنی تھیں جو کبھی — بڑودا کے جیل پر بوچھاڑ ان کی ہو گئی
چھا لگا انجن میں تو سناٹے کا عالم تھا وہاں — کیا ڈرائیور کو پتی تک کا نہیں پایا نشاں
تھا نہ انجن کا ڈرائیور گارڈ بھی تھا بے پتا — عقل گم تھی ان کی آخر ہو گیا ان سب کو کیا!
تھا اگر کوئی تو تھیں کچھ عورتیں کالی وہاں — جو اکٹھی کر رہی تھیں اپنی بکھری ساڑیاں
ان کو وحشت اچھلی۔ لپکے عورتیں تھیں جس طرف — ہو گئی تھیں وہ کھڑی یہ دیکھ کر اب صف بہ صف
ایک ان میں سے جو مکھیا سی انھیں آئی نظر — بولے اسکی بانہہ کو پنجے میں اپنے پھانس کر
"کیا کیا انجن کا صاحب گارڈ صاحب کیا کیا؟ — سچ کا ماتک بولتا۔ دیکھو یہ پسٹل ہے بھرا!"
مسکرائی وہ اشارہ پل کی جانب کر دیا — یہ ادھر سمجھے کہ ان کو غرق دریا میں کیا
تھی ادھر یہ کشمکش آئی ادھر سے یہ صدا — "اوہ۔ وی آر سیوڈ" یہ ان صاحبوں نے جو سنا
سمجھے انکے مارنے والے جو تھے مارے گئے — اب جو ہیں یہ سب ہیں مستوجب سزائے موت کے
آ گئے اب گارڈ اور انجن کا عملہ سب کوئی — ان کے چہروں پر ادا تھی شکر و اطمینان کی
دیکھ کر وہ سین جو تھا اس جگہ پر رو نما — آنیوالوں میں سے اک اک بے تحاشا ہنس پڑا
گارڈ بولا بانہہ چھوڑو اسکی۔ جوڑو اس کو ہاتھ — اور انھیں شکرانہ میں دیدو جو کچھ ہے اپنے ساتھ
جاؤ دیکھو پل وہ ندی کا ہے سب ٹوٹا ہوا — اور ہے پل کی جگہ پر واہ اک چھوٹا ہوا
اس جگہ پر یہ نہ ٹھہراتیں اگر اس ریل کو — حشر کیا ہم سب کا ہوتا اس کو تم خود دیکھ لو

سن کے یہ بات اُن سبھوں کی جان میں جان آگئی
بولے وہ "یہ لال بی بی لوگ اوہ اچھا۔ گڈی"

ہینڈ شیک اُن سے ہوئے اور شکریے بیحد ادا
جیب میں جو کچھ تھا سب کچھ اُنکے آگے رکھ دیا

سر پہ چڑھ جاتا ہے جب انگریز کے غصے کا بھوت
پھر نہیں وہ دیکھ سکتا۔ وجہ، علت اور ثبوت

سہو کا، اپنی غلط کاری کا ہو جائے یقیں
اس سے اچھا آدمی پھر کوئی مل سکتا نہیں

ہو مخل آرام میں اس کے جو کوئی حادثہ
تو بھڑک اُٹھتا ہے۔ ایسا کچھ ہے اسکا خاصہ

پوچھنے بیٹھے ہو کیا ان بیبیوں کی ذات پات
وہ انھیں میں سے تو ہیں تم کو ہے جن سے چھوت چھات

تم کہو چاہے ہری جن ان کو اور چاہے اچھوت
یہ اکیلا کام ان کا ہے شرافت کا ثبوت

عورتوں نے جو کیا کارِ نمایاں دیکھ لو
سوچ سمجھو ناقص العقل ان کو ہرگز مت کہو

مارنے والا قوی۔ تو ہے قوی تر جو بچائے
مرد و زن کا ہے یہی منصب اگر تم کو سُہائے

عورتوں سے جو اکڑ فوں کرتے ہو زیبا نہیں
ان کو ادنے اور کمتر جاننا اچھا نہیں

نسل انساں کی محافظ بھی ہیں وہ ماتا بھی ہیں
یہ نہ سمجھو نازنیں، کمزور اور دُبلی سی ہیں

وہ نہ ہوتیں تو نہ تم ہوتے نہ ارجن اور بھیم
ہوتے افسانے سکندر اور رستم سے جسیم

نخل ہستی کے جو تم پھل ہو تو عورت اسکی پھول
واقعہ یہ سُرخ ساڑھی کا کبھی جانا نہ بھول

ولائیت جانے والے نوجوانوں کیلئے

(لاہور ۱۷ ستمبر ۱۹۳۳ء)

جانے لگتا ہے جو یورپ کی طرف کوئی عزیز
اُس سے یوں ہوتا ہوں اپنایت سے میں گرمِ سخن

علم و فن تحصیلنے پردیس میں جاتے ہو تم
واقعہ یہ یاد رکھنا بھولنا مت جانِ من

ملک غیر اور غیر سب انسان پاؤ گے وہاں
دُور کیا۔ تم سے ہزاروں میل پر ہوگا وطن

اس جگہ بیبیوں ملیں گے دل فروش، ایماں فروش
اجنبی کو لوٹنے کے جو کریں لاکھوں جتن

ایسے ہی کاموں سے چلتی ہے ہزاروں کی معاش

تم وہاں جاتے ہو فن یا علم کی تحصیل کو
اسلئے لازم ہے رکھنا سادہ طرزِ زندگی

عیش و شوقلینی کے رنگوں میں نہ پڑ جانا کہیں ‏ ایسے شغلوں میں پڑے تو کب رہے بیدار بھی
ہو نقاہت اور صحت کا تحفظ دلنشیں ‏ جان اور عزت سے بڑھ کر قدر کب ہے مال کی
چارہ[1] میں ہنٹنگ ہو اور کیم پر پکنک بھی ہو ‏ یہ تو سب کچھ ہو مگر قابو میں ہوں جذبات بھی
نفس کے ہاتھوں نہ ہو داماں عصمت پاش پاش

اچھے اچھے بھی ملیں گے آدمی تم کو وہاں ‏ روح جن سے پائے راحت اور پائے قلب نور
ایسے اخوان الشیاطیں سے بھی تم ہو گے دو چار ‏ عقل میں ڈالیں جو افلاطوں۔ ارسطو میں فتور
دیکھو اچھوں کو تو اچھا بننے کی تحریک ہو ‏ جو بُرے ہوں ان سے رہنا چاہئے بس دور دور
آزمائش میں نہ اپنے آپ کو تم ڈالنا ‏ نیک نفسی پر نہ اپنی تم کبھی کرنا غرور
چل چکے ہیں رشیوں۔ ولیوں پر بھی اس جادو کے تاش

تم سے گر کوئی سبک حرکت وہاں ہو جائے گی ‏ تو کہیں گے سب یہی "جاتا ہے وہ ہندی جواں"
ہند کے اخلاق جانچیں گے تمہارے خُلق سے ‏ اور چلن سے۔ ہند کی کلچر کا لیں گے امتحاں
اس طرح رہنا نہ ہاتھ آئے مسالا کچھ انھیں ‏ رہتے ہیں مس میو کے ایجنٹ بھی اکثر وہاں
یہ سمجھ لو ہے تمہارے ہاتھ اعزازِ وطن ‏ غور سے دیکھو تو کیا کم ہیں یہ ذمہ داریاں
ان میں پورے اترو۔ دے پرماتما توفیق کاش

جس لئے جاتے ہو مقصود اس میں ہو کسب کمال ‏ امتیاز اسمیں ملے تو کوششیں ہوں سب بکار
ہر طرف، ہر چیز کے پیچھے نہ ہرگز دوڑنا ‏ شوق میں آکر نہ بن جانا خدائی فوجدار
وہ برائی کے۔ سلم[2] کے۔ نفسیاتی مسئلے ‏ چھانٹنے مت بیٹھ جانا۔ ہے یہ شغل ہرزہ کار
کھینچ لے جائے کدھر فطرت کی نیرنگی کا جوش ‏ ایسی تحقیق و تجارب میں نہ پڑنا زینہار
ریگ صحرا میں کنولِ کا پھول مت کرنا تلاش

مشرق و مغرب میں ہے ہر طرح بُعد المشرقین ‏ اِک انوکھی سرزمیں ہوگی وہاں۔ دُنیا نئی

---

[1] چارہ آکسفورڈ میں ایک ندی ہے۔ اس میں طلبا کشتی چلانے کی مشق اور تفریح کیا کرتے ہیں۔ اس کشتی رانی کو ہنٹنگ کہتے ہیں۔ کیم بھی ایک ندی کا نام ہے جو کیمبرج کے نیچے بہتی ہے۔ پکنک رہا ہر کھلی جگہ میں تفریح اور ناشتہ کی تقریب کو کہتے ہیں۔ کیم کے کنارے ایسی صحبتیں اکثر ہوتی ہیں۔

[2] سلم لندن کا وہ بدنام مشرقی حصہ جو افلاس اور جرائم کا مترادف ہے۔

یاد رکھنا اس کی عزت ہے تمہارے ہاتھ میں ہو نہ جائے آن اپنے دیس کی آئی گئی
یاد رکھنا اپنی ہندی اصل کو مت بھولنا کیٹس اور شیلے کی دھن میں تم بہاری ست سئی[1]
ایسا موقع ہی نہ آئے جو تمہیں کہنا پڑے "درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ
باز مے گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش"

اُن بچاروں کو وہاں جا کر بھلا دینا نہ تم ماں نما کے تم نے چھوڑے ہیں جو گھر میں دو نسکار
تم ابھی ناآشنا ہو ماں نما کی آنچ سے نو نیوز از گڈ نیوز[2] اس پہ نہ رکھنا انحصار
جان سی ان کے تن بیجان میں پڑ نہ جائے گی خیریت کے تم جو لکھ بھیجو دو کلمے ہفتہ وار
تم ہو اُن جذبات روحانی سے معصوم اے عزیز تم پہ وہ احساس قلب اب تک نہیں ہے آشکار
ہے یہ نیچر کا تقاضا۔ جانگداز اور دلخراش

اے معزز میہماں دل میں نہ کرنا یہ خیال پند سے اس اولڈ فوگی[3] کو غرض اور واسطہ
آپ کے والد جو ہیں استاد آدھے صوبہ کے اُن کے اک ناچیز سے شاگرد کا ہول میں پتا
جو کہا میں نے وہ ہے اک پند عام ان کے لئے کرتے ہیں بے سوچے سمجھے جو سفر انگلینڈ کا
آپ کی تو تربیت۔ تعلیم۔ اس پایہ کی ہے آپ کو پند و نصائح کی ضرورت ہی ہے کیا
جو سفر کی ہے غرض پوری خوش اسلوبی سے ہو تندرستی، کامیابی سے رہیں۔ یہ ہے دعا
خیر سے جب واپس آئیں تو کہیں سب شادباش

بھارت کے نوجوانو!

(لاہور ۲۲ ر دسمبر سنہ ۱۹۳۳ء)

جو دیش بھگت ہے یہ ہے اُس سے مرا کلام ہے خدمت وطن کا ترے دل میں انصرام
اس دھن میں تیرے کٹتے ہیں دن، رات، صبح و شام لیکن جو چاہتا ہے تو ہونا نہیں وہ کام

---

[1] بہاری ہندی کا مشہور شاعر تھا۔ اس کے سات سو دوہوں کا نام ست سئی ہے ،،

[2] عدم خبر دلیل خیریت۔ خط نہ لکھنے کا یہ ایک بہانہ ضرب المثل ہے ؛

[3] اولڈ فوگی۔ بوڑھا۔ دقیانوسی۔ پرانے فیشن کا ؛

سُن لے تو کان کھول کے اس بات کو نہ بھول
اک روز ننھی ننھی یہ کلیاں بنیں گی پھول

یہ پھول جب کھلینگے تو پھل ان میں آئے گا جن کی چمک سے باغ وطن جگمگائے گا
ان سے نئی بہار یہ گلزار پائے گا پھل پھول اس کا دل کی کلی کو کھلائے گا

اصل اور استعارے میں ہرگز نہ کر تمیز
یُووک کا سنگھ جو ہے اسے دل سے رکھ عزیز

بھارت کے نوجوانوں سے میرا یہ ہے سخن دم سے تمہارے آج پُرامید ہے وطن
اس واسطے ہی کوششیں ہیں اور سب جتن آننت یہ سنگھ ہو یہی ہر من کو ہے لگن

پروان چڑھتا دیکھیں ہم اس نونہال کو
بھارت عزیز دل سے ہو بھارت کے لال کو

گر یہ یقین اپنے دلوں میں بٹھاؤ تم شکتی سے شانتی سے اگر من لگاؤ تم
تن، من کو شکتی مان جو اپنے بناؤ تم طاقت سے تن کو۔ پریم سے من کو سجاؤ تم

مشکل وہ کونسی ہے جو آسان پھر نہ ہو
کس چیز اور بات کا امکان پھر نہ ہو

ورزش کی۔ برہمچریہ کی مہما بتاؤں کیا شکتی کے فائدے جو ہیں تم کو سناؤں کیا
دن رات دیکھتے ہی ہو ان کو دکھاؤں کیا سورج کی روشنی میں دیا میں جلاؤں کیا

پرکرتی ہو کہ شکتی ہو۔ اسکا ہی ہے ظہور
ست دھرم کو اسی کی بدولت ملا ہے نور

نربل کی زندگی بھی کوئی زندگی میں ہے بل ہو جہاں میں آتما کا بل اسی میں ہے
بل آتما کا دیہہ کا جس آدمی میں ہے سچائی من بچن میں صفائی سعی میں ہے

اس کیلئے کٹھن نہیں دنیا میں کوئی کام
زندہ رہے جہاں میں سدا اس کا نیک نام

مغرب زدہ زمانہ ہے اس کا بھی دھیان ہو یورپ کی نقل کہتے ہیں ہندوستان ہو
بھارت نواسیوں کا جب ایسا گمان ہو بھارت کی پھر نہ خطرے میں کس طرح جان ہو

یورپ اپادھیوں سے جو ہے آج اپنی تنگ

سوچو وہ ہم میں آئیں تو کیسا ہو رنگ بھنگ

گُن اچھے جن میں پاؤ اُنھیں تو کرو قبول　　ان کو نہ لو ہو جن میں ضرر اور ہوں فضول
کلچر کو اپنے دیس کی ہر گز نہ جاؤ بھول　　لالچ میں بیاج کی کہیں کھو بیٹھنا نہ مول

پچھم کی کل وہ ہے کبھی چل کر رُکی نہیں
نام و نشاں بریک کا اس میں نہیں کہیں

اس میں نہیں تعصب و نفرت کی کوئی بات　　تنگیٔ نظر کی اس کو سمجھنا ہے واہیات
تم چیخنے دو اُن کو جو کہتے ہیں دن کو رات　　تم مشتنہ صفات پہ وار دو نہ اپنی ذات

ہے سامنے جو ہوتا ہے مُلکِ فرنگ میں
بند آنکھ کر کے نقل کی حاجت نہیں تمھیں

بھارت نواسی جو ہو وہ چھوٹا ہو یا بڑا　　سب سے پریم رکھو کسی سے نہ اپرشا
یہ گُرُ کی بات ہم کو بتاتی ہے سنتھیتا　　سب ڈال ایک پیڑ کی ہیں کون ہے جدا

بھارت کے باسی وہ بھی تو تم جیسے ہیں تمام
اس راہ پر چلو تو بنے کا بنا ہے کام

اے نوجوانو! قوم کی عزت تمھیں سے ہے　　بھارت کے بوڑھے جسم میں طاقت تمھیں سے ہے
بنتی۔ سدھرتی اسکی جو ہو گت تمھیں سے ہے　　کل ہونی ہے وطن کی جو قسمت۔ تمھیں سے ہے

بھارت کے پیارے اور دُلارے تمھیں تو ہو
اس کی ضعیف آنکھ کے تارے تمھیں تو ہو

یہہ کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟

۴ ستمبر سنہ ۱۹۳۳ء

یہاں عالم نظر میں تیرہ و تار　　وہاں لائے فلک سے شمس اُتار
یہاں بخت سیہ کا ہے اندھیر　　وہاں آنکھیں ہیں تابشوں سے سیر
یہاں عالم ہے عالم ظلمات　　وہاں جاری ہے رود آب حیات
ہے یہاں تو عدم کا سناٹا　　وہاں لاشوں کو بھی جلائے صدا
زندگی سے یہاں ہے بیزاری　　وہاں خواب اجل سے بیداری

یہاں بے موت مرتے جاتے ہیں — وہاں مردے بھی جان پاتے ہیں
جیتے جی ہے یہاں اجل کا خمار — وہاں سوتے ازل کے ہیں ہشیار
خود فراموشی کی یہاں خواہش — وہاں ایک ایک بات کی پرسش
یہاں دل نے بھلا دیا بد و نیک — داد خواہی یہ ہے وہاں ہر ایک
یہاں آپے کی بھی نہیں ہے خبر — وہاں کس چیز پر نہیں ہے نظر
اِک نظر کو یہاں ترستے ہیں — وہاں عمروں کے بچھڑے ملتے ہیں
یہاں روح عمل تغافل ہے — پرسشوں میں وہاں توغل ہے
یہاں جور و جفا کا غلبہ ہے — وہاں اک عدل کارفرما ہے
یہاں بھوگیں سزا وفاؤں کی — وہاں تعزیر ہے جفاؤں کی
زہر کھانے پہ ہیں یہاں مجبور — ہے وہاں انتظار جام طہور
یہاں صدق اور کذب ہے یکساں — دودھ پانی الگ الگ ہے وہاں
کس مپرسی کا ہے یہاں عالم — ہے وہاں بازپُرس اور پیہم
یہاں بے جرم مارے جاتے ہیں — وہاں مُجرم جلائے جاتے ہیں
یہاں لب کھولنے کی ہے بندش — فاش گوئی وہاں کی آزمائش
یہاں فعل عبث ہے عرض حال — وہاں کھلتے ہیں دفتر اعمال
ابتدا ہے یہ آہ پیہم کی — انتہا ہے وہ شادی و غم کی
ایک بات ان میں مشترک ہے ضرور — جس کو پانا نہیں سمجھ سے دور
کاٹے کٹتیں نہیں یہاں گھڑیاں — ساعتوں کا نہیں شمار وہاں
طول پر اس کے ہے ابد کی نقاب — اُسکا عرصہ بھی ہے برونِ حساب

کون جانے یہ کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟
جس پہ گذرے وہ جان سکتا ہے

الہ آباد کا تاریخی مشاعرہ

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو حکومت ہند کے سابق قانونی ممبر کو پریوی کونسلر کا اعزاز ملنے کی تقریب تہنیت میں ۱۱ فروری ۱۹۳۴ء کو دیوان رادھے ناتھ صاحب گلشن نے ایک عالیشان مشاعرہ اور گارڈن پارٹی کی دعوت دی۔ سر شاہ محمد سلیمان چیف جسٹس ہائیکورٹ الہ آباد مشاعرہ کے صدر تھے۔ ڈیڑھ سو کے قریب شعراء نے شرکت کی۔ اساتذہ اور مشاہیر شعرائے اردو کا اتنا بڑا مجمع شاید پہلے کبھی نہیں ہوا۔ مصرع طرح تھا:

کیا دکھاتا ہے ہمیں چاکِ گریباں دیکھئے

حضرت کیفی نے یہ قطعہ مناسب موقع فرمایا۔ غزل اپنی جگہ ملے گی:

کیوں زمانے کی کشاکش سے ہوئے مایوس آپ
آئیے اس بزم میں عشرت کا ساماں دیکھئے

کیا مسرّت کا سماں ہے آج الہ آباد میں
مثلِ گل ہر ایک کے چہرے کو خنداں دیکھئے

یہ نہیں ذاتی تشخّص ہے وطن کا افتخار
ذاتِ سر سپرو میں اعزازِ ہندستاں دیکھئے

کون سر سپرو جو ہیں اک معدنِ علم و حکم
حق پسندی رائے میں ان کی نمایاں دیکھئے

ہر ہدایت دلپذیر اُن کی افادت سے بھری
ان کے خطبوں میں کھلا دلکش دبستاں دیکھئے

کیا حکومت اور کیا پبلک۔ جو ہے وہ معترف
سب کو ان کی مدح میں سرگرم یکساں دیکھئے

ذاتِ پاک اُن کی ہے شرق و غرب کی کلچر کا عطر
ملک کے علم و ادب پر ان کا احساں دیکھئے

ہیں وہ مجموعہ عمل اور علم و حُبّ قوم کا
ہے عجب سنگم میں سنگم لطفِ یزداں دیکھئے

صدر جو اس تہنیت اور شعر کی صحبت کے ہیں
ان کے حُسنِ خلق و اوصافِ درخشاں دیکھئے

دعوتِ مور و سلیماں کے ہو گر قصّہ میں شک
آئیے اخلاق و لطفِ سر سلیماں دیکھئے

کیفی اس محفل میں جو شے ہے وہ فردوسِ نظر
میزباں کی گرمجوشی، شانِ مہماں دیکھئے

شباب

(دہلی - ۲ - اپریل ۱۹۳۴ء)

جناب کیفی کی تحریک سے منتظمان روزانہ اخبار تیج نے دہلی میں ایک مناظمہ کی دعوت دی - اس کے لئے طرح کا مصرع نامزد کرنے کی بجائے - چند موضوع مقرر کئے گئے تھے - جن میں سے ایک موضوع **شباب** تھا - قید صرف تیس اشعار کی تھی - جناب موصوف اس صحبت کے صدر منتخب ہوئے - آپ نے پہلے اردو شاعری کی موجودہ حالت اور مشاعروں اور اپنے مخترع **مناظمہ** پر ایک پُرمغز اور نہایت دلچسپ تقریر کی اور سب سے آخر میں یہ نظم فرمائی:

سُنتے ہو جو حکماء کرتے ہیں اس کی تعریف
جانتے ہو شعرا میں جو ہے اس کی توصیف
دِن مرادوں کے اسے کہتے ہیں حضرات شریف
سُدھ بسر جاتی ہے جب آتی ہے اسکی تشریف

کوئی کافر اسے کہتا ہے کوئی خانہ خراب
غضب آجاتا ہے جب آتے ہیں ایامِ شباب

ہیں جو معصومیت و معصیت الفاظ شہیر
جن میں ہے ایک پہ لطف و کرم ربِّ قدیر
اور ہے دوسرے کے واسطے حکم تعزیر
بچ نکلنے کی نہیں کوئی بھی جس سے تدبیر

عصمت ان دونوں کے ہے بیچ میں حدِّ فاصل
گر شباب آکے نہ کردے اسے حک اور باطل

جانتے ہو جو شباب آتا ہے کیا ہوتا ہے
ذہن آماجگہ حرص و ہوا ہوتا ہے
ولولہ سینے میں اور سر میں بھرا ہوتا ہے
ایک نشہ سا دماغوں کو چڑھا ہوتا ہے

بحر پر دیکھتے ہو چاند کی کرنوں کا اثر
یہی کرتا ہے شباب آکے دلِ انساں پر

سینے تن جاتے ہیں چڑھ جاتے ہیں کچھ کر تیور
نہیں پڑتی کبھی بھولے سے بھی نیچے کو نظر
آنکھ اٹھتی ہے کبھی حور کبھی غلماں پر
ٹھیٹ سودا زدہ ہو جاتے ہیں قلب اور جگر

آکے رگ رگ میں اٹھاتا ہے وہ جوش اور خروش

نیک و بد کیا ہے کہ رہتا نہیں آپے کا ہوش

کہتے ہیں جوش پہ جس وقت شباب آتا ہے — ضبط و تمکیں کے لئے روز حساب آتا ہے
دشمن فہم و خرد خانہ خراب آتا ہے — کیا شباب آتا ہے اک جی کا عذاب آتا ہے

فعل ناقص ہو تو ہو عندیہ کامل کیونکر
مبتدا یہ ہو تو بے ربط نہ ہو کیونکہ خبر

دھن ہوس کوشیوں کی طبع کو گرماتی ہے — نئی دنیا اسی دنیا میں نظر آتی ہے
لذت نفس حواسوں پہ جو چھا جاتی ہے — رخصت واہمی تمیز وہاں پاتی ہے

دین و دنیا کی خبر پھر نہیں رہتی ان کو
فرض و واجب پہ نظر پھر نہیں رہتی ان کو

وہ جو بالغ نہ کبھی ہوتے تو رہتے معصوم — وجہ تخریب ہے تکمیل۔ یہ تھا کیا معلوم
آکے ارمانوں نے حسرت نے مچا دی اک دھوم — خواہشوں نے دل بیکس پہ کیا گھر کے ہجوم

ان کو تشبیب ہی میں سوجھی ہے کیسی یہ گریز
ساتھ مطلع کے ہی مقطع کو کیا ہے آمیز

اک جنوں چڑھ گیا سر کو کہ جوانی آئی — جان جاں بن کے چھپی دشمن جانی آئی
یاد ارمان و تمنا کی کہانی آئی — ہائے تعمیر ہی تخریب کی بانی آئی

شجر عمر کے پھل پھول نہ راس آئے انھیں
کیوں بہار اب نہ خزاں کیطرح تڑپائے انھیں

بندۂ نفس جو ہیں ان کا ہے یہ کچھ احوال — روز تم دیکھتے ہو ان کا جو ہوتا ہے مآل
ان کے حق میں تو جوانی ہوئی جی کا جنجال — ہے شباب ان کیلئے ایک عذاب اور وبال

رک سنبھل کر جو جوانی میں یہاں رہتے ہیں
دل و دماغ ان کے ہمیشہ ہی جواں رہتے ہیں

کیسی پیری مری جاں! اور ہے کیا چیز شباب — تم یونہی ڈالتے ہو روئے صداقت پہ نقاب
تم نے دیوانی جوانی کو دیا کیوں القاب — آمد و صرف کا سمجھو اسے تم ایک حساب

تمھیں نیچر کو جو دینا تھا وہ دے کر چلدی
عمر بھر اس کو چلاؤ کہ اڑا دو جلدی

ایک خط اور اُس کا جواب

(سنہ ۱۹۳۶ء)

بغیر تصرف کے نثر کے خطوں کو نظم کر دیا ہے

---

(۱)

تُو جو ہندو ہے تو اسلام سے رغبت کیسی؟ — دھرم کے معترضوں سے یہ محبت کیسی؟

اُن کی بولی کی ترقی میں ترا وقت ہو صرف — دیوبانی کا زباں سے نہ کبھی نکلے حرف

ہیں "روایاتِ عرب اور عجم" نوکِ زباں — گویا ایران ہے مولد ترا۔ یا عربستاں

طبع غیروں ہی کی چیزوں پہ ہے تیری مایل — اُن کی تاریخ و آداب میں تو بہت ہے کامِل

سُننے جب تیری زباں سے تو وہی رونا ہے — سنگریزہ ہے بھرت ورش عرب سونا ہے

"مولوی" کوئی تجھے کہتا ہے "ملا" کوئی — نام کے ساتھ ہے "علاّمہ" کا پچھلا بھی

فارسی اور ہے اُردو سے تجھے عشق بہت — اپنی ہندی سے نہ جانے تجھے کیوں ہے نفرت

یہ نہیں بات کہ آتی نہیں تجھ کو ہندی — مغز میں ہے مگر اُردو ہی کی ہندی چندی

ذکر ہے اُس کا تو اُردو کی افادت کیلئے — نہ کہ خود اس کی ترقی و اشاعت کیلئے

جلسہ اُردو کا کہیں بھی ہو کہ اُفتاں خیزاں — تو پہنچ کر رہے میلوں کی مسافت سے وہاں

کیوں تجھے بھُول گیا ہے کہ برہمن ہے تُو — آریہ بھاشا کا پھر کس لئے دُشمن ہے تُو

دُشمنی یہ نہیں ہندی کی اگر تو کیا ہے؟ — دیکھو جب اُردو کے ماتم کو لئے بیٹھا ہے

تیری مت بھنگ ہوئی غیروں کی صحبت جو ہوئی — ہندوانی ترے جذبات میں رنگت نہ رہی

پُورے ہونے کو ترے دِن ہیں۔ سمجھ جیت۔ سنبھل! — سانس چلنے سے نہیں آج تو رہ جائے گا کل

(۲)

میرے دِن گِننے کی تکلیف نہ فرمائیں آپ — اور مرے سانس کی الجھن میں نہ پڑ جائیں آپ

اس اصول اور عقیدے پہ ہے میرا تو عمل — آج ہی کیوں نہ کرو کام جو کرنا ہے اکل[۱]

۱؎ یہ لفظ (اکل) جناب کیفی کے اختراعات میں سے ہے۔ اسی طرح اپرسوں وغیرہ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

فارسی۔ اردو نہ ہندی ہی میں مجھ کو ہے کمال — طالب علم ہوں میں اور یہ ہے میرا حال
کام کی بات جہاں ملتی ہے لے لیتا ہوں — آنکھ پر رکھتا ہوں اور دل میں جگہ دیتا ہوں
میرا ذمّہ نہیں کوئی مجھے کیا کہنا ہے — میں ہی جانوں کہ مرے علم کا مبلغ کیا ہے
اس کا۔ ہاں علم ہے کیا کچھ نہیں مجھ کو معلوم — یُوں میں عالم ہوں۔ جو عالم کا یہی ہے مفہوم
پا کے یہ عمر بھی ہرگز نہیں بڈھا توتا — ٹو کے با موقع تو شاگرد ہے اُستاد مرا
رہیں وہ باتیں جو پہلے مرے مشفق نے کہیں — ان کی نسبت مرے دل کو یہی پختہ ہے یقیں
کہ محبت کے تقاضے نے کہلوائی ہیں — اسلئے کیوں کہوں ناقابلِ شنوائی ہیں
اُن میں غصّہ کی ہے پھنکار۔ ہے یہ بھی ظاہر — اس کی علّت ہے مگر تم تو نہیں ہو ماہر
تم جو اُردو کو مسلمانوں کی سمجھے ہو زبان — خود مسلمانوں میں ہے بعض کو ایسا ہی گمان
وہ زباں ہندوؤں کی ہے نہ مسلمانوں کی — بلکہ وہ ہے کہ برتتے ہیں یہاں جس کو سبھی
اس کو اُردو نہ کہو اور نہ ہندی ہی کہو — اک زباں اپنے وطن کی ہے۔ یہی تم سمجھو
نام ہی چاہو تو کہہ دو اسے **ہندستانی** — اس میں کیا دھرم کی لم؟ کیا ہے شقِ ایمانی؟
ہے جنوں سر میں تمہارے تو کھڑی بولی کا — اور من میں ہے مرے پریم کھری ہندی کا
کہتے ہو ہندی سے **کیفی** کو یہ نفرت کیوں ہے؟ — **برج بھاشا** سے مگر تم کو عداوت کیوں ہے؟
برج بھاشا ہی سے رل کر تو بنی ہے اُردو — نہ عرب سے نہ عجم ہی سے چلی ہے اُردو
پہلے کیا اُردو کی۔ کیا بھاشا کی یہ صورت تھی؟ — ہندو و مسلم رہے برتا کئے چھ سات صدی
امتیاز ان میں بڑا تھا۔ تو یہی رسم الخط — اور تھے وجہ تمیز ان میں کچھ الفاظ فقط
وہی جملے کی بناوٹ۔ وہی انشاء کا طریق — وہی اسلوب۔ الگ تھا مگر املا کا طریق
تم نے مادھو کی مدھر بانی کو دی جب سے طلاق — اور اس کے لئے تجویز کیا اونچا طاق
سنسکرت آکے بری طرح بس اس پر چھائی — سنسکرتی کہو۔ ہندی یہ کہاں ہے بھائی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہ لفظ وہ آنے والے زمانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اور گزرے ہوئے زمانہ کے لئے وہی کل۔ پرسوں۔ اس طرح گزرے ہوئے اور آنے والے زمانوں میں امتیاز ہو جاتا ہے۔ جو فارسی، انگریزی وغیرہ میں پہلے سے موجود ہے ؛

ہندی والا تو نہ ہرگز کھڑی بولی سمجھے — جو امر کوش رٹا ہو وہ یہ ہندی سمجھے
یاد ہے کچھ جو پدم سنگھ نے پشکر میں کہا — سمّیلن نے بھی کبھی اس پہ ذرا دھیان دیا
ہندی کھا سکتی ہے اُردو کو نہ یہ ہندی کو — اصل میں ایک ہیں یہ ان کو نہ سمجھو تم دو
میری کوشش تو یہ ہے اُردو بس ایسی ہو جائے — ہندی والوں کی سمجھ میں جو سہولت سے آئے
کاش ہندی میں برج بھاشا کا آ چمکے رنگ — سنسکرت اس میں نہ ٹھونسو۔ یہ بدل ڈالو ڈھنگ
فرق رہ جائے گا باقی جو یہ رسم الخط کا — اپنے موقع پہ یہ عقدہ بھی کبھی حل ہوگا
یہی میں ان سے کہا کرتا ہوں اُردو کے لئے — عرب ایراں کے نکالو اسے تم پنجے سے
وہ سموئے گئے اب ملکی زباں میں آ کر — اب وہ اردو سے کہ ہندی سے نہ ہونگے باہر
طے زباں کا تو ہؤا قصّہ اب اِک بات رہی — تم کو بو آتی ہے اوروں میں جو غیریت کی
اس میں مت بھید نہیں۔ یہ تو سمجھ کا ہے پھیر — وہ بس ہیں۔ دوست! اسی سے تو مچا ہے اندھیر
غیر وہ بھی نہیں۔ جس طرح کہ تم غیر نہیں — دونوں پیارے ہیں کسی سے بھی مجھے بَیر نہیں
آریہ ورت کے جس طرح نواسی ہو تم — اور کہتے ہو وطن اپنا ہندستاں کو تم
ٹھیک اسی طرح وہ تم جیسے ہیں بھارت باسی — چاہے لودھی ہوں حسینی ہوں کہ ہوں عبّاسی
سب سے کہتا ہوں کہ ہر ایک جماعت سے ملو — صاف دل سے ملو۔ شوق اور محبّت سے ملو
تم سے اور اُن سے۔ ہر اک سے ہے مرا یہ کہنا — جبکہ تم سب کو ہے اس ایک وطن میں رہنا
اِس لئے چاہیے مِل جُل کے محبّت سے رہو — فرق آپس کے جو ہیں مل کے مٹا دو اُن کو
دھرم اور دین کی بات اور ہے لیکن پھر بھی — سبھیتا اور رواداری ہیں چیزیں ایسی
وہ بھی مِل جاتے ہیں جس وقت چڑھے ایکا رنگ — کرو گڈمڈ نہ تم اس لوک کو پرلوک کے سنگ
پہلے دنیا کے تو کاموں میں بنو ایک سماج — جو اکل ہونا ہے اُس سے نہ رُکے آج کا کاج
بابا نانک نے کہا۔ "بلّے دی مہماں" ہے اپار — موڑ باگوں کو دِلوں کی۔ یہ تھی بُلّھے کی پکار

۱؎ اُس بحث کی طرف اشارہ ہے جو پنڈت پدم سنگھ شرما نے اجمیر اور مظفرپور کے ہندی ساہتیہ سمّیلن کے اجلاس میں اپنی صدارتی خطبہ میں کھڑی بولی اور برج بھاشا کے موازنہ کے متعلق اٹھائی۔ دیکھو پدم پراگ صفحہ ۳۵۲

۲؎ گورونانک صاحب کے قول کی طرف اشارہ ہے:- "بلّے دی مہما کہی نہ جائے"

۳؎ حضرت بُلّھے شاہ کے قول کی طرف اشارہ ہے:- "موڑ دلاں دی باگاں نوں"

اور میری جو کہو۔ مجھ کو تو ہیں دونوں ایک — مجھ کو دونوں میں نظر آتے ہیں مخلص اور نیک
کب نہ اک آنکھ سے ان دونوں کو دیکھا میں نے — نہ کیا اپنے پرائے کا پرکھا میں نے

مجھ سے جو پیار سے ملتا ہے مرا پیارا ہے
اور تم جانتے ہو پیار سے لستا را ہے

الوداع سر عبدالقادر

۱۰ جون سنہ ۱۹۳۴ء کو لاہور میں پنجاب لٹریری لیگ نے سر عبدالقادر اور لیڈی قادر کو ٹاؤن ہال میں الوداعی دعوت "ایٹ ہوم" کی دی۔ وجہ تقریب یہ تھی کہ سر قادر وزیر ہند کی کونسل کے ممبر ہو کر انگلستان جانے والے تھے۔ اس تقریب میں حضرت کیفی نے یہ نظم پڑھی:

سچ ہے سب وقتوں میں وہ وقت کڑا ہوتا ہے — جب حبیب ایک حبیبوں سے جدا ہوتا ہے
گرچہ امّید ہو پھر ملنے کی۔ لیکن دل میں — ہر نفس ایک تلاطم سا بپا رہتا ہے
قول یہ سچ ہے کہ انسان ہے وابستۂ حال — کل کی امّید میں گو لطف بڑا ہوتا ہے
رام جس وقت اجدھیا سے ہوئے تھے رخصت — کس کو تھا ہوش کہ کل دیکھئے کیا ہوتا ہے
جان کی تن سے کہ یوسف کی تھی کنعاں سے وداع — یہی دھڑکا تھا کہ دم آج فنا ہوتا ہے
اہل لاہور کا دل کیوں نہ ہو حسرت کا ہدف — اک پرانا محب آج اس سے جدا ہوتا ہے

آپ جاتے ہیں کہ ہوش اپنے اڑے جاتے ہیں
دل بھی آنکھوں کی طرح سب کے بھرے آتے ہیں

منجبر نور سحر جیسے ہے شب کی ظلمت — منتج وصل اسی طرح ہے یہ فرقت
یعنی جاتے ہیں وہاں خیر سے حضرت کہ جہاں — آپ کے ہند کی ہوتی ہے معیّن قسمت
آپ سے ہیں کچھ امیدیں وطن مسکین کو — آپ پر آئینہ ہے۔ ہند کی ہے جو حالت
حریت اور معیشت کے۔ سیاست کے رموز — ہیں عیاں آپ پہ تفصیل کی ہے کیا حاجت
آپ رکھتے ہیں امّید کچھ ارباب وطن — اس میں آئین نوی ہو کہ تجارت حرفت
متعلق ہوتی ہے وقتی بھی اساسی بھی۔ مگر — اصل پہ چاہئے دینی نہ فرع کو دو قعت

دُور آنکھوں سے ہیں گھٹنے۔ یہ مثل ہے مشہور
ایک ہی جسم کے وہ بھی مگر اعضا، ہیں ضرور

انتخاب آپ کا گو اور کے ہاتھوں سے ہوا ۔۔۔ لیکن اے محترم اس بات کو دینا نہ بھلا
آپ ہندی ہیں اسی سے یہ ملا ہے منصب ۔۔۔ خدمتِ ہند کی خاطر ہی تو حضرت کو چنا
اس لئے ہند کی بہبود و ترقی کا خیال ۔۔۔ چاہئے دوسری چیزوں سے مقدم رکھنا
کہتے ہیں گھر ہے طلسمات کا وہ قصرِ سفید ۔۔۔ وہاں جو جاتا ہے رہ جاتا ہے ہکّا بکّا
اچھے منصوبوں کو اک رو میں بہا دیتا ہے ہمیں ۔۔۔ کایا انساں کی پلٹ دیتی ہے لندن کی ہوا
صُورتِ حال مگر آپ کی تو ہے کچھ اَور ۔۔۔ آپ کو ہے نہ وہ لندن نہ وائٹ ہال۔ بنا

یوں تو سب آتے ہیں رہتے ہیں چلے جاتے ہیں
ہیں مُبارک وہی جو خلق کے کام آتے ہیں

آپ کا کام یہ مانا کہ ہے مشورے دینا ۔۔۔ خدمتِ ہند کا کیا اس میں ہے لینا دینا
یہ تو سب سچ ہی سہی۔ ہے فرض مشیروں کا بھی ۔۔۔ صدرِ مشورے کو بد و نیک کا جتلا دینا
نقصِ افہام میں تفہیم میں تھوڑے تو نہیں ۔۔۔ ہیں جو قسّام مجازی ہی اُنھیں سمجھا دینا
کام جو کرتے ہیں ان سے ہی خطا ہوتی ہے ۔۔۔ نہیں شائستہ کسی کو بھی الہنا دینا
کچھ بھی ہو پھر بھی ہے معقول پسندی ان میں ۔۔۔ وہم نے قلعے جو گھڑ رکھّے ہیں وہ ڈھا دینا
عزم بالجزم ہو۔ دل صاف ہو۔ نیت ہو بخیر ۔۔۔ پھر ہے اک بات زمانے کو بھی پلٹا دینا

فضل و توفیق خدا ہوتے ہیں جب شاملِ حال
خدمتِ خلق خدا کا جبھی آتا ہے خیال

آپ اس قادرِ مُطلق کے ہیں عبدِ ممتاز ۔۔۔ جس کی رحمت پہ ہے کُل خلقتِ عالم کو ناز
آپ ہیں اہلِ نظر۔ علم و خرد کے مخزن ۔۔۔ کیونکہ رہ سکتا ہے یہ آپ سے پوشیدہ راز
سیّدِ قوم وہی تو ہے جو ہے خادمِ قوم ۔۔۔ مُضمر اس قول میں ہے نکتۂ ناز و نیاز
لیڈی قادر کا بھی ہمراہی میں ہے عزمِ سفر ۔۔۔ ان سے یہ ایک گذارش ہے بصد عجز و نیاز
آپ یورپ سے مع الخیر جب آئیں واپس ۔۔۔ سوشل، اخلاقی، وہاں کے جو ہوں طرز و انداز
فاش اُن کو یہاں مغرب زدہ لوگوں پہ کریں ۔۔۔ معتدل تاکہ ہو رفتارِ وطن کی پرواز

اب دُعا ہے کہ سفر خیر سے ہو جس پائیں

اور واپس نوزک وشاں سے وطن میں آئیں

اُستاد اور شاگرد

(۹ جون سنہ ۱۹۳۴ء)

تعلق جو گرو چیلے کا تھا اگلے زمانے میں
نہ تھا محدود مطلق وہ بس اس پڑھنے پڑھانے میں

وہ روحانی تعلق زندگی بھر کے لئے ہوتا
زیادہ باپ سے عزت میں تھا اُستاد کا درجا

محبت پر بنا کی جبر تھا استاد کا بھاری
ترقی بہتری اس کو بھی تھی شاگرد کی پیاری

وہ باتیں اب کہاں۔ اب تو کچھ ایسا دور آیا ہے
دلوں سے جس نے سب اگلے طریقوں کو بھلایا ہے

یہ فرض استاد کا بس رہ گیا ہے اِس زمانے میں
کہ لڑکے امتحانوں میں بہت سے پاس ہو جائیں

نتیجے پر ہے شاگردوں کے حصر اس کی لیاقت کا
سند پر امتحانوں کی مدار اس کی فضیلت کا

رٹائیں یہ نہ لڑکوں کو نصابوں میں جو لکھا ہے
تو استادوں کے پاس اسکے سوا چارہ ہی پھر کیا ہے

وہ باہر کچھ کریں۔ کیا اس سے مطلب ان بچاروں کو
پیامِ شوق وہ بھیجا کریں سنما ستاروں کو

سمجھتے ہیں کہ ان باتوں سے استادوں کو کیا مطلب
کرانا پاس۔ اب ٹھہرا ہے بس تعلیم کا مطلب

جو پہلے تربیت اور تزکیہ تھا خُلق و عادت کا
وہ اب ان درسگاہوں میں کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملتا

مگر اب بھی ہیں کچھ استاد موجود اس زمانے میں
سعی جنکی ہے شاگردوں کو نیک انساں بنانے میں

وہ نگراں اُن کے ذہن اور خُلق و عادت کے بھی رہتے ہیں
چلن لڑکوں کا سنبھلے اس میں وہ زحمت بھی سہتے ہیں

وہ کڑھتے ہیں کوئی شاگرد جب بدراہ ہوتا ہے
خفا ہوتے ہیں جب وہ شغل بد میں وقت کھوتا ہے

شفیقانہ تعلق اپنے شاگردوں سے ہے ان کا
نہیں وہ صرف پاس اور فیل کا ہے گیان اور گُن کا

یہی چاہا ہے ان کی کوشش پاس بھی شاگرد ہوں اُن کے
سداچاری بھی ہوں۔ و دوری ہو ان کو سارے عیبوں سے

یہ وہ اوصاف ہیں جو ہر کہیں پائے نہیں جاتے
جو تعلیمی سر رشتے کی ہدایت میں نہیں آتے

جو ضمناً آ بھی جاتے ہیں تو کس کو اسکی کاوش ہے
کہ اس بارے میں اس استاد کی کس درجہ کوشش ہے

نہ افسر ہی، نہ اس کو سرپرست اچھا سمجھتے ہیں
جو وہ کرتا ہے اس پر سب کے سب ناحق اُلجھتے ہیں

غرض محرومِ تحسیں کون ہے دُنیا میں اُس جیسا

جو دے داد اس کی جانکاہی کی۔ کوئی بھی نہیں ایسا

اِنتظار

(۵ ر اگست ۱۹۳۴ء)

دن بڑے ہوتے ہیں یا ہوتی ہیں راتیں لمبی — مجھ کو کیا فصل کوئی جاتی ہے یا آتی ہے
گرمی، سردی ہیں یہاں کس کو ہے فرق او رتمیز — رُت کوئی ہو۔ اسی حالت سے کٹی جاتی ہے

آنکھ کو انتظار ہے کس کا — رات کٹتی ہے کیوں مصیبت میں
اب تو تارے بھی ہو گئے ہیں چاند — یہ ترقی ہوئی بصارت میں

موت سے تجھ کو زیادہ سخت کہتا ہے جہاں — باز آیا میں تری تفضیل سے اے انتظار
تو اگر مرگِ مفاجات اے مری دمساز ہو — تو نہ ہو دِل کو مرے یہ کرب اور یہ انتشار

اے انتظار! تیرا کبھی خاتمہ بھی ہے؟ — میرے لئے ہے مرگ مسلسل ترا وجُود
مقسوم میں نہیں ہے اگر وجہ انتظار — ہو جائے کاش جان کو ہی جسم میں جمُود

دوالی یا دوالہ

(ماڈل ٹاؤن ۳۱ر اکتوبر ۱۹۳۴ء)

گر دوالی سے دِلوں میں بھی اُجالا ہوتا — ہند میں سوچ سمجھ کا نہ دوالا ہوتا
آج جس طرح جلاتے ہیں چراغوں سے چراغ — یونہی اِک دوسرے کا عاشق و والہ ہوتا
صفیں بھر جاتیں تو مندر میں جماعت ہوتی — صحنِ مسجد میں بھی تعمیر شوالہ ہوتا
یہ جو ہوتا تو جو دِل چاہتا وہ حاصل تھا — اپنا گھر دَیر و حرم سے بھی نرالا ہوتا
ان دہاڑوں نہ پہنچتے جو یہ ہوتا کردار — نفسی نفسی کا نہ نیا رسالہ ہوتا

غیر ملکوں میں نہ ہوتی کبھی یہ رسوائی — مرتبہ دہر میں ہندی کا دوبالا ہوتا
کام ظاہر کی پرستش نے بگاڑا ہے یہاں — دل کی باگیں تو کوئی موڑنے والا ہوتا
متّفق ہوتے جو آپس میں اخوّت ہوتی — وائٹ پیپر نہ یوں انگلینڈ میں کالا ہوتا
خوب آپس کے نفاقوں کی نکالیں راہیں — کوئی ملنے کا بھی رستہ تو نکالا ہوتا
روسیاہی سے بری چہرہ کی رنگت تو نہیں — سرخرو رہتے اگر رنگ بھی کالا ہوتا

تو سنانے کسے بیٹھا ہے یہ باتیں کیفیؔ
کوئی تو قوم پہ دل وارنے والا ہوتا

صبحِ بہار

(جے پور۔ ۱۹ اپریل ۱۹۳۵ء)

۲۰ اپریل ۱۹۳۵ء سے ۲۳ اپریل تک جے پور میں ایک عالی شان مشاعرہ ہوا۔ نظم کے لئے موضوع تھا۔ صبحِ بہار اور غزل کے لئے مصرع طرح تھا۔ ع آئے نہ بے نقاب وہ میرے خیال میں
اس صحبت میں نہ نظم پڑھی گئی۔ غزل اپنی جگہ پر درج ہوگی ؛

کیا جانفزا نظارہ ہے صبحِ بہار کا — بدلا ہوا ہے ڈھنگ ہی کچھ روزگار کا
ہے آج رنگ اور ہی لیل و نہار کا — آئینہ ہے فضا صنعِ کردگار کا

ہے یہ سحر تبسّمِ قدرت کہیں جسے
ہے یہ سحر ترنّمِ فطرت کہیں جسے

اس فصل کے کار نمایاں نئے نئے — پائے ہیں باغ و راغ نے ساماں نئے نئے
گلزار میں کھلے گل و ریحاں نئے نئے — جنگل میں لہلہائے گلستاں نئے نئے

فطرت کی رُوح رونقِ صبحِ بہار ہے
تصنیفِ کائنات کا یہ شاہکار ہے

ہے تازہ کاریِ صبحِ بہاری کی آشکار — گلشن کا اس سے آج دوبالا ہوا نکھار
کر دی فضا شمیم نے اک دم میں مشکبار — گلگونۂ شفق نے دکھائی عجب بہار

سبزان باغ آج دُلھن ہیں بنے ہوئے
شبنم جبین گُل پہ ہے افشاں چنے ہوئے

وہ کیف پاشی آج سحر کی فضا کی ہے
مستانی چال باغ میں باد صبا کی ہے
متوالی چال ڈھال فلک پر گھٹا کی ہے
صبح بہار ہے کہ کرامت خدا کی ہے

ٹکڑا جو ابر کا ہے صراحی بدوش ہے
رخصت زمیں سے کیا کہ فلک سے بھی ہوش ہے

اک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں سارے شیخ و شاب
دامِ کہن پہ صبح بہاری سے ہے شباب
بخشا شفق نے پیری کو اس کی بنا خضاب
گھاٹوں[1] کی دشت و راغ نے پائی ہے آب و تاب

ہے آج حسن عالم تکوین بہار پر
سبزہ کی ضو ہے نور فگن سبزہ زار پر

حسنِ ازل کی یہ سحر آئینہ دار ہے
رضواں کی روح اسکی پھبن پر نثار ہے
فطرت کا یہ سہاگ ہے۔ اس کا سنگار ہے
دیباچۂ ریاض ارم در کنار ہے

استھائی ہے ترانۂ تکوین کی یہ سحر
مشاطہ ہے جہان کی تزئین یہ سحر

بادل کی چال نرگس مستانہ ہو گئی
جو کھل گئی کلی وہی پیمانہ ہو گئی
گل کی بھڑک پہ شمع بھی پروانہ ہو گئی
راہِ قدیم خلق سے بیگانہ ہو گئی

غنچہ جو گل ہوا ہے تو گل پھول ہو گیا
زاہد آج فرط کیف سے سجدے میں سو گیا

یہ وہ گھڑی ہے نور ازل کا کہیں جسے
یہ وہ سماں ہے خلد کا نقشا کہیں جسے
اس کی ہوا وہ ہے دم عیسےٰ کہیں جسے
اس کی ضیا وہ ہے ید بیضا کہیں جسے

اس صبح میں ہے روح فزائی کمال کی

---

[1] شہر جے پور کے قریب ایک نہایت دلفزا مقام ہے۔ پہاڑ کی تلیٹی ہیں کئی میل تک سڑک دو رویہ باغ ہی باغ چلے گئے ہیں۔ اس کو گھاٹ یا گھاٹوں کہتے ہیں۔ گھاٹوں کا میلہ جے پور میں مشہور ہے۔ جو برسات میں ہوتا ہے ؁

اک شکل ہے تفنّنِ طبعِ جمال کی

مطلع ہے یہ سحر غزلِ کائنات کا　　یہ وقت حسن مطلع ہے نظمِ حیات کا
ہے قطعِ بند سلسلہ ممکنات کا　　مقطع ہے دے کے نوحۂ و بَینِ وفات کا

تشبیب ہے قصیدۂ ہستی کی یہ سحر
اس سے گریز ہی میں خزاں کو ملا مفر

مانا یہ صبحِ منتخبِ روزگار ہے　　تزئینِ حُسنِ صنعتِ پروردگار ہے
ایک اور اس بہار کے اندر بہار ہے　　جس پر کہ امن و راحتِ جنّت نثار ہے

شام و سحر نہ کیوں یہاں صبحِ بہار ہو
جب عدل و رحم و لطف کی جاں شہریار ہو

کوئٹہ کا زلزلہ

(ڈماڈول ٹاؤن ۵ جولائی ۱۹۳۵ء)

نامور صوبہ وہ ہندستان کا یعنی بہار　　لکھ گئے تاریخ والے جس کو سرتاپا بہار
تُو نے اے جوشِ زمیں اس کو کیا اُجڑا دیار　　دن دہاڑے حشر ڈھا کر بھی رہا دل میں غبار

کوئٹہ والوں کو جب دیکھا سلحشور اور جری
ان پہ شبخوں مارنے کی چال من میں ٹھان لی

یہ زمیں میں لغزشِ مستانہ کیسی آ گئی　　کیوں مچل کر اپنی سیدھی راہ سے کترا گئی
ابتری ایسی نظامِ دہر میں کیا چھا گئی　　زیب و زینت سے خود اپنی کیوں زمیں اُکتا گئی

گود میں تھیں اس کی وہ سب نعمتیں جو اس نے دیں
توڑ پھوڑ ایسی تو طفلانہ ہٹیں اس میں نہ تھیں

چرخ کو اب تک کہا کرتے تھے شاعر کینہ ور　　فتنہ انگیزی کا تھا الزام اس کی ذات پر
جو بلائیں آئیں اوپر ہی سے آئیں بیشتر　　بدنصیبوں کو مگر اس بات کی تھی کیا خبر

ظلم ڈھانے میں زمیں بھی آسماں ہو جائے گی
بند اہلِ ملک پہ راہِ اماں ہو جائے گی

ماتم تھا آنکھ جن سے چرخ پر روئے زمیں   بن گئی رونق ہیں جن سے یہ زمیں خلد بریں
قصر و ایواں وہ دکھائی اب نہیں دیتے کہیں   وہ کھڑے تھے کس جگہ یہ بھی نشاں باقی نہیں
ان سے اب باقی اگر کچھ ہے تو ہیں ڈھیر اور کھنڈر
اب وہ ہیں موضوعِ آثارِ عتیقہ سر بسر

سربلند آرامگاہیں حشر ساماں ہو گئیں   پُر شغب آبادیاں شہرِ خموشاں ہو گئیں
قیمتی تعمیریں سب گورِ غریباں ہو گئیں   چہچہاتی بستیاں اک دم میں ویراں ہو گئیں
کیا خبر تھی ان کی قسمت بھی وہیں سو جائیگی
آنکھ کھلنے میں جو آئی حشر کے دن آئے گی

تھے زمینوں کے جو مالک کھا گئی ان کو زمیں   دفن اپنے ہی مکانوں میں ہوئے زندہ مکیں
چند جیسے کچھ سسکتی لاشیں ملبہ میں ملیں   باقیوں کو جان لو گویا وہاں تھے ہی نہیں
بُردباری تھا ہمیشہ سے زمیں کا خاصّہ
جانستانی اور خونخواری میں اب یہ لا گیا

اے زمیں کتنا کٹھور اتنا نہ تھا تیرا سبھاؤ   جھونپڑی اور چند چیزیں جیسے گھر کا تھیں بناؤ
اُن غریبوں پر بھی آئے بن رہا تجھ کو نہ تاؤ   ہے مثل کافی ہے مرغی کے لئے تکلے کا گھاؤ
ہاں مساوات اور یکرنگی سے رکھّا تو نے کام!
یعنی چھوٹے اور بڑے سب کا کیا قصّہ تمام!

بجلیاں ڈنکے کی چوٹ آ کر گریں اکثر یہاں   شور اُٹھاتا ہے سمندر جب ہو طوفانی سماں
پیش خیمہ بھیج دیتی ہیں غضب کی آندھیاں   ہر بلا الفصّہ پہلے اپنا دیتی ہے نشاں
اے زمیں کرتی اگر پہلے سے تو اعلانِ جنگ
زندگی کا عرصہ یوں ہوتا نہ خلق اللہ پہ تنگ

ہے قیامت سے زیادہ کوئٹہ کا سانحہ   روزِ محشر ہی سے پہلے حشر برپا ہو گیا
حشر میں تو بچھڑے بھٹکے سب کا ہوگا جمگھٹا   لیکن اس آفت میں بیٹے کا نہیں ماں کو پتا
کنبے والے کل جو تھے وہ آج لاوارث ہوئے
لکھ پتی اب تک جو تھے کنگال اور مفلس ہوئے

مُردے ہی کھانے کی اب تک تو زمیں کو چاٹ تھی   اب اسے زندہ ہڑپ کرنے کی عادت پڑ گئی

اس نے تازہ کی نئے انداز سے رسمِ سنتی ساتھ ہی شوہر کے بیوی نے بھی اکثر جان دی
کتنی گودیں ہو گئیں خالی ۔ لُٹے کتنے سہاگ
اس پہ بھی اہلِ زمیں سے تھی زمیں کو سخت لاگ

"زندہ درگور" ایک فقرہ تھا فقط حرفِ مثال تھے مجازی جس کے معنی اور غلو سے عرضِ حال
اب وہ امرِ واقعہ ہے کل جو تھا امرِ محال نام کو اغراق کا اس میں نہیں ہے احتمال
سیکڑوں کیسے؟ ہزاروں دفن زندہ ہو گئے
بسترِ راحت پہ خوابِ مرگ میں وہ سو گئے

اب وہاں باقی مکیں ہیں اور نہ باقی ہیں مکاں بستیوں پر وحشت و ویرانہ کا چھایا ہے سماں
چرخ سے اُتریں بلائیں تو زمیں پر لیں اماں جان لیوا جب زمیں ہو جائے تو جائیں کہاں
اس بپتا کو سُن کے کس کا دل نہیں اندوہگیں
پانو کے نیچے سے گویا ہے نکلنے کو زمیں

اس کے آگے کیا کہوں معلوم ہے سب کو یہ حال قصۂ غم سُن کے کس کا جی نہیں ہوتا نڈھال
اب ہے تم سے صرف اک سیدھا سا اور سادہ سوال کیا یونہی اہلِ وطن کو رہنے دو گے پائمال
دو خُدا کے نام پر تم یا وطن کے نام پر
اس مصیبت میں مدد ان کی کرو دل کھول کر

سیکڑوں ہیں آپ کے آگے وہ ذی رُتبہ فقیر بات ہے کل کی جو تھے املاک والے اور امیر
پنجۂ افلاس کے وہ ہو گئے ہیں اب اسیر تم نہیں ہو گے تو ہو گا کون ان کا دستگیر؟
اس کڑے وقت اے عزیزو! ان کے نہ آڑے آؤ گے
تو قیامت میں انھیں کیا جا کے تم بخشاؤ گے

بخشتے ہو تم بہت دھرم اور دیں کے نام پر سُرگ اور جنّت میں خیراتوں سے بنواتے ہو گھر
معصیت کے رفع کو کرتے ہو صرف سیم و زر وقت ہے ذاتی غرض سے اب اُٹھا لو تم نظر
تم میں جو ہر ہے جو ہمدردی کا اس سے کام لو!
اور ان آفت کے ماروں کو جو دے سکتے ہو دو!

رحم و ہمدردی میں سب اہلِ وطن مشہور ہیں سرد مہری اور کنجوسی سے کوسوں دُور ہیں
کرتے ہیں گزران یا دولت سے وہ بھرپور ہیں الغرض ذی جاہ و سرمایہ ہیں یا مزدور ہیں

فرض ہر اک کا ہے اس کو کام اپنا مان لے
اور جس کی جس قدر طاقت ہو اس چندے میں دے

ہے وہی انساں جو انسانوں کا رنج و غم مٹائے ۔ ہے وہی مرد خدا جو بیکسوں کا دکھ بنٹائے
ہے وہی طاقت جو مظلوموں کو آفت سے بچائے ۔ ہے مبارک دھن وہی جو مستحق کے کام آئے

تم پر اُپکار اس کو مت سمجھو ۔ یہ اپنا کام ہے
دیکھ کر بپتا میں ان کو کیا تمہیں آرام ہے

بنسی کی دُھن سُنائے جا

(ماڈل ٹاؤن ۔ ۸ ؍ جولائی ۱۹۳۵ء)

جنم اشٹمی کے موقع پر

بنسی کی دُھن سنائے جا ۔ دھرم سے لَو لگائے جا ۔ پریم کا رس پلائے جا
پھر وہی گیت گائے جا
بنسی کی دُھن سُنائے جا

پھیلی ہیں ایسی بدعتیں ۔ بگڑی ہیں سب کی خصلتیں ۔ چھائی ہیں گہری غفلتیں
ہوش میں ان کو لائے جا
بنسی کی دُھن سنائے جا

توڑ کے بندشِ ملل ۔ کھو کے نفاق کا خلل ۔ بخش کے جذبۂ عمل
کام کا گُر سکھائے جا
بنسی کی دُھن سُنائے جا

پریم رہا نہ دیش کا ۔ دیش بدیش ہو گیا ۔ ہم کو تو اپنا ہت سکھا
مُردہ ہیں دل جلائے جا
بنسی کی دُھن سُنائے جا

اب نوبت کمال ہے ۔ کیا کہوں میں جو حال ہے ۔ حُبِّ وطن کا کال ہے

بگڑی کو تو بنائے جا
بنسی کی دُھن سُنائے جا
مان کو قوم کھو چکی۔ نام کو بھی ڈبو چکی۔ کرموں کو اپنے رو چکی
گر گئی ہے اُٹھائے جا
بنسی کی دُھن سُنائے جا
حد کی ہپت نپٹ کلیش۔ عنبر بنے ہیں جو ہیں خویش۔ اے مرے دوارکا نریش
بچھڑوں کو تو مِلائے جا
بنسی کی دُھن سُنائے جا

ہادئے قومِ قدیم

(دہلی سنہ ۱۹۳۵ء)

یاد ہوگا وہ زمانہ۔ اے بزرگو! دوستو! — جب بھلا بیٹھے تھے ہم دھرم اور دھرم اپدیش کو
وید۔ ہیں احکام جس کے کُل زمانے کے لئے — قوم کے لیکھے تھے گویا بھول جانے کے لئے
کیا **گنادہ** اور کیا **بشسٹ** نامور اور کیا **کپل** — سب بھُلا بیٹھا تھا افسانہ کی مانند اپنا دِل
ذکر جس میں تھا کہ انسان زندگی میں کیا کرے — تُم نے اُس **گیتا** کو رکھ چھوڑا اتھا مرنے کیلئے
ہندوؤں کی قومی حالت پھر نہ کیوں ہوتی سقیم — بھول جاتے کیوں نہ تم کو **بھیشم۔ ارجن۔ بھیم**
دھرم۔ کرم اور دین و دنیا کا غرض یہ حال تھا — جب ظہور اس دیس میں اک دیس ہتیشی کا ہوا
اے رشی صاحب نظر! اے ہادئے قومِ قدیم! — تو وکیلِ حق تھا۔ یکساں تھے تجھے رام اور رحیم
تیرے اُپدیشوں سے مردہ قوم میں جان آگئی — کھلبلی جو سو کھی تھی تیرے دم سے وہ ہریا گئی
اہل ہند اب تک جو تھے اک خواب میں مدہوش سے — ہو گئے پھر چونچال۔ اُٹھ بیٹھے نہایت جوش سے
اپنی حالت کی اُنھوں نے کی جو پوری دیکھ بھال — تو رِشی کی پیروی ہی میں ملی اصلاح حال

ایسے اُستو۔ ایسے سبق روز تو مِلتے نہیں — پھول ایسے باغ میں آٹھ دِن کھِلتے نہیں
اِس لئے اِک بات کہنا چاہتا ہوں آج میں — جانتا دیس اُنّتی کی ہو جسے معراج میں

تیج سورج کا ہے جیسے کل زمانے کے لیئے
ہے اسی صورت ہمارا دھرم سب کے واسطے

دھرم کے اُپدیش ہیں اور اُنتی کے کام ہیں
غیریت کا نام تک بھی ہے بھلا دینا ہمیں

دھرم میں نیچ اور اونچ کیا؟ کیسا چھوت اور کون غیر؟
دھرم سکھلاتا ہے پریم۔ اس سے الگ رہتا ہے بَیر

سبھیتا اور ہو روا داری اگر طرزِ عمل
تو ہماری کوششیں من مانتا لائیں گی پھل

ہے یہی آخر میں ترلوکی کے مالک سے دُعا
دویش ہتکاری کا تو سنسار میں ہو آسرا!

ان کو دے شکتی کہ جو اب تک ہٹے ہیں ان سے کام
کر دکھائیں اُس سے بڑھ کر یہ صدی ہو جب تمام

مرزا غالب

(ماڈل ٹاؤن۔ جنوری ۱۹۳۶ء)

اِک وقت تھا کہ باغِ سخن تھا خزاں کی نذر
شعر اور ادب کا ملک میں بازار سرد تھا

اُس وقت بھی تھے گرچہ ادیب اور نکتہ سنج
دُور ان سے دردِ میر تھا اور سوزِ درد تھا

پُر گوئی مصحفی کی نہ سودا کا وہ شکوہ
انشا کی جدّتوں کا بھی اب رنگ زرد تھا

ذوق اور مومن آتش و ناسخ بھی تھے یہاں
ان کا سمندِ خامہ بھی گو دُور گرد تھا

اک شخصِ خاص کی تھی ادب کو مگر تلاش
اُس کو لحاظ حال نہ ماضی کا درد تھا

مستقبل اُس کے سامنے تھا تھی اسی کی فکر
آئندہ ہی کی دُھن میں ادب رہ نورد تھا

تھے جو عوارض آنے کو اُردو کے سامنے
نبٹے جو اُن سے کوئی بھی ایسا نہ فرد تھا

غالب نے ایسے وقت میں پایا یہاں ظہور
جب دفترِ زبان و سخن فرد فرد تھا

مُورث تھا اُسکا کون؟ نہیں اس سے کچھ غرض
افراسیاب شاہ تھا یا یزدجرد تھا

اس دور میں ہے اس پہ مگر سب کا اتفاق
میدانِ شعر کے لئے غالب ہی مرد تھا

ماضی سے کرنے کو تھا جو آئندہ عہد جنگ
سرکردگی کو اس کی وہ میرِ نبرد تھا

صنّاعی اس نے کی ہے وہ تخئیلِ شعر میں
طرزِ قدیم جس کے تقابل میں گرد تھا

وہ اختراعِ طرز میں نثر اور نظم کے
بے شک وحیدِ عصر تھا۔ بے مثل و فرد تھا

اسلوبِ خاص۔ طبع میں جدّت۔ قلم میں زور
تھا اُس کے سر میں جوش۔ بھرا دل میں درد تھا

تزئینِ نقشِ شعر ہوئی اُس کے کلک سے   ہر مرکز اس کا ایک خطِ لاجورد تھا
اس کی شمیم سے ہے معطّر مشامِ رُوح   گیا سَہر سَبد ریاضِ بلاغت کا ورد تھا
ہمنام تھا جو شیرِ خدا کا اسی لیئے   غالب ادب کے معرکے میں شیر مرد تھا
مغلُوب کرنے کیا اُسے آلامِ دُنیوی   وہ دشت و راغ میں بھی خیاباں نوَرد تھا
صُوفی تھا اعتدال سے ہٹتا مزاج کیوں   یکساں اُسے زمانہ کا ہر گرم و سرد تھا

کیفیؔ اُسی کے مصرع کو تُو فاتحہ میں پڑھ
"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

نوحۂ وفات پنڈت موتی لال نہرو

(لاہور ۔ ۷ فروری ۱۹۳۱ء)

سر پہ کھیلے جو وطن کے لئے سردار وہی   خادمِ قوم وہی زُبدۂ احرار وہی
جان و تن ملک پہ قربان ہو ایثار وہی   جسکی تقلید کرے خلق۔ ہے کردار وہی
خادمِ قوم ہی مخدوم ہُوا کرتے ہیں
قوم کی آن پہ جو جان فدا کرتے ہیں

ہند رویا تھا نہ کیا ہجرِ تلک کے غم میں   رحلتِ داس سے باقی نہ رہا دم دم میں
ملک تھا لاجپت۔ اجمل کے ابھی ماتم میں   ایک گاندھی کا علمدار رہا تھا ہم میں
وہ بھی افسوس کہ اب ہم سے جُدا ہوتا ہے
آج سنگم بھی اسی غم میں لہُو روتا ہے

آج ماتم کدہ کیا صرف ہے آنند بھون   مُرغِ بسمل ہے ترے سوگ میں ہر اہلِ وطن
چاک ماتم میں نہیں کون سا ہے وہ دامن   لارڈ ارون کو بھی اس صدمہ سے ہی رنج و محن
زندگی ہو تو یہ۔ اور موت ہو تو ایسی ہو
یار و اغیار کا دل جِس کے سبب زخمی ہو

قید اور بند میں دن جنکے گزر جاتے ہیں   وہی آزاد بندھی قوموں کو کر جاتے ہیں
وہ نہیں مرتے۔ نہ سمجھو کہ وہ مر جاتے ہیں   سنگِ بنیاد وہ آزادی کا دھر جاتے ہیں

خدمتِ قوم میں جو رنج والم سہتے ہیں

وہ شہیدانِ وطن ہی تو امر رہتے ہیں

نشۂ حبِّ وطن سر سے نہ تیرے اُترا　　تیرے کُنبے سے بھرے جیل ترا جی نہ بُجھا

جیل میں بھی نہ قدم باپ کا جس نے چھوڑا　　باپ تجھ ایسا ہو، بیٹا ہو جواہر جیسا

ایسے ہوتے ہیں سپوت ایسے محبانِ وطن

ہیں یہی رُوحِ وطن اور یہی جانِ وطن

تیرے برسوں کے مساعی کو تھی ملنی معراج　　تھا یہاں نقشِ عمل ہونے کو آغاز سوراج

سفرِ خُلد کا دِن تو نے نکالا کیا آج　　صاف دِل ہو گئے تھے راہ پر آئے تھے مزاج

دِل نہیں توڑتے دمِ عشق کا بھرنے والے

یوں گزر جاتے ہیں دُنیا سے گذرنے والے

حُریت کا وہ ترانہ کوئی تجھ سے سیکھے　　کام میں علم کو لانا کوئی تجھ سے سیکھے

مرتے قوموں کو جِلانا کوئی تجھ سے سیکھے　　وطنیت کا فسانہ کوئی تجھ سے سیکھے

آگ جو دِل میں وطن کی تھی بجھائی نہ گئی

ہائے افسوس صد افسوس کہ آئی نہ گئی

تجھے لیاقت کے تری مالک تحریر غلام　　حُبِّ قومی و تدبّر کا ہُوا تجھ سے نام

کیوں نہ کُل ہند میں ماتم کا مچا ہو کُہرام　　غمزدہ کیوں نہ ترے ہجر میں ہو مُلک تمام

بحر اور کوہ سے نکلینگے بہت موتی لعل

دوسرا ہند میں پیدا ہو تو ہو موتی لعل

داستانِ ترک

(ماڈل ٹاؤن ۱۴؍ دسمبر ۱۹۳۶ء)

انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ ہشتم کا مسز ارنسٹ والس سمسن کی خاطر
تاج و تخت سے دست بردار ہونا ؛

خالی نہیں ہے ترک سے کوئی بھی سرزمیں ہے ترک حریت کہیں۔ تو ترک حق کہیں
ترک اتفاق کا ہے کہیں یا ہے ترک کیں دیکھو تو ترک ترک کا ساماں کہیں نہیں

دُنیائے مادّی کا جو مردِ خبیر ہے
کہتا ہے بڑھ کے ترکوں میں ترک سریر ہے

اس کلیہ کو۔ آئیے۔ ہم مان لیں ذرا سچ مچ ہے ترک تختِ شہی بھی بہت بڑا
ہر صاحبِ سریر کا کب ہے یہ حوصلہ تختِ شہی کو چھوڑے لگا کر جو پشتِ پا

اکراہ و جبر کا نہ ہو کچھ شائبہ اگر
کچھ بھی علل ہوں تختِ شہی ہے عظیم تر

ترکِ سریر کی جو تو ارزنخ دیکھئے ہم پلّہ کوئی بھی نہیں گوتم کے ترک سے
تارِک ہوا وہ خلق کا دُکھ درد دیکھ کے کاسہ لیا گدائی کا خلقت کے واسطے

روحانیت محرک ترکِ شہی ہوئی
اُس ترک میں نجاتِ جہاں تھی بھری ہوئی

گوتم کے ترک کا سا نہیں ترک دُوسرا جو بعد ترک کام ہُوا اس سے رُونما
خلقت کی ذہنیت کا پلٹ اُس نے رُخ دیا اُس کا تو اِس زمانہ میں ہے تذکرہ ہی کیا

پھر بھی کرے جو ترک شہی پاسِ عہد پر
سمجھو وہ شیر دِل ہے۔ بڑا اُس کا ہے جگر

جذبات۔ ان میں جذبۂ عشق اس قدر شدید قدس انتما نہ مالو تو ہے عقل سے بعید
احساس نازک۔ امر وفا کا ہو دِل شہید تہدید ہو کسی سے۔ غرض ہو نہ ہو اُمید

ان صورتوں میں تختِ شہی کو جو چھوڑ دے

خلق اس کا نام پریم سے، عزت سے کیوں نہ لے

سر دے دئے ہیں عشق میں تاجِ شہی ہے کیا؟   دِل کے معاملہ میں غمِ دُنیوی ہے کیا؟
آگے گدائے عشق کے شاہنشہی ہے کیا؟   تدبیر و مصلحت کا یہاں دخل ہی ہے کیا؟

بالا بہت ہے عقلِ سیاسی سے شانِ عشق
ضد سے رہی رواج کے دب کر نہ آنِ عشق

کوئی بتائے سننے میں آیا ہے کب یہ حال   ایثارِ عشق کی یہ ہے معراج - یہ کمال
قصّوں میں سنتے آئے تھے ہم عشق کا مآل   اب آنکھوں دیکھکر ہوئی خاموش قیل و قال

ایڈورڈ ہشتمی وہ عجب کام کر گیا
مستغنی اہلِ دل میں بڑا نام کر گیا

اس شاہی سلسلے کی مسلّم ہے سروری   اس کو ہنوری کہے کوئی کہ وِنسری
جس کے علم کی مانی ہے عالم نے برتری   حاصل ہے جس کو ہند سے کشور کی داوری

اس خاندان اور قلمرو کا تاجدار
کرتا ہے جذبِ دل پہ سریرِ شہی نثار

اِنسان

(ماڈل ٹاؤن - ۲۴ر جولائی سنہ ۱۹۳۵ء)

سرتاجِ ہمہ موجودات کا تُو جوہر ہے مخلوقات کا تُو   عارف ہو اپنی ذات کا تُو کیا آگے ہیں تیرے جِنّ و مَلک
گر آتم بودھ کا شیدا ہو تو سب کچھ تم میں ہویدا ہو   پرچھائیں ہیں تیری پیدا ہو کندن کی دمک ہیرے کی ڈلک
ہیں دشمن جانی بیم و حزن ہے ذکر عدم دیوانہ پن   نور آنکھ میں کیا ہو جلوہ فگن گر تم ہو جس وقت تلک
ہے جسم جامد شکل صنم کیوں بارکش اس کا ہو یہ دِل   وہ سنگ نہیں آئینہ ہے دیکھ اس میں نُورِ ازل کی جھلک
ہے پیشِ نظر آئینہ ترے زنگار مگر ہے نفس ترا   حائل نہ اگر ہو دم تیرا تو سمائے دِل میں عرش تلک
سیماب وشی اور سعئ مضطر پائے ترقی کا نہ ثمر   قائم جو شجر اک ٹھور رہا تب قامت پایا سر بفلک

ایثار کا جوہر ہو تجھ میں تو عمل کا جذبہ عامل ہو
یکساں ہو قول و فعل ترا گر من کو خدمت کی ہو للک

دعوتِ عمل

(ماڈل ٹاؤن ۱۲ر اگست ۱۹۳۵ء)

حسبِ ترا ہے تردّد نسب ترا حرکت ۔۔۔ توکّل اور سکوں سے ہے پھر یہ کیوں رغبت
ہے تیری عمر کا سرمایہ جہد اور کوشش ۔۔۔ ہے عاقبت کا تری توشہ جوش اور شورش
خیال کر کہ ہوئی کیونکہ تیری نشو و نما ۔۔۔ تو پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے۔ غور کر تو ذرا
خبر ہے گوشت کا جب ایک لوتھڑا تھا تو ۔۔۔ تو ماں کے پیٹ میں چکّر لگا رہا تھا تو
قوائے ذہنی و جسمانی اب کہ ہیں کامل ۔۔۔ تو کس لئے تو فسردہ ہے اور ہے کاہل
فسردگی تو ہے انسان کی دشمنِ جانی ۔۔۔ یہ ہے تباہ کنِ ارتقائے انسانی
جسے سکون و توکّل بتا رہا ہے تو ۔۔۔ وہی جمود و تعطّل ہے ہمدم خوش خو!

تو پاؤں توڑ کے بیٹھا ہے کس لئے اٹھ اچل! ۔۔۔ یہ واہمہ ساختہ تیرا ہے۔ اس کو توڑ! انکل!
خدا ترا نہ ہے صیّاد اور نہ ہے جیلر ۔۔۔ خدا ترا نہ ہے جلّاد اور نہ شعبدہ گر
نہیں یہ بات تو یہ قوتیں تجھے کیوں دیں ۔۔۔ یہ ذہن و جسم کی کیوں طاقتیں تجھے بخشیں
تو ان سے کام لے ورنہ گناہگار ہے تو ۔۔۔ ادائے فرض میں اپنے نہ کردہ کار ہے تو
چڑھا ہے سر پہ ترے گر نوشتۂ تقدیر ۔۔۔ تو اس میں درج ہے یہ بھی کہ چھوڑ مت تدبیر
سُنی ہوئی ہیں وہ سب فلیسوفیا نہ گپیں ۔۔۔ نہ کام کرنے کے لاکھوں بہانے اور راہیں
یہ صبر اور توکّل عدوئے جانی ہے ۔۔۔ سکون اے مری جاں! موت کی نشانی ہے
خدا کا شکر کر اور صبر سے ہو تو آزاد ۔۔۔ ہیں وسوسوں کی تن آسانیاں ہی بس بنیاد
جوانی اور کہالت جوانی اور سکوں ۔۔۔ وجاہت بشریت کی حد سے ہے بیروں
ملی عمل کی تجھے ذاتِ قدس سے دعوت ۔۔۔ ادائے فرض سے کس واسطے ہے پھر نفرت
پسِ شباب جو ہے۔ شوق سے کہولت ہو ۔۔۔ مگر ہے شرم جوانی میں گر کہالت ہو
تو دیکھتا ہے کہ بوڑھے بھی ہیں کمربستہ ۔۔۔ اگرچہ آنکھوں سے اوجھل ہو منزل اور رستہ
مگر اے میرے جواں دوست ترا احوال ہوا وہ ۔۔۔ تو اپنی آنکھ تو کھول اے عزیز! اگر کچھ غور
وہ کیا ہے۔ سامنے آنکھوں کے تیری منزل ہو ۔۔۔ جو دل پہ رکھے تو کوئی سفر بھی مشکل ہے
نہ راہ گم ہی ہو یہاں۔ ہو نہ راہبر معدوم ۔۔۔ تو کس لئے ہو نہیں پھر یہ راستہ پر نہیں معلوم

آثارِ قدیمہ

(لائل پور ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء)

دیکھو نہ حقارت سے اُجاڑ اور کھنڈر کو
اقوام کی تاریخ کے ہیں یہ تو خزینے

جن ڈھیروں کو سمجھے ہو کہ مٹی کے ہیں تودے
ہیں چشمِ محقق کو وہ انمول دفینے

جُز دفترِ پارین کا ہے اینٹ یہاں کی
آئینہ ہیں ہر سنگ سے ماضی کے قرینے

پائے علما نے یہاں تاریخ کے دفتر
قرباں کئے جب اس پہ برس اور مہینے

یہ ٹھیکرے یہ پتھروں اور اینٹوں کے ریزے
تاریخ کی دیوی کے مُکٹ کے ہیں نگینے

ملبے جو تہ فرشِ زمیں دفن پڑے ہیں
تاریخ کے ایوانِ ترقی کے ہیں زینے

اک علم ہے اب مستقل آثارِ قدیمہ
تسلیم کیا اس کی افادت کو سبھی نے

تاریخ میں کھانچے جو بھتے پُورے ہوئے اس سے
تاریک زمانوں کو اجالا ہے اسی نے

موہن جدڑو اور وہ ٹکسیلہ کے آثار
تاریخ کے ترتیب ہوئے جس سے سفینے

تب ہاتھ لگے ہیں اُنھیں یہ گوہرِ نایاب
ویرانوں میں برسوں جو بہائے ہیں پسینے

ہے زیرِ زمیں رُوئے زمیں سے بھی پُر اسرار
ثابت کیا سائنس کی یہ دیدہ وری نے

سنہ ۱۹۲۶ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک

یہ مزاحیہ اور طنزیہ ٹکڑے ہیں۔ جو مختلف ہنگامی موضوعوں پر نظم ہوئے۔ چونکہ ان عنوانوں کے آخر **اٹ** یا **یات** آتا ہے۔ اس لئے اس حصّہ کو یات نامہ کہا گیا+

روحانیات

سنتے ہو کہتے ہیں جو اہل فرنگ — بھر کے سیم و طلا سے اپنا گھر
ساری دُنیا کو کر کے زیر نگیں — لا کے قبضے میں سارے بحر و بر
ایشیا اور ہند کا ہے فرض — کہ نہ میمن پہ جائے اس کی نظر
وہ تو روحانیت کا چشمہ ہے — اعتقاد اور دین کا ہے گھر
مالداری کے جو معائب ہیں — چھا گئے دیکھو کس طرح ہم پر
حال ہو گا یہی تمہارا بھی — ہو گئے طالب فراغ اگر
کوئلہ والوں ہی کو دیکھو تم — روز ہڑتال پر ہیں باندھے کمر
نت نئی منڈیوں کی ہے جو تلاش — جنگ کی ہے یہ علّتِ اکبر
تم سکھاؤ ہمیں بھی روح کے راز — اور چھوڑو نہ وہ قدیم ڈگر"
اہل مشرق سے ہے سخن میرا — ہوں نہ اس پند کے وہ زیر اثر
ہم میں روحانیت کا ہے جو وفور — مادّیت جو اُن میں ہے حد بھر
تو ہے لازم شعار سے اُن کے — لے چلیں اپنا اس قدر نو اثر

کہ نکل آئے اس سے اک اوسط — اور برابر کی ہم بنیں ٹکر
ورنہ دھوکے کی ہیں یہ سب باتیں — لوریوں سے ذرا نہیں کمتر
خوابِ غفلت میں تم رہو سوتے — یہی مقصد، یہی ہے مدّ نظر
اُن کو رُوحانیت کی ہے جو لگن — بانٹ دیں ہم کو اپنا مُلک و زر
کہہ کر اُن سے تو دیکھئے یہ ذرا — ساری توپوں کے مُنہ ابھی ہوں ادھر

ان کے اس قول میں بھی ہے اک بھید:۔
'من نہ کردم شما حذر بکُنید'

غرب کو گر شرق کر سکتے نہیں — اہل مشرق! اپنے لچھن چھوڑیئے
کیجئے انجیل کا ہر روز پاٹھ — وید، قرآن اور درشن چھوڑیئے
آسماں کی بادشاہت کا ہے شوق — تو مصلاّ اور آسن چھوڑیئے

معمّا ہے یہ کیا اے بوالعجب حیرت ہے
تہ و بالا زمانہ ہو رہا ہے کیا قیامت ہے
ہُوا قربان وہ خلقت پہ۔ خلقت ان پہ قرباں ہے
زمیں کی بادشاہت آسماں کی بادشاہت ہے

کل پنڈت اور مولوی میں تھا مناظرہ — ہونے لگا مناظرہ میں اک مکابرہ
ذاتِ خدا سے بحث تھی۔ یہ تھا معاملہ — قرآن اور وید تھے صرف مقابلہ
طرفین کی صدائیں بہت تیز ہوگئیں — وہ نکتہ خیز باتیں شرر ریز ہوگئیں
القصّہ بات باتوں میں اس درجہ بڑھ گئی — چھوٹے جو تھے۔ آستیں اُوپر کو چڑھ گئی
ہر چند خدا بھی کوئی تماشائیوں میں تھا — للّٰہی غازیوں سے یہ اس شخص نے کہا
ذاتِ خدا ہے مہر و موالات کیلئے — ہمدردی پر ہم اور مساوات کیلئے
شفقت جو اس کی خلق پہ ہے جاننا بھی ہے — خالق کا اپنے حکم کوئی ماننا بھی ہے

باتیں یہ آسماں کی زمیں پر نہ چھیڑ تو

تجھ کو خُدا کی کیا پڑی اپنی نبیڑ تُو

ہے غلط یہ خیال حضرت کا | رُوح کو فوقیت بدن پر ہے
زندگی انکے میل کا ہے نام | ہے عرض جسم رُوح جوہر ہے

رُوح دیکھی ہے کبھی جسم بغیر آپنے کیا؟ | مادّے سے ہے یہ پھر کس لئے بے پروائی
رُوح اور مادّہ ہیں لازم و ملزوم جناب | بات یہ فہم مبارک میں نہ ہرگز آئی

مادّہ روح کے بغیر بھی ہے | رُوح بے مادّہ کہیں بھی نہیں
شعبدے سحر سے نہیں سروکار | عالم ارواح کا ملا نہ کہیں

رُوح بازی بھی ایک پیشہ ہے | قلب کمزور اس کا دلبہ ہے
رُوحیں ملواتے ہیں ٹکٹ پر وہ | چیٹے بٹوں کا یہ تماشہ ہے

جمالیات

سمائی آنکھوں میں تیری نہ شان محبُوبی | نہ تیری رُوح کبھی بحر حُسن میں ڈُوبی
لگائے رہتا ہے سینہ سے کیا تُو یہ پُرزہ | ہے ذرّے ذرّے میں آئینہ دارئے خوُبی

تعّینات کا نکلا نہ تیری آنکھ سے خار | بساط دہر کا دیکھا کبھی نہ تو نے سنگار
سدا بہار ہمیشہ جواں ہے شاہد حُسن | ہے اسکے باب میں مہمل شباب اور بہار

دمن دمن چمن حُسن ہے کوئی دیکھے | ریاض خُلد کی ذروں میں دلکشی دیکھے
دہان تنگ نہیں قید خانہ جس دل کا | ہر ایک شے میں وہ انداز دلبری دیکھے

عشقیات

یہ باتیں سُننے میں آتی ہیں کیسی متوالی
جو اللہ والے ہیں اللہ ان کا ہے والی
غلط ہے کفر کا فتوےٰ کہ میں ہوں کافرِ عشق
جبھی ہے خلدِ بریں میں مری جگہ خالی

اصل میں سب یہ نری بوالہوسی ہے اے دوست
کیوں ہر شاکی تُو غمِ عشق کو کیوں روتا ہے
پُوچھنا مجھ سے کوئی اس کی نشاط انگیزی
رُوح کو اس سے فرح، دل کو سکوں ہوتا ہے
یہ جو ہوتا تو نہ ہم ہوتے نہ کچھ بھی ہوتا
روحِ ہستی کی ہے یہ موج، یہی سوتا ہے
اس کا عالم وہ طلسمات کا عالم ہے جہاں
جاگتا جس کو سمجھتا ہے تُو، وہ سوتا ہے
ذوقِ احساس جو حاصل ہو ملے درد کا لطف
آہ و زاری میں یونہی وقت کو تو کھوتا ہے

ہم کو تسلیم ملامت کے وہ کلمے ناصح!
ہر کبھی حق میں محبت کے جو تو کہتا ہے
اپنے ماں باپ سے۔ اولاد سے الفت ہے تجھے؟
غرض اور حرص کے کیوں پھیر میں پھنستا ہے

شبابیات

یہ عام شکوہ ہے دو دن کی چاندنی شباب
یہ چل دیا تو گیا لطف زندگانی کا
سنبھل کے کاٹے ہیں جس نے یہ دن جوانی کے
وہ لطف اُٹھاتا ہے پیری میں بھی جوانی کا

ترقیات

یہ کیوں ہر نئی بات ٹھہری ہے بدعت
ہے ایجاد و جدّت پہ کیوں طعن و لعنت
کوئی وقت تھا جب ہر اک شئے نئی تھی
قدامت جواب ہے۔ کبھی تھی وہ جدّت

جدت جو نہ ہوتی تو نہ ہوتا عالم
اک بدعتِ کبریٰ تھی ظہورِ آدم

ابلیس تھا سب سے پہلے جدّت کے خلاف
ابلیس کو مانیں یا خدا کو اب ہم

یہ آئے دن کی ہے تعریض کیا۔ یہ کیا ایراد؟
رفارمر پہ یہ کیسی ہے تہمتِ الحاد
ہر ایک بات نئی ہے جو قابلِ تعزیر
ہے اس جہان کا کیوں نام عالمِ ایجاد

تکوین کے فعل کا ہے یہ علم ہمیں
یعنی ہے یہ خلقت کا عمل بے پایاں
فارغ نہ ہوا خدا جو پیدا کر کے
یہ ارض و سما یہ مہر و ماہِ تاباں
پھر ان کی ترقّی کا تعیّن ہے عبث
بڑھ کر بھی نہ کیوں بڑھتے ہی جائیں انساں

قدرت کو تو سب کہتے ہیں نامتناہی
جس کی نہیں انتہا کسی کو معلوم
پھر صبر کے کیا معنی؟ توکّل کیسا؟
دولت سے قناعت کی نہ کیوں ہو محروم
انسان کو لازم ہے کہ بڑھتا جائے
کیا حد کمال اور کیا ہے مقسوم

بولا یہ سن کے شیخ، بہت کفر بک چکے
یہ کام جو گنائے ہیں ربّ العلا کے ہیں
ذاتِ خدائے پاک سے دعوئے ہمسری
سر کی خبر لیں آپ بھی جاہل بلا کے ہیں
یہ مسکرا کے شیخ کو ہم نے دیا جواب
ہم قائل آپ کی خردِ نارسا کے ہیں
جو کُنہ تھا حقیقتِ احکامِ پاک کا
دور اس سے ہاتھ آپ کے فہم و ذکا کے ہیں
حکمِ خدا ہے فعلِ خدا ہی تو مہرباں!
آئے کہاں سے عقل و فراست گنوا کے ہیں
اللہ ہے رحیم تو ہم رحم چھوڑ دیں؟
فتوے یہ شاید آپ کے دھریا نما کے ہیں
ماخوذ حکمِ رب ہے جو افعالِ پاک سے
تقلیدِ رب پہ کس لئے ورّے قضا کے ہیں

نادان! ہمسری نہیں۔ ہے یہ تو پیروی
بندے خدا کے ہم بھی تو بندے خدا کے ہیں

وہبیات

کیا کہا" ہم ہیں شاعرِ وہبی — فاعلاتن سے ہم کو کیا ہے کام
جی میں آتا ہے ۔ شعر کہتے ہیں — آمد ۔ اور ۔ نیچرل ہے اپنا کلام
قاعدے فن کے جن کو کہتے ہو — بر قدم اسپ طبع کو ہیں لگام
بحر کیا شئے ہے اور کیا ہے زحاف ؟ — مرغِ مضموں کے حق میں ہے وہ دام
ہے زباں بس وہی جو ہم لکھ دیں — اور آمد کا ہے فصاحت نام
شعر کہنے سے کام ہے ہم کو — ہے فسانہ عیوب و حُسنِ کلام
سُن چکے ہیں ڈھکوسلے سارے — ان قواعد کو دُور سے ہے سلام
کس کی ٹکسال ۔ اور کیا مرکز — ہم کسی کی نہیں سند کے غُلام
جن کو کہتے ہیں آپ اہلِ زباں — نہ چلیں اب تو ان کے چام کے دام
آجکل ہیں رواں کرنسی نوٹ — اگلے سکّے مُلت ہوئے ہیں تمام"

میں نے یہ عرض کی ۔ کہ حضرتِ من — سُن لئے ہیں نے آپ کے احکام
نوٹ کا آپ نے جو ذکر کیا — ساخت کا اس کی بھی ہے ایک نظام
نہیں اس کا مجاز ہر کوئی — ہے کسی اور کے لئے یہ کام
نوٹ اصلی ہیں اور جعلی بھی — ان میں جعلی ہیں قابلِ الزام
آپ کے نوٹ خانہ ساز ہیں سب — ان کے اُٹھیں اناڑیوں میں دام
یہ تو چل سکتے ہیں وہیں بے شک — نہ جہاں ہوں مبصّرانِ کرام
آپ فطرت سے اچھے ہیں شاعر — اور فطرت کا تو ہے سخت نظام
اس کے قانون ہیں اٹل سارے — مانتا ہے جنھیں جہان تمام
شعر کے قاعدے سے پھر باہر — کس طرح چل سکے کوئی اک گام

آپ شاعر نہ بن سکیں گے کبھی
اپنے ذمّہ لیں اور کوئی کام

متشاعر بھی نہیں آپ تو شاعر کیسے　　ترجماں ہو تو کوئی اور۔ مترجم ہیں آپ
ہے ابوالشعر کوئی۔ کوئی ہے جدّ النّاثر　　اپنے مُنہ آپ میاں مٹھو۔ یہ ہے خوب الاپ

خیال کی بھی ہے تنظیم میں کمال اُنھیں　　وہ نثر لکھتے ہیں۔ پھر اس کو نظم کرتے ہیں
پھر اس میں آپ کو کیا؟ ہے یہ اپنا اپنا ڈھنگ　　یونہی فضول کی جھنجھٹ میں آپ مرتے ہیں

جب نہ ہو دل میں سوز و ساز کا رنگ　　کیونکہ جم جائے فقرہ باز کا رنگ
شاعری ہے کہ شعر بازی ہے　　درد کا ہے نہ ہے گداز کا رنگ

جان گھُل جائے رُوح پھُنک جائے　　ذہن میں شعر تب ڈھلے گا کہیں
آپ پڑیئے نہ اس بکھیڑے میں　　شاعری خالہ جی کا گھر تو نہیں

اس کی تعریف جو سمجھے ہو کلام موزوں　　شعر اس کو نہ کہو شعر کا وہ ڈھانچا ہے
"ماورا" کا تو ہے کیا ذکر۔ ہے مطلب غائب　　ہے وہ اسلوب کہ ہر گام پر اک کھانچا ہے

کہی وہ نظم کہ بسمل ادب کو کر ڈالا　　یہ تُم نے خوب ہی واللہ بے تُکی ہانکی
کلام ہے کہ جنون کی بڑ ہے بے سر و پا　　زمین کی ہیں یہ باتیں کہ چرخ گرداں کی

ہے عبارت غلط، سیاق بھی سُست　　لفظ و معنی میں جوڑ میل نہیں
آپ فٹ بال کی بنائیں ٹیم　　شعر کہنا تو کوئی کھیل نہیں

اَدبیات

کل یہ شاگرد سے استاد نے جھنجلا کے کہا — تو پڑھے گا نہ کبھی ۔ ہٹ ۔ مرا بھیجا مت کھا
کند ہے ذہن ترا ۔ ٹھس ہے طبیعت تیری — کچھ نہ آئے گا تجھے ۔ قوم کا شاعر بن جا

ہے جو صاحب کے گلے میں تو ہے وہ بھی کالر — ہے جو بلڈاگ کی گردن میں تو وہ بھی کالر
کیا زباں کی بھی وسعت ہے ۔ تموّل ہے بہی — غور کے بعد تو فرمائیں ذرا اسکالر

ملک کے ایک بہی خواہ نے مجھ سے یہ کہا — شعر سے کیوں نہ لیا جائے یہاں کوئی کام ...... سوال
کیوں نہ دیں اس کے ذریعے سے عمل کی دعوت — رہتے تخئیل کے جنجال میں کیوں عمر تمام
ہوتے آئے ہیں سدا مُصلحِ قومی شاعر — اُن کا عزّت سے لیا جاتا ہے تاریخ میں نام ...... جواب
تھے زباں قوم کی اور روحِ ادب وہ استاد — آج تک بھی تو سند اُن شعرا کا ہے کلام
ہے جو منظورِ نظر تم کو ترقی و فلاح — اور آزادئ قومی کا پیا ہے گر جام
تو نہ سمجھو کہ ہے بے بہری کا ہمنام سوراج — ضابطے کا ہے وہ پابند ۔ قواعد کا غلام
شاعری میں بھی ہُوا ۔ اور یونہی حاصل ہو سوراج — کہ رہے پیشِ نظر ضابطۂ حُسنِ کلام
اس میں اصلاح کی ترمیم کی جو حاجت ہے — قومی شاعر نہیں ۔ اُستادوں پہ چھوڑو یہ کام

چیف سے مِس ہو الگ تو ہے وہ صاحبزادی — چیف سے مِس جو مِلے تو ہے لڑائی کی بات
یہ سیاسی نہیں یہ تو ادبی مسچیف ہے — غور فرمائیں ذرا منتظِمِ تعلیمات

شہرت اور داد کی جو ہے خواہش — واہ وا کا اگر ہے شوق بہت
شاعری کا تو گھر بہت ہے دُور — قومی نظمیں لکھا کریں حضرت

شعر تر سے تو کلیجہ تر نہیں ہوگا کبھی — تم ہو موزوں طبع ۔ کوئی پیٹ کا دھندا کرو
یہ سبھا ۔ وہ انجمن ہے ۔ جاؤ اور نظمیں پڑھو — خدمتِ قومی سے پوٹا تر ہو گر چندا کرو

کبھی دیکھا بھی ہے معانی ہیں — کہ فصاحت ہے کس پرند کا نام
ماحصل ہے فصیح گوئی کا — گرے سامع کے دل پہ سحر کا کام
قومی شاعر کا فرض اوّل ہے — ہو فصیح و بلیغ اس کا کلام

قاعدے سے یہ انحراف ہے کیوں؟ — تم تو سب ضابطہ کے ہو شیدا
ورد دستور جاپ ہے آئین — اور قانون ہے تمھارا خدا
پھر ہو کیوں دشمن قواعد فن — شعر کے قاعدے سے بغض یہ کیا؟

نہ لفظ ہی ہیں صحیح اور نہ ہے کلام فصیح — جو شعر ہیں ہو تمھارے اثر تو کیونکر ہو
نہ دیش ہی ہو سُتنتر نہ ہو وطن آزاد — سخن کا قوم کے دل میں ہو گھر تو کیونکر ہو

ناقص ہے روزمرہ غلط ہے محاورہ — شاید یہی کلام کا طرزِ نوی ہی نہ ہو
ذوق سلیم سامعہ کا شکوہ سنج ہے — ہاں دیکھنا یہاں کہیں قومی کوی نہ ہو

جس سے واقف نہ ہو انسان۔ جو وہ کام کرے — یاد رکھئے کہ ہے یہ بات نہایت ہی بری
خدمتِ قوم کے تو اور بھی رستے ہیں جناب — شعر کے حلق پہ پھیرا نہ کریں آپ چھری

خون دل کا خشک ہو تو شعر تر پیدا بھی ہو — درد ہو دل میں تو شعروں میں اثر پیدا بھی ہو
ترجماں جذبات اعلےٰ کی بنے کیونکر زباں — غم میں گھل جائے وطن کے وہ جگر پیدا بھی ہو

ایسٹر اور بڑے دِن کے جو دن آئے قریب — اٹھی ہے ایک پھڑک ان کو سخن سنجی کی
شاعری ایک الگ چیز ہے تُک بندی سے — ہے یہ سچ۔ اس میں ہے کیا بات شکر رنجی کی

غور سے سن رکھیں یہ بات حضور — شاعری کا تو گھر بہت ہے دور
آپ لکچر دیا کریں بے شک — نہ کریں شاعری کو چکنا چور

قوم کو شاعرانِ ذی شاں نے — نیچے گرتے ہوئے اُٹھایا ہے
بخشی مردہ دِلوں کو تازہ رُوح — مَوت کے خواب سے جگایا ہے
حُریّت ان کا نام جپتی ہے — نُور آزادی اُن کا سایا ہے
سچّے شاعر وہی تھے۔ اور اُن کا — کم نہ پیغمبروں سے پایا ہے
آجکل کے جو قومی شاعر ہیں — اُن کے حصّے میں کب یہ آیا ہے

مُوسیقیات

غنا کا رنگ نکالا جناب سائلؔ[1] نے — کچھ اس کی ہونے لگی بزم شعر میں تقلید
اور اب تو ہو گیا یہ ٹھاٹھ شعرخوانی کا — مشاعروں میں سناتے ہیں نغمۂ ناہید

پکھاوج کی پڑ ہیں وہ دف پر نکالیں — وہ ٹھُمری ہیں دُھرپد کی تانیں اُڑائیں
طبیعت اگر شعر کہنے پہ آئے — نہ کیوں روحِ آزادؔ[2] پر قہر ڈھائیں
ہے افہام و تفہیم بے سُود ان کو — رہِ راست پر تو وہ آئے نہ آئیں
وہی ٹھیکیدار اب ہیں شعر و ادب کے — جو سمجھاؤ ان کو تو دُھرپد سنائیں

بھائی نہ مشاعرے میں جانا — ہیں آپ کیسے سُنانے والے
سنگت ہے مغنّیوں کی وہ تو — ہیں جمع وہاں تو گانے والے

مغنّیوں کا ہے جلسہ یہ شاعروں کا نہیں — ہوئی ہے بزمِ سخن اب تو سخت بدڈھنگی
ہو اپنا رنگ جمانا اگر تمھیں منظور — مشاعرے میں چلو لے کے طبلہ سارنگی

---

[1] نواب سراج الدین احمد خان سائلؔ دہلوی۔ مصنّف نے پچھلی صدی کی اسیّیوں میں سب سے پہلے آپ کی زبان سے ترنّم کے ساتھ اشعار سُنے تھے۔ غالباً اس طرزِ غزلخوانی کے مُوجد بھی یہی ہیں۔

[2] شمس العلماء مولوی محمد حسین آزادؔ دہلوی۔ جو نئے طرزِ شاعری کے مُوجد ہیں۔

شاعری ہے اور تُک جوڑنا شے دوسری
کاغذی گل اور ریحانِ گلستاں اور ہے

ہے حقیقی سے جُدا عشق اور حُسنِ عارضی
چاہ کنعاں اور ہے چاہِ زنخداں اور ہے

خون کر کے شعر کا غازی تو بن سکتے نہیں
شیرِ قالیں اور ہے شیرِ نیستاں اور ہے

ہے علاج اُس کا تو ممکن۔ لیکن اس کا کچھ نہیں
اور ہے جہلِ مرکّب۔ جہلِ ناداں اور ہے

اس پہ طرّہ یہ کہ موسیقی سے لیتے ہیں مدد
اور ہے لطفِ سخن اور لطفِ الحاں اور ہے

شعر پر لاتے ہیں غش سنگیت کے منتر سے وہ
میر کا فن اور فنِ تان رس[۵] خاں اور ہے

شعر کے نقصوں پہ گانے سے نہ پردہ پڑ سکے
نادِ وِدیا اور ہے علمِ غزل‌خواں اور ہے

کیوں انجمن میں آ کر اپنی ہوا نہ باندھیں
شاعر تو جیسے تیسے۔ گانے میں ہیں وہ کامل

ٹھاٹھ ان کے ہیں، یہی تو وہ دن نہ دُور سمجھو
جب ہارمونیم ہو بزمِ سخن میں داخل

دو ہاتھ سُرستی کے اُڑے ایک ہاتھ میں
منہ چھُٹ غضب کے آپ زبردست ہیں بڑے

سر پیٹیں دونوں ہاتھ سے بیچاری کیوں نہ اب
شعر اور راگ دونوں پہ بپتا جو آ پڑے

شعروں کے ساتھ گانا
گانے میں ہے بتانا

ہے یاد قول دانا
یک تیر و دو نشانا

کل ہم سے ملے ایک گویّے شاعر
کہنے لگے ایک پنتھ دو کاج ہے بہ بہ

موسیقی و شاعری ہیں دونو بہنیں
شاعر ہو مغنّی بھی تو معراج ہے بہ بہ

زیر و بم کے شعر پر گولے نہ برسایا کریں
ذوق گانے سے اگر ہے۔ شوق سے گایا کریں

---

[۵] تان رس خاں دہلی کے مشہور گویّے حیدرآباد میں ملازم تھے۔ خیال گانے میں لاثانی تھے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں انتقال کیا۔

شاعری کا راگ سے ظالم نے بھیا کر دیا   تال سُر سے شعر کا بالکل ہی قیمہ کر دیا
مصرعِ موزوں اگر کوئی بھلا چنگا ملا   ساتھ لے کے آپ نے سُر کو بھی دھیما کر دیا
سُقم کے موقع پہ لے کر سات سُر کی ایک تان   اس کی بھونڈی شکل کو کیا ماہِ سیما کر دیا

اس سے ادب کی اور نہ خدمت ہو قوم کی   سمجھے ہیں دل لگی مگر اس شاعری کو آپ
جذبات کی نہ قوم میں تحریک ہو سکے   تشفّی کریں جو شعر سے خُنیاگری کو آپ

گانا تو بزمِ شعر میں داخل ہی ہو گیا   سارنگی طبلہ رہتا ہے باقی اور آؤ بھاؤ
پبلک کے حسبِ مذاق کی یہ ہو گئی ہو گت   تو اب انہیں جو چاہو وہی ناچ تم نچاؤ

سُننے والوں کے ہلاک کرنے تھے سحر مضمون پر   حال اب یہ ہے کہ ہل جاتے ہیں سر سُر تال پر
ماہرانِ فن کی کیوں خالی نہ پائیں ہم جگہ   جب چلائیں لوگ بزمِ شعر کو اس چال پر

مقبول ہو گیا کلام اُن کا   سُر تال نہیں ہے۔ لَے نہیں ہے
شاعر وہ نہیں۔ اگر گلے میں   زیر و بم چنگ و نے نہیں ہے

جب مضامین شعر کے الجھتے ہیں   وہ دگن کی اڑائے جاتے ہیں
شعر موزوں ہو یا نہ ہو کچھ ہو   بے تکلف وہ گائے جاتے ہیں

اے دوست اپنا رنگ جما خوب بزم میں   گر ہارمونیم نہیں کھٹ تال ہی سہی
مجرا کہو مشاعرہ کہنے میں ہو جو عذر   مضمون عنقا رہو ہے سُر تال ہی سہی

گائے بغیر شعر کا پڑھنا ہوا حرام   اب تان سین چاہئے۔ صدرِ مشاعرہ
ہوں شعر چاہے کیسے۔ مگر ہو گئے ہیں نُور   ہیں شمعِ بزم وہ۔ وہی بدرِ مشاعرہ

مضمون شعر کچھ بھی ہو لیکن گلا ہو تیز
تو کیوں نہ بزم شعر میں سکّہ جمایئے
گھبرا کے راگ سیکھیے جس طرح بن پڑے
گندھرب وِدّیالہ کہ ٹہتی میں جایئے

آپ کیوں خونِ جگر کھاتے ہیں
اِس سے تو کام نہیں چلنے کا
طاق پر رکھیے غالب اور آتش
کیجئے یاد گدھا دُم ٹھُڈ کا

سُن رکھیے کان کھول کے حضرت! کہ لد گئے
وہ دن کہ فاختہ جب اُڑاتے خلیل خاں
اب شُول فاختہ کی ذرا مشق کیجئے
تخئیل شاعرانہ کا موقع نہیں یہاں

پنچم۔ رکھب بھی ٹھیک ہو اور سَم بھی ہو درست
لَے کی چلت ہو اور ہو سُر کی مٹھاس بھی
بزمِ سخن میں رنگ جمانے کا گُر ہے یہ
گن رسیے زیب بزم ہوں کچھ آس پاس بھی

'وہ شاعر غرّا ہیں' نہ مانیں گے ہم
"گاتے بھی ہیں وہ؟ یہ تو بتاؤ ہم کو"
'اچھا کہتے ہیں' کہتے ہوں گے لیکن
وہ جانتے ہیں "تال کو، لَے کو، سَم کو؟"

خاک پتھر سمجھ میں آئے شعر
تان جب وہ اُونچ کی لیتے ہیں
پھر عجب کیا کہ سامعین کرام
داد کے بدلے "تال دیتے ہیں

پہلے شک ہونے پہ تقطیع کی فرمائش تھی
'فاعلاتن' کی جگہ چھینی ہے اب سرگم نے
کیا زحاف اور زوائد کا ہے مذکور یہاں
سب کو پڑتے ہیں چھپا رکھا ہے خالی سم نے

گئے ہم نفس اب تک تو فقط میگھ ملار
چھتری ہی نہیں تو میہٹ تھی خاصی ماہن
دیپک کا ریاض اب وہ کر بیٹھے ہیں
منگوالو مشاعرے میں فائر انجن

ہے فن کی کتابوں میں صریحاً تاکید
ہوں لفظ سلیس۔ اُن میں ترنّم بھی ہو

ہیں شعر کے پڑھنے کے بھی دلکش انداز
ہو لطف بیاں، لطف تکلّم بھی ہو
آواز میں ہو صعود اور ہیں نزول
جزر و مد لحن کا تلازم بھی ہو
لیکن یہ کہیں نہیں ہدایت دیکھی
برپا گانے کا اک تلاطم بھی ہو

ہاں ہاں انھیں سے طے کرو اور لے چلو وہاں
شاعر ہیں وہ ہے ان کا گلا پاٹ دار بھی
نیچو بھی باولا ہو جو اُن کی سُنے الاپ
لرزائے "تان سین" کو ان کی پکار بھی
ہر ہفت سات سُر سے ہو نا ظورہ سخن
لے جائیں مشعرے ہیں جو وہ سُر سنگار بھی

اس میں کیا شک ہے مغنّی کا ہے احساں شعر پر
ہے یہ وہ حکّاک پتھر کو نگینا کر دیا
تال سُر سے کیا سہانی اس کو بخشی ہے جلا
پانچویں سپتک سے اس کا کھوٹ بینا کر دیا

کتُب میں راگ کی تعریف ہے توازُنِ صَوت
لکھا ہے رقص کو وہ ہے توازُنِ اعضا
کہا ہے نظم کو وہ ہے توازُنِ الفاظ
ملائے تینوں کو جو۔ ہے پیمبرِ شعرا
گلے کے گھنگھرو ہوں جیداں ان کے پاؤں پر جو نثار
تو پھر یہ معجزہ ہو دلپسندِ خلقِ خدا
ہو یادگار زمانہ میں یہ نئی "تثلیث"
نہ چار کھونٹ میں نکلے کہیں جواب اس کا

مشاعرے میں سنگیت

"کچھ خبر آپ نے سُنی کل کی
کیفیت جو مشاعرے میں ہوئی
ابھی استفائی ہی الاپے تھے
میرا مطلب ہے مطلع گاتے تھے"
"بھئی سیدھی طرح سے بات کرو
فقرہ بازی کو جیب میں رکھ لو
جانتا ہوں وہ گا کے پڑھتے ہیں
اور گلے کے بھی وہ رسیلے ہیں
اس میں پھر کون سی ہے بات نئی؟
ہاں۔ ہوا کیا سُنائیے تو سہی"
"آپ نے بات کاٹ دی میری
اور وہ بات مجھ کو بھول گئی"
"اچھا یہ رنگ! خیر جانے دو
ہم نہ بولیں گے اب۔ معاف کرو"

"ہاں وہ مطلع کی لے رہے تھے خبر — گا رہے تھے وہ خوب لہرا کر
دُور جلسہ کے ایک گوشے سے — جہاں کچھ لوگ جٹ کے بیٹھے تھے
چند سازوں کے سُر بلند ہوئے — لگ گئے کان اس طرف سب کے
بانسری اور ایک چھوٹا چنگ — اور ننّھا سا ایک تھا مردنگ
ایک کنسرٹینا بھی اُن میں تھا — اور مجیروں کی بھی سُنی تھی صدا
اس طرح کے تھے اور بھی باجے — تھے سُر بیلے۔ بڑے رسیلے تھے
تھی وہ سنگت ذرا نہ بیڈھنگی — سارے سازوں میں تھی ہم آہنگی
جلسے والوں کو تھی بہت حیرت — کہ یہ آئی کہاں سے سُر سنگت
اپنی دھن میں جو گائے جاتے تھے — وہی یہ سنگتی بجاتے تھے
وہ کئی شعر گا گئے یوں ہی — تب کہیں جا کے ان کو سُدھ آئی
وہ ہنسے بائیں کی خوب کی پرتال — تو کھلا جا کے ان کو اصلی حال
مارے غصہ کے چہرہ پھُول گیا — تال۔ سُر۔ گُر۔ گرام بھول گیا
گا رہے تھے کہ رو دئیوں آئے — سٹ پٹائے۔ بہت ہی گھبرائے
بولے :۔ "بس واہیات! کیا ہے یہ! — مشعرہ ہے کہ آپیرا ہے یہ!"
بولا سنگت سے منچلا کوئی — "مشعرہ ہے کہ بزمِ موسیقی؟"
اس پہ اونچے سُروں میں فرمایا — "شعر گانے کے ساتھ ہے آیا"
کہا اس نے :۔ "یہ قول دانا ہے — جہاں گانا وہیں بجانا ہے
آپ کیوں تلملائے جاتے ہیں — گائیے ہم بجائے جاتے ہیں"

اس پہ جلسہ نے پیٹ دی تالی
اور شاعر کی تھی جگہ خالی"

قاموسیات

فہم انساں سے جو ہے بالاتر آپ کا نادر کلام
سننے والوں کو نہ ہوں کیں واسطے مایوسیاں
فقرے فقرے پر اگر کوشش اور ضروری ہے شراح
کب سمجھ میں آسکیں یہ آپ کی قاموسیاں

شاعری کا تو نہیں واسطہ لفاظی سے
شعر گوئی کا انھیں پڑ گیا کیوں چٹخارا
لوٹتے ہیں جو ہے لفظوں کے تشکم میں گدبد
کھولنے بیٹھو جو مطلب تو کھلے بھنڈارا

ان کے شعروں میں اس قدر بھرمار
فارسی کی ہے کیوں ؟ نہ سمجھے ہم
اس کا مجھ سے سنیں جواب جناب
ہے بہار سخن بہار عجم

شمع ان کے سامنے آئی کہ گھس پھس ہے شروع
ہو رہی ہیں حاضرین جلسہ میں سرگوشیاں
کوئی کہتا ہے یہاں کیوں آئے جائیں دیوبند
ہیں وہیں کو لائق ان کی یہ بلاغت کوشیاں
پڑھنے بیٹھے وہ کہ سارا مجمع گم سم ہو گیا
اور وہ سمجھے مرادف داد کی خاموشیاں

ذوق ہندی کا اگر ہے شوق سے ہندی لکھیں
اس زباں کی کیوں کیا کرتے ہیں وہ مٹی خراب
چھوڑ کر اردو کو وہ ہندی اگر لکھا کریں
ہم بھی کہہ دینگے ہے یہ اجائبن کا نشانا من جواب

شعر ان کے سمجھ میں کیا آئیں
بے طرح ہے لغات کی بوچھاڑ
وہ بلاغت اسے سمجھتے ہیں
کہ فصاحت کو دیں پتال میں گاڑ

بیاں میں ہیں گلجھڑیاں سر بسر
ہے اسلوب یا گیسوئے خم بہ خم
وہ ہے نثر یا نظم اس ڈھب کی ہے
لغت کی کتب چاہئیں دم بہ دم

مطلب جو ملے کہیں ہمارا ذمہ
تشبیہ کی اک بھول بھلیاں ہے یہ

مضمون جو ہو تو عالم بالا پر   تخئیل معالیہ کا طوفاں ہے یہہ

استعاروں کا ہے گرداب کلامِ اقدس
اس میں ممکن نہیں معنی کا لگے تھل بیڑا

ہے کلامِ جناب بس کہ دقیق   اس کو سمجھے یہ کس کو یارا ہے
نہیں تشبیہ میں اگر تشبیہہ   اِستعارہ در استعارہ ہے

مطلب خاک سمجھ میں آئے   ہے خیرہ ہر چشم نمایر
ایسے موقع پر ہی کیا ہے   المعنی فی بطن الشاعر

یہ حالت جو تخئیل عالی کی ہے   تو مضمون پا در ہوا کیوں نہ ہو
جو صنعت نگاری کا ہے یہ جنوں   تو پھر صنعتِ مہملہ کیوں نہ ہو

الفاظ کے اختراع میں غرق ہیں وہ   معنی کی کریں فکر یہ جھمیلا ہے یہہ
دیں کچھ بھی اتا پتا تو مطلب نکلے   ہیں اور یہ پہیلیاں پہیلا ہے یہہ

انھیں مغلق بیانی میں کمال اس درجہ حاصل ہے   ہمارا ذمہ ان کی بات جو کوئی ذرا سمجھے
کلام ان کا سراسر فہم سے انساں کی برتر ہے   انھوں نے جو کہا وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

بات ہے وہ کہ اک معمّا ہے   بدر چاچی کا یا قصیدہ ہے
نادر روزگار ہے یہ کلام   کوئی سمجھے نہ کوئی سمجھا ہے

جو سنے اس کا سر پھرے گتھیاں بات بات میں
کہتے ہیں 'کلک فی السواد' ہو جو قلم دوات میں

ان کی ایسی سخن سرائی ہے — معتقد جس سے کُل خدائی ہے
کوئی کھائے نہ کھائے پچھتائے — یہ بھی گپ چپ کی اک مٹھائی ہے

معنی کو کرے اخذ یہ کس کی ہے مجال — ہر بات غرابت کا ہے گویا پھندا
مضمون نہ کھُل سکے کسی پر انکا — الفاظ کا ہے عجیب گورکھ دھندا

نہ سمجھے کوئی اور نہ سمجھا سکے — یہ تصنیف کا آجکل ہے طریق
پہنچ ان کے معنی تک از بس محال — "حوالیہ مِن کُلِّ فجٍ عمیق"

اُن کی قاموسیاں سُن سُن کے یہ بولے نقّاد — بے شبہ روح غرابت ہے کلامِ عالی
لفظ ہیں خُوب گرانڈیل بہت ہی بارُعب — پیٹ الفاظ کا معنی سے مگر ہے خالی

ان کی جانے بلا کہ ثقل ہے کیا — اور کیا جا لوز تنافُر ہے
مغز معنی درست ہو کیونکر — شکم شعر میں قراقُر ہے
بولے یہ سُن کے آپ کو پھر کیا — شاعری یہ نہیں تشاعُر ہے

کہتے ہو سخن میں تیرے سب وصف — معنی سے مگر ہے اس کو پاکی
تسلیم تجھے یہ عیب حضرت — بے عیب تو ذات ہے خُدا کی

پیٹ گورکھ کا کھولنا کیوں ہے — جانے نقّاد کو ہے کیا آزار
دیکھے لفظوں کا اختراع عجیب — نئی ترکیبوں کی یہ تازہ بہار
اس میں معنی کی ہے تلاش عبث — "محتسب را درونِ خانہ چہ کار"
دیدہ زیبی پہ ہو سخن کی نظر — قول سعدیؒ سے کیوں ہُوا انکار
"ہر کرا جامہ پارسا بینی — پارسا دان و نیکمرد انگار"

اتنی چیزیں تو ہیں پھر چاہئے کیا اور مجھیں ایک چیز اس میں جو تم کو نہیں ملتی نہ سہی
استعارے ہیں صنائع بھی ہیں تشبیہیں بھی ”نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی“

معاشیات

نکمی چیز ہے دولت یہ کس غبی نے کہا ضرور بات میں ہے زندگی کی اس کا شمار
یہ ایک چیز ضروری ہے یاد رکھ لیکن نہیں اس ایک ہی شے پر تو زندگی کا مدار

یہاں کوئی جو زر و مال کا پجاری ہے تو کوئی روٹی لنگوٹی سے بھی تو عاری ہے
جو ٹھیک ٹھیک ہو تقسیم زر جماعت میں کوئی ہزاری یہاں ہے نہ پھر بھکاری ہے

سیاسیات

منزل کی جستجو میں ہوں آوارہ ہر طرف کھو بیٹھا اس ہوا میں یونہی اپنے گھر کو میں
خود غرضی اور خودی میں نہیں لطف زندگی پاؤں تو اس جہاں میں نہ پوچھوں خضر کو میں
اصلاح ”مصلحوں“ کے جو اخلاق کی کرے لاؤں کہاں سے ڈھونڈ کے ریفارمر کو میں
حامی ہے اتفاق کا ہر بانیٔ نفاق لڑنے میں برق پاتا ہوں ہر صلح گر کو میں
سمجھاؤں جس کو چپکے سے کہتا ہے وہ یہی بھائی بشر ہوں پھینکوں کہاں جا کے شر کو میں
ملنے میں دیکھتا ہوں بگڑنے کے رنگ ڈھنگ الفت میں رنگ رنجش باہمدگر کو میں
ہر تیز رو کے ساتھ میں لگ جاؤں کس طرح کیوں راہزن نہ سمجھوں ہر اک راہبر کو میں
کرتا نہیں کسی کی میں تقلید اس لئے پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

لالا کے گھروں سے جو کپڑوں کو جلاتے ہیں
وہ چڑھتے ہیں کتوالی اور لاٹھیاں کھاتے ہیں
عاشق کا جلا کر دل جو خاک بناتے ہیں

ہم بھی تو سُنیں۔ اُن پر جو دفعہ لگاتے ہیں

(۲۰ مارچ ۱۹۲۹ء)

پٹھانیات

رکھے اللہ اماں ہیں کابل کو
سقّہ بچہ ہے فاسد و غاصب

یہ بہشتی کا کونڈا ہو فی النّار
اس پہ قندھاری فوج ہو غالب

دیکھا مُلّانوں نے طوفان مچایا کیسا
کام دس سال کا مٹی میں ملایا کیسا

شور بازار سے فتنہ کا ہؤا شور بلند
اور اس شور نے یہ حشر اُٹھایا کیسا

زمانے کی یہ کیسی رفتار ہے
کہ دار الاماں شور بازار ہے

جدھر دیکھیے شور و شر لوٹ مار
اس الٹی سمجھ پر علی کی سوار

گنوا بیٹھے "تمیز سُود و زیاں
مٹاتے ہیں اپنا ہی نام و نشاں

(۲۰ مارچ ۱۹۲۹ء)

ملّیات

مسلم اور ہندوؤں سے میرا قول
ہے یہی۔ کاش وہ اسے سُننے

"ہند میں راج جب تمھارا تھا
اُن کو آنے سے تم نہ روک سکے

کس طرح اب نکال سکتے ہو
بن گئے ہندی اب وہ تم جیسے"

اور مسلمان بھائی بھی یہ سُنیں
"تم تھے جب شاہ یہ رعایا تھے

ان کی ہستی تم اتنی صدیوں میں
صفحۂ دہر سے مٹا نہ سکے

پھر یہ کس واسطے ہے جنگ و جدل
کیوں ہیں اب یہ لڑائی یہ جھگڑے

رہو مل جل کے دونوں اہل وطن
اور چھوڑو بھی یہ شُتر غمزے"

جو تم کو شُدّھی و تبلیغ کا ہؤا سودا
تو سبّ و شتم پہ پھر کیا ہے اور کیوں جھگڑا

جو چاہتے ہو کہ غیر آکے تم میں ہو شامل — تو حسن خلق و محبت کا پہن لو جامہ

ہوئی شمولیت دیں جو اب یہاں جاری — اخوت اور وطنیت کی ہو گئی خواری
بہ گُر کی بات نہیں سوجھتی کسی کو حیف — کہ روح شُدّھی و تبلیغ ہے رواداری

جو روح نیکی و ایثار آپ کا ہو چلن — تو پھر یہاں کوئی کافر رہے نہ کوئی یمن
لڑائی جھگڑے سے تبلیغ ہو نہ شدھی ہو — ہے سب کے سامنے جو کام کر رہے ہیں مشن

جو دُھن توسیع دیں کی ہے تو اچھی بات ہے لیکن — ہدایت جو ہوئی ہے وہ بیاں اس کا بھی نہیں آیا
بناؤ نیک لوگوں کو ثمر مل جائے گا اس کا — کلام پاک میں ارشاد "اجر المحسنین" آیا

جب کہتے ہیں تلوار سے اسلام نہ پھیلا — پھیلائیگا پھر کیا یہ چھرا اور یہ ڈنڈا؟
ست دھرم کی ہے جان اہنسا اسکو ہو کہتے — کرپان کا لاٹھی کا یہ پھر چوچلا کیسا؟

محبّت سے ہوتی ہے توسیع مذہب — صداقت سے ہوتی ہے توشیع مذہب
نہیں زور اور زر سے دل جیت سکتے — یہی کہہ گئے اہل توضیع مذہب

ہندو ہوا نہ ہند مسلمان کُل ہوا
حُبّ وطن کا مُفت میں افسوس قتل ہوا

فکر یہ ہے کہ بڑھے آبادی — قتل سے اس کی کریں ایزادی
اس سمجھ والوں کو سمجھے اللہ — قومی ایزادی ہے یا بربادی

ارے نادانو! یہ ایزادی ہے یا بربادی — کبھی تلوار سے لاٹھی سے بڑھی آبادی
دین اور دھرم منافی جو اخوّت کا ہو — اس کی توسیع نہ ہو گی کبھی اور ایزادی

یہ فکر ووٹ بڑھانے کی جو دو طرفہ ہے — جدید ضابطہ آئین کا شگوفہ ہے
یہ خوب ہاتھ میں بندر کے استرا سونپا — وہ اپنے زعم میں سمجھا وہی خلیفہ ہے

شمار اس سے بڑھے اور نہ اس سے ووٹ بڑھے — اگر بڑھے تو دو طرفہ دلوں کی چوٹ بڑھے
خلوص پہلے ہی کم تھا رہا نہ نام کو اب — جدید ضابطہ سے خوب من کے کھوٹ بڑھے

حُریت کا ہے جزو لاینفک — یاد رکھو باہم رواداری
وہ مُحبِ وطن کہاں سے ہُوا — نہیں انسان جو سدا اچاری

یہاں جو ہے وہی مصروف خانہ جنگی ہے — فدا وطن پہ ہر اک بچہ فرنگی ہے
جو لڑتے لڑتے تھکے۔ ذات پات لے بیٹھے — یہ ڈوم ہے۔ یہ جولاہا۔ یہ نائی۔ بھنگی ہے

یہی ہر ایک زباں پر ہے۔ ہم تو ہیں معصوم — انھیں نے جنگ پہ باندھی تھی سب سے پہلے کمر
جواب میں تھا سراسر کیا جو ہم نے سلوک — مخالفوں نے سنبھالے تھے پہلے تیغ و تبر
بدی۔ بدی سے نہیں۔ نیکیوں سے مٹتی ہے — کبھی یہ راز بھی اے مہرباں! کھلا تم پر
وہ بدتھا پہلے پہل کی جہاں میں جس نے بدی — کی اسکے بدلے میں جس نے بدی وہ تھا بدتر

بتائیں کیا تجھے اور کیا سمجھائیں یار عزیز — تجھے تو کام کی باتوں سے کوئی کام نہیں
یہ یاد رکھ کہ بدی سے بدی پنپتی ہے — فنا کرے جو بدی کو وہ انتقام نہیں

جہاد کیسا ہے یہ اور دھرم یدّھ ہے کیا؟ — یہ کس طرح کی شہادت ہے اور قربانی
شہادت اصل میں تو اب ہوئی ہے آکے شروع — پولس نے دستِ مبارک کی جو تو اضع کی

تھا وقت کہ تم رکھتے باہم صلح و صفائی — یہ بات دماغوں میں نہ آنی تھی نہ آئی
اب آئی کمیشن[1] تو کھلا ہوش کا دڑبا — کہنے لگے مل جاؤ۔ چلو چھوڑ دو لڑائی

---

[1] سائمن کمیشن سے مراد ہے

دِل کھول کے کر بیٹھے ہو جب بھائی کاٹ سُوجھا ہے کمیشن کا تمھیں بانٹی کاٹ
جب ذہنیت اس درجہ ہو ناقص تو کیوں ہو قوم نہ تین تیرہ اور بارہ باٹ

یہ رنگ ڈھنگ تمھارے یہ طور و طرزِ عمل فتورِ عقل میں ہے اور دماغ میں ہے خلل
یہ گھر کا حال ہے تو گت بنے گی ملک میں کیا؟ سوراج آپ کو ملنے لگا ہے آج نہ کل

سر میں لوگوں کے سمایا ہے گدھا دم ٹھیکا دیس سے ہو انھیں کیس واسطے اُنس اور رغبت
رنگ کلیان کا بگڑے جو الاپے بے سُر ٹھاٹھ ایمن کا جمے کیا۔ جو ہو بگڑی ہوئی گت

ہیں اب بھی اُلجھ پڑتے سماج اور سبھا بھولا نہیں مومنوں کو بھی رفع یدین
باہر نہ ملے کوئی تو گھر میں کھٹ پٹ بے جنگ بہادروں کو پڑتا ہے چین؟

جو رشی اپنی اعانت آپ کر سکتے نہیں جو ولی اپنی ولایت آپ کر سکتے نہیں
نام اور ناموس کا ان کے محافظ ہے خُدا ان بزرگوں کی حفاظت آپ کر سکتے نہیں

مانا کہ ہیں سو عیبوں کی کان اہلِ فرنگ دانش میں ہے ان کی مادّیت کا رنگ
دیکھو تو ڈسپلن اُن کی اور حُبِّ وطن ان ڈھنگوں سے تُم ہوئے کب ان کا پاسنگ

لڑنا ہے روا جبھی کہ حق پر ہو جنگ ملنے کا ہے جب مزا کہ دِل مِل جائے
فہم اپنی ہے قاصر وہ عمل ہے تیرا یہ جنگ یہ صُلح کب سمجھ میں آئے

قیادیات

یہ راہبر اور یہ ترقی کی راہ — ہے ایسا زمانہ کہ بس اللہ کی پناہ
ان حالوں سوراج و حریت کے دعوے — لاحول و لا قوۃ الا باللہ

آئینہ لے کے ذرا منہ دیکھیں — آپ ہیں ملتِ بیضا کے امین
آپ بھی سامنے رکھیں درپن — برھم روپ آپ ہیں سب اور کمین

کل کوئی اونچے گلے سے یہ سُناتا تھا زیٹ — قوم پر ہم ہیں فدا جانے ہمارا اللہ
آپ کو کس نے کہا دشمن دیں قوم فروش — کیوں نہیں، آپ تو ایسے ہی ہیں ماشاء اللہ

اخبار نہ ہوتے تو یہ لیڈر بھی نہ ہوتے — لاٹھی جو نہ چلتی۔ تو نہ اخبار بھی چلتے
مارا اِسے، پہنچایا اُسے جیل کے اندر — پھر چندے کے اعلان نکلتے ہی نکلتے
پسماندوں کی امداد کا اچھا ہے بہانہ — سرمایۂ قومی سے ہی "خدّام" ہیں پلتے
لیڈر بھی ہیں معذور نہ دیتے وہ اگر ووٹ — یہ اینٹھ کے کونسل کے نہ کمروں میں ٹہلتے

نہ پیٹ ٹھونکتے بلوائیوں کی کیوں لیڈر — وہ شئے ہے ووٹ بنا دے جو شیر کو گیدڑ
اِدھر یہ شورشِ اخبار اور اُدھر جمہور — نہ کیوں دماغ میں لیڈر کے ڈالتے گڑبڑ

سچ پوچھو تو انبوہ کے پیرو ہیں یہ لیڈر — اِک ہاتھ میں باگ اس کے ہے اک ہاتھ میں کوڑا
یہ باگ ہے ووٹ اور وہ کوڑا ہے الیکشن — ابنائے وطن کا دِل اسی نے تو ہے چھوڑا

پیچھے دُنیا کے نہ پاگل ہو خدا کے بندے — کام ان سے جو چلیں بھی تو چلینگے چندے
جس میں برکت ہو وہ اے دوست کمائی ہی حلال — تجھ کو نَاروں نہ بنا دینگے یہ قومی چندے

زندگانی کی کشاکش سے وہ سستے چھوٹے — ان کو بیکنٹھ ملا۔ رِل گئی ان کو جنّت
نام پر زخمیوں، پسماندوں کے چندے کھولے — آپ کو سونے کی چڑیا ہوئی قومی خدمت

قومیات

ایک سائنس جاننے والا — کل ملا۔ تو کہا یہ میں نے سوال
ایک شے کی پگھلنے گھلنے سے — شکل کیا ہو گی اور کیا احوال
وہ یہ بولا بدیہی امر ہے یہ — کہ وہ ہو جائے گی رقیق کمال
جب کہا میں نے دیکھتا ہوں میں — سوز و دردِ وطن میں خلق کا حال
سوزِ حبِّ وطن میں گھل گھل کر — پھول جاتے ہیں کیوں یہ قوم کے لال
ننھے سوا من تو ڈھائی من ہیں اب — گھل پگھل کر ہوا نہ پتلا حال

مسکرا کر کہا یہ عالم نے
اس میں سائنس کی زبان ہے لال

اکثر۔ افل کے دُھر پر کا گُر سمجھ میں آیا؟ — دُھن دیس کے سُروں میں بُلبان کی بھری ہے
اخبار ہے اسی سے۔ گھر بھی اسی سے چلتا — سونے کی ایک چڑیا یہ جنگ زرگری ہے

ڈبل اعجاز ہے اُن کا کہ اُمّت لٹتی جاتی ہے — غمِ اُمّت میں وہ گھل گھل کے موٹے ہوتے جاتے ہیں
مگر باریک بیں کہتے ہیں۔ وہ تو گول ہے بالکل — تعجب کیا بڑے ہو کر بھی چھوٹے ہوتے جاتے ہیں

قوم کی مرثیہ خوانی کی جو ہے تم کو لگن — ہمہ تن سوز ہو۔ دردِ مجسّم بن جاؤ
آپ مٹ جاؤ تو پھر قوم کا کچھ کام بنے — اپنے اخبار کے اعجاز سے یہ مُردہ جلاؤ
کام کا وقت ہے بیکار ہیں کوری باتیں — قُم باذنی کا زمانہ نہیں، یہ دل سے بھلاؤ
تاج کانٹوں کا یہ ہے اور یہ تیار صلیب — ہو مسیحائے وطن تو اسے پہنو۔ چڑھ جاؤ

تُلنے کی مشین چیں بول گئی

زمرۂ خادمانِ قومی سے ۔۔۔ ایک مدت کے دوست تھے میرے

قومی دورے سے آ رہے تھے وہ ۔۔۔ اک دوا گھر میں جا رہے تھے وہ

تاکہ لیں ہاضمہ کی کوئی دوا ۔۔۔ جس سے معدے کا بوجھ ہو ہلکا

وزن کش تھی مشین کمرے میں ۔۔۔ جی میں آئی کہ وزن اس پہ کریں

چڑھ کے اس پر اکنّی اک ڈالی ۔۔۔ سوئی اپنی جگہ سے پر نہ ہلی

ہو کے آنے کے غم میں وہ بیتاب ۔۔۔ بولے یہ ہو گئی مشین خراب

پاس گاہک تھے ایک زندہ دل ۔۔۔ ہو گئے ضبطِ خندہ سے بسمل

بولے سمجھو نہ میری بات مخول ۔۔۔ ذرا دیکھو تو اپنا یہ ماحول

اپنا یہ ڈیل ڈول تو دیکھو ۔۔۔ ایک اکنّی کا اور خون کرو

تب جگہ سے سوئی ہلے تو ہلے ۔۔۔ ورنہ پھر وزن ٹال ہی میں تلے

ہو کے حیران یہ انھوں نے کہا ۔۔۔ تل گیا تھا ابھی میں ہفتہ ہوا

ایک ہفتہ میں بڑھ گیا اتنا ۔۔۔ اس کا بگڑا ہے بس کوئی پرزا

ہو رہی تھی یہ گفتگو تو ادھر ۔۔۔ آ گیا اس طرف سے مینیجر

سن کے سب واردات حضرت سے ۔۔۔ ہوا گویا بہت متانت سے

یہ تو ہے ایک سیدھی سادی بات ۔۔۔ نہیں غصہ، مباحثہ کی بات

آپ پبلک کے ہیں بڑے لیڈر ۔۔۔ خادمِ ملک، قوم کے رہبر

خدمتِ قوم کا ہے بار بدوش ۔۔۔ اس میں کیا ہے شکایتِ تن و توش

وزنِ انساں کا یہ دکھاتی ہے ۔۔۔ لیکن اس سے یہ ہچکچاتی ہے

اس کی طاقت کو بارِ قوم اٹھائے ۔۔۔ اس سے لنگر یہ کب اٹھایا جائے

نہ سمجھئے مشین کا ہے قصور ۔۔۔ ہے مری عرض ایک اور حضور

قومی دورے تو ہوتے ہیں اکثر؟ ۔۔۔ بولے وہ "مہر مہینے ہفتہ بھر"

مینیجر نے یہ مسکرا کے کہا ۔۔۔ کارخانہ ہے اور اک میرا

وہاں کرتے ہیں کام درزی بھی ۔۔۔ اور موجود ہے بزازی بھی

اس پہ بھی ہو نظر عنایت کی
ہے یہ عرض آپ کی ضرورت کی

نسائیات

ہوش ہیں آپ کے جناب کدھر؟ — کیوں فقہ نے یہ سر پھرایا ہے
بحث کیا ہے نقاب و بُرقع کی — ستر کا راگ کیا یہ گایا ہے
شام کو جا کے مال روڈ پر آپ — دیکھئے تو سماں جو چھایا ہے

. . . .

کیوں حواس آپ کے فرار ہوئے — مانا اونچا بہت ہی سایا ہے
بازو اور سینہ بھی ہے کچھ آزاد — کہئے تو ستر میں یہ آیا ہے؟

. . . .

کیا دکھائی دیا بتائیے تو؟ — کس لئے سر کو یوں جھکایا ہے
یہ تو موزے ہیں سر بسر حضرت — وہم کیا ذہن میں سمایا ہے
کیا شباہت ہے اصل رنگت کی — گل یہ صنعت نے کیا دکھلایا ہے
دیکھئے تو کمال خفّافی — رنگ میں رنگ کیا رلایا ہے
تیکھی چتون سے یہ ہوا ارشاد — ہوش تم نے کہاں گنوایا ہے
مانا عرُیاں نہیں یہ حصۂ جسم — دیکھتے بھی ہو کیا کنایہ ہے

(دسمبر ۱۹۲۶ء)

مردوں کے شارٹ عورتوں کے سگرٹ

ہے پرستش جناب نیچر کی — آج جو شے ہے انتصاری ہے
ذہن ہے اس دلیل کا شیدا — کون اس کا نہیں پُجاری ہے
جب برہنہ یہاں سب آتے ہیں — نقل فطرت میں نفع بھاری ہے
وہ حیا کو سمجھ رہے ہیں ریا — پھر یہ کیا شغل اور ساری ہے
سوچے اور سمجھیے یہ غرض کس کو — جوش تقلید کا یہ جاری ہے
"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے" (۱۹۲۶ء)

فکر یورپ کی کیا ہے قاضی جی — وہی حالت نہ ہو ہماری بھی
تم کو ہے شارٹ اور سکرٹ کا خبط — اور پچی ہونے لگی ہے ساری بھی

(۱۹۲۶ء)

عورتوں میں خواص مردانہ — آ رہے ہیں تو شوق سے آئیں
پر توازن ہے ذات فطرت میں — مرد عورت کہیں نہ بن جائیں

عورت کی وضع قطع جو مردانہ بن گئی — تو ہو گیا مماثلِ انسوانیت ہے مرد
جو فرق ظاہری تھے وہ سب مٹ مٹا گئے — اب ہو گیا ہے مطلع جو تھا شعر پہلے فرد

اب عورتوں کے واسطے بارک بنائینگے — مرد اب حرم سراؤں کو آ کر بسائینگے
فطرت کی ناز کی جو مزاحم ہو جنگ میں — کندھے پہ رکھ کے مرد کے رفلیں چلائینگے

کیا فیشن نے کیا کایا پلٹ کایا بدل کہیے — کہ شک ہے مرد پر زن کا۔ گماں ہے مرد کا زن پر
ملا ہے حکم روح القدس کو اک شرح لکھوائیں — کتاب آدم و حوا کے اس تازہ اڈیشن پر

دیکھیے تہذیب نے ہموار کیسا کر دیا — ادنے اعلے کیا کہ مرد و زن بھی ہمسر ہو گئے
تھا سرِ مو فرق ان میں وہ بھی اب جاتا رہا — دونوں ہم آہنگیٔ فطرت کا مظہر ہو گئے
لہلہاتی ان کی کھیتی اب نہیں کرتے گریز — اور وہ پُر پیچ پٹے رکھ کے یکسر ہو گئے
اب بہ تمیز ظاہری مسٹر مسٹرس میں کچھ نہیں — یہ بڑھے کچھ وہ گھٹے دونو برابر ہو گئے

موئے مشکیں رہے نہ وہ خم و پیچ — اب کہاں اپنے دل کا زنداں ہو
بوٹ میں قید ہے۔ وہ صرف تراش — ایڑی چوٹی پہ کون قرباں ہو

پہلے مشاطہ تھی ندیم و جلیس — اور یہ چلتی تھی خوب اس کی معاش
ہو گیا سر و بال سے آزاد — مورد لطف اب ہے خاص تراش

دیوی جی جب سیر کو چل دیں بامن دیوتا کہنے لگے
کرپا کرا ے کرُنا ساگر ہے منجدھار میں میری نیّا
بیٹی میری ٹیڑھی مانگ نکالے۔ پُتر پیئے سوڈا اور سگریٹ
ہائے انرتھ ہوا یہ کیسا اُن میں ہی رل گئی اُن کی میّا
گرہست اس کو سارا بھولا جب دیکھو لکچر جلسوں میں
گاڑی یہ کس طرح چلے گی رہ جائے جب ایک ہی پہیّا
یہ بڑ سن کر ان کی بیں نے ان سے کہا اے برہما مورتہ
ست جگ کی باتیں نہ کرو تم اب تو یہاں کلجگ ہے بھیّا

دھرم پتنی نے چھوڑ کر چرخا
اور ذرا حلق صاف کر کے کہا
دیکھنا جی ذرا ادھر آنا
گھر کو تم نے کبھی نہ گھر جانا
رات دن ہے کچہری اور کلب
گھر کی باتوں کا وقت اب ہے نہ جب
لڑکی اب ہو گئی ہے خوب جوان
اس کی شادی کا بھی ہے تم کو دھیان
اب تو سیانی وہ ہو چلی ہے بہت
اور پڑھ لکھ بھی وہ گئی ہے بہت
ڈپٹی صاحب جواب میں بولے
میں تو سو بار کہہ چکا تم سے
کوئی اچھا سا بر تلاش کرو
کوئی اونچا سا گھر تلاش کرو
بی بی بولیں بڑے دھڑلّے سے
میں نے دو چار گھر تلاش کئے
آؤ بیٹھو تو ساری بات کروں
کہوں اپنی تمھاری بات سنوں
ابھی تمہید ہی کی تھی تصنیف
آ گئی مس صاحبہ کی جو تشریف
اسکے آتے ہی ماں کو چپ سی لگی
تھی وہ لڑکی مگر ذہین و ذکی
بات جو ہو رہی تھی بھانپ گئی
خشک لہجے میں ماں سے یوں بولی
آپ کو اس کی فکر ناحق ہے
ایسی باتوں کا ذکر ناحق ہے
پالا پوسا بڑا کیا ہم کو
اور لکھایا پڑھا دیا ہم کو
فرض جو تھا وہ کر چکے ہو ادا
جانتی ہوں جو اور ہے کرنا
کام میرا ہے اس کو میں جانوں
اس جھمیلے میں آپ پڑے کیوں

سانجھ جس سے ہو زندگی بھر کا — ڈھونڈنا اس کو کام ہے میرا
مجھ کو تعلیم و تربیت جو دی — اس کا گن جانتے ہیں بابو جی
آپ پڑیئے نہ اس بکھیڑے میں — من کو ڈالیں نہ اس جھمیلے میں
یہ کہا اور سنبھال کر ریکٹ — مسی بابا چلی گئیں کھٹ پٹ
لان ٹینس میں فرد کامل تھیں — ٹورنامنٹ میں بھی داخل تھیں
ماں تو غش کھا گئی یہ سنتے ہی — غفلت جاتی رہی پتا جی کی
بن کے طیارہ تھے ہوا پر ہوش — زہر کا گھونٹ پی کے کتنے خاموش
گھر سے القصہ وہ کلب کو گئے — چلتے چلتے رکے۔ پلٹ کے چلے

ایک مندر کا رُخ اُنھوں نے کیا
جہاں ویدوں کی ہو رہی تھی کتھا

فکر افلاس کی ہے کیوں تم کو — کیوں ہے بے روزگاری کا ماتم
ہم بتاتے ہیں اک نئی تدبیر — جس میں نقصان ہے نہ بیش نہ کم
بل کراؤ وہ پاس ہو جائے — جرم جس سے ہو تولد پیہم
دفعہ ایسی بھی اس میں ہو جس سے — حکم طبی ہو زوجیت میں اہم
پھر نہ بچّے ہوں اور نہ زدج کہ ہیں — برتھ کنٹرول ویو جنک توام

ان کو ہے برتھ کنٹرول کا شغل
ان کو 'پوتوں پھلو' نہ اب کہنا

فکر بچّوں کا ہے تجھے ناداں — کیا ہے یہ بیبی ویک کی پرواز
بیٹیوں سے تو پوچھ حوّا کی — برتھ کے کنٹرول کا انداز

تو ہے جو اُمیدوار ہو - وہ تو نہیں — تیری نہیں پوری ہونے کی یہ اُمید
جی بھر گیا ان کا تو بھری گود سے اب — ہوتا ہے ریاض انقطاع تولید

سمجھا نہیں لکچر کو مگر چوبے نے — تالی جو بجی۔ کہا "کرشن جی کی جے"
کانوں میں جو یوجنک پڑا۔ تو بولا — یوجن کہاں؟ کا کے مونڈ چڑھ بیٹھو ہے؟

کہنے لگے بھری رہے تری گود سدا — عورت کو دعا یہی تو دی جاتی تھی
اب آج یہی کسی کے حق میں جو کہو — پھرنے لگے سر پہ بے تحاشا جوتی

نپوتی تھی گالی کبھی ہند میں — عقیمہ کو سوکن کا تھا دغدغا
دعا دو اگر اب تم اولاد کی — تو چپل کے مارے ہو سر پلپلا

چھوڑ دنیا کے جھگڑے گھر کو دیکھ — لے کے بیٹھا ہے کیا تو گیتا کو
لے خبر پہلے گھر کی او غافل — دیکھ تو جا کے دخترِ برہما کو
برتھ کا کنٹرول تو تھا ہی — اب لگی ہے یہ دھن مہیلا کو
کیوں رہے ان کا پھر بیاہ اٹوٹ — جب پتی سے ہو نفرت ابلا کو
کوکھ اجڑی تھی مانگ بھی اجڑی — رو کے اب یاد کر تو میّا کو

گھر میں دفتر سے ہانپتا آیا — ساتھ مثلوں کا پوٹ بھی لایا
آکے بیٹھا تھا جو ہوا ارشاد — ہے نئی فلم کا یہ دن! ہے یاد
بولا وہ کچھ بسور کر منھ کو — ابھی آیا ہوں دم تو لینے دو
دیکھتی ہو کہ پوٹ میں کیا ہے — صبح سے پہلے سب یہ کرنا ہے
سن کے یہ پھر کہاں تھی ان کو تاب — چڑھ گئی تیوری اور دیا یہ جواب
اٹھ رہے اجل جائے یہ کوئی گھر ہے! — گھر ہے کمبخت یہ کہ دفتر ہے
ہم چلے تم نہ چلتے ہو نہ چلو — موٹی مثلوں پہ بیٹھے خاک ملو
دودھ بچے کو وہ پلا دینا — پانی اور یہ دوا پلا دینا
دودھ کو اک ابال کافی ہے — اور بوتل بھی صاف کرنی ہے
کھانا ہوٹل سے گرم لا رکھنا — اور ننھے کو مت رلا رکھنا

ہیضہ۔ طاعون سب ہی جھیلا ہم نے اور انفلوئنزا کا سہا تیغا بھی
مغرب زدگی مگر وبا ہے ایسی عاری ہوئی جس سے اُمّتِ عیسٰی بھی

اُتار چڑھاؤ بتایا سارا کتنا تجھ کو سمجھایا
نقل تو جن کی کرتا ہے دیکھ ان کی گت کچھ سوچ اور چیت
ملک اُجڑا تھا گھر بھی اُجاڑا اپنے ہاتھوں سے تو نے
اب پچھتائے کیا ہوگا جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت

زوج و دختر کا اب یہ کیا رونا کیوں ہے ماتم کہ گھر کا بگڑا رنگ
نقل و اصلاح کا سمجھ کے نہ فرق تو نے ہی تو بگاڑا ان کا ڈھنگ
گھر کو لُٹوا کے عقل آئی ہے اب سمجھ اس کو مُشت بعد از جنگ

برہمن کو تھی مسجدوں میں تلاش متجسّس تھا شیخ مندر میں
ایک کی دوسرا تلاش میں تھا تھا نہ ان میں سے کوئی بھی گھر میں
ملے آخر تو رو کے یوں بولے خون اترا تھا دیدۂ تر میں
کیا زمانہ ہے کانپتا ہے دل عقل ہے اپنی سخت چکّر میں
بھائی آؤ کہ سوچیں مِل جل کر عورتیں کہہ رہی تھیں لکچر میں
لونڈی باندی ہیں کیا کسی کی ہم کام کیوں ہم کیا کریں گھر میں
ہے مساوات۔ اب تو چولھا پھونک ہم بنیں ایکٹرس تھیٹر میں
وہ جو چیں بیں کرے تو دینا ڈانٹ کہنا سن لیں سبھی گلی بھر میں

بُوٹ پر کر ابھی پالش
ورنہ ہوگی طلاق کی نالش

متفرقات

جنگ تھی۔ فوج میں تھے۔ ملک بھی تھا از حد گرم — وہاں کس کی تھی شرم
جا تکیا شارٹ جسے کہتے ہیں۔ ایجاد کیا — اغراض اس میں نہ تھا
اب محلّوں میں، گھر۔ اور ریل میں تم لو جو بہن — ساتھ ماں اور بہن
اس میں مردانگی کیا اور وجاہت ہے کیا؟ — صاف ہے خون حیا
وہ سوا مرد جو پہنتے ہیں تو کچھ خوف نہیں — اونچی ہو پھر بھی نہیں
کیوں یہ مردانہ ثقاہت کو بتا یا بنتا — ہوش کر مرد خدا!

کل شیخ یہ رو کے کہہ رہا تھا — کیا بگڑے ہیں دیکھیے تو اخلاق
بیوی نے طلاق دی میاں کو — بیٹے نے کیا ہے باپ کو عاق

گھر میں ہیں آپ۔ ہر پھاٹک پہ مگر لوٹ ایٹ ہوم — راستبازی نئی تہذیب کی دیکھو تو ذرا
جب وہ اک بات پہ فرمائیں "کروں گا کوشش" — تو سمجھ لو کبھی یہ وعدہ نہ ہوگا پورا

پابند اور آزاد میں نازک ہے تمیز — ہے فرق جمود اور سکون میں موجود
پرّاں بھی ہوا میں ہے، معلق بھی ہے — آزاد ہے ایک۔ ایک محروس قیود
آئین پہ اپنے ایک عامل مختار — ہے ایک کا کوئی اور ہادی۔ مسجود
تعطیل ہے کام کر کے سستانا بھی — عطلت میں معطل ہے مگر سست وجود
اک کام سے مطمئن نکما ہے ایک — رکھتا ہے یہی فرق سکون اور جمود

چھوت نے ملک باندھ لایا اک شاگرد — میں نے اس سے کہا یہ ہیں متروک
بہ ادب اس نے یہ جواب دیا — بھول بندے کی ہے نہ اس میں چوک
جب دلت اور اچھوت ہیں شامل — ہو کے مقبول اہل ملک و ملوک
کیوں رہے چھوت اچھوت لفظوں میں — کیوں نہ مقبول ہوں جو تھے متروک

دورِ چہارم
۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء

ترقیٔ اُردو

۶ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ع

یہ قصیدہ اپنی وضع کی پہلی نظم ہے جو اُردو میں لکھی گئی حضرت کیفی کو جو قدرت مطلب نگاری پر ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ آپ کا طرز استدلال بانکپن اور دلپذیری میں بیعدیل ہے خدا آپ کو مدتوں سلامت رکھے

آثار زمانہ

نہیں احساس کیا احباب کو موجودہ حالت کا
ہے رفتار زمانہ میں چلن بجلی کی سُرعت کا

زمانہ جدت آگیں ہے زمانہ جدت آگیں ہے
بنا ہے بانگ بے ہنگام افسانہ قدامت کا

غلط ہے یہ سمجھنا اس سے جو کچھ ہو چکا اب تک
وہ سب ہے لغو اور بیکار، دفتر ہے حماقت کا

پہنتے تھے جو تم بچپن میں کپڑے، اب نکمے ہیں
جوانی اور اس میں فرق ہے قد اور جسامت کا

مناسب جو کبھی پوشاک تھی اب ہے وہ ناکارہ
یہی عالم مہذب قوم کی ہے ہر ادارت کا

جو قومیں زندہ ہیں پابند تغیّر و تمدن ہیں
رہے گا ان کے سر پر بوجھ آئینی اطاعت کا

طبیعی زندگی جس طرح ہے تغیّر کا معرض
ادب پر بھی ہے عاید حکم تغیّر اور جدّت کا

کل اور کل

جو کل تھا وہ نہیں ہے آج پھر کیسی ہے یہ کل کل
کہ ہم اس کو نہ مانیں گے ہو جس میں رنگ جدت کا

ہمیں بھی تو پڑی ہے کل کی لیکن فرق اتنا ہے
کہ دیروز ازل ہے ایک، اک فردا قیامت کا

ہمیں ہے عاقبت کی فکر، مستقبل کا سودا ہے
انہیں ماضی کی رٹ ہے اور وظیفہ ہے قدامت کا

جو ہونا تھا ہوا، اچھا ہوا، اب اسکو جانے دو
جو آخر بیں ہے انساں اسکے سر سہرا سعادت کا

مبارک بندہ ہے جو مرد آخر بیں ہے سن لکھو
یہ ہے قول سلف جو بہرا ہے اسمیں حکمت کا

قدامت

کبھی اردو زباں کی آپ نے تاریخ بھی دیکھی
کہ تھا معیار کیا پہلے اور اب کیا ہے فصاحت کا

زباں تھی میر[1] و مرزا[2] کی جو تھی یکرنگ[3] ناجی[4] کی ؟ — تو پھر بوقت کا یہ راگ کیوں چھیڑا ندامت کا
قدامت کے اگر ہو مدعی، تو شوق سے بولو — جگہ کو جاگہ، اسمیں کیا ہمن کوں محل حجت کا
وہی بولو زباں ہاں ہاں! سمجھ پر مطلب آوے ہے — ہمیں کیا کار لیویں وہ نین سینی، بصیرت کا
"گرو باتاں بجن سیتی" جس طرح اسلاف کرتے تھے — گرد انجھواں سے دریا بُرد سارا ملک بھارت کا
سخن اسلاف کا تھا خوب یعنی اُس زمانے میں — یہی تھا اقتضا شان فصاحت اور بلاغت کا
بہت اچھا ہوا جو کچھ ہوا ہے اگلے وقتوں میں — سزاوار اہانت ہے نہ مستوجب شکایت کا
محقق ان دفینوں میں جواہر ڈھونڈ سکتے ہیں — کلام ان کا ہے اک سرچشمہ تاریخی افادت کا
مگر دوراں کا دردسر یہ کس کے ماتھے جائیگا — تغیر ہو چکا ہے ہو رہا ہے کیں قیامت کا
وہ احساسات کے بندے تھے۔ ہمکو کام کرنا ہے — یہی ہے امتیاز انکی ہماری ذہنی حالت کا
وہ اپنے وقت میں جو کہہ گئے ہمکو ہے فخر اس پر — سخن تھا ان کا عکس اسوقت کی موجودہ حالت کا
ضرورت ہی کچھ ایسی آپڑی طرز عمل اپنا — نہ ہے احسان فراموشی نہ شیوہ ہے بغاوت کا

جدت اولین

بنایا اولیں انسان جب صناع قدرت نے — ملائک کو ہوا ارشاد سجدہ اور حرمت کا
جھکیں سب حضرت آدم کے آگے حکم ربی تھا — اٹھایا اہرمن نے عذر لیکن اسمیں بدعت کا
کہا اب تک خدا کو سجدہ ہم کرتے رہے سارے — منافی ہے نیا ارشاد ہے رسم قدامت کا
سزا ایسی اس کی وہ راندا گیا قہر الٰہی سے — ملا گردن کشی کا ثمرہ اسکو طوق لعنت کا
مفصل دیکھنا ہو تو کلام اللہ میں دیکھو — یہ پہلا واقعہ ایجاد و جدت سے بغاوت کا
یہ تم خود سوچ لو وہ ابلیس یا اللہ کے پیرو ہیں — جو یہ جھگڑا اٹھاتے ہیں قدامت اور جدت کا

تجدید قدیم

جو کل تھا نہیں ہے آج کیوں کل آج کا سا ہو — جو بدلی ہے تو بدلیگی ہے دنیا نام جدت کا

[1] میر محمد تقی میر وفات تقریباً سو برس کی عمر میں سنہ ۱۸۱۰ء
[2] مرزا رفیع سودا۔ وفات بڑی عمر میں سنہ ۱۷۸۴ء
[3] غلام مصطفےٰ خان یکرنگ طبقہ اول کے شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ محمد شاہ کے عہد میں ہوئے۔
[4] سید محمد شاکر ناجی۔ نادر شاہ کے حملے کے وقت زندہ تھے۔

نہیں تو عالم ایجاد کیوں سب اسکو کہتے ہیں   لغت ایجاد و جدت کا جو ہم معنی ہے بدعت کا
ہنر کے نام سے سمجھے کہ چھوٹے سب بکھیڑوں سے   سند ہی پر اگر ہے حصر انکی بحث و حجت کا
تو فرمائیں سند لائینگے کس اُستاد ہستیں سے   سخن پر ان کے جن کا نام ہے ممدوح خلقت کا
ٹفن[1]، لمبر[2]، فریم[3] انشا و غالب اور ناسخ نے   جو باندھا تو قدامت نے کیا صاد اس پہ صحت کا
وہ آغاز تغیر تھا نہ فرمایا گیا اس پر   فصاحت کا مخل ہے یہ نہ نقص اس میں غرابت کا
مزے سے ذوق اڑائیں فیر[4] اور انشا ٹفن چکھیں   ڈنر، ٹوس اور بسکٹ میں ہے ان کو عذر علت کا

مولویت اور تصرفات زبان

کہیں یہ دُھن سمائی کشف اور قاموس لے بیٹھے   سبق رٹنے لگے اعراب اور معنی کی صحت کا
سکون و کسر سے زیر و زبر عالم کو کر ڈالا   رہا مسلک یہی ہر اجتہاد و آئین کی امت کا
لغت کی لغویات آ کر ہوئیں حاوی تصرف پر   کنوڈا کر دیا اُردو زبان کو مولویت کا
وہیں ماخوذ کو چھوڑا پڑے ماخذ کے قضیے میں   نیا ان کو مرض یہ ہو گیا اُردو کی صحت کا
نہ سمجھے لفظ جو اُردو میں آیا ہو گیا اُردو   چناں ان کو نہیں موتی یہ دریائے لطافت[5] کا

زمانہ بدل رہا ہے۔

کٹھالی میں ہے ملک اسوقت اُردو بھی اسی میں ہے   وہی ہو کر رہے گا حکم جو ہوگا مشیت کا
بہت نازک ہوا کرتا ہے ایسا وقت قوموں پر   نہیں باتوں سے چلتا کام ہے یہ موقعہ ہمت کا
نظر ہو اس کی اس پر وقت جب اب آنے والا ہے   لیا ہے اپنے ذمہ جس نے فرض اردو کی خدمت کا
کریں کیا ہو گئی ہے کچھ سے کچھ صورت زمانے کی   نہ اطمینان اگلا سا نہ وہ عالم فراغت کا

۱ه سید انشا ہے اس آفت کا میک سیر کہ وا کب اس کا۔ حاضری کھائے جو کلکتہ تو لندن میں ٹفن۔

۲ه مرزا غالب۔ سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ۔ مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

۳ه شیخ ناسخ۔ ترے رخسار تاباں کا کبھی جو عکس پڑتا ہے۔ فریم آئینے کی بنتی ہے ہالہ ماہ کامل کا

۴ه شیخ ابراہیم ذوق۔ پکارے سب کہ قواعد ہے فوج میں شاید۔ کہ فیر اُڑ رہے ہر صف میں ہے قطار قطار

۵ه نام کتاب مصنفہ سید انشا۔ تاریخ تصنیف سنہ ۱۸۰۰ء صفحہ

یہ ہے نا اہل اِسے اردو سے مطلب؟ یہ دہاتی ہے" — عمل اور قول ایسا تھا کبھی اہلِ فصاحت کا
یہاں اب سارے ہندستان کو اردو سکھانا ہے — نہیں یہ ایک دو کا کام ہے ساری جماعت کا
انہیں دل کے پھپھولے پھوڑنے سے کام رہتا تھا — ہمارے سر یہ بوجھ اب آ پڑا ہے کس قیامت کا
ضرورت ہے زباں میں سارے علم و فن سما جائیں — سوال اپنا سلف کی رُوح سے خود ہے اعانت کا

زبان کا فعلِ منصبی

زباں کی وسعتیں پہنائے عالم سے فزوں تر ہیں — بِنا پر اس کی قائم قصر ہو علم اور حکمت کا
زباں ہے ترجمانِ علم و تجارب اور تخیّل کی — ہے وسعت ان کی معیارِ مسلّم اس کی وسعت کا
یہ فرماتے ہیں علم السنہ کے جاننے والے — خیال و نطق کے بارے میں کیا مذکور سبقت کا
بغیر الفاظ کے فعلِ تخیّل غیر ممکن ہے — تم اب خود دیکھ لو رتبہ ہے کس کو اولیّت کا
زباں کی وسعت و تنگی خیال و نطق پر حادی — غرض یہ تو وہ جوہر ہے یہ ہنگم طرفہ حیرت کا
زباں وہ کیا جو کردے ذہنیت کو پست اور عاجز — شعور اور مُدرکہ پر ڈال دے پردہ جہالت کا
تمدّن ارتقا کا ہم ردیف اس کا مرادف ہے — زبانِ زندہ ہے اردو تو کیا جھگڑا قدامت کا
جو بدعت ہی اسے کہنا ہے کہیئے بدعتِ حسنہ — ترقی کے منافی ہی اگر فتویٰ ہے حضرت کا

تغیراتِ سابق دلیلِ تجدید

اگر تبدیلیاں اس میں ہوئی ہیں اور کبھی ہونگی — جب ایسا ہو چکا ہے تو یہ کیا ماتم ہے جدّت کا
وہی تھی کیا زبانِ ذوق و آتش۔ ناسخ و مومن — چمن جس میں کھلایا میر اور مرزا نے جودت کا
ولی[10] اور آبرو[11] کے متبع آیا یہ دونوں تھے — اسے بھی دیکھیں گر ہے شوق تحقیقِ صداقت کا
نہ وطواط[12] اور سکاکی[13] کے وہ اندھے مقلّد تھے — چلن حذفِ ماعنفا کا رُکن تھا ان کی عقیدت کا
نہ اگلوں سے اگر تجدید و اصلاحِ سخن ہوتی — تو اب تک ہم میں رہتا نقص لثغہ اور لکنت کا
سبق اصلاح کا ہم کو بزرگوں نے سکھایا ہے — جو کوئی معترض ہو اس پہ آئینہ ہے عبرت کا

---

[10] ولی تخلص شمس اللہ نام (اس میں اختلاف ہے) مولد اورنگ آباد۔ وفات سنہ ۱۱۴۲ھ
[11] آبرو تخلص۔ شاہ مبارک نام۔ خان آرزو سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ طبقۂ اول کے شاعر ہیں۔
[12] رشید الدین وطواط۔ مصنف مفتاح السحر۔ وفات سنہ ۱۱۸۲ھ
[13] سکاکی لقب۔ ابو یعقوب یوسف بن ابو بکر نام۔ مصنف مفتاح العلوم۔ وفات سنہ ۱۲۲۶ھ

لئے بیٹھے ہو تم اس کو جسے وہ چھوڑ بیٹھے تھے
اصول ان سے نہ تھا بیگانہ اصلاح اور جدّت کا

جو وہ دو گز بڑھے دس گز بڑھو تم کو لازم ہے
سپوتوں کے کرو کام اور تمنا ہو سعادت کا

تغیّر لابُد

عوارض نو بہ نو تجدید کا پیغام لائے ہیں
عبث جھگڑا اٹھاتا ہے قدامت اور جدّت کا

جو قوموں کے تغیّر میں ہوا ہے حکم ربّانی
نہیں محتاج وہ ہرگز سند کا اور شہادت کا

خدا نے اسکی حالت کو نہ بدلا ہے نہ بدلے گا
نہیں جس قوم کو دھیان آپ ہی تغیّر[۱] حالت کا

ترقی اور تغیّر زندگی کی شرط اوّل ہے
بدیہی امر ہے یہ اس میں کیا ہے دخل حجت کا

لائحہ عمل

زباں میں جس کو وقعت کلیہ کی ہو گئی حاصل
وہی اک قاعدہ ہموزن ہے قانون قدرت کا

قواعد کون سے ہیں وہ؟ یہی تحقیق کرنا ہے
ہر اک قانون بن سکتا نہیں قانون قدرت کا

ہے یہ بھی دیکھنا کرنا ہے کیا آئندہ نسلوں کو؟
مثلاً عمل ان پہ کیا ہونگے؟ تقاضا کیا طبیعت کا

غرض جو کچھ بھی ہوگا ہو۔ مگر یہ دھیان رکھنا ہے
کہ حلیہ ہی بگڑ جائے نہ اردو کی لطافت کا

جو اردو پن ہی زائل ہوگیا۔ پھر کیا رہی اردو
یہ سب کچھ سوچنا ہے فرض ارباب لیاقت کا

رہے اردو کی اردو۔ کام بھی نکلیں سبھی اس سے
نظر ہے ان اصولوں پر نہ ہو اندیشہ بدعت کا

جو ابنائے وطن ہیں اہل اردو کی ترقی کے
انہیں ہاتھوں میں ان کے خدشہ اردو کی حفاظت کا

یہ ہے فرض اہم۔ وقعت کو اسکی وہ سمجھتے ہیں
وکالت اک طرف۔ احساس ہے ان کو کفالت کا

بزرگوں کے بنائے کو بڑھانا کام ان کا ہے
یہی ہے فرض اولیٰ اور تقاضا بھی ودیعت کا

تمہارے بعد آنیوالے اس کو خوب جانچیں گے
سلف کا عزم کیا بالفعل تھا اردو کی خدمت کا

مفصّل عرض ہوگا اہل اردو کو جو کرنا ہے
ذرا موقعہ ملے کمیٹی کو اطمینان و فرصت کا

---

[۱] کذا فی التنزیل۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔

حیدرآبادی نظمیں

ستمبر۔ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء میں حضرت کیفی کا ایک کانفرنس کے سلسلہ میں حیدرآباد دکن جانا ہوا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر بالقابہ صدر اعظم نے آپ کے اعزاز میں ایک دعوت اور بزم مشاعرہ منعقد فرمائی۔ آپ نے علاوہ طرحی غزلوں کے یہ قطعہ طرح مشاعرہ میں پڑھا اور بعد کی نظم بطور شکریہ بھیجی۔ یہ صحبت ۴ر اکتوبر کو ہوئی۔

حال زمانہ دیکھ کے جی ڈوبتا تھا کیا
اونچا تھا سر سے خون تمنا کہیں جسے

دہلی و لکھنؤ کا رہا تھا نہیں وہ رنگ
علم و ادب کے چہرے کا غازہ کہیں جسے

وہ اہل بزم ہی رہے باقی وہاں نہ بزم
مرکز علوم اور ادب کا کہیں جسے

دیکھا دکن میں آکے تو آنکھیں سی کھل گئیں
ہر سو رواں ہے علم کا دریا کہیں جسے

موسےٰ کا ہر کنارہ مجمع علوم ہے
ارباب معدلت لب عیسےٰ کہیں جسے

ہو دیکھنا جسے اسی خطہ میں پائے گا
تہذیب مشرقی کا نمونہ کہیں جسے

اُلجھا جو سارے ہند میں حل ہو گیا یہاں
تعلیم اور علم کا عقدہ کہیں جسے

سب کچھ یہ فیض سے ہے جناب نظام کے
بحر شہی کا گوہر یکتا کہیں جسے

ممکن نہیں کہ مدح کا حق ہو سکے ادا
ہے یہ خراج غیر مودّی کہیں جسے

پھر کیا تعجب اس میں کہ اس بادشاہ کا
ہے صدر اعظم ایسا کہ ہیرا کہیں جسے

وہ انتخاب دہر یہ ہے انتخاب ہند
کوئی نہیں کہ آپ کا ہمتا کہیں جسے

مہاراجہ بے بہا دُر دریائے الفت
مُہر مدبری کا نگینا کہیں جسے

دل کس کا جناب شاد سے دل شاد ہو گیا
وہ دل شکستہ اور فسردہ کہیں جسے

اس جاہ اور شکوہ پر ایسا ہے حسن خلق
دل دار و دلنواز و دل آرا کہیں جسے

قدموں میں آکے وہ گدڑی بیٹھا جو خوش نصیب
وہ لے گیا خوشی کا خزانا کہیں جسے

کیفی کے ساتھ ذرہ نوازی کا یہ سلوک — کیفی کہ ننگ علم و ادب کا کہیں جسے
جو کچھ سنا تھا اس سے سوا دیکھتا ہوں میں — مالک دلوں کا ہے تو کنہیا کہیں جسے
وہ کون ہے جو تیرا ثنا خواں نہیں یہاں — تیری وہ ذات ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

دل سے زبان پہ یہی آتا ہے بار بار
"ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے"

نظم شکریہ

ایک دن وہ تھا دیا جب شاہ تغلق نے یہ حکم — دلّی والے چھوڑ کر دلّی چلے جائیں دکن
کم نہ تھا مرگ مفاجاتی سے حکم شاہ وقت — چار و ناچار اہل دارالملک نے چھوڑا وطن
وہ کوائف دفتر تاریخ میں محفوظ ہیں — جن میں اس ہجرت کا ہوتا ہے بیان با رنج و محن
چند صدیوں بعد پھر ایسا زمانہ آگیا — ہوگئی معکوس رفتہ رفتہ رفتار زمن
اہل دہلی کو زمانہ نے لتاڑا اس قدر — ہوگئی دشمن زمیں، پرخاش پر چرخ کہن
سر چھپانے کو جگہ باقی نہ جب پائی کہیں — یاد آیا تب انھیں بھولا ہوا ملک دکن
ہن برستا ہے دکن میں گھر میں جو سنتے تھے وہ — اپنی آنکھوں دیکھکر جانا وہ سچا تھا سخن
سرپرستی اس نے پائی آگیا جو اس جگہ — جن کا گھر دہلی تھا لیتے ہیں یہاں وہ علم و فن

حیدرآباد آگیا جو فن وہ زندہ رہ گیا
اوّلین ہے نام اس احیا میں چندو لال کا

راجہ رایان ذی اکرام حضرت کے بزرگ — نام نیک ان کا قیامت تک رہیگا برقرار
اس وزیر نیک تدبیر اور عالم دوست کا — شاعری پر ہے جو احساں وہ رہے گا یادگار
کیا امیر اور داغ کا مذکور؟ کل کی بات ہے — اور بھی حق ہے کرے اس ضمن میں جو شہریار
راجہ صاحب سورگباسی نے جو فیاضی دکھائی — بھول سکتے ہیں بھلا کب اسکو اہل روزگار
وہ سخنگو تھے جو استاد زمانہ بن سکے — ان میں کس پر تھا نہ ان کے بذل اور احساں کا بار
یکہ تاز عرصۂ شعر و سخن شاہ نصیر — تھے دعا گو اور اسی دربار پر دل سے نثار
غالب و ذوق اور ناسخ پر بھی تھی چشم کرم — حاضری کا گو نہیں پایا انھوں نے افتخار

قدرِ علم و فن نہیں کم اُس سے اس دربار میں
مدح خواں تھے اس کے سرشارؔ و ظہیرؔ نامدار

وہ جلیلؔ استادِ شہ اور اخترِؔ شیوا بیاں
وہ چکے ہیں آپ کی سرکار کے مدحت گزار

باکمالوں کی نہ کیوں عزت ہو اس دربار میں
جوہرِ علم و ریاست ہیں بھرے سرکار میں

ہے اسی سے تو مجھے حیرت کہ یہ کیا بات ہے
کیفیؔ ناچیز پر مہراج کا اتنا کرم

ہے سخن کی آذری میں کون ثانی آپ کا
کوئی دکھلائے تو ایسا صاحبِ سیف و قلم

وہ مذاقِ نغز گفتاری کہاں اور میں کہاں
شعر گوئی اور ادب سے گرچہ میں ہوں متّہم

اس پہ قدر افزائی اور ذرہ نوازی اس قدر
ذہن میں اوّل نہیں آیا تھا یہ امرِ اہم

فہم نے کی فیض پابوسی اقدس سے مدد
اور کہہ اٹھّا یہ دل حل اسکا سمجھاتے ہیں ہم

کیا نہیں تو دیکھتا سارا دکن اور ملکِ ہند
آج کھاتا ہے مہاراجہ کی عظمت کی قسم

کون ہے دنیا میں جو اس کا نہیں ہے مدح خواں
ہے یہ وہ سرکار جس کا فیض ہے سب پر اتم

حسنِ خلق و حسنِ تدبیر اور ادب کی پرورش
کون ہے اوصاف جس میں اتنے پائیں گے ہم

اے مہاراجہ بہادر یہ دُعا کیفیؔ کی ہے
تو رہے باکام اور دلشاد و ہو عالم میں بجے

ادبی قیل وقال

۲۸ اکتوبر ۱۹۲۹ء

(۱)

ان کو تم بحرِ عرب میں ڈال دو
ہیں مطوّل مختصر بس کام کے

پُرزے کرنے کو ہے پچھوائی ہوا
اس ادب کے جامۂ احرام کے

ہے پہننے کو زباں جامہ نیا
اب بٹن ہوں جانشیں ہو تام کے

مستردسب ہو چکے فن کے قیود
بند ٹوٹے ہو گئے اس دام کے

اس زمانے میں تو چل سکتے نہیں
چونچلے اسناد اور الہام کے

اب ادب کا راگ ہے کابل سوراج
سن چکے قصے ذم اور استقام کے

مرکز اور اہل زبان ہیں بائیکاٹ
ہیں یہ سب منسوخ اب نیلام کے

میر ہیں اب میر فرش بزم نو
یعنی بس تاریخ کے ہیں کام کے

درد دل سے سر سے سودا ہیں وداع
نقش ان کے مٹ چکے پیغام کے

ناسخ اب منسوخ - آتش سرد ہے
وہ نہیں محبوب خاص و عام کے

اب نہیں مومن امام دین شعر
اس کے فتوے قابل استفہام کے

ذوق خاقانی سے طاقانی ہوئے
اب مذاق تازہ ہیں ارقام کے

مرثیے اور سوز کے دن لد گئے
رنگ ہیں بدلے ہوئے اسلام کے

کیوں انیس ماضئے غمناک ہوں
مبتلا دل حال کے آلام کے

دور ہے تدبیر سے قول دبیر
رزم کے یہ دن نہیں ہیں کام کے

شارح و نقاد[2] سے مغلوب ہیں
میرزا نوشہ ہیں غالب نام کے

دفتر پارین کا ہے لب لباب
چند قصے[3] بدر اور گلفام کے

داستانیں قیس اور فرہاد کی
اور فسانے بادہ و اصنام کے

ہے اگر تیغ نظر خاراشگاف
نالے برہمزن فلک کے بام کے

عرش کے سینہ کو چیریں آہ سے
وہ بھی ہیں لندھور اپنے نام کے

وصل کی بیہودگی - درد فراق
ہیں وظیفے ان کے صبح و شام کے

کہئے ان دیوانوں کو ہم کیا کریں
مختصر ہوں گے ان گئے ایام کے

اور کیا ترکہ ہیں پایا ہے بنائیں
معتقد اجداد اور اعمام کے

پھر ہماری ان کی کیونکر نبھ سکے
فرق ہیں باہم کئی اقسام کے

چاہیئے ترک موالات ان سے جو
قابض واحد ہیں اس گودام کے

اب نئی دنیا ہے عالم ہے نیا
رنگ بدلے چرخ نیلی فام کے

۱؎ طاق پر رکھ چھوڑنے کے قابل - ناقابل التفات

۲؎ شرح دیوان غالب لفظ نظم طباطبائی - اور مضامین آرگس - مندرجہ رسالہ نگار کی طرف اشارہ ہے۔

۳؎ بدر سے مراد قصہ بدر منیر و بے نظیر یعنی مثنوی سحر البیان اور گلفام سے اشارہ ہے اندر سبھا کی طرف۔

ہو گئی اور نوٹ کا جاری چلن — اُٹھ چکے دام اب درم اور دام کے
آپ کی ٹکسال کے سکّے ہیں جو — آج کل ہیں بے بدل کس کام کے

(۲)

گھر کے سکّے گھر ہی میں کرتے ہو رد — چاہیے قربان ان احکام کے
چل چکے ہیں آگے بھی سکّے بہت — کیوں بنے ہیں مدعی اقدام کے
بے بدل ڈالر ہے لندن میں اگر — پونڈ امریکہ میں کس کام کے
سکّۂ کہنہ سہی خالص ہے زر — یہ نہیں لائق کسی الزام کے
خوب جانچیں اور کسوٹی پر کسیں — ہیں زرِ خالص کے سیم خام کے
سیم و زر جو ہیں کھرے۔ بالغ عیار — وہ نہیں پابند ان احکام کے
ان کی در جانے مبصّر۔ جوہری — اس کو کیا نقّاد جانیں نام کے
سکّۂ حالی نہیں ہیں تو نہ ہوں — چاندی اور سونا نہیں کس کام کے
جھاڑ شاہی اشرفی کے سامنے — دام چل سکتے نہیں یہ چام کے
زر ہی رہنے دو سانچا تو نیا — ڈھالو تازہ سکّے عُرفِ عام کے
شکل بدلو اصل رہنے دو وہی — گُر بتاتے ہیں یہ تم کو کام کے
لیکن اس کارِ اہم میں دوستو! — ہاتھ ڈالیں ہوں جو اہل اس کام کے
مانتے ہیں آ رہا ہے انقلاب — ہم ہدف ہیں گردشِ ایام کے
ہم کو یہ احساس ہے اچھی طرح — اب نہیں دن تاج[ف] اور گلفام کے
چاہیئے تعظیم ان کی جو بزرگ — اہل ہیں تفہیم اور افہام کے
کس سے سیکھے ہیں بتائیں تو سہی — ناشرع انداز یہ دُشنام کے
ہانکتے ہیں سب کو اک لاٹھی سے وہ — صدقہ دل گردے کے اس ابرام کے
شوق سے کہیئے جو کہنا ہے مگر — روک کر کلک اور زبان کو تھام کے
ان پہ استبداد کی تہمت ہے جو — کر گئے نعرے صلائے عام کے

ف تاج الملوک۔ مثنوی گلزارِ نسیم کا ہیرو۔ مراد قصہ و افسانہ سے ہے۔
[illegible] جے پور کی اشرفی جو خالص سونے کی ہوتی ہے۔

کیا کیا ہے۔ آپ نے فرمایئے! ترجمے۔ جن میں ہیں چند اک کام کے
جو پرانی ہو گئی مغرب میں چیز ترجمے اس کے رہے کس کام کے
تازہ تصنیفات تو دکھلایئے کس لئے دعوے ہیں پھر یہ نام کے
بھیڑ جو حشرات کی تولید کی ان میں عنصر کب ہیں استحکام کے
مورچے[٥] مخمل کے تکتے ہیں تمہیں جھانکتے ہیں آدمی بادام کے
زلف مشکیں کے ہوا میں پیچ و خم بن گئے اڑ کر کنگورے بام کے
بحر کا ظالم نے پوچھا توڑ کر نام دھو ڈالے ہیں بھیم اور سام کے
جس ادب کو آپ کہتے ہیں لطیف داغ اس سے کھل گئے اندام کے
فخر ہے عریاں نویسی کا اگر اس کو رکھیئے اپنے سر میں خام کے
ہو گئی عصمت حیا سے بے نیاز صدقہ ان کی جدت ارقام کے
ان کے ہاتھ آئے تو جو مینا کریں غرب میں جھنڈے گڑیں خیام کے
میر اور غالب کا ہے پھر ذکر کیا وہ تو ہیں ہی قریۂ بدنام کے
مرثیے کا نقد کیا سمجھو گے تم تم تو دلدادہ ہو بس اوہام کے
مرثیہ حالی نے بھی لکھا تھا ایک دل ہلائے جس نے خاص و عام کے
تم ہبلکڑ ہو۔ مگر بھولا نہ ہند معجزے جذر و مد اسلام کے

یہ بزرگوں کی ہے قدر و منزلت
ہیں کرشمے گردشِ ایام کے

---

٥ حضرت ناسخ نے کچھ مہمل شعر اور غزلیں بنا رکھی تھیں۔ انہیں شعر کی فرمائش کرنے والے کے سامنے رکھ دیا جاتا تھا۔ تاکہ اس کی اہلیت کا امتحان ہو۔ ان میں سے ایک شعر یہ ہے ؎ ٹوٹی دریا کی کلائی زلف الجھی بام میں۔ مورچہ مخمل میں دیکھا آدمی بادام میں۔ اس شعر کے مفہوم کو یہاں تین اشعار میں ادا کیا ہے۔ اس کنایہ سے مراد مہمل گوئی ہے جس کا آج کل رواج ہو رہا ہے

زندہ دلی

۱۲؍ دسمبر ۱۹۳۲ء

جیتے جی موت کے دھڑکے سے مر جاتے ہیں
یہ بھی اے دوستو جینے میں ہے جینا کوئی؟

موت آنی تو ہے لابُد۔ مگر اک بار فقط
خالی ان کا تو نہیں موت سے لمحہ کوئی

جب مر گئے تو بہت روئیں گے کیا فکر اس کی
سوگ اپنا بھی کیا کرتا ہے۔ دانا کوئی۔

موت کی تم کو مجھے فکر تمہارے دل کی
مردہ دل شخص کا جینا بھی ہے جینا کوئی

زندہ دل مر کے بھی دنیا میں جیا کرتے ہیں
ہے یہ وہ راز کہ اس راز کو سمجھا کوئی

زندگی یہ ہے کہ ہو زندہ دلی انساں میں
اس سے بڑھ کر نہیں دنیا میں مسیحا کوئی

نقش خاتم کی طرح دب کے ابھرتے ہیں سوا
اہل ہمت کو مٹائیگا بھلا کیا کوئی

اصل میں موت کا بیما ہے وہ۔ یہ یاد رہے
زندگانی کا بھی کر سکتا ہے بیما کوئی

زندگی کا ہو تو بس زندہ دلی سے بیما
کہ سقوط اور تعطل نہیں جس کا کوئی

اس کو بیدرد کہو درد کی ہے جس کو تلاش
عشق کا دل میں نہیں اس کے شرارا کوئی

تو یہاں آیا ہے خوش رہنے کو خوش کرنے کو
رونے رلوانے سے تو خوش نہیں ہوتا کوئی

نیچرے اور چمتکار یہ سر دھنتا ہے۔
کس طرح تجھ سے یہاں کام ہو سیدھا کوئی

کشمکش زیست کے ہر صیغے میں جو ہے جاری
اس کے سر کرنے کا پہلو بھی نکالا کوئی

یہ صف جنگ حیات اور وہ صف ماتم ہے
عمل اور مرثیے کا فرق سمجھتا کوئی

ہمت اور زندہ دلی سے اسے حل کرتا ہے
رونے دھونے سے بھی حل ہوتا ہے عقدا کوئی

برسات کی بہاریں

۲۰ اگست ۱۹۲۹ء

اللہ اللہ کہاں قصیدہ۔ رباعی اور غزل۔ اور کہاں یہ نئے طرز کی چیز۔ جو قدیم اصناف سخن کی فہرست کو آنکھ دکھاتی ہے زمانہ کے ساتھ چلنے سے شان استادی گھٹ نہیں جاتی۔ بلکہ استادوں کا فرض ہے کہ عہد حاضر کی پسند عام کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں۔ بلکہ اس کی طرف عملی توجہ فرماویں۔ تاکہ عام مذاق کی اصلاح ہو۔

برسات کی بہاریں موروں کی وہ جھنکاریں
وہ جانفزا پھواریں وہ گاہیں آبشاریں
پُر جوش جوئباریں
دھومیں مچا رہی ہیں
برسات کی بہاریں دل کو لبھا رہی ہیں

(۲)

اک دھوم سی مچا دی گھنگھور چھا رہی ہیں
دنیا کی نیند اڑا دی سوتے جگا رہی ہیں
امرت کی لے کے دھاریں
کیا اُمڈی آ رہی ہیں
برسات کی بہاریں دل کو لبھا رہی ہیں

(۳)

آئیں اور آکے چھائیں اٹھلاتی وہ گھٹائیں
کوئل نے بھی سنائیں مستانی وہ صدائیں
زاہد کا دل سنواریں
مستی سی چھا رہی ہیں

برسات کی بہاریں   دل کو لبھا رہی ہیں

(۴)

کیا سج گئی ہے ہستی   وہ دھندوکار آئے
چھائی دلوں پہ مستی   مینخلے وہ لنڈھائے
ہوش و خرد سدھاریں
گتریں ہی گیا رہی ہیں
برسات کی بہاریں   دل کو لبھا رہی ہیں

(۵)

ہے دل میں جوش اٹھاتا   بادل کا وہ گرجنا
کیا ناچ ہے نچاتا   وہ جل ترنگ بجنا
جذبوں کو جو ابھاریں
حوریں یہ گا رہی ہیں
برسات کی بہاریں   دل کو لبھا رہی ہیں

(۶)

مدماتی لڑکھڑاتی   چلتی ہیں کیا ہوائیں
مہکاتی وجد لاتی   ان کی ہیں سب ادائیں
حسن جہاں نکھاریں
قسمیں یہ کھا رہی ہیں
برسات کی بہاریں   دل کو لبھا رہی ہیں

(۷)

کیا دن لگے گلوں کو   پھلواریاں کھلی ہیں
دیکھو تو بلبلوں کو   کیا چہچہا رہی ہیں
بھولیں وہ سب پکاریں
منگل منا رہی ہیں
برسات کی بہاریں   دل کو لبھا رہی ہیں

(۸)

پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ہے کیا انیلی
مینا کی اور پپیہے کی آوازیں وہ رسیلی
نائک بھی بازی ہاریں
وہ سُر ملا رہی ہیں۔
برسات کی بہاریں دِل کو لبھا رہی ہیں

(۹)

پھولوں سے یا پھلوں سے ٹہنی ہر اِک لدی ہے۔
نیچر کھلے خزانے دولت لٹا رہی ہے۔
یہ بوجھ کیا سہاریں
سب جھونک کھا رہی ہیں
برسات کی بہاریں دِل کو لبھا رہی ہیں

(۱۰)

برپا جہاں فغاں تھی بلبل کے چہچہے ہیں۔
خاک اُڑ رہی جہاں تھی سبزے کے لہلہے ہیں
پھولوں کی یہ قطاریں
کیا گُل کھلا رہی ہیں
برسات کی بہاریں دِل کو لبھا رہی ہیں

(۱۱)

کوثر ہو یا پانی جھرنے کی وہ پھبن ہے
پاتا نئی جوانی جو اس میں غوطہ زن ہے
امرت کی ہیں یہ دھاریں
مُردے جلا رہی ہیں
برسات کی بہاریں دِل کو لبھا رہی ہیں

(۱۲)

چھایا وہ جوش شادی غم جانتا نہیں دل
تیغ ادا کا اس کی ہے گر کوئی ہے بسمل

ہیں پیار کی یہ ماریں
سب دکھ بھلا رہی ہیں
برسات کی بہاریں دل کو لبھا رہی ہیں

(۱۳)

ارمان و شوق کی ہیں دل میں بھری ترنگیں
کیا کیا مچل رہی ہیں بے چین ہیں امنگیں
وہ شوق کی پکاریں
جی میں سما رہی ہیں
برسات کی بہاریں دل کو لبھا رہی ہیں

(۱۴)

تمکین و ضبط بھولے حسن و شباب والے
گھر سے نکل کے جھولے امرؤں میں ہیں ڈالے
کب تک وہ من کو ماریں
پینگیں بڑھا رہی ہیں
برسات کی بہاریں دل کو لبھا رہی ہیں

(۱۵)

مسحور کر رہی ہیں ڈھولک کی پیاری تھاپیں
دل میں اتر رہی ہیں کجری کی وہ الاپیں
وہ میگھ وہ ملاریں
جادو جگا رہی ہیں
برسات کی بہاریں دل کو لبھا رہی ہیں

(۱۶)

اٹھتی امنگ کیوں کر دابیں دبوچ ڈالیں
قابو نہیں ہے دل پر آنچل کو کیا سمبھالیں

بالوں کو کب سنواریں
آپے سے جا رہی ہیں
برسات کی بہاریں　　دل کو لبھا رہی ہیں

(۱۷)

یہ دیکھ کر کلبلیں تو　　چپلا بھی مسکرائی
مژگاں کی تیز بھالیں　　کھائیں تو تلملائی
تیر نظر کی آریں
کیا قہر ڈھا رہی ہیں
برسات کی بہاریں　　دل کو لبھا رہی ہیں

اس نظم کی نسبت کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ ایک بات یہ کہنی ہے کہ عموماً غزلوں میں دو تین شعر کا قطعہ ڈال دیا کرتے تھے یہاں نظم مسلسل ہے مگر بیچ میں چھ سات شعر غزل کے یعنی مختلف الموضوع آ گئے ہیں۔ یہ بھی ایک نئی بات ہے۔

دیر و حرم میں کس لئے بھٹکا کرے کوئی　　خالق کو خلق ہی میں نہ دیکھا کرے کوئی
حسن ازل کی ہر کہیں ظاہر ہے آب و تاب　　ہاں شرط ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی
ہے ذرہ ذرہ آئینہ دار جمال حق　　دریا کو بند کوزے میں پھر کیا کرے کوئی
مشاطۂ ازل نے جہاں کو سجا دیا　　اس کا مشاہدہ نہ کرے یا کرے کوئی
دیکھے ہلال کا جو افق میں یہ بانکپن　　ابروئے ناز پھر نہ اشارہ کرے کوئی
افشاں جبین چرخ پہ کیا کہکشاں کی ہے　　اختر شمار اس کا نظارہ کرے کوئی

ہے حُسن ڈال ڈال تو خوبی ہے پات پات
کانٹوں میں کیوں گلوں کو گھسیٹا کرے کوئی

قطرے میں بحر ذرّے میں خورشید دیکھ لے
یہ آنکھ یہ نگاہ تو پیدا کرے کوئی

دنبالۂ نوکِ خار ہے چشمِ غزال کا
مژگاں سے شانہ کارئ صحرا کرے کوئی

یہ تیرہ خاکدان ہے خلد کا سماں
چشمِ دروں کو گرمِ تماشا کرے کوئی

تسنیمِ حسن کا ہے رواں چشمہ رات دن
کیا خواہشِ صراحی و صہبا کرے کوئی

اب وقت ہے کہ پھول گل و یاسمن کے ہوں
کب تک مروں کو رات کے رو یا کرے کوئی

محدود ہے یہی گل و سنبل تک ان کا علم
زیبا نہیں کہ نازشِ بیجا کرے کوئی

یہ بھی تو زلف و رخ کے تقید میں ہے جو ہے
وابستہ کیوں پھر اس سے دل اپنا کرے کوئی

ہم نے یہ کب کہا کہ جو انساں ہو حسیں
اس کی طرف سے آنکھ کو اندھا کرے کوئی

اپنا تو یہ یقیں ہے ہر شے میں حسن ہے
ہوئے میاں سے کیوں اسے باندھا کرے کوئی

وہ شے ہے کونسی کہ میسر نہیں یہاں
کس چیز کی جہاں میں تمنا کرے کوئی

شکرِ خمارِ جس کے ہو درپئے وہ کیا سرور
کیا آرزوئے ساغر و مینا کرے کوئی

خود بند یاس میں نہیں پھنسا تو کیا ہی یہ
کیوں بڑھ کے اپنی حد سے تمنا کرے کوئی

کشتِ امید سبز نہ ہو جوئے اشک سے
پایاب کیوں نہ سر کا پسینا کرے کوئی

کب نوک دار کزلک حرفِ ازل بنی
کیوں بانس پر کسی کو چڑھایا کرے کوئی

پیکِ خیال کی بھی ہو آہٹ جسے گراں
کیا چشمِ شوق سے اسے دیکھا کرے کوئی

کیا کہہ رہا تھا اور کدھر جا پڑا خیال
یہ شانِ بیخودی ہے نہ شکوہ کرے کوئی

ہے نظریہ جو حسن کا وہ ناقص الاساس
اس پر نہ قصرِ وہم بنایا کرے کوئی

خط کا تناسب اور توازن ہے رنگ کا
جو کچھ بھی حسن ہے اسے پیدا کرے کوئی

چند آڑے ترچھے تنکے نشیمن میں ہیں فقط
ہاں ہے کہ اس کی نقل کا دعویٰ کرے کوئی

مکسوب فن ہے فن جو ہے نیچر کی نقل ہے
کیا فرقِ اصل و نقل کہ افشا کرے کوئی

پھر بھی جو سچی نقل کے ماہر ہیں اہلِ فن
ان کے کمال ہی سے افادہ کرے کوئی

قدرت نے جو دیا تمہیں رعنائی کا سبق
ہے یہ بھی شاذ اس کا اعادہ کرے کوئی

دنیا بھری پڑی ہے مناظر سے حسن کے
ہو دل کا تزکیہ جو نظارا کرے کوئی

بد خلقیوں نے خلق کی بد نام کر دیا — وہ شے ہے ورنہ حسن کہ پوجا کرے کوئی
بویا غرض کا بیج جو اس حسن زار میں — ثمرہ عمل کا اپنے سمیٹا کرے کوئی
بندہ جو نفس کا ہے نہ ہو بندہ حسن کا — کیوں ننگ خلق حسن کو رسوا کرے کوئی
جو شے ہے وہ نظر میں ہے اپنی تو دلفریب — اسکو جنوں جو سمجھا ہے سمجھا کرے کوئی
فطرت کا حسن شانِ جمالی کا ہے شہود — پیدا تو ایسی حسن کی دنیا کرے کوئی

کیفی تو اس کی خوبیٔ ذاتی پہ ہے نثار
ناظورۂ سخن کو سنوارا کرے کوئی

حسن اور نفس

۲۲ جولائی ۱۹۲۹ء

حسن ازل کا پردہ در اور ہے پردہ دار بھی — عارض حق کی ہے نقاب اور یہی سنگار بھی
حسن کا ہر کہیں ہے زور بحر و بر اس سے شور نور — موج کا قہقہہ بھی ہے خندۂ آبشار بھی
قید و تعینات سے حسن حقیقی ہے بری — باغ بھی منظر اس کا ہے وادی و کوہسار بھی
اسکی صفات میں نقیض فعل بھی ہیں بہت عجیب — ہے یہ دلوں کا اضطراب اور یہی قرار بھی
دل کی کلی کھلی کبھی ہو گئی بیکلی کبھی — مرہم زخم دل بھی ہے خنجر آبدار بھی
اس سے ہی حوصلے بڑھیں اس سے ہی ہمتیں گھٹیں — ہے یہ کبھی دم مسیح اور ہے ذوالفقار بھی
ہے یہی جنتِ امید دوزخ یاس بھی یہی — عشق کے سر کا تاج ہے اور گلے کا ہار بھی
حسن سے لطف زیست ہے حسن سے ہے سکون مرگ — ہے یہ سرور زندگی اور یہی خمار بھی
آئینہ دار حسن ہے دل کی خصوصیات کا — وجہ قرار قلب ہے روح کا خلفشار بھی
حال کو رنگ دے ترے تیرا خیال اے عزیز — آپ الم فزا ہے تو آپ ہی غمگسار بھی
نفس کا ترے انعکاس گرد ترے صور پذیر — ہے یہ جہنم اور ارم نور ہے اور نار بھی
جذبے اگر غرض سے پاک اور حسین لطیف ہوں — معرکہ حیات میں جیت ہے اس کی ہار بھی
ہے یہی مایۂ حیات ہے یہی روح کائنات — حسن پہ جان دے کے دیکھ ہو تو کبھی نثار بھی

اس کی کرشمہ ریزیاں وہم و گمان سے پرے
اس کی فسوں طرازیاں برج فلک کے پار بھی
من کا کھلائے یہ کنول رنج خوشی سے دے بدل
اسکی طرب فزائیاں نے حد و بے شمار بھی
غم! ارے حسن اور عشق! آب حیات و کرب موت!
نفس کے پیچھے ہو گئے ہوش ترے فرار بھی
پاک غرض سے ہو جنوں دیکھنا اسکا پھر فسوں
نازنشیں ہو زیب بر۔ ہاتھ میں ہو مہار بھی

نفس کا جو ہوا غلام حسن ازل سے اسکو کام
ہے وہ زمین کا زیر مشق چرخ کا ہے شکار بھی

توی

۲۵ مئی سنہ ۱۹۲۹ء

غیر ذی روح کی تشخیص میں علامہ کیفی کو ید طولے حاصل ہے آپ کی ایک لمبی مثنوی پریم ترنگنی (جو بوجہ علیحدہ چھپ جانے اور طویل ہونے کے اس مجموعے میں شامل نہیں کی گئی) اردو میں پہلی تمثیلی نظم ہے۔ نظم ذیل کی نسبت صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ آپ نے نیچرل شاعری کی تزئین اور اس کو دلکش بنانے میں پہل کی تھی۔ اور آپ ہی نے اسے کمال کو پہنچایا۔ پہاڑی ریاست چینی میں آپ کئی برس وزیر کے عہدے پر ممتاز رہے آپ کے مکان کے نیچے توی بہتی تھی وہیں یہ نظم ہوئی۔ ملاحظہ ہو۔

شرماتی اور لجاتی
اور ساتھ مسکراتی
گلشن سی لہلہاتی
بلبل سی چہچہاتی
ہنستی ہنساتی گاتی
اور ناچتی نچاتی

پرچاتی جا رہی ہے

حور ارم کے سر کی
گویا وہ مانگ سی ہے
سانچے میں کہکشاں کے
یا آ کے ڈھل گئی ہے
نور ازل کی پتلی
چونچال ہو رہی ہے

اٹھلاتی جا رہی ہے

پرواہ نہیچ کا ہے صحرا کو اور بن کو
وادی کو گھاٹیوں کو کہسار اور دمن کو
تاریک جنگلوں کو کیا؟ باغ اور چمن کو

چمکاتی جا رہی ہے

ہے سوکھے دھانوں پانی وہ کشت مرزباں میں
اس سے سدا بہاریں پہنائے گلستاں ہیں
اس کی ہے روشنی ہے جو نور ہے جہاں میں

برساتی جا رہی ہے

درویش کی روش ہے اس کو نہیں اقامت
گو ہے چلن میں اسکے از حد بھری متانت
اس پر بھی چال اسکی ہے دل کو اک قیامت

تڑپاتی جا رہی ہے۔

وہ نو بہ نو نظارے سنیما کی جیسے فلمیں
چنچل پن اچپلاہٹ شوخی ہے آب گل میں
کیا سرد مہریوں سے اک آگ سی وہ دل میں

بھڑکاتی جا رہی ہے

ظالم ہے چال اس کی غنچوں اور گلوں کو
پرلے کی طرح وہ ہے زندوں کو بسملوں کو
وہ محشر رواں ہے بن والوں کے دلوں کو

ٹھکراتی جا رہی ہے

انداز اس حسین کے دنیا سے ہیں نرالے
پہلے تو خلق کے دل تیر ستم سے گھالے
اور اب کیا ہے ان کو بس یاس کے حوالے

کتراتی جا رہی ہے

تن پر نہیں ہے لتّا — اس پر یہ طنطنے ہیں
پانی کیا ہے ان کو — جو سدّ رہ بنے ہیں
کف بہہ رہے ہیں منہ سے — تیور غضب تنے ہیں
بل کھاتی جا رہی ہے

اس کو نہیں لگی ہے — دُنیا کی کچھ ہوا بھی
سر پاؤں کی نہیں ہے — اس کو خبر ذرا بھی
مستی میں کب ہے اسکو — ہوش اپنے جسم کا بھی
مدماتی جا رہی ہے

گدرایا گو ہے جوبن — قابو ہے خواہشوں پر
شوق اور دل میں ارماں — ٹھہرے مچل مچل کر
بس تنگ آکے اس نے — چھاتی پہ رکھے پتھر
تیوراتی جا رہی ہے

مطلب نہیں کسی سے — ہے اپنے دھن کی پکّی
پروا نہیں جو سر پر — اس کے چلائیں چکّی
پست و بلند عالم — سے ہے نہ ہکّی بکّی
لہراتی جا رہی ہے

اس کو غرض نہیں ہے — کچھ شاہ یا گدا سے
نظّارگی ہوں تو ہوں — درشن کے لاکھ پیاسے
وہ اپنے راستے پر — گردن کو سو ادا سے
نہوڑاتی جا رہی ہے

ہے شوق دید اتنا — اک بھیڑ سی لگی ہے
خاموش بن کی خلقت — دونوں طرف کھڑی ہے
وہ لاجونت مورت — سہمی سی کچھ ہوئی ہے
شرماتی جا رہی ہے

لو۔ دیکھو! شائقوں نے — نرغے میں اس کو گھیرا

مجبور ہو گئی ہے   لرزے میں ہے سراپا
اہل ہوس کی انگلی   پا بوسی کی تمنا
گھبراتی جا رہی ہے

دیکھا جو اس کو بولیں   مہراج سے بھوانی
کیلاس کی بھتیجی   اب تو ہوئی ہے سیانی
پر حسن کے نشے میں   یہ ہو گئی دوانی
مدماتی جا رہی ہے

اٹھتی ہیں اب ترنگیں   معصوم دل میں اکثر
اب دینے پاؤں کا بھی   اسکو نہیں رہا ڈر
کھل کھیلنے کی دھن ہے   سپنے سے سبز چادر
سرکاتی جا رہی ہے

اس کا نہ کوئی ساتھی   اس کا نہ کوئی رہبر
دم لینے کو ٹھہرتی   ہرگز نہیں وہ دم بھر
تھکتی نہیں ذرا بھی   پاؤں آگے آگے چلکر
پھیلاتی جا رہی ہے

دیدار غم ربا سے   اندوہ و رنج ہو گم
دل کی کلی کھلائے   وہ غنچۂ تبسم
جاں مردہ تن میں ڈالے   وہ جانفزا ترنم
کیا گاتی جا رہی ہے

سورج کی وہ کرن ہے   جوہر ہے وہ نگیں کا
پاتا ہے نور اس سے   حسن آسمان زمیں کا
دردِ وطن سے غمگیں   دل کیفئے حزیں کا
بہلاتی جا رہی ہے

مرثیہ لالہ لاجپت رائے

جرم میں عشق کے مستوجب تعزیر بھی ہو　　طوق گردن میں ہو اور پاؤں میں زنجیر بھی ہو
ہو بسا دل میں کھبا سینے میں اک تیر بھی ہو　　ہو کے بسمل خم فتراک کا نخچیر بھی ہو

حریت کے تو وکیلوں کا یہی زیور ہے
چھاؤں تلواروں کی اور جیل ہی انکا گھر ہے

حریت کیا ہے؟ بلا بیم و رجا ہو جانا　　قومیت کیا ہے؟ عزیزوں پہ فدا ہو جانا
زندگی ہے رہِ خدمت میں فنا ہو جانا　　وطنیت ہے تعصب سے رہا ہو جانا

اس حقیقت کو وطن کا جو ہویدا جانے
اس کی در خود غرض اور تنگ نظر کیا جانے

داغِ دل، چاک جگر، نقش تسلی نہ ہوا　　خونِ عاشق سے وہ جبتک متجلّی نہ ہوا
اس پہ بھی رشک سے بری جذبہ قومی نہ ہوا　　مان لیں جسکو سبھی۔ ایسا تو کوئی نہ ہوا

دیش بھگتی کے تری گن تو سبھی گاتے ہیں
مدعی تک تری نیکی کی قسم کھاتے ہیں

جان دے دی ہے وطن پر یہ ہے ایثار کی شان　　نہ ڈرا ضرب ستم سے یہ ہے احرار کی شان
آگے بڑھکر نہ ہٹے ہے یہی سردار کی شان　　جیسے عیسےٰ سے بڑھی تھی رسن و دار کی شان

روح تازہ ہے وطن کو یہ تری قربانی
تھی اسے خون جگر سے ترے عزت پانی

گل کھلائیگی یہاں بادِ بہاراں کتنے　　ہونگے پیدا یہاں بھیم اور نریماں کتنے
بحر اگلیگا یہاں گوہر غلطاں کتنے　　لعل برسائیگا کہسار کا داماں کتنے

گرچہ دنیا میں رہیں گی یہی راتیں یہی دن
لاجپت دوسرا پنجاب میں ہو۔ ناممکن

حُسن

۲۹ر اگست سنہ ۱۹۲۸ء

آپ کے مذہب کا ایک رُکن ہے حسن جہانگیر۔ یہ نظم اسی تلقین اور پراپگنڈے کی ذیل سے ہے۔

قدرت کے حسن کا تم دیکھو اگر نظارا
تو یہ جہان سارا محبوب ہو تمہارا

کس میں نہیں تناسب کس میں نہیں توازن
وہ خاک کا ہے ذرّہ یا پُرضیا ستارا

رنگین عینک اپنی آنکھوں سے دُور کر دو
بے پردہ دیکھنا ہے گر حسن کا نظارا

لیلےٰ کو چشمِ مجنوں سے دیکھنا ہے لازم
یہ ہو تو دل پکارے۔ ہے حسن عالم آرا

پردہ بنے تقیّد گھونگٹ بنے تعیُّن
پھر حسن اور خوبی کا ہو کہاں گذارا

وہ حسن کی پرستش ہے نفس کی پرستش
جب حرص اور غرض نے جذبات کو اُبھارا

تم حسّیاتِ اسفل کے ہو گئے ہو بندے
لذاتِ نفس سے ہے ذوقِ سلیم ہارا

اچھے بُرے کا تم کو احساس ہو تو کیونکر
ہے بدمذاقیوں نے نفسِ حسوں کو مارا

دریا کا ہے ترنّم یا بحر کا تلاطم
شانِ جلال ہے یہ۔ وہ ہے جمال آرا

شمعِ ازل سے روشن بزمِ جہاں ہے ساری
انسان میں بھی اُسکا آ چمکا اک شرارا

انسان وہ حسن کا تم سمجھے ہو جو تلازم
وہ بھول ہے سراسر اور سادہ پن تمہارا

بیدار ذہن میں ہو حسِّ جمالیاتی
پھر دل کی آنکھ کا ہو گل کیا ہے خار تارا

گُل بوٹے کیا جہاں کی یک یک شئے حسین ہے
وہ چشمِ حسن بیں ہی تم کو ملی نہیں ہے۔

سب حسن کا زبان سے ہیں نام لینے والے
حرص و ہوا کے لیکن وہ پڑ گئے ہیں پالے

دیدارِ حسن سے ہو دل کی کلی شگفتہ
اک رُخ کی چھب سے کوئی کیوں دل میں داغ ڈالے

گیسو میں دل اُلجھکر رہ جائے کیوں تمہارا
کیوں زلفِ عنبریں کے ڈس جائیں تم کو کالے

کیوں دیکھکر وہ قامت لوٹے وہیں قیامت
گھائل ہو کیوں جو دیکھے مژگاں کے تیر بھالے

بجلی گرائے دل پہ کیوں عشوۂ تبسّم
کیوں تیغ ابروؤں کی قلب و جگر کو کھالے

یہ نقص ذہنیت ہے۔ تنگی ہے یہ نظر کی — آنکھوں پہ گہرے پردے حرص و ہوس نے ڈالے
عاشق کہو نہ اسکو وہ بوالہوس ہے انساں — روح اور دل کو کر دے جو نفس کے حوالے
جب تک ہے شاخ پر گل ہے مظہر تجلی — لازم ہے رنگ و بو کا تو دید سے مزا لے
تو گل کا چھید کر دل جو ہار گوندھتا ہے — یہ ہے ہوس پرستی مت نام عشق کا لے
سب راگ سن چکے ہیں جو تو الاپتا ہے — حسن اور عشق کے ہیں دفتر بہت کھنگالے
ہو دل جو صاف تیرا۔ احساس پاک تیرا — تو حسن تیرے دل سے خار الم نکالے
صورت کا ہے تو شیدا معنی سے واسطہ کیا — آنکھوں میں بس رہے ہیں تیری تو گورے کالے

یہ حسن کے کرشمے رعنائی کے نظارے
سینوں میں عشق کل کے چمکاتے ہیں شرارے

کیوں گل کو دیکھکر تو بے خود ہوا چمن میں — جا دیکھ تو بہاریں کہسار اور بن میں
کیا مست دیکھتا ہے ان کاغذی گلوں کو — کھل جائیں تیری آنکھیں جا کر جو دیکھے بن میں
باد بہار ہوتی ہے کیف پاش جس دم — مستی سے جھومتے ہیں گویا پہاڑ بن میں
سبزے جیون آبشاریں۔ نیچر کی وہ بہاریں — سب کیونکہ آسمائیں اک چپہ بھر چمن میں
صنعت بدل نہ ہوگی قدرت کی خوبیوں کی — نیچر کی نقل ہے وہ جو ہے کمال فن میں
ہے اصل و نقل۔ صنع و قدرت کا فرق ظاہر — ہے نور شمع میں بھی سورج کی بھی کرن میں
پاکیزگی نہیں ہے شئے کوئی اکتسابی — جو بات ہے لگن میں ہرگز نہیں جتن میں
تو ہے نقش تصنع آگیں تو ہے تکلف آئیں — پھر حسن عالم آرا کیونکر سمائے من میں
کوزے میں آسکے ہوں کب دریا کی بند جیسا — ہو جلوے جذب کیونکر ظل جو حسن کے بدن میں
اپنی جگہ ہے صنعت پر ہر جگہ ہے فطرت — اعجاز نہیں کم ہے اس کا ہی بن چمن میں
کیا آئینے کے آگے معذور ہے کہ ہے بھی — تو بحر حسن کا ہے اک قطرہ تیرے تن میں
جذبات کو ابھارے کیا بحر کا تموج — بس غرق ہو چکا ہے تو تو چہ ذقن میں

مست ہوس ہے بلبل جو پھول پر فدا ہے۔
کیفی کو ساغر گل جام جہاں نما ہے۔

کرشن جی کا فلسفہ عمل

۲۳ر اگست ۱۹۲۸ء

جب کروکھیتر کے میدان میں لشکر آئے
سور با خود و زرہ چلتے ہیں سج کر آئے
بر قدم سیل صفت تند تگاور آئے
اور رتھوان مہاوت کے برابر آئے

فوجیں ترتیب سے جمتی تھیں صف آرا ہو کر
جگمگاتی تھی انی نیزوں کی تارا ہو کر

اونچی بن کے بہر دآزما آئے رن میں
تن زرہ میں تھا تو تھا جوش جلادت من میں
ان میں مشہور تھا ایک ایک دغا کے فن میں
فوج ارجن میں تھا یا لشکر دریودھن میں

تھی چکا چوند وہ کھانڈوں کی چمک سے چھائی
دھندسی آنکھ میں اک تیر فلک تک آئی

جنگجو دونوں فریقوں کے ابھی آتے تھے
اور ترتیب سے میدان میں جم جاتے تھے
شہسواروں کے پرے گھوڑوں کو چمکاتے تھے
پیدلوں کے جھپٹتے قلعوں کو بھی لرزاتے تھے

اک نیستاں تھا وہ میدان دنما بھالوں سے
دن تھا کھانڈوں کے چمکنے سے تو شب ڈھالوں سے

حال یہ تھا کہ یکایک ہوا اک شور بلند
آ گئے لے کے وہ ارجن کو کشن چند مکند
جو سمجھتے تھے وہ چپ چاپ ہوئے سیل دمند
جھنجھناتی تھی نہ تلوار نہ ہلتی تھی کمند

اک دم چھا گیا جنگاہ میں سناٹا سا
بتکدہ بن گیا گویا کہ وہ میدان دنما

سب کی آنکھیں تھیں ادھر انکی تھیں فوجوں کی طرف
جا لگی ارجن نے کشن جی نے وہاں اک اک صف
تب دل ارجن کا جیسے جنگ میں تھا لبکہ شغف
دفعتہً ہو گیا مایوسی کے پیکاں کا ہدف

یاس نظارۂ جنگاہ سے زعشہ لائی
دل پہ ارجن کے غضبناک اداسی چھائی

ان عوارضن میں جو مہراج نے جو اُپدیش کیا — اس کی ہر رمز کی نکتہ کی ہے حامِل گیتا
جسکو آنکھوں پہ جگہ دیتی ہے ساری دُنیا — مجھ کو منظور نہیں اس کا یہاں دُہرانا
مختصر گُر جو ہے اس کا وہ بتاتا ہوں میں
حکم پاک آپ کا جو ہے وہ سناتا ہوں میں

یُنہیں کہہ کے کشن جی نے کیا ختم کلام[۱] — فلسفہ اس میں کرم یعنی عمل کا ہے تمام
سُنیئے کرتے ہیں جو ارجن کو ہدایت گھنشام — یاس کو چھوڑ دے اور کر تجھے کرنا ہے جو کام
تجھ پہ جو فرض ہے کرنا وہ تو ہر حال میں رہ کر
عظمت فعل ہے عطلت سے کہیں بالا تر

فرض یا دھرم سے ہٹ جائے گنہگار ہے وہ — اسکو ہمدرد نہ کہہ سخت غرض دار ہے وہ
رحمدل وہ نہیں بزدل ہے ستم گار ہے وہ — مکت پد[۲] کیسا؟ نہیں پُن کا سزاوار ہے وہ
کیونکہ یہ فرض ہے کر اس لئے تو فرض ادا!
اس کے پھل اور نتیجے کی نہ الجھن میں جا

غور سے سُن تو سمجھتا ہے جسے دل یا من — اس کے اندر تو جلا بھگتی کی پاکیزہ اگن
ہر نفس چاہیئے جاری رہے یہ پاک ہَوَن — آہوتی کے لئے کر باسنا[۳] من کی ارپن
رہ کے پانی میں نہ تیرا ہو ذرا دامن تر
ہے نجات اس میں یہی مارگ ہے سب سے بہتر

---

[۱] شریمد بھاگوت گیتا کے ادھیا ۳ شلوک ۸ کے شروع کا کلمہ۔
[۲] مکت پد۔ درجہ نجات۔
[۳] باسنا۔ خواہش۔ ارپن۔ نذر۔

مرثیہ حکیم اجمل خان مسیح الملک

یکم جنوری سنہ ۱۹۲۸ء

مصرعے کیا ہیں دل کے ٹکڑے ہیں جو محبت کے جوش سے بحر کی روانی میں بہہ رہے ہیں
مسیح الملک مرحوم سے آپ کے بھی کئی تعلقات تھے میرے روبرو ایک شخص نے اس نوحہ کی
بہت تعریف کی۔ آپ نے ایک آہ کو روک کر فرمایا۔ بھائی کوئی دل کے کرب سے روتا ہے
تم اس کی تعریف کرتے ہو۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ تم بھی میرے ساتھ رونے اور تڑپنے لگو
اللہ اکبر۔ کیا دل اور دماغ اللہ نے بخشا ہے۔

آج دلی میں قیامت کی سنائی آئی — جس سے ماتم کی گھٹا شہر کے دل پر چھائی
تار برقی نے یہ غمناک خبر پہنچائی — کہ وطن چھوڑ کے چلا آج وطن شیدائی
چوٹ غم کی دل پر اہل وطن کھاتا ہے
کہ وطن چھوڑ کے شیدائے وطن جاتا ہے

کہنے ہیں نام کو باقی ہے نشان دہلی — چل بسے لوگ جو تھے روح رواں دہلی
مٹ چکی گرچہ بہت شوکت و شان دہلی — کچھ ہو۔ تھی ذات مقدس تری جان دہلی
جان دہلی میں نہیں وہ سہی اجڑا سا دیار
آج پھر کس لئے کل ہند ہوا ماتم دار

تجھ سے دلی کی نہیں ہند کی دلداری تھی — ہر رگ و پے میں ترے حب وطن ساری تھی
دوستداری تھی رواداری تھی غمخواری تھی — ہاں تعصب سے تری طبع بہت عاری تھی
جن میں ہوں جمع یہ کل وصف وہ کم انساں ہیں
یہی اوصاف حسن حب وطن کی جاں ہیں

ملک میں کتنے کوی راج ہیں اور کتنے حکیم — والیان علم و طب کے مخصوص ندیم
بیشتر فن میں نہیں جن کے عدیل اور سہیم — کس میں لیکن ہیں یہ سب وصف ہے اللہ علیم

طرفہ مجموعۂ اوصاف حمیدہ تھا تو
غرض جوہر اخلاق سعیدہ تھا تو

ذکر حکمت کا ہے کیا وہ تو ہے گھر کی لونڈی
ہاتھ میں شافئ مطلق نے شفا بخشی تھی
موت اور زیست تو ہے تابع حکم ربی
معترف خلق ہوئی اسکی شفا بخشی کی
انگلیاں نبض پہ رکھتے ہی مرض دھر پکڑا
شیر نے پنجہ میں روباہ کو جیسے جکڑا

فرد تھا مشرقی ملکوں میں وہ ایسا تھا طبیب
یہ حذاقت تو نہیں ہوتی ہے ہر اک کو نصیب
خلق وہ ڈھونڈھ کے نہ پاؤ گے کوئی اس سے نجیب
الغرض ایسا طبیب ایسا نجیب، ایسا حبیب
دوسرا آج زمانے میں کوئی کم ہوگا۔
حشر تک اجمل مرحوم کا ماتم ہوگا۔

ایک سر حلقۂ ارباب صفا تھا نہ رہا
ایک روح تن اخلاص و وفا تھا نہ رہا
محفل شعر میں جان فصحا تھا نہ رہا
خدمت ملک پہ دل جس کا فدا تھا نہ رہا
تو نہ ہوگا تو تری یاد رہے گی دل میں
شمع محفل ہو ترا ذکر ہر ایک محفل میں

عطر تھا مشرقی تہذیب کا تیرا برتاؤ
روح تھا دلی کی کلچر کا ترا نیک سبھاؤ
کوئی کچھ ہی کہے آتا تھا طبیعت کو نہ تاؤ
ایک تھا تجھ کو زمانے کا اتار اور چڑھاؤ
ملک میں ہوتے رہے روز نئے ہنگامے
تھا تو اٹھتے ہوئے طوفانوں کو روکے تھامے

ملک میں کیا نہ ہوئی پچھلے دنوں جنگ ملل
اور لوگوں کے دلوں میں تھی غضب کی ہلچل
ان بزرگان وطن میں تھا ہمارا اجمل
نام کو جن کی روا داری میں آیا نہ خلل
دعوت ابنائے وطن کو جو عمل کی دی تھی
لائحہ کار میں اس کے نہ ہوئی تبدیلی

تھا امیدوں کا کھلا ایک گلستاں دلمیں
ملک آزاد ہو تھا اک یہی ارماں دل میں
گرچہ رکھتا تھا تو اک کعبۂ ایماں دل میں
تھے برابر تجھے ہندو و مسلماں دل میں

ایک آنکھ ان کو بس اس مرد خدا نے دیکھا
دین اور دھرم کا تھا ایک ہی میں لیکھا

گرچہ کہنا کبھی گاندھی کا ہی مانا نہ گیا | حفظ ملی کا وہ مصنوعی بہانہ نہ گیا
لب سے تیرے وطنیت کا ترانہ نہ گیا | تھا غم عشق وطن دل سے نہ جانا نہ گیا
غم وطن کا رہا دل میں ترے ارماں ہو کر
یہ گیا بھی تو گیا ہم نفس جاں ہو کر

ان پہ وہ اس پہ سب احرار وطن مرتے تھے | فرش رہ دیدہ و دل اس کے لئے کرتے تھے
شیخ اور برہمن اس کا ہی تو دم بھرتے تھے | اس کے ہی نقش قدم پر وہ قدم دھرتے تھے
کم ملیگا تمہیں اس دور میں اجمل ایسا
نہیں ممکن کہ ملے جوہر اکمل ایسا

پائیں گے خلق و موالات ترے ہم کس میں | آخری تیری صدارت ہوئی جس مجلس میں
اتفاق آکے پڑا دیکھئے کیسا اس میں | صلح ہندو و مسلماں کی ہوئی تھی جس میں
تھیں کھلی بہتریٔ قوم کی راہیں تجھ پر
جب پڑا وقت تو اٹھتی تھیں نگاہیں تجھ پر

آشرم صدق و محبت کا جو گجرات میں ہے | صدر اس کا کہ کشش جس کے مقالات میں ہے
عشق و ایثار بھرا جس کے خیالات میں ہے | اثر اعجاز کا جس شخص کی ہر بات میں ہے
اس کی وطنیت اس احرار کے سرنام سے پوچھ
دوستداری و خلوص اس کا سری[1] رام سے پوچھ

شادی و رنج وطن سینہ میں جاگیر بھی تھا | عشق رگھبیر بھی دل میں غم شبیر بھی تھا
کام کرنے میں جواں رائے میں وہ پیر بھی تھا | شدت جوش میں جذبوں کا عناں گیر بھی تھا
دل سنان غم الفت سے چھدا رہتا تھا
تن بدن سوز محبت سے پھنکا رہتا تھا

رہنما راہ ترقی کا ہو رہگیر بھی ہو | دبش بھگتی کا کلیجے میں کھبا تیر بھی ہو
دل میں آہ سحری نالہ شبگیر بھی ہو | درد ہو دل میں اور الفاظ میں تاثیر بھی ہو

[1] لالہ سری رام مولف خمخانۂ جاوید

جمع یہ وصف تو ہوتے نہیں ہر انسان میں
ہاں یہ موجود بہ حد درجہ تھے اجملؔ خاں میں

وہ دل افزائی کی ہمدردی کی پیاری گھاتیں
خون رلوائیں گی پسماندوں کو تیری باتیں
ملک میں ایسی نہ نکلیں گی بہت سی ذاتیں
فکر میں قوم کی گھٹتے ترے دن اور راتیں

غیر کے درد کو سینہ میں جو اپنے لے لیں
جاں تک نذر وہ اس درد دلی کو دیدیں

غم وطن کا نہ کبھی تجھ سے جدا رہتا تھا
تو ہمیشہ وطنیت پہ فدا رہتا تھا۔
ملک کا درد ترے دل میں بھرا رہتا تھا
سازِ دل زخمۂ الفت سے چھڑا رہتا تھا

جان اس دل پہ فدا ہو کے نہ کیونکر رہتی
دلِ پُر درد کی چوٹوں کو وہ کیونکر سہتی

قلم اور لب سے طلسمات رچانے والے
یوں تو سب راگ اخوت کا ہیں گانے والے
کم ہیں جو کہدیں وہ کر کے بھی دکھانے والے
قومی خدمت کے تھیٹر کو چلانے والے

دردمندانِ وطن ایسے تو ہوں گے تھوڑے
جن کے دل سوزِ وطن سے ہوئے پک کے پھوڑے۔

درد سینے کو وطن کا ہمہ تن جاں ہونا
سیکھتا تجھ سے کوئی قوم پہ قرباں ہونا
جو ہر انسان کا ہے ہمدردئے انساں ہونا
قول اور فعل کا آساں نہیں یکساں ہونا

سروری چیست؟ بگو خادم اخواں بودن
غم ابنائے وطن خوردن و شاداں بودن

شیر دل جو ہیں وہ ہو جاتے ہیں اس سے عاری
ہے وہ ایثار طلب قوم کی ذمہ داری
کس سے اٹھتا ہے۔ اٹھائیں تو اسے انصاری[1]
خدمت ملک کا ہے بوجھ بہت ہی بھاری

باوفا دوست کے کاموں کا سرانجام کریں
رُوح مسرور ہو مرحوم کی وہ کام کریں

رُوح اجملؔ کو ملے تیرا جوار رحمت
بارگاہ صمدی میں ہے دُعا بارقت
اس کی تقلید کی ہو اہل وطن کو ہمت
کام چھیڑے تھے جو اس نے وہ چلیں بے وقت

اس کا فرزند جو ہے خلق پدر کی تمثیل
کر عطا یارخدایا تو اسے صبر جمیل

[1] ڈاکٹر مختار احمد انصاری (اب مرحوم)

ہندو مسلم فساد

سنہ ۱۹۲۷ء

مئی سنہ ۱۹۲۷ء کے اول ہفتہ میں شہر لاہور میں ہندو مسلمانوں کے سخت بلوے ہوئے دونوں طرف کئی قتل اور بہت سے زخمی ہوئے۔ مار پیٹ اور لوٹ کھسوٹ کا تو ذکر ہی کیا ہے اس خونی اور بربریت کے مناظر سے متاثر ہو کر علامہ نے یہ نظم لکھی جو ۲۲ مئی کے اخبار بندے ماترم لاہور میں چھپی اور کئی اخباروں میں نقل ہوئی۔

چلن ہو گیا وحشیانہ تمہارا
ہر اک فعل ہے جاہلانہ تمہارا

یہ کیا وجہ ہے؟ ہر کوئی پوچھتا ہے
تجاہل یہی ہے عارفانہ تمہارا

تنظیم ہے نہ یہ سنگھٹن ہے
ہے بیہودہ ہر اک بہانہ تمہارا

اسے جو سُنے کیوں نہ ہو تم سے نافر
لکھا خوں سے ہے فسانہ تمہارا

کسی بزم میں کب ہو جانے کے قابل
ہو دنیا کو کیا منہ دکھانے کے قابل

یہ کیا خانہ جنگی یہ کیوں کشت و خوں ہے
سروں میں سمایا یہ کیسا جنوں ہے

گلہ ہے یہ کرتوت ہیں سب پریس کے
خیانت کا یہ لیڈروں کی فسوں ہے

ہدف کون سوچو تو ہے تیغ کیں کا؟
چھری خون میں کس کے یہ لالہ گوں ہے

زمیں جس سے لاہور کی ہے شہابی
خبر ہے یہ کن بیگناہوں کا خوں ہے

نہیں یہ لہو شیخ اور برہمن کا
کہ ہے اشک خونیں یہ اُمّ الوطن کا

بڑا شیر مارا جو مارے ہیں بھائی
یہی کی ہے دھرم اور دیں کی کمائی

سیہ کاریاں ایسی کرتوت ایسے
مگر تم نے شرم و حیا بھون کھائی

جہالت نے آنکھوں پہ ڈالا ہے پردہ
شرافت وہ تہذیب سب کچھ گنوائی

بنایا ہے فولاد کیوں دل کو تم نے
یہ کس معرکہ میں تھی زور آزمائی

مناسب ہے سمجھو کہ کیسی خوشی ہے؟
یہ ہے خودکشی یا برادر کشی ہے۔

کبھی یہ بھی سوچا کبھی یہ بھی جانا — کہیگا تمہیں کیا مہذب زمانا
سنا کچھ کہ تیغ و تبر لے کے نکلے — جہالت کا وحشت کا ہے کچھ ٹھکانا
یہ تھا وقت گھر کرتے ہر اک کے دل میں — لیاقت کا لازم تھا سکّہ بٹھانا
یہاں تو مگر۔ جو ہے وہ کام الٹا — سمجھ الٹی۔ الٹا ہے سب کارخانا

وہ رحم اور دیا کے سبق بھولے سارے
بُرے دن ہی آئے ہیں شاید تمہارے

تمہارے تو ہیں ڈھنگ ہی سب نرالے — سمجھالے تمہیں تو خدا ہی سمجھالے
ذرا اپنے اعمال پر تو نظر ہو — یہ ہیں دہرم والے - یہ ایمان والے
پولس چاہیئے اب جلو میں تمہاری — ہراول میں ہوں پلٹنیں اور رسالے
کہا کچھ کسی نے کہ آپے سے باہر — وہیں لاٹھیاں اور خنجر نکالے

نہ سمجھو کہ بھائی کا سر کاٹتے ہو
وطن کا تم اپنے جگر کاٹتے ہو

پیامِ کیفی

۲۷ر دسمبر سنہ ۱۹۲ء

اس نظم کی نسبت صرف اتنا ہی کہا جائیگا۔ کہ ایک محب وطن کا دل کیوں نہ کُڑھے۔ جب وہ اربابِ وطن کو آپس میں لڑتے جھگڑتے دیکھے۔ حضرت کیفی کی روا داری اور تلقین مواسات ضرب المثل کی حد تک پہونچ گئی ہے۔ کاش ہم سب کی ذہنیت اسی رنگ اور نوعیت کی ہوتی۔

ملک ہندوستان کے خاص و عام — آج ہے صاف صاف تم سے کلام
سب اشارے کنائے ختم ہوئے — بے کم و کاست سن آج کا ہے پیام
میں بھی رکھوں گا اب نہ لاگ لپیٹ — کیونکہ جو بات ہے وہ طشت ازبام
آخر ایسے بھی کیا دن تیرے ہیں — کہ کریں لوگ دور ہی سے سلام

سننے والوں کی چڑھ گئی تیوری — کان میں جب پڑا تمہارا نام
کیا نہیں جانتے جو کہتے ہیں — تم کو دنیا کے لوگ اور اقوام
یہ کہاوت کبھی سنی تو نہ تھی — بد سے بدتر جہاں میں ہے بدنام
اور جو اس کے ساتھ بد بھی ہو — اسکو کیا دیجئے گا آپ انعام
نہ ہمیشہ کبھی چلے نہ چلیں — چار دن کے ہیں سب یہ چام کے دام
ذاتی غرضیں بھی کر چکے پوری — ہو چکا ہے وطن کا بھی نیلام
جو یہاں ہے وہی ہے شعلہ زباں — جو یہاں ہے وہی ہے برق خرام
یہ چلن ہیں تو پھر خدا کی پناہ — اس زباں سے ضرور غیر ہو رام
کوئی پھانسی کوئی چھرے سے مرا — کتنے گھر ہیں جہاں مچا کہرام
کیا غرض آپ کی بلا جانے — کتنی بیوہ ہوئی ہیں اور ایتام
اس زمانہ کا صفحہ تاریخ — خون اخواں سے پا چکا ارقام
تیرا قشقہ کلنک کا ٹیکہ — تیرا بہروپ جامہ احرام
کہہ گیا چٹ وہ سر اٹھنا کا — کاف لام اس کا ٹھہرا ہے اسلام

شیخ اور برہمن یہ سن رکھیں — ہے بڑے کام کا بڑا انجام
بات اب کیا نئی ہوئی پیدا — جس پہ یوں باندھنے لگے ہو لام
مسجدیں کیا یہاں نہ تھیں پہلے — اور سنا تھا نہ چنگ و دف کا نام
یا نہ مندر رہتے اور نہ گائے یہاں — اور جلوسوں کا بھی نہ تھا اعلام
کیا تھے ہندو ہی ہندو ہند میں سب — یا تھے سب ہی مقلد اسلام
ہند کے اب بھی چند حصوں میں — قوم کی ہے حکومتوں کا نظام
کسی حصے میں ہندوؤں کا راج — اور کسی میں ہے شاہیٔ اسلام
وہاں رہتی ہے کیونکہ خلق خدا — کیوں ہے آنند کا وہاں بسرام
نہ یہ جھنجھٹ نہ خرخشے ہیں وہاں — شیخ اور برہمن ہیں با آرام
یہاں کیا آ گئی ہے یہ شامت — ہو گیا ہے جو امن تم پہ حرام
کیا اسی پیسے کی ہے یہ تاثیر — قدما جس کو جانتے تھے حرام

وہ فقط اک روائتی ہے گھڑت — اس میں سچائی کا نہیں ادغام

کس شرافت کے یہ عناصر ہیں — لاٹھی، خنجر، طمنچہ اور دشنام
کچھ سنا اور جامہ سے باہر — اتنے جذبات کے ہوئے ہو غلام
یہ تمہارا شعار اور اس پر — بھر کے منہ حرّیت کا لینا نام
ہاں سوراج آپ کو ملیگا ضرور — جو یہی دن ہیں اور یہی صبح و شام

یہاں ہندو ہیں یا مسلماں ہیں — ہند - ہندی کا اب رہا نہ مقام
وطنیت ہوئی ہے ملک بدر — گو یا شملہ سے آئے ہیں احکام
جب نہ اپنے کو سمجھیں اہل وطن — کہاں حُبِّ وطن کرے گی قیام
خارجی بھی ہیں اس کے چند اسباب — امن کا جس سے کام ہی ہے تمام
سب سمجھتے ہیں جاننے والے — حیف! پھنستے ہیں دیکھ بھال کے دام
کہتے ہیں یہ فساد کی جڑ ہے — کونسلوں کا جو ہے جدید نظام
جو نہ ہوتی موافق اس کے زمیں — کیونکہ اس جڑ کو ملتا استحکام
سردی - گرمی ہمیشہ آتی ہے — ان کو ہو ضعف معدہ اور زکام
جسم پہلے سے جن کے ہوں کمزور — جن کی صحت میں ہوں چھپے اسقام
نزلہ عضو ضعیف پر ہی گرے — یہ مثل جگتوں سکا ہے انام

کچھ ہی اسباب اور لواحق ہوں — ان سے ہم کو نہیں زیادہ کام
اب مرض کا ازالہ واجب ہے — ورنہ پھر قوم کا ہو مرگ انجام
میں کہوں گا اسے سمجھ کا پھیر — جس کو سمجھے ہو گردش ایام
کام کرنے کے جو ہیں گردہ کرد — تو زمانہ بھی ہو تمہارا بہ کام
کچھ تو قابو میں رکھو جذبوں کو — اور اپنی زباں کو دو لگام
کر چکے خون بھائیوں کا بہت — کیجئے اب تو تیغ کیں کو نیام
بند اب کیجئے یہ مہابھارت — بھائی بند آ چکے بہت سے کام

کربلا اور کرکشیتر کو اب — وقت ہے دیجئے وداع دوام
خلق میں نیکی اور رواداری — ہوں نمایاں تو سب ہٹیں آلام
دین بھی اس سے سدھرے دنیا بھی — ہر کسی کا ہو دل دھرم کا دھام
ہاتھ اُٹھے تو بس مدد کے لئے — غم و غصہ کو دو جو دو دشنام
یہ وتیرے تھے ان بزرگوں کے؟ — جن کا لیتے ہو تم ادب سے نام
اب بھی سمجھو تو کچھ نہیں بگڑا — نہیں پابند وقت اچھا کام
اس کو بھولا ہوا نہیں کہتے — صبح جو جائے اور آئے شام

اس کو مانو نہ مانو ہو مختار
یہی کیفی کا ہے تمہیں پیغام

سُورج کی ایک کرن

۷ ستمبر ۱۹۲۷ء

علامہ کیفی کا یہ نیا نظریہ ہے کہ رام چندر جی کا مقصد جنوبی ہند میں آرین کلچر اور تہذیب کو پھیلانا تھا۔ جبھی تو وہ بن باس کا حکم سنتے ہی سیدھے جنوب کو ہو لئے۔ نثر میں بھی آپ کا ایک مضمون اسی موضوع پر ہے۔ یہ محض آپ کی جدّت تخیّل ہے۔ جو والمیک سے لیکر آج تک کسی کے ذہن میں نہیں آئی۔ طرفہ یہ کہ نظر غائر سے کام لیا جائے تو واقعات اس کی تائید کرتے ہیں۔

رنگ تہذیب کے چہرے نے انوکھا پایا — جوش اک سر میں ترقی کے سہانا آیا
شاد مانی کا تمدن نے ترانہ گایا — نور اخلاق نے انسان کا دل چمکایا

رام جی کی ہوئی جس وقت اودھ سے رخصت
اور مڑی سوئے دکن اُنکی عنان ہمت

ہے محقق کے لئے یہ بھی اہم ایک سوال — کیوں نہ رُخ ان کا ہوا جانب اقصائے شمال
کیوں نہ مشرق کو گئے وہ سوئے ملک بنگال — کیوں نہ مغرب کی جانب کا ہوا ان کو خیال

کیوں چلے گھر سے نکلتے ہی دکن کو رگھبیر
کوئی منصوبہ مگر ذہن میں تھا عکس پذیر

تھی جو اصلاح خلائق کی رگھوبر کو لگن
خدمت خلق کی تھی شمع جو دل میں روشن
عزم میں حب جہانگیر جو تھی جلوہ فگن
راجدھانی سے نکلتے ہی چلے سوئے دکن

تاکہ لوگوں کو وہاں آریہ تہذیب سکھائیں
اور تہذیب وتمدن کی سبیل ان کو بتائیں

سلطنت کی انہیں توسیع نہیں تھی منظور
ملک گیری کی تمنا سے نہ دل تھا ماثور
زر و گوہر کی بھی خواہش تھی بہت عزم سے دور
شہرت اور نام سے بھی ذہن نہیں تھا مامور

چاہتے تھے کہ چھٹیں بربریت سے وہ لوگ
اور آراستہ ہوں آدمیت سے وہ لوگ

سیکھیں اخلاق حسن اور سدا چاری ہوں
کلچر اور علم وہاں آریوں کے جاری ہوں
حیثیت سمجھیں جماعت کی پر اپکاری ہوں
وحشیانہ چلن اور جہل سے وہ عاری ہوں

آریوں کے سے ہوں شائستہ وہ سارے افراد
ملک آباد ہو باشندے ہوں اسکے دلشاد

عزم بالجزم یہی تھا کہ تھا عامل دل میں
رام جی سوچتے رہتے تھے یہی دل دل میں
راج کے کام میں تھے اس سے نہ غافل دل میں
قصد اس امر کا کر بیٹھے تھے کامل دل میں

موقع بن باس کا یوں رام کو جو پیش آیا۔
جامہ تکمیل کا تخیل کو اب پہنایا

سوچ میں تھے کہ معین کریں کیا لائحہ کار
کہ ہوا بالی و سگریو میں قصد پیکار
کیا اخلاص کا سگریو نے آکر اظہار
ہوگئے حق پہ اسے پاکے مدد کو تیار

عرصہ جنگ میں بالی کا ہوا کام تمام
تاج سگریو کو پہنا کے پھرے لچھمن و رام

داد احسان و وفاداری کی سگریو نے دی
دوستداری کی شرائط جو تھیں سب کیں پوری
بڑھ کے سگریو سے ہوگا نہ حلیفی کوئی
اس پہ اخلاص تھا ختم اور عقیدت مندی

آج دُنیا میں نہیں پائیں گے اِنساں ایسے
جاں نثاری میں ہوں سگریو ہنوماں جیسے

جنگ کا خسرو لنکا پہ ہُوا جب اعِلان   یہاں دو بھائی وہاں جنگ کا پورا ساماں
تھے جو ساتھی وہ تھے بس صورت اِنساں حیوان   جنگ پھر فتح کا ۔ فرمائیے کیا تھا امکان

پر یہ وہ دو تھے ۔ کہ دو لاکھ پہ بھی بھاری تھے
جنگ میں ان سے زمانے کے جری عاری تھے

ملک کے تھے جو قبیلے انہیں کرکے باہم   جاں نثاری کی وفاداری کی دی ان کو قسم
دیدئے تیغ و تبر ۔ تیر و کماں اور بلّم   جنگ کے فن میں غنیموں سے نہ تھے ہرگز کم

بانروں[1] سے وہ رگھو بنسیوں کی فوج بنی
موت لنکا کی وہی فوج ظفر موج بنی

آدمی حسن تدّبر سے بنایا ان کو   فوج کا قاعدہ آئین سکھایا ان کو
جنگ کے کام میں جرّار جو پایا ان کو   حرب اور ضرب کا سب ڈھنگ بتایا ان کو

فوج اس طرح بنی یوں ہوئے لشکر تیّار
شہ لنکا پہ ہوئی آریہ دل کی یلغار

جنگ سنگل کا نتیجہ جو ہوا ۔ جو انجام   اس کی تفصیل سے معمور ہے تاریخ تمام
دو غریب الوطنوں نے کئے سر ایسے مہام   ہوا شائستگی و تہذیب کا اس ملک میں نام

یہ سبق وہ ہیں جو تاریخ سے پا سکتے ہیں
اہل دنیا جنہیں سر مشق بنا سکتے ہیں۔

---

[1] بانر یعنی جنگل کا رہنے والا ۔ وہ لوگ جن کی فوج سے لنکا پر حملہ ہُوا ۔ بندر نہ تھے ۔ بلکہ جنگلی نیم وحشی قبیلوں کے آدمی تھے ۔

بھارت کی خبر لیجئے

۸ر اگست سنہ ۱۹۲۷ء

(۱)

امڈی ہیں تنزل کی وہ گھنگھور گھٹائیں
چلتی ہیں تباہی کی یہ جھکڑ کی ہوائیں
اور چھائی ہوئی ہم پہ ہیں غفلت کی ادائیں
پھوٹ اور جہالت کی ہے دھن سر میں سمائی   بھارت کی خبر لیجئے اے کرشن کنھائی

(۲)

طوفان ہے ہر چار طرف قوم پہ چھایا
آتا ہے کسی کو نظر اپنا نہ پرایا
اور ہمکو ڈراتا ہے بس اپنا ہی سایا
دیتی نہیں بچنے کی کوئی شکل دکھائی   بھارت کی خبر لیجئے اے کرشن کنھائی

(۳)

بگڑے ہیں دل اور سر میں حماقت کا نشا ہے
جن پھوٹ کا ہے سر پہ جو ہر اک کے چڑھا ہے
کیا غیر یہاں بھائی سے بھائی ہی جدا ہے
سنسار میں دیکھی نہیں ایسی تو جدائی   بھارت کی خبر لیجئے اے کرشن کنھائی

(۴)

جب دیکھئے اپنوں ہی سے اپنوں کی ہے کھٹ پٹ
ذاتوں کی ہے نیچ اور اونچ کی ہر بات میں جھنجھٹ
جب قوم کی یوں پھوٹ کے بگڑ جائے بناوٹ
کیا دیش کی پھر سوچ سکیں گے وہ بھلائی   بھارت کی خبر لیجئے اے کرشن کنھائی

(۵)

ہے دِل میں دَیا اور نہ ہے مان منوں میں
ہے آتما شکتی ہی نہ ہے بل ہی تنوں میں
اس پر بھی تو کامل ہیں جہالت کے فنوں میں
بیٹھا ہے لڑائی پہ تُلا بھائی سے بھائی بھارت کی خبر لیجیے اے کرشن کنھائی

(۶)

آتا نہیں وہ کام ضروری جو ہے کرنا
اس اپنے نکھد جینے پہ کیا ہنستا ہے مرنا
پھر اُنتی کس طور ہو کیونکر ہو سدھرنا
آپس میں ہے کیا ہٹ کہ ہو اور دل سے لڑائی بھارت کی خبر لیجیے اے کرشن کنھائی

(۷)

اب ہم میں نہ ہمت ہے نہ ایکا ہی رہا ہے
غیرت ہے نہ عزت کا تقاضا ہی رہا ہے
گیان اور کرم کا نہ وہ چرچا ہی رہا ہے
جو فرض ہیں سب کرتے ہیں اب ان سے رکھائی بھارت کی خبر لیجیے اے کرشن کنھائی

(۸)

ہم کام کی باتوں کو سمجھتے ہیں ٹھٹو لی
اور بولتے ہیں روز نئی سے نئی بولی
خود غرضی کی منڈی میں دوکاں سب نے ہے کھولی
لوگوں نے گنوائی ہے وہ پرکھوں کی کمائی بھارت کی خبر لیجیے اے کرشن کنھائی

(۹)

جب سخت بپت آئی ہوا تنگ زمانا
ست اور دھرم نے کہیں پایا نہ ٹھکانا
تو آپ کا اُس دم ہوا سنسار میں آنا
بپتا کی گھڑی پیش وہ اب ہند کو آئی بھارت کی خبر لیجیے اے کرشن کنھائی

(۱۰)

سب آپ پہ روشن ہے جو احوال ہوا ہے۔
کہتا نہیں بھارت کی یہ سچ مچ کی دشا ہے۔
بپتا کی کہانی ہے یہ دُکھڑوں کی بتھا ہے۔
ہے اپنے ہی ہاتھوں کی یہ سب کارروائی — بھارت کی خبر لیجیے اے کرشن کنھائی

(۱۱)

منہ کھول کے کیا کہیے جو دُرگت ہے ہماری
ہردے پتی روشن ہے حقیقت ہمیں ساری
آئے ہیں دیا وان کے دوارے پہ بھکاری
اور دیتے ہیں کیفی کی زباں سے یہ دُہائی — بھارت کی خبر لیجیے اے کرشن کنھائی

دِل

۴ مارچ سنہ ۱۹۲۷ء

علم نفسیات کے ماہر اس نظم کو غور سے پڑھیں اور تسلیم کریں کہ شاعری سائنس سے عاری نہیں۔

دِل بھی کیسا عجیب منظر ہے — حدّ و ہم و گماں سے باہر ہے۔
اسمیں اٹھتی ہیں نت نئی موجیں — ایک احساس کا سمندر ہے
اس کے جذبات ایسے عالمگیر — اس کے حیطہ میں ہفت کشور ہے
زیب تکوین ہے اس کے طرفہ نقوش — دہر کے آئینہ کا جوہر ہے۔
ہے کبھی مرہم جراحت روح — اور کبھی آب تیغ و خنجر ہے۔
وہ تلوّن ہے اس کے فعلوں میں — دیکھکر جس کو عقل ششدر ہے۔
وہ تنوّع عمل میں ہے اس کے — جسم کثرت کا طرفہ زیور ہے۔
رُوح وحدت ہے اس کی نیرنگی — خضر راہِ نجات اکثر ہے۔
نہیں پابند طور اس کا نُور — اس سے سارا جہاں منور ہے
اس میں ذات و صفات مدغم ہیں — ہے غرض اور یہی تو جوہر ہے۔

اس کی افتاد و واردات کا ذکر
ذہن سے فلسفی کے برتر ہے۔
اس کی تعریف دہر کی تعریف
اس کا دونوں جہاں مسخر ہے۔
اس کی ہے سب کرشمہ پردازی
کائنات اس کا ایک منظر ہے۔
اس میں دوزخ اسی میں ہے جنّت
اس میں راون ہے رام چندر ہے۔
کبھی شمر اور یزید کا مسکن
کبھی شبّیر کا یہی گھر ہے۔
ہے کبھی تو یہی دمِ عیسےٰ
اور کبھی ذوالفقار حیدر ہے۔
یہی عامل ہے اور یہی معمول
اصل میں من ہی تو منو ہر ہے
اس کی ہستی سے ہے تمام عالم
سب کچھ اس سے ہی جلوہ گستر ہے
دیکھتے ہو جو کچھ زمانے میں
اس کا پھوٹا ہوا وہ منتر ہے۔
وجہ تسکیں ہے اس کی ہر حرکت
زندگی کا مدار اسی پر ہے۔
دلربا کون۔ جستجو کس کی
یہ تیرا دل ہی تیرا دلبر ہے۔
نقش میں اس کے معتذر نقّاش
ذکر میں بند ہر سخنور ہے۔
کیا زباں کر سکے ادا اسکو
آدمی کے جو دل کے اندر ہے

ہوں پجاری اسی کا میں کیفیؔ
یہ مکاں جس کا پاک مندر ہے۔

کیول کٹیا

۱۴ر جولائی ۱۹۲۷ء

حضرت کیفی لاہور کی گرمی سے تنگ آکر کچھ دنوں کے لئے جالندھر شہر چلے گئے وہاں پنڈت کیول کرشن بی۔ اے بیرسٹر ایٹ لاء مرحوم کے مہمان رہے۔ صاحب ان کے پرانے دوست تھے۔ اور نہایت شستہ ادبی مذاق اور فقیرانہ مزاج رکھتے تھے شہر کے باہر ایک باغ میں چھوٹا سا مکان تھا وہاں رہتے تھے۔ ایک دن موسم روح افزا تھا۔ وہاں ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے اور دوستوں سے باتیں کرتے کرتے یہ نظم موئی۔ جو مبالغہ سے مبرّا ہے۔

باغ کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں　　اٹھلاتی متوالی گھٹائیں
کوئل کی وہ مست صدائیں　　کنجوں کی دلچسپ فضائیں
دِل میں گھر کر جانے والی ہو

بن بن کر وہ صبا کا چلنا　　پھر کے منہ کلیوں کا مچلنا
بلبل کا وہ رنگ بدلنا　　اس کا بھانڈا پھوڑ کے ٹلنا
چال اس کی چل جانے والی

موروں کی وہ مست جھنکاریں　　اور پپیہے کی وہ پکاریں
امرئیوں کی میٹھی بہاریں　　پھولوں کی ہر سمت قطاریں
دِل میں ہیں کھب جانے والی

گل کی ہنسی غنچوں کا تبسم　　بلبل اور بھونروں کا ترنم
ایک گھڑی دیکھو یہ سماں تم　　غم جنموں کے ہو جائیں گم
ہے یہ فضا غم کھانے والی

بلبل کا گلبن پہ چہکنا　　پھولوں سے کیاری کا مہکنا
ناز سے سبزے کا وہ لہکنا　　مینا اور کوئل کا بہکنا
ہر شئے دِل کی لبھانے والی

پھول ہے جو وہ جام بکف ہے　　جو پتا ہے چنگ ہے دف ہے
فوج گلوں کی صف در صف ہے　　جس کا ہر سینہ میں ہدف ہے
زہد پہ آفت لانے والی

رنگ ہواؤں نے وہ جمائے　　امڈ گھمنڈ کر بادل آئے
کڑکے۔ گرجے۔ گھر کر چھائے　　ناچے۔ کودے اور اٹھلائے
ان کی ادائیں رجھانے والی

مچلیں، بپھریں اور اٹھلائیں　　جیسے مست آپے سے جائیں
جائیں اور مچل کر آئیں۔　　وہ اودی گھنگھور گھٹائیں
پریم کا رس برسانے والی

بادل گرجے مور جھنکارے　　کوئل کوکی لال پکارے

خوشبوؤں کے آئے لغارے ابھرے امرت کے جھارے
اور ہوا بھرڑ کانے والی
کیسی سن موہن یہ زمین ہے ثانی اس کا کوئی نہیں ہے
رہ کے یہاں خوش ہر غمگیں ہے روح یہاں پاتی تسکین ہے
غم دنیا کا مٹانے والی
یہ رت اور سماں یہ پیارا باغ کی چھب۔ کھیتوں کا نظارا
پانی۔ ہوا خوشبو۔ چہکارا اور پھر صحبت ایسی دل آرا
پریم کا راگ سنانے والی
سنگت کے دنیا سے نرالے دل کے صاف محبت والے
دلداری کے جیتے پالے مئے الفت کے ہیں متوالے
سنگت من پر چھانے والی
ہر کٹیا آنند بسیرا سکھ تو یہاں پایا بہتیرا
پر کیوں دل سے گلہ ہے میرا کیوں من ہر ناکام ہے تیرا
ہے یہ یاد ستانے والی
جو شے ہے وہ سہانی پیاری کنج آموں کے اور پھلواری
لگتی ہے دل کو کیاری کیاری چھوٹتے ہی مارے گی کٹاری
ہے یہ ہنسی تو رلانے والی
دھندلے دن اور چاندنی راتیں کیول کی وہ پیاری باتیں
دل داری کی سہانی گھاتیں کیفی کو یہ دن یہ راتیں
کب کب ہیں پھر آنے والی

روپ چالیسا
یا
حسن فطرت

یہ چالیس شعر کی نظم گویا آپ کے دین ادب کا پراپگینڈا ہے آپ کی شاعری کا آخری پیغام ہے عالمگیر حسن اور عالمگیر محبت۔ یعنی کائنات کی ہر شے حسن رکھتی ہے اور یہ کہ محبت تعینات اور تقید سے مبرا ہے استدلال کو سکت اور اس کے ساتھ ہی دلچسپ بنانا علامہ کیفی کا حصہ ہے۔

بزم حسن فطرت کیا بیخودی کی دنیا ہے ۔۔۔ ذرہ ذرہ ساغر ہے قطرہ قطرہ صہبا ہے
غور سے اگر دیکھو کائنات عالم میں ۔۔۔ حسن کا ہے اک طوفاں جو ازل سے برپا ہے
سنگ میں شجر میں وہ برگ میں ثمر میں وہ ۔۔۔ رنگ حسن میں ڈوبا اس کا چپا چپا ہے
لخلخہ ہے جنت کا وہ رباب فطرت کا ۔۔۔ گل میں پتیاں کچھ ہیں بلبل ایک چڑیا ہے
بلبل ایک منت پر گل ہے برگ ہائے تر ۔۔۔ کیا انہوں نے دیوانہ دہر کو بنایا ہے
گل تو کیا ہے سبزے میں دیکھو اس کی بیداری ۔۔۔ جو ہے تم کو بیگانہ حسن کو یگانا ہے۔
پنکھڑی سے کم دلکش کب ہے داغ لالہ کا ۔۔۔ گو یوں سکے جھومر میں جلوہ گر کنہیا ہے۔
اس میں کچھ تنوع ہے اور نہ پھول پھل اس میں ۔۔۔ سرو پر ہے جو عالم کس قدر سہانا ہے۔
قمری اس پہ مرتی ہے اس پہ وجد کرتی ہے ۔۔۔ حسن اسکو کہتے ہیں حسن نام اس کا ہے
حسن چاند تاروں میں حسن ہے بہاروں میں ۔۔۔ حسن ہے خزاں میں بھی آنکھ کو جو لبھاتا ہے
داد حسن مہ کی دی تم نے میگساری میں ۔۔۔ کبک کو ذرا دیکھو کتنا اس کا شیدا ہے
آنکھ خلق کی پڑتی کیوں نہ بزم انجم پر ۔۔۔ ہے وہ روح خوبی کی حسن کی وہ دنیا ہے
ہے زمیں سے گردوں تک حسن کی ضیاپاشی ۔۔۔ کہکشاں تجلی کی ایک بہتی گنگا ہے
وہ دھنک کی دلدوزی اور رنگ کی آمیزی ۔۔۔ شاہ عشق نے اٹھکر یا کیا وہ کھینچا ہے
وہ کلبلیں موجوں کی سینہ پر سمندر کے ۔۔۔ انکے سر کیا سجتا موتیوں کا سہرا ہے

ڈل میں شام کو جاکر تم شفق کی چھب دیکھو
جذب حسن فطرت کا دلربا نظارہ ہے۔

حسن کیا ہے انساں کا ایک قیدی زنداں کا
ایک قطرہ طوفاں کا اس میں آسمایا ہے

حسن نوع انساں کا بھی ہے دلربا لیکن
نسبت ایک قطرے میں اور بحر میں کیا ہے

اسکی آنکھ کی تشبیہ کیوں ہے چشم آہو سے
آدمی ہی خلقت میں حسن کا جو پتلا ہے

کیوں مماثلت ہے یہ گل سے ایک چہرے کی
حسن کا اگر مرکز صرف جسم زیبا ہے

تم میں لالہ رخ کوئی اور سیمتن کوئی
کوئی مہر طلعت ہے کوئی ماہ سیما ہے

آنکھ نرگسی ٹھہرے زلف عنبریں ٹھہرے
اور پھر کہے جاؤ حسن آدمی کا ہے

دیکھ کر تم آئینہ کیا ہو ساجد و ثنا گر
تم نیاز کہتے ہو جسکو ناز بیجا ہے

حسن کب مقید ہو ایسی تنگ نظری کا
اک بہار عارض سے کیوں یہ جوش سودا ہے

حسن کی ہے آئینہ فطرت اور مشاطہ
غازہ اور گلگونہ اس کے منہ کو تکتا ہے

نشان حسن کی یہ ہے دل میں ولولے اٹھیں
روح تازگی پائے اس کا جذب ایسا ہے۔

تازگی دلوں کو ہو۔ اوج حوصلوں کو ہو
امرت اس کو کہتے ہیں یہ دم مسیحا ہے

ہوں تعینات اس کے دائرہ پہ کیا عائل
حسن حاوی کل ہے اس کی ہر کہیں جا ہے

حسن ہے ہر اک شے میں حسن ہے ہر اک لے میں
کوئی دیکھنے والا کوئی سننے والا ہے!

دل بھی کھینچ لیتا ہے چین بھی ہے یہ دل کا
دلبری و دلداری کا یہ ڈھب نرالا ہے

خواہشوں کے محشر کو اس سے ہے سکوں ملتا
نفس کی ہواؤں کو خاک میں ملاتا ہے

حسن ہے فنا کرتا حسیات اسفل کو
ذہنیات الطف کو رنگ روپ دیتا ہے

فیلسوف کی حجت اس میں چل نہیں سکتی
حسن روح ہستی ہے حسن عالم آرا ہے

یہ جمال روح افزا جس کے قلب میں چمکا
جنت نظر اسکو یہ تمام دنیا ہے

پتا پتا جنگل کا اس کو سورۂ یوسف
جس کے دیدۂ دل میں حسن کا اجالا ہے

ایک رنگ کا پرتو دہر کی ہے نیرنگی
کثرت اور وحدت میں فرق جزو و کل کا ہے

آدمی بک اٹھتا ہے جہل کے تقاضے سے
دم بخود ہے کل خلقت کچھ تو اسنے دیکھا ہے

جلوہ حسن فطرت کا اپنے دل کے اندر دیکھ
یہ جو تیرا سینہ ہے ایک طور سینا ہے۔

حسن عشق کا بادی عشق خلق کا ہادی
راز ہے یہ ہستی کا مت سمجھ تماشا ہے

اس کا راگ گاتا ہوں اس سے کیف پاتا ہوں
سطح بیں تو کچھ سمجھا حسن نام کس کا ہے۔

دُہائی

۱۸ر اگست سنہ ۱۹۲۶ء

پھرتی ہے ترے نام کی عالم میں دُہائی
بھارت کی خبر آکے ذرا لے تو کنہائی

دن رات ہوئے ایک وہ پھیلا ہے اندھیرا
گھنگھور جہالت کی گھٹا جھوم کے چھائی

مت بھنگ ہوئے لوگ جہالت کے نشہ میں
کیا غیر کہ بھائی سے ہے بھائی کی لڑائی

کیا انتّ ہو دیش کی حالت ہو جو ایسی
سوجھے نہ بُرائی اسے اپنی نہ بھلائی

بھارت کی تو ایسی کبھی دُرگت نہ ہوئی تھی
بے فایدہ لڑتے ہیں یہاں بھائی سے بھائی

ہمت ہے نہ طاقت ہے نہ ہی جوش دلوں میں
اور حد سے سوا سب کے دلوں میں ہے ڈھٹائی

زردار ہیں خودغرض ہے دیندار ہیں حجّت
دیتا نہیں بے عیب کوئی ہم کو دکھائی

دیکھو جسے مایوس ہے اور زیست سے بیزار
امید کی صورت نہ کہیں بھی نظر آئی

گُن۔ گیان سے اور کرم سے غفلت ہوئی سب کو
سدّھرم پہ بدرسموں نے کی آکے چڑھائی

پھر کرم کا دو آکے سبق خلق کو گھنشام
ست مارگ سے بھٹکے ہیں کرو راہنمائی

گمراہ تھے جو آگئے وہ راہ پہ دم میں
مُرلی کی صدا تم نے جو خلقت کو سنائی

انہد کا ہمیں پھر سے سُنا شبد مراری
بنتی یہی تجھ سے ترے کرتے ہیں فدائی

بسنت کی خبر

لاہور۔ ۵ر جنوری سنہ ۱۹۲۶ء

دشت بنے ہیں گلستاں
کھیت ہیں کشت زعفراں

اُٹھتی ہے آنکھ جس طرف
خلد نگاہ ہے سماں

آج ہوئی ہے کائنات
فیض بہار سے جواں

گل ہے کھلاتی کیا بسنت
زر ہے لٹاتی کیا بسنت

باغ نیا ہے بن نیا گل کا ہے پیرہن نیا
پتیوں کی پھبن نئی پھول کا بانکپن نیا
ہر کہیں ہے فضا نئی ہے فلک کہن نیا

کیسی ہے جانفزا بسنت
کیسی ہے دلربا بسنت

نشو و نما کا ذکر کیا ہو گیا ہر شجر نیا
برگ نئے ہیں گل نئے رنگ ہی سب بدل گیا
چہرۂ زمہریر پر نکلا ہے خطِ استوا

شان سے آئی ہے بسنت
دہر پہ چھائی ہے بسنت

پھول ہیں ساغرِ شراب غنچہ ہے غمزۂ حجاب
روئے زمیں پہ ہر کہیں لنڈھتی ہے حسن کی شراب
حسن ہے اور فروغِ حسن کون و مکاں پہ ہے شباب

مایۂ ناز ہے بسنت
حسن نواز ہے بسنت

دامن دشت و کوہسار حسن سے بھر گئی بہار
کیوں نہ دلوں کو چھین لے شاہد گل کا یہ نکھار
مہر ہے ذرہ ذرہ آج قطرہ ہے نافۂ تتار

طرۂ حور ہے بسنت
رو کشِ طور ہے بسنت

لو وہ بسنت آ گئی قدرت حق دکھا گئی
آنکھوں میں بس گئی بسنت دل کی کلی کھلا گئی
راغ کو باغ۔ باغ کو رشکِ ارم بنا گئی

حُور ہے یا پری بسنت
کیسی ہری بھری بسنت

سُن چکے یہ تو سب مگر اب کرو اس طرف نظر
ہوتے ہو باغ باغ تم رنگ بسنت دیکھکر
گھر کا اپنے حال کیا کچھ ہے بسنت کی خبر

دیکھ رہے تو ہو بسنت
سُن لو ہے کہتی جو بسنت

آئی یہاں ہیں آئے سال کر گئی خلق کو نہال
کر دیا ان کو سر بلند تھے جو خزاں سے پائمال
ہندیوں کا مگر رہا ویسا ہی تنگ و خستہ حال

تم وہی - ہیں وہی بسنت
رکھتی نہیں لگی بسنت

کہتی ہوں ہیں یہ بے ورنگ ہو گئے دِل تمہارے سنگ
نشۂ جہل ہیں ہو مست سر ہیں حسد کی ہے ترنگ
پہنے ہو کیسری لباس دل کا مگر سیہ ہے رنگ

شرم دلاتی ہے بسنت
صاف سناتی ہے بسنت

دُور ہوں یہ کدھنگیاں بند ہوں خانہ جنگیاں
ایک صدف کے ہو گہر کس لئے پھر دو رنگیاں
دور ہوں تنگدستیاں دل کی مٹیں جو تنگیاں

ایسی پھر آئے گی بسنت
آ کے نہ جائے گی بسنت

جب رشی

سوامی دیانند سرسوتی کی شان میں

۲۳ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء

جب رشی قوم کے سوتوں کو جگاتے آئے — ہوش میں مدتوں کے نیند کے ماتے آئے
نہ تو مُردے ہی جلائے نہ چمتکار کیا — ہاں جو دل مردہ تھے ان سب کو جلاتے آئے
جو اندھیرا تھا جہالت کا دلوں سے کھویا — وید کا شبد جو انہد ہے۔ سناتے آئے
برہم ودیا کا جسے کہتے ہیں سب سرچشمہ — آریہ ورت کو امرت وہ پلاتے آئے
دھرم اور کرم کے سب بھید بتائے ہمکو — بات بگڑی ہوئی بھارت کی بناتے آئے
ان کے اپدیش میں پردھان ہی کرم اُدر اُبھاؤ — گیان اور گُن کی فضیلت کو جتاتے آئے
ست کا بل تھا جو کہا سب کے دلوں میں اُترا — من کی تشنکائیں وہ ایک ایک مٹاتے آئے
قول سے فعل کو ان کے نہ جُدائی تھی کبھی — جو کہا منہ سے وہی کر کے دکھلاتے آئے
لاکھ بجلی کی تڑپ اِک دِل پُر سوز میں تھی — آگ میں قوم کی آپ کو جلاتے آئے

کیفی کیا اور کئے جان وطن پر دیدی
آپ کر گذرے جو اوروں کو سکھاتے آئے

جے جگدیش ہرے

لاہور ۱۰ر اگست سنہ ۱۹۲۶ء

روزانہ ٹریبیون اخبار لاہور جو ۹ر اگست کو آیا۔ اس میں جو ولائتی تار درج تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مشہور سائنس کے محقق سر جگدیش چندر بوس نے "برٹش اسوسی ایشن فار ایڈوانس منٹ آف سائینس" کے جلسے میں ایک مضمون پڑھا جس کا موضوع تھا۔ ہارٹ بیٹس آف پلانٹس" یعنی اشجار کا قلب متحرک لیکچر نہایت عالمانہ اور محققانہ تھا۔ تجربات سے دعوے کو ثابت کیا گیا۔ اس کو پڑھکر اگلی صبح کیفی صاحب نے یہ نظم کہی نظم کیا ہے شعر اور سائینس کا بیاہ ہے جس حسن ادا سے علم کو شعریت کا جامہ پہنایا ہے۔ توصیف سے مستغنی ہے

نجد کے ریگستانوں میں وہ ناقہ کو ٹھکراتی تھی
قیس کہیں ملتا ہی نہ تھا صحرا میں خاک اڑاتی تھی
تھی یہ تمنا مل جاتا تو رکھتی اب دلداری سے
اسکو چھڑاتی قید الم سے۔ مایوسی۔ بیزاری سے
ہاتھ میں اپنے اسکو رکھنے لیلےٰ کی یہ خواہش تھی
ناز وستم کی مشق رہے یہ خواہش تھی یہ کوشش تھی
دشت کسے جی اکتایا تھا کرتی تھی فلک کا نظارہ
جو نظر آیا اس کو ہوا پر ایک عجائب طیارہ
کاغذ اس سے ایک گرا لیلی نے مارا ہاتھ اس پر
کیا جانے لفظوں میں اسکے کیا جادو تھا کیا منتر؟
جن کو پڑھکر عزم اس کے ایک تغیر آیا ہے
دشت سے منہ موڑا ہے اس نے اور ناقہ کو اڑایا ہے
اس کی نظر کی برق دشتی وہ کیونکہ اڑائی ناقہ نے
بن میں ہمالہ کے وہ دونوں اس سرعت سے جا پہنچے

ناز و ادا اور حسن کی پیکر جب یوں آئی ہماچل میں
پڑ گئی ایک غضب کی ہلچل اس کے سارے جنگل میں
از خود رفتہ پیر و جواں سب اس بن کے ہوئے جاتے تھے
اک نازک احساس سے خود کو اس کی بھینٹ چڑھاتے تھے
لیلی تھی حیران اور ششدر جی ہی جی میں کہتی تھی
ایک ہی دل قبضے میں آیا جب میں عرب میں رہتی تھی۔
اور یہاں واللہ شجر تک ہاتھوں میں ہیں دل کو لئے
کون ہیں وہ مجھ پر نہ جنھوں نے اپنے دل قربان کئے
جسکو میرا دامن چھو جائے وہ دل اپنا نذر کرے
کیوں نہ مگن ہو ہو کے کہوں ہیں ہر دم جے جگدیش ہرے

۱۹۲۵ء

(اردو نظم رزم کے بارے میں جبکہ وہ ملّی اور مذہبی یا اعتقادی رنگ سے بے واسطہ ہو۔ بہت تنگدست ہے چنانچہ مراثی سے قطع نظر جن میں سراسر خوش اعتقادی کا رنگ ہے پورسکندر پہلی رزمیہ نظم ہے۔ جو اردو کو نصیب ہوئی۔ علامہ مدظلہ نے تاریخ سے واقعہ بھی وہ چھانٹا جو ملّیات سے آلوث نہیں ہے۔ رزم کے تمام ارکان اس نظم میں موجود ہیں۔ سبحان اللہ کیا طمطراق اور جلال ہے۔ اور پھر کمال یہ کہ تاریخی واقعات سے کہیں تجاوز نہیں کیا گیا۔ اس کا نام آپ دیکھتے ہیں۔ پورسکندر ہے اس میں ایک دلچسپ جدّت ہے۔ پورس سکندر میں سے ایک سین اڑا کر پورسکندر بنا دیا۔ جیسے فردوسی نے

سپید بو از تو ہلاک آمدہ

میں ایک دال اڑا دیا تھا)

پورب سے نہ نکلا تھا ابھی صبح کا تارا
فوجوں کے دو رویہ ہوئے دل آکے صف آرا
تھا آب سے تیغوں کی رواں گنگ کا دھارا
نیزوں سے نیستان تھا۔ دریا کا کنارہ
ڈھالوں کے گھٹاٹوپ سے دھندلا گئیں آنکھیں
کھانڈوں کی چکاچوند سے چندھیا گئیں آنکھیں

جانباز عجب شان سے میدان میں آئے
بادل کی طرح پھیل کے جنگاہ پہ چھائے
چلتے زرہ۔ بکتر سے بدن اپنے سجائے
خود۔ اور جھلم سے تھے سر اور منہ کو چھپائے
تلواریں سجی۔ چلّے چڑھے۔ نیزے تنے تھے
لشکر میں جو تھے اونچی شتر سے بنے تھے

بیتاب تھی تلوار بہت میان کے اندر
اور تیر تڑپتے تھے کہ ترکش سے ہوں باہر
گھوڑے تھے کہ تھے تیز لوں میں برق سے بڑھکر
پیدل تھے تراروں میں سواروں کے برابر
چنگھاڑوں سے گج دل کی فلک کانپ رہا تھا
ہیبت سے ہر اک جن و ملک کانپ رہا تھا

جہلم کے دو رویہ تھے جمع لشکرِ خونخوار — فوجوں میں جو تھا مارنے مرنے کو وہ تیار
تھا یورپی لشکر کا سکندر سپہ سالار — تھا ہند کی سینا کا بھی پورس جرار

جنگ آور و مردانِ دغا کار تھے دونوں
تھی جیسی سپہ ویسے ہی سالار تھے دونوں

یونانیوں کو دھن تھی۔ کہ بن جائیں جہانگیر — ہمت تھی بلند اور عمیق ان کی تدابیر
تھی ہاتھ میں ان کے عجم و مصر کی تقدیر — ارمان تھا کر ڈالئے دنیا کو ہی تسخیر

روندے ہوئے تھے ان کے سر پہ جم و کاؤس
تھی انکی سپر شعلۂ زردشت کا فانوس

ہندی تھے ادھر محو فقط ایک لگن میں — وہ گھر کی حفاظت کے لئے آئے تھے رن میں
تھے اپنی نظیر آپ ہی وہ حُبِّ وطن میں — تھی فرد سپہ ان کی ہر اک جنگ کے فن میں

نفرت انہیں خونریزی و غارت سے بڑی تھی
بھارت کی حفاظت میں تھے بھارت کے ہتیشی

چاؤش کڑاکے سے ادھر رجز تھے گاتے — چارن بھی ادھر زور سے ساکھا تھے سناتے
کڑکیتوں کے کڑکے تھے پرے چرخ کے جاتے — یوں حوصلے سب اپنے دلیروں کے بڑھاتے

رن بھوم سے ہر موقعہ کو پرتال چکا جب
یوں فوج کو پورس نے کیا اپنی مخاطب

اے چھتریو! کیا تم کو بتاؤں کہ یہ رن ہے — اور سامنے دشمن جو ہے قتّالِ زمن ہے
فوجوں سے غنیموں کی گھرا اپنا وطن ہے — بھولا ہوا کیا تم کو کرشن جی کا بچن ہے

"جو چھتری ہو کر نہ دھرم یدھ میں ہو شامل
آن آریا ہے۔ وہ نہیں تعظیم کے قابل

ہاں فرض ہمارا ہے کہ تم سب کو جتائیں — مرنے کا جنہیں ڈر ہے وہ گھر شوق سے جائیں
رہ جا کے وہاں گود میں بچوں کو کھلائیں — ہاں سامنے ہو کر نہ کہیں پیٹھ دکھائیں

ہار اس میں ہے جیت اس میں ہے میدان یہی ہے
مردانِ دلاور کا تو ایمان یہی ہے

ہے وقت یہی جان لڑا دینے کا دلیرو! — منہ اپنا غنیموں کی نہ تلوار سے پھیرو

وہ دیکھو نکل جانے نہ پائیں انہیں گھیرو ہاں ایک جھپٹ میں انہیں لے لو۔ مرے تیرو!

جوہر انہیں تم تیغۂ ہندی کا دکھا دو

چار آئینوں کو یو نوں کے چو رنگ بنا دو

یہ سنکے ہر اک چھتری نے سونتی وہیں تلوار سر اس پہ جھکایا ہوا آمادۂ پیکار

چلّوں کو چڑھانے لگے مردان کماندار برچھوں کو ہلانے لگے سب راکب رہوار

غالب ہوا جیکارے کا غل کرّنا پر بھی

اتنے میں بجا جنگ کا نقّارہ ادھر بھی

گھمسان کا وہ رن پڑا کیا ذکر ہو جس کا گرداب فنا بن گیا میدان وغا

بہنے لگا اک خون کا دریا لب دریا میدان وغا کیا تھا۔ کہ محشر کا سماں تھا

تلوار کی کیا شعلہ فشانی کا بیاں ہو

وہ آگ بھڑکتی تھی کہ جس میں نہ دھواں ہو

وہ صاعقہ ریزی تھی وہاں تیغ دودم کی باہر تھی زرہ کے۔ جو ابھی خود پہ چمکی

وہ آنچ تھی اس کی کہ نہ مہلت ملی دم کی آب دم شمشیر میں کیا آگ تھی جم کی

وہ جس پہ گری اس کا ٹھکانا نہ کہیں تھا

اک ڈھیر تھا بس خاک کا اور کچھ بھی نہیں تھا

تلوار کی چالوں سے قیامت کا سماں تھا گھاٹ اس کو اتارا جو ذرا منہ پہ چڑھا تھا

اس دھار سے اک خون کا پرواہ چلا تھا جوہر کا نشان اور نہ چھالے کا پتا تھا

جب میاں سے نکلی تھی تو تھی رنگ میں آبی

پی پی کے لہو ہو گئی اب تیز شہابی

یوں سر پہ گئی جیسے تھی اس شخص کی آئی جی چھوٹ گیا۔ کان میں وہ بات سنائی

رکھی نہ لگی لپٹی نہ تھی تیر ہوائی جو بات تھی دو ٹوک تھی ایسی تھی صفائی

میدان میں ضرب اس کی دکھاتی تھی عجب ڈھنگ

ایک ایک کو دو ہاتھ میں کرتی تھی وہ چو رنگ

تھا اس سے اماں میں نہ سوار اور نہ گھوڑا تھی اندر کا بجر اسکو جلایا اسے توڑا

دھڑ کاٹا زرہ چاک کی اور خود کو پھوڑا بھنڈارا ہی بس کھول دیا۔ تسمہ نہ چھوڑا

بے سر ہوا صف میں جو ابھی تن کے کھڑا تھا
اک دن میں ہزاروں کا وہاں کھیت پڑا تھا

القصہ بتاتے ہیں یہ تاریخ کے دفتر — مینہ تیروں کا برسانے لگے ہندی لاور
ترکش ہوئے خالی تو لیا نوکِ سناں پر — اب کھانے کو گھونگھٹ ہوا یونان کا لشکر
اسوقت بڑھا آگے کو تکھیلا کا سردار
سرِ لشکرِ یونان سے بولا وہ دغا کار

تقصیر کریں عفو مری اے شہِ یونان — میدان سے ہٹنے کی ہے کیوں فکر ہیں قربان
اک عرض کرے بندۂ احقر جو ہو فرمان — اس پر جو عمل کیجئے تو فتح ہے آسان
پورس کے قلعے یوں تو نہ ہم توڑ سکیں گے
جنگاہ کو سو بار بھی گر چھوڑ سکیں گے

کیا عرض کروں کیسے ہیں جیوٹ وہ سپاہی — ہے جنگ کے ہر فن میں انہیں زرف نگاہی
ظاہر ہے یہ ہر طور سے اے زینتِ شاہی — لشکر پہ ہمارے وہ ہیں لانے کو تباہی
منہ تیغ و تبر سے وہ نہیں پھیرنے والے
ہیں ہم کو چکا یو ہیں ابھی گھیر نے والے

خدامِ شہی کو یہ بخوبی رہے معلوم — پورس کی سپہ کی ہے جلادت میں بڑی دھوم
وہ سینہ سپر ہو کے لڑیں گے مرے مخدوم — ان چھتریوں میں بزدلی اور خوف ہے معدوم
آپ اور طرف جنگ سے اب ہاتھ اٹھالیں
دیوار ہے جو ہاتھیوں کی اسکو ہلا دیں

ہو حکم کہ سب مل کے کریں ان پہ ہی دھاوا — پھر دیکھئے گا جنگ کا بدلا ہو انقشا
اک بار نہ پھر ادوسری جانب جو رُخ انکا — پھر ان کو نظر آئے گا اپنا نہ پرایا
اک کھلبلی پڑ جائے گی بس فوجِ عدو میں
یلغار پر چڑھ دوڑیں گی پھر آپ کی فوجیں

تجویز یہ سردار کی سب کو ہوئی تسلیم — اک دم میں بدل دی گئی سب جنگ کی تنظیم
جو طرزِ جدال آگے تھی وہ ہو گئی ترمیم — فوجوں کی نئے طرز پہ جب ہو چکی تقسیم
چھانٹے گئے لشکر سے کئی چست رسالے
اور ہاتھیوں کی فوج ہوئی ان کے حوالے

جس طرح پہاڑوں پہ گھٹا جھوم کے برسے　　یوں ہاتھیوں پر پل پڑے نیزے سے تبر سے
روندے گئے بھاگے بھی کئی سونڈھ کے ڈر سے　　ہاتھی جو بگڑ بیٹھے مہاوت گرے سر سے
منہ ہاتھیوں کے پھیر کے یوں ان کو بھگایا
رجپوتوں کی قسمت نے پہاڑ ان پہ گرایا

لکھتے ہیں کہ یہ لشکرِ ہندی کا ہوا حال　　کام آئی نہ تلوار۔ محافظ نہ ہوئی ڈھال
سیدھی پڑی سردار دغاکیش کی وہ چال　　کر ڈالی سپہ ہاتھیوں نے اپنی ہی پامال
یہ دیکھ کے یونانیوں نے بول دی یلغار
کام آ گئے ہزاروں وہاں مردانِ دغاکار

پورس نے مگر اب بھی گنوائے نہیں اوسان　　سمجھا کہ ہے اجماعِ عساکر نہیں آسان
دیکھا کہ نہیں ضابطہ کی جنگ کا امکان　　جو بچ رہے پھرتے تھے پراگندہ پریشان
دشمن سے نہ بھاگے تھے نہ ہمت کے تھے ہیٹے
ان میں سے جو ہاتھ آئے وہ پورس نے سمیٹے

اور لوٹ پڑا ایسے کہ انہیں قلبِ عدو پر　　جو منہ پہ چڑھا ہو گیا وہ لقمۂ خنجر
یونانی تھے حیران یہ ہیں کون دلاور　　اس طرح جو گھس بیٹھے غنیموں کے ہیں اندر
"پورس ہے یہ" ٹیکسلا کا سردار پکارا
ہاں! جانے نہ پائے یہ شکار اب ہے ہمارا

لیکن یہ سکندر نے دیا حکم۔ خبردار!　　ہاتھ ان پہ اٹھائے نہ کوئی دیکھنا زنہار
شرم آتی نہیں تم تو ہزاروں ہو یہ ہیں دو چار　　یہ حکم دیا اور وہیں میان کی تلوار
مائل ہوا پورس کی طرف پھر شہِ یونان
گویا ہوا یوں خسروِ بھارت سے بصد شان

لکھی ہوئی دل پہ ہے مرے ہند کی عزت　　محتاج ثنا چھتریوں کی کب ہے شجاعت
ہے پوچھنی اک بات مجھے اے شہِ بھارت　　ہاتھ آئی ہے اس جنگ سے کیا آج نصیحت
پورس نے کہا "لاؤں گا اب رن میں نہ ہاتھی
ہر ہندی کو سمجھوں گا نہ میں ہند کا ساتھی

پورس کا سُخن سُن کے سکندر ہُوا حیران   یہ بانکپن اس حال میں یہ تمکنت اور آن
دل میں کہا تعظیم کے قابل ہے یہ انسان   پھر اس سے مخاطب ہُوا یوں خسروِ یونان
تبلاؤ تمہیں۔ تم سے میں برتاؤ کروں کیا؟
پورس نے کہا "کرتے ہیں راجا سے جو راجا"
گھر کر گئی دل میں شہِ یونان کے یہ بات   تاریخی ہے۔ ہرگز نہیں۔ ماخوذ روایات
کہنا تھا یہی دل میں سکندر ارے ہیہات   ہیں ایسے جوانمرد سے دھوکے کی کروں بات
کھولے ہوئے آغوش قدم آگے بڑھایا
اور سینے سے پورس کو سکندر کو لگایا

———— ∴ ————

بنسری والے آجا

۱۹۲۵ء

اب تو جگ بیت گئے۔ بنسری والے آجا
اپنی آواز سے سوتوں کو جگالے آجا

جو مرے جاتے ہیں بے موت انہیں دے جیون
جو گرے ہیں انہیں پستی سے اٹھالے آجا

قوم لاچار ہوئی جہل کی بیماری سے
آخری وقت ہے لیتی ہے سنبھالے آجا

ساری دنیا پہ جہالت کا اندھیرا چھایا
اے مرے گیان کی آنکھوں کے اجالے آجا

کیا ہی۔ نشکام یہاں کام سے ہی نفرت ہے
سب نکمّے ہوئے غفلت کے حوالے آجا

تنگ آئے ہیں زمانے کے بہت چکر سے
سایہ میں مور مکٹ کے تو چھپالے آجا

وقت اب چکر سدرشن کے چلانے کا نہیں
اپنی مرلی۔ وہ مدھر بانی سنبھالے آجا

کر دیا ہم پہ گبردھن کے اٹھانے والے
ناؤ بھارت کی بھنور میں ہے بچالے آجا

منّیا ویشیا منو[1] خود تو نے کہا ہے بھگون
بھگت ہیں تیرے ہمیں پاس بلالے آجا

دل ترا گھر ہے تو دے شانتی اگر اسمیں
فتنے اٹھتے ہیں۔ یہاں روز نرالے آجا

"ناستو ودیتے"[2] قول ہے تیرا گردھر
ست کو پنجہ سے فنا کے تو چھڑالے آجا

کان دھر کر تو ذرا سن لے تو بھارت کی بپتا
کیا نہ اس کے ابھی تجھ تک گئے نالے آجا

آسرا اور نہیں ہم کو جگادھر کوئی
قید سے غم کی ہمیں کیوں نہ نکالے آجا

بخشش خلقت کے گنہ عرض ہے یہ کیفی کی
اور چرنوں سے ہمیں اپنے لگالے آجا

---

[1] "منّیا ویشیا منو" سے بھگوت گیتا کے بارھویں ادھیا کا دوسرا اشلوک شروع ہوتا ہے اس کی طرف اشارہ ہے اس کا ترجمہ یہ ہے جو دل کو مجھ میں لگا کر خلوص عقیدت سے ہمیشہ میری پرستش کرتے ہیں۔ وہ اصلیین میں اعلیٰ ہیں۔

[2] "ناستو ودّیتے" سے بھگوت گیتا کے دوسرے ادھیا کا سولھواں شلوک شروع ہوتا ہے اس کی طرف اشارہ ہے اس کا ترجمہ یہ ہے۔ باطل کی ہستی نہیں اور حق کو فنا نہیں۔ ان دونوں کا فرق محققوں نے دیکھا ہے۔

۱۰ر اکتوبر ۱۹۲۶ء

یہ کہتا ہوں یونہی سوز وطن سے سب کے دل جلنے
نظر پڑتی ہے جب میری دوالی کے چراغاں پر

لگی ہو ٹھیس دل کو تو وہ پہنچیں عرشِ اعظم تک
گرائیں بجلیاں آہیں تری گردونِ گرداں پر

ہمیشہ عاشقِ صادق کا دل صد چاک رہتا ہے
نمودی عاشقوں کا زور چلتا ہے گریباں پر

وہاں پوچھا گیا تو یہ کہ کیا کیا کچھ کیا تو نے؟
عبث تھا۔ اہلِ دیں کو اتنا غرّہ اپنے ایماں پر

بگڑتے ہیں جھگڑتے ہیں یونہی آپس میں لڑتے ہیں
خدا جانے گرہ آئی ہے کیا ہندو مسلماں پر

پڑی ہیں دو گتھیاں اِل ہیں سلجھنے میں نہیں آتیں
گئے وہ دن کہ دل تھا لوٹ اِک گیسوئے پیچاں پر

ارے ناداں انھیں کے دم قدم سے ہی جہاں قائم
یہ کیا بہتان ہے اے محتسب رندوں کے ایماں پر

۱۹۲۵ء

آپ نے اردو فارسی میں بہت سے ساقی نامے دیکھے ہوں گے۔ ذرا اس کے کیف کا بھی لطف اُٹھائیے۔ سبحان اللہ۔ کیا اپج ہے۔ اور کیا ولولہ انگیزی ہے ایک دریا ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے مصرعوں کی موجوں میں جوش مار رہا ہے۔

کیا مست گھٹا چھائی
متوالی ہوا آئی

پھولوں کی یہ رعنائی
سبزے کی یہ زیبائی

ہے فضلِ خدا ساقی
دے خُم ہی لنڈھا ساقی

پُر جوش و خروش آئے۔ میخانہ بدوش آئے۔
تسنیم فروش آئے۔ وہ صیقل ہوش آئے۔
آنکھیں تو اُٹھا ساقی
ہاں خُوب چھکا ساقی

پیمانہ بہ کف ہے گُل مستانہ نوا بُلبُل
ہے قُل کی جگہ قلقل ہے مست جہاں بالکل
دے تو بھی صلا ساقی
رندوں کو بُلا ساقی

اس بحر ترنّم میں امواج تبسّم ہیں
طوفان تکلّم میں دلچسپ تلاطم ہیں
اُٹھ بہر خدا ساقی
بن راہ نما ساقی

گردش میں ہو پیمانہ چکر میں ہو میخانہ
فرزانہ ہو دیوانہ دیوانہ ہو فرزانہ
وہ دَور چلا ساقی
دوراں کو جگا ساقی

سر معرض طوفاں ہو۔ دِل حشر بہ داماں ہو
ہوش اتنا مگر ہاں ہو۔ بیہوشی کا ساماں ہو
سب ہوش مٹا ساقی
مدہوش بنا ساقی

آنکھوں میں سرور آئے اور قلب میں نور آئے
مشعل لئے طور آئے شیشہ لئے حُور آئے
وہ جام پلا ساقی
اعجاز دکھا ساقی

اِک آگ لگا دے تو اِک شور مچادے تو

سوتوں کو جگا دے تو   مردوں کو جِلا دے تو
کر حشر بپا ساقی
خمخانہ لُٹا ساقی

رندوں کی یہ تقریریں   کوثر کی ہیں تفسیریں
زاہد کی وہ تکبیریں   ماضی کی ہیں تعزیریں
فردا کو بھُلا ساقی
لطف آج اُڑا ساقی

وہ بنتِ عنب آئی   امرت کی ہے ماں جائی
سب اس کے ہیں شیدائی   کیفی ہے کہ صہبائی
چھلک اور چھلکا ساقی
پی اور پلا ساقی

ہاں دَور پیا پے ہو   ہر رند جم و کے ہو
یہ فرض نہیں مے ہو   ہاں ایسی کوئی شے ہو
چھوڑے نہ خودی باقی
ایسی پلا ساقی

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی زندگی کا ایک واقعہ

سنہ ۱۹۲۵ء

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زندگی کے ایک واقعہ پر یہ نظم لکھی گئی۔ یہ واقعہ آپ کی سوانحعمری میں درج ہے۔ پیشوا دہلی کے رسول نمبر میں شائع ہوئی۔

زمانے میں جسے دیکھو ہی اس کا ثناگر ہے   یہ ذہنِ فلسفی میں ہے یہ شاعر کی زباں پر ہے
کہ رحم انسانیت کا ہے تقاضا اس کا جوہر ہے   یہی اعلیٰ تریں احساس ہے اور خلقِ بدتر ہے
فضائل اس کے ہیں مانے ہوئے ساری خدائی میں
کہ رحمان و رحیم آیا ہے شانِ کبریائی میں
یہی تو عنصرِ حاوی ہے تہذیب اور حکمت کا   یہی رکنِ مسلط ہے ہر اک دین اور ملت کا
یہی سرتاج ہے ایمانداری اور شریعت کا   برابر رحم کے پایا ہے کب عدل اور نصفت کا

اہنسا کوئی کہتا ہے اسے اور کوئی ہمدردی
کوئی انسانیت سمجھا اسے۔ کوئی جوانمردی

شرف وحشت پہ ہے شائستگی کو اس نشانی سے
مزاحم ہے یہی انسان کا ایذا رسانی سے
تمدّن کی چلی کشتی اس کی بادبانی سے
جلا پائی ہے اس نے جلوۂ ماہِ یمانی[1] سے

اگرچہ سایہ افگن تاج تھا سر پر نبوّت کا
بھروسا تھا مگر حضرت کو بس اللہ کی رحمت کا

بتاتے ہیں ہمیں علم سیر کے جاننے والے
جو ہیں ہر بات غربالِ یقین میں چھاننے والے
کہ حد کے رحمدل اسلام کے تھے ماننے والے
حقیقت تھے دیا اور رحم کی پہچاننے والے

بھری حد درجہ ہمدردی انسان انکے دل میں تھی
تھے نیتر افگن۔ مگر رحم اور رقت آب و گل میں تھی

جہاں میں رحم کے اوصاف کا سب راگ گاتے ہیں
بُرا سنگین دلی ایذا رسانی کو بتاتے ہیں۔
تمہیں تاریخ سے ہم واقعہ آج اک سناتے ہیں
جگہ اسلام میں کیا رحم کی ہے یہ دکھاتے ہیں

جنابِ اوّلین مومنین کی یہ حکایت ہے۔
تواریخی کتب میں درج یہ سچّی روایت ہے۔

ہُوا اک روز حضرت کا پئے سیر و سفر جانا
سر رہ اک شجر دیکھا کہ پہنے تھا ہرا بانا
وہ قلب پاک تھا صہبائے عشق حق کا پیمانہ
ہُوا جو حال طاری اس پہ سہے منظور دکھلانا

شجر کو دیکھ کر صدیق اکبرؓ آہ بھرتے تھے
جو ہمراہی میں تھے اس کا سبب دریافت کرتے تھے

یہ فرمانے لگے کاش اے خدا میں اک شجر ہوتا۔
کہ جس سے بہرہ ور ہر آدمی اور جانور ہوتا
کسی کو بھی نہیں دنیا میں کچھ اس سے ضرر ہوتا
یہ وہ ہستی ہے جس سے فائدہ ہی سر بسر ہوتا

خزاں آتی ہے جب اور اس کے پتّے سوکھ جاتے ہیں
مساکین ان کو لیجاتے ہیں اور چولھے تپاتے ہیں

بنا یہ سفرۂ مہماں نوازی جب بہار آئی
عصافیر اور پرندوں نے غذائے نو بہ نو پائی
جو نکلا اونٹ ادھر سے اس نے اپنی ڈاڑھ گرمائی
مسافر نے بھی پائی اس کے سایہ میں تن آسائی

---

[1] جناب رسالت مآب صلعم کی ذات۔

یہ خود کھاتا ہے کیا؟ جو ہے ہوا۔ پانی میں مٹی میں
مگر رحم اور شفقت ڈال دی تھی اسکی گھٹی میں

ہے خوانِ الوانِ نعمت کا یہ جسوقت آکے پھلتا ہی
دلِ انسانوں کا اسکے ذائقہ پر کیا پھسلتا ہے۔
سمجھ کر خوانِ یغما اس پہ ہر کوئی مچلتا ہے۔
کبھی لاٹھی کبھی پتھر سے بھی ارمان نکلتا ہے۔
مگر یہ سنگساری پر بھی منہ میٹھا ہی کرتا ہے۔
یہ پتھر کھا کے جھولی میوۂ شیریں سے بھرتا ہی

کبھی اس پر کہاڑے اور آرے ہم چلاتے ہیں
کڑی شہتیر اور تختوں کی صورت میں مٹاتے ہیں۔
مکان ان سے بناتے ہیں عمارت میں لگاتے ہیں
ہزاروں قسم کے سامان اور چیزیں بناتے ہیں۔
وہ جیتا تھا تو گھر چڑیوں کا تھا۔ مر کر ہمارا ہے
بتاؤ کس کو رحم اور بذل کا اسدرجہ یارا ہے

وہ فطرت کے تقاضے سے جب اپنے آپ مرتا ہے
تمہارے مطبخ اور حمام پھر بھی گرم کرتا ہے
عیال اللہ کی خدمت کا دم مر کر بھی بھرتا ہے
کوئی اہلِ بصیرت ہے جو اسپر دھیان دھرتا ہے
ہے وقفِ فیضِ عام اس کی ممات اور زندگی ساری
ہمیشہ چشمۂ رحم و افادت اس سے ہے جاری

بتاؤ تم میں ایسا رحمدل انسان ہے کوئی
شجر کی مثل فیض اور شفقتوں کا کان ہے کوئی
بدی کا بدلہ دے نیکی میں کیا آسان ہے کوئی
ہے کوئی جس سے ایذا کا نہیں امکان ہے کوئی
حضورِ ایزدی میں بار بندہ کو اگر ہوتا۔
یہی درخواست کرتا کاش میں بھی اک شجر ہوتا

تخلیقِ عالم

ترجمہ رگ وید منڈل ۱۰ منتر ۱۲۹
۱۵ ؍ مارچ سنہ ۱۹۲۵ء

محقق سوچ میں ہے کیونکہ اس کا ماجرا کہئے
جہاں کیونکر ہوا پیدا اسے کہیے تو کیا کہئے
اسے مایا کا کھیل اس کا سبب حکمِ خدا کہئے
ہے عاجز فہمِ انسان مدرکہ کو نارسا کہئے

جہا پرلے کے پیچھے کیا ہُوا کرتا ہے عالم میں
بتاتے ہیں تمہیں لکھا ہے جو وید معظّم میں

نہ ہستی کی حکومت تھی نہ راج اننگ عدم کا تھا   نہ تھا یہ آسماں ہی اور نہ پُر نور اس کا جلوہ تھا
نہ امبر کا یہ دِل بادل زمیں کے سر پہ چھایا تھا   نہ تھا چاند اور نہ تھا سورج نہ نور افشاں ستارا تھا

محیط اور حاوی کل کون تھا کون اس میں مضمر تھا۔
اگھم پانی تھا۔ یا ذخّار و موّاج اِک سمندر تھا۔

نہ تھی جب موت تو کیسے حیاتِ جاوداں ہوتی   تعیّن اور حد کی قید دُنیا میں کہاں ہوتی
تمیز روز و شب پھر جلوہ گر کیونکر یہاں ہوتی   یہ حالت وید میں ہے اس زمانے کی بیاں ہوتی

وُہی اِک واحد مطلق تھا کل برہمانڈ میں حاوی
یہاں اس کے عِلاوہ کوئی شے تھی اور نہ تھا کوئی

اندھیرا ہر کہیں گھنگھور عالم پر چھایا تھا   نہ تھی جب روشنی پیدا نمایاں جب نہ سایہ تھا
سمندر تھا کہ تاریکی کی موجوں میں سمایا تھا   سراسر تخم ہستی کو اندھیرے نے چھپایا تھا۔

مگر کب تک چُھپا رہتا وہ یوں اس خاک ظلمت میں
ظہور اس کا ہُوا اگنی سے پرکرتی کی صورت میں

ہُوا تب سب سے اوّل پریم کا دلکش گزر اس پر   اُبل اُٹھا یکایک ایک چشمہ قلب کے اندر
ہُوا رشیوں کا دِل تحریک سے اسکی اثر پرور   تصوّر میں وہ ڈوبے دیکھکر یہ تازہ تر منظر

تجلّی ریز دل میں معرفت کا جب ہُوا جلوہ
تمیز ان کو ہوئی مخلوق نا مخلوق میں پیدا

اندھیرا ہو گیا کافور ان کرنوں سے جب یکسر   ہوئی یہ فکر دامنگیر اس کا کس جگہ ہے گھر
وہ اوپر ہے کہ ہے نیچے یہ غوطہ تھا یہی چکر   یہی تھی جستجو ان کو وہ اندر ہے کہ ہے باہر

اودھر مصروف تکوین اور تھی ساری کل شکتی
محیط کل اُدھر چیتنیہ تھا عامل تھی پرکرتی

کسے عین الیقین ہے کون ہے دعوی سے کہہ سکتا   کہ یہ خلقت ہوئی کیونکر کہاں وہ بیج ایجا تھا
جگ اُتپتی کی اس خلاق کو تھی یا نہ تھی اِچھا   یہ ہے وہ راز سربستہ کہ حیرت میں ہیں کل دانا

ہے جسکو غیب کا علم اور گہری ہے نظر جس کی
حقیقت اس پہ تھی شاید نہیں یا ہے کھلی اس کی

بچوں کا ہفتہ

۶ مارچ سنہ ۱۹۲۴ء

مثل مشہور ہے درزی کی سوئی کبھی گاڑھے میں جاتی ہے اور کبھی مخمل میں۔ یہی حال قادر الکلام شاعر کا ہے یہ بچکانہ موضوع اور علامہ کیفیؔ کا قلم۔ پڑھیئے اور داد دیجیئے۔

کیا خوشی ہوتی ہے جب گھر میں ہو بچہ پیدا سننے میں آتی ہے ہر سمت مبارک کی صدا
کوئی شہنائی بجاتا ہے تو کوئی باجا مانگتا ہے کوئی دعوت کوئی نقدی۔ جوڑا
آکے گھر والوں کو دیتے ہیں بدھائی سب لوگ
باپ اور ماں کی سمجھتے ہیں بڑائی سب لوگ

مست شادی میں نظر آتے ہیں سب گھر والے خاطریں کرتے ہیں دائی کی سب اوپر والے
مال و زر خوب لٹاتے ہیں جو ہیں زر والے شامل عیش بھی ہو جاتے ہیں باہر والے
جیسے کھل جاتا ہے اس گھر میں ہر اک دل کا باغ
ہو کے خوش سب یہی کہتے ہیں یہ ہے گھر کا چراغ

لڑکی پیدا ہوئی تو سمجھے کہ لچھمی آئی اپنی ہمراہی میں وہ دولت و ثروت لائی
اور لڑکا ہوا تو آئی مچلتی دائی زیور اور اچھی سی پوشاک کی بدھ ٹھہرائی
کوکھ ماں کی رہے ٹھنڈی ہے یہی سب کی دعا
یہ پھلے پھولے رہے اس کا کلیجہ ٹھنڈا

الغرض بچے کے آنے سے ہے خوش سارا گھر قہقہے، چہچہے رہتے ہیں سب اندر باہر
جس طرف دیکھئے ارمانوں کی شکل آئے نظر پھولی آپے میں سماتی ہے نہ مادر نہ پدر
غور سے دیکھے جو کوئی تو یہ سمجھے لیکن
کہ ہے ماں باپ کے حق میں یہ بہت مشکل دن

آئی ماں باپ کے سر اک نئی ذمہ داری ذمہ داری بھی اہم اور بہت ہی بھاری
سونپتی ہے انہیں اک جان یہ ذات باری ساتھ اس حکم کے یہ رکھیں سب گھر باری

چاہتے ہو اگر اس فرض کو پورا کرنا
دھیان اس بچے کی صحت پہ ہمیشہ دھرنا

دھیان رکھنا کہ وہ روتا ہے تو کیوں روتا ہے
ہچکیاں کس لئے لیتا ہے وہ جب سوتا ہے
گرچہ دکھ اس کا تمہارا ابھی تو سکھ کھوتا ہے
درد سے اس کے تمہیں کرب بہت ہوتا ہے

مامتا سے نہیں ہٹ سکتی ہے اس کی تکلیف
اس کی تکلیف مٹائیگی نہ یہ حسّ لطیف

اس لئے چاہیئے دن رات تمہیں رکھنا دھیان
زندگی اس کی اسی پر ہے اسی پر ہے اٹھان
صاف ستھرا ہو۔ ہوادار ہو بچے کا مکان
بدن اور کپڑوں پہ ہو میل کا مطلق نہ نشان

دودھ ماں کا کہ وہ اوپر کا پئے نپتی سے
جو ہدایات ہیں پوری ہوں خبرداری سے

دل میں ارماں بہت سینکڑوں ہیں جو نپ اور رچاؤ
زیور اور قیمتی کپڑے بھی جو چاہو پہناؤ
شوق سے کرتے رہو اس کا سنگار اور بناؤ
تم کو آتا نہیں بچے کا جو رکھ رکھاؤ

تو یہ بے فائدہ ہیں بچے کی صحت کے لئے
تم نے خود غرضی کے ارمان جو کتنے پورے کئے

چاند کا ٹکڑا تمہارا ہے وہ اور نور نظر
دھیان اس کا بھی ذرا رکھنا ہے تم سب کو مگر
اس کا تن صاف رہے میل نہ ہو کپڑوں پر
کھانے پینے کی بھی لیں وقت مقرر پہ خبر

بے زباں اور ہے ننھی سی فقط جان اس کی
اور ہے مامتا بس ماں کی نگہبان اس کی

کہتے منہ کھول کے بچوں کو تو ہو لخت جگر
اپنا جی۔ جان بتاتے ہو انہیں۔ نور بصر
کبھی اسکی بھی مگر رکھتے ہو اک لحظہ خبر
بچہ والو کبھی اس پر بھی تمہاری ہے نظر

بچہ اک شیشہ ہے بس ٹھیس لگی، ٹوٹ گیا
بلبلہ ہے کہ ہوا تیز لگی۔ پھوٹ گیا

غم اولاد سے بچنا جو ہے تم کو منظور
عمر بھر چاہتے ہو رہنا جو خوش اور مسرور
گر یہ خواہش ہے رہو بچوں کی دوری سے دور
تو ہدایات کی تعمیل میں ہو کچھ نہ قصور

یاد رکھو کہ تم اک جان کے ہو ذمہ دار
ہونے پائے نہ وہ کمزور۔ دکھی اور بیمار

بہت ایسے ہیں کہ بچہ جو کبھی روتا ہے / تو وہ فوراً یہ سمجھ لیتے ہیں وہ بھوکا ہے
گو یہ ممکن ہے کہ بدہضمی سے درد اٹھتا ہے / جس سے بے چین ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتا ہے

اس لئے سوچنا لازم ہے یہ اس موقع پر
کوئی تکلیف بتاتا تو نہیں وہ رو کر

بیسیوں ایسی ہی باتیں ہیں بتاؤں کیا کیا / ان کا اعلان ہو اس واسطے ہے یہ جلسہ
تاکہ لگ جائے ہر ایک شخص کو خوب اسکا پتا / کون سی باتوں سے رہ سکتا ہے بچہ اچھا

جستجو بچوں کی جہاں تک کہ ہے ممکن۔ ہو بند
تندرست اور توانا ہوں وہ چاق چوبند

یہ نمائش یہ سبھی یہ جو دھندا ہے تمام / یہ کتابیں، یہ رسالے، سندیں اور انعام
بچوں کے ہفتہ کا ہر شہر میں سالانہ نظام / اسلئے ہے کہ ہے منظور نظر فائدہ عام

سب ہوں محتاط و خبردار یہی خواہش ہے
آپکے بچوں کی خاطر ہی تو کوشش ہے

جمنا کا چڑھاؤ اُتار

(اپریل ۱۹۲۷ء)

خاص نمبروں کا ہر لکھنے والے کو دق کیا کرتے ہیں حضرت کیفی کیونکر بچ سکتے۔ جب راقم نے اس نظم کی نسبت دریافت کیا۔ تو فرمایا کہ ہاں شامل کردو۔ اور ضرور۔ میں خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ آپ کی نظر ادھر پڑی مسکرائے اور فرمایا۔ بھلے مانس سے بار بار کہا۔ کہ نہ فرصت ہے نہ طبیعت حاضر۔ معاف کریں۔ نہ مانا۔ چڑھ کر کہا۔ کہ اچھا کل لے جانا۔ ہندو اخبار اور وہ بھی بنسانی جنم اشٹمی کا خاص نمبر پڑھیں اور اپنی مونچھوں کے بال نوچیں۔ یہ نظم حاضر ہے۔ لوگوں کو یاد تو رہے کہ شاعر کو دق نہیں کیا کرتے۔ اور شاعر کے دماغ کو سنگ فشیں نہیں سمجھتے۔

بگڑی ہوئی اس شب تھیں عناصر کی ادائیں — چھائی ہوئی تھیں چرخ پہ گھنگھور گھٹائیں
بجلی کی کڑاک اور گرج کی وہ صدائیں — طوفان بھری چلتی تھیں چو بائی ہوائیں
خیمے کی طرح چھائے ہوئے چرخ پہ بادل
تا حدّ نظر سطح زمیں ہو گئی جل تھل

وہ تار بندھا مینہ کا کھمتا تھا نہ دم بھر — برسیگا وہ گویا نہ کبھی آج برس کر
آکاش پہ جا بیٹھے تھے یا سات سمندر — گندھربوں نے پھینکا تھا انہیں لا کے زمیں پر
چھیڑا ہوا تھا میگھ کا وہ چرخ پہ سرگم
مُہرہ کا پتا جس میں نہ ہلتا تھا کہیں سم

اک عالم مائی ہوا ہنگامہ مایا — پلٹی گئی اس رنگ سے سنسار کی کایا
پانی تھا ہوا کی جگہ ہر شے میں سمایا — اوپر سے وہ دریا کرۂ خاک پہ آیا
کرتا ہے رواں جسکو سر چرخ ارسطو
بہہ جانے کو کیئندر سے کیوں پھر نہ ہو میرو

برسائیں سمندر پہ سر گر ددں سے گھٹائیں — بہہ اتری تھی گنگا جو کھلیں شو کی جٹائیں
پانی کی ورُن سے تھیں بغاوت کی ادائیں — وائیو نے کمک کیلئے بھیجی تھیں ہوائیں
تھا عالم آب اپنا اُدھر زور دکھاتا
تو لشکر وائیو تھا۔ ادھر شور مچاتا

اِندر اور ورت میں تھی ٹھنی سخت لڑائی — ہارا ورت اور فتح بڑی اندر نے پائی
اس طرز سے جب پانیوں نے پائی رہائی — تو کانپی زمیں اس پہ ہوئی ان کی چڑھائی
سجدے میں گرا گرچہ وہ گلزار ورُن کا
کیا قہر ہے گو تر رہا اس پر بھی پیاسا

بجلی کے تڑاقے تھے وہاں رعد کے کڑکے — سکّان فلک لڑتے تھے آپس میں بگڑ کے
جب تھک گئے آکاش پہ یوں لڑ کے جھگڑ کے — نیچے اتر آئے وہ ہمالہ کو پکڑ کے
وہ چپقلش اب ہونے لگی روئے زمین پر
آکاش سے بجز اندر کا چھپا تھا وہیں پر

اک شور قیامت تھا۔ کہ دنیا میں مچا تھا — تکوین کا شیرازہ پراگندہ ہوا تھا
آکاش سے پاتال تک اک حشر بپا تھا — پرلے کا سماں تھا۔ کہ زمانے میں بندھا تھا
چکر میں تھا نٹ راج کے تانڈو سے زمانہ
یہ دیکھ کے وشنو ہوئے دھرتی کو روانہ

تھا گھور اندھیرا کوئی نکلا تھا نہ تارا — ہاں روہنی نکشتر کا چمکا تھا ستارا
طوفانوں کا جب چار طرف تھا یہ نظارا — آیا نظر اک سمت کو دریا کا کنارا
جاتا تھا کوئی شخص ادھر پانو اٹھائے
اک بچہ کو سینہ سے وہ تھا اپنے لگائے

پانی کہیں پایاب جو اس شخص نے پایا — کچھ سوچ کے کچھ سہم کے دریا میں در آیا
اک آدھ قدم ہی تھا۔ مگر اس نے بڑھایا — پانی نے جو ایک اسکو نیا رنگ دکھایا
یہ حال تھا جتنے قدم آگے وہ بڑھاتا تھا
پانی جہاں پایاب تھا اوپر کو چڑھا تھا

جوں توں لئے بچے کو کچھ آگے جو وہ پہنچا — تو اور بھی اونچا ہوا پانی کا وہ تختا
بچے کو لیا گود سے اور کندھے پہ رکھا — پانی کا مگر زور ہوا اور زیادہ
حیران تھا طغیانی یہ کیوں آتا ہے پانی
اک سمت سے جو اسکو سنائی دی یہ بانی

"بسدیو جی ظاہر میں یہ ہے پُتر تمہارا — تم جانتے ہو آنکھوں کا اپنی اسے تارا
لیکن ہے حقیقت میں دھرم کا یہ سہارا — مت پوچھو یہ خالق ہے کہ خالق کا ہے پیارا
گھر بیٹھے جو جمنا کو یہ مل جائے سعادت
وشنو کے چرن چوم کے کیوں پائے نہ عزت

جھجکو نہ ذرا خوف کوئی دل میں نہ لاؤ — مہاراج کو پانی سے تم اونچا نہ اٹھاؤ
کومل چرن ان کے ذرا نیچے کو جھکاؤ — جمنا کی یہ بھگتی کی جو ہے پیاس بجھاؤ
جمنا نے یہ پابوسی کا اعزاز جو پایا
پانی جو چڑھا جاتا تھا نیچے اتر آیا

بے غرض خدمت

(۱۹۲۳ء)

نظم کیا ہے فلسفہ ایثار کا دلچسپ اور بے نظیر مقالہ ہے۔ آخری شعر اہل وطن کیلئے قابل غور ہے

یہ ایک روز کیا فلسفی نے مجھ سے سوال
بتایئے تو ہے کیا چیز بے غرض خدمت

قرار دیتی ہے کیا اس کی اصل اور تعریف
ہمارے شاعروں کی فہم اور ذہنیت

دیا جواب یہ میں نے کہ ہے یہ سیدھی بات
دخیل اس میں نہ منطق ہے اور نہ ہی حکمت

مفاد غیر کی خاطر جو فعل سرزد ہو
غرض نہ رکھتی ہو فاعل کی جسمیں کچھ نیت

چھڑائے دکھ سے کسی کو بلا امید صلہ
اسی کو کہتے ہیں ہم لوگ بیغرض خدمت

جواب طنز سے یہ مسکرا کے اس نے دیا
کہ اس کی کچھ نہیں میزان عقل میں وقعت

بکھانتے ہیں بہت حسیات کو شاعر
مگر نکات سے اسکی انہیں نہیں نسبت

کہا جو میں نے کہ مانا۔ تو وہ ہوا گویا
نہیں تو فلسفہ کی شاعری پہ ہے عظمت

جو ٹھہری غلت غائی فعل ہمدردی
بدیہی فعل سے ثابت غرض کی ہے خدمت

نہ سمجھے تم تو میں تمثیل سے دلیل کروں
جب ایک شخص کی کچھ ایسی ہو گئی سیرت

کسی کو دکھ میں جو پائے تو خود دکھی ہو جائے
ہو آپ اس پہ ہی طاری جو غیر کی ہو ہئیت

وہ ایک دن لب دریا ٹہل رہا ہو کہیں
کہ یہ مشاہدہ میں اس کے آئے کیفیت

کہ غرق ہونے کو منجدھار میں اک انسان
معاون اس کا نہ کوئی بچاؤ کی صورت

کوئی نہیں اسے پنجے سے موت کے جو چھڑائے
دم اس کا ٹوٹنے کو اور طاق ہے طاقت

یہ دیکھ کر لب دریا ٹہلنے والے کی
تمہاری فہم سے بالا ہے جو ہوئی حالت

تھی اسکی سیرت و اخلاق میں جو ہمدردی
تھی وجہ کرب اسے اس غریب کی آفت

یہ اس کے ذہن پر احساس چھا گیا فوراً
بھنور میں کود پڑا وہ معاً۔ اسی ساعت

یہ غیر کے لئے جوکھوں میں آپ پڑ جانا
کہو گے تم کبھی تو ہے بے غرض خدمت

یہی ہے شاعروں کا جہل و نارسا ادراک
کہ انکی عقل سے ہے دور بحث و حکمت

اگر ہو تجزیہ اُس شخص کے تخیّل کا — نتیجہ اس سے یقیناً یہی ہو مستنبط
جب اُس نے ڈوبتے اُس آدمی کو دیکھا تھا — تو اس کے قلب پہ طاری ہوئی یہ کیفیت
کہ جیسے آپ ہی وہ ڈوبتا ہے دریا میں — اذیّت اپنی مٹانے کو یہ سہی زحمت
یہ فعل اس کا نہ اس غیر کی ہُوا خاطر — محرّک اس کی غرضمندی اور تھی، علّت
ذکی تھی اور شدید اتنی حسّ ہمدردی — کہ اس کی ہو گئی جو کچھ بھی غیر کی حالت
حقیقت ایسی تھی۔ تو پھر کیا جو کچھ اس لئے — وہ بیغرض نہیں ہے صاف خود غرض خدمت
کہا یہ میں نے سنا فلسفی کا جب یہ کلام — مُبارک آپ کو یہ فلسفہ یہ عقلیّت

یہاں بھی ایسے ہی چند ایک خود غرض ہوتے!
یہی ہماری تمنّا ہے اور یہی حاجت

منشی وِنایک پرشاد طالب بنارسی کی وفات پر

(۷ر جون سنہ ۱۹۲۲ء)

ہند تھا بھولا ہُوا بھو بھوتی۔ کالیداس کو — پردۂ نسیاں رُخ بھاسا پہ تھا چھایا ہُوا
گاہ گہہ ہوتے تھے اب بھی سوانگ اور ناٹک یہاں — غالب اُن پہ پہلیوں کا رنگ تھا آیا ہُوا
جھانکیوں یا فارس سے بڑھکر نہ انکی شان تھی — تھا کہیں سنگیت نے بھی خود کو چمکایا ہُوا
یہ نمائش جنس دیرینہ کی یوں ہندی میں تھی — اور جو بن تھا اِدھر اُردو کا گدرایا ہُوا
اس کو ستاون کی شورش نے دیا یکسر بدل — طرز جو تہذیب کا تھا۔ ہند کو بھایا ہُوا
ایک کروٹ لی زمانے نے کہ ہل چل پڑ گئی۔ — جیسے مغرب کی پری کا ہند پہ سایا ہُوا
تھے یہاں سامان جو تفریح و استحظاظ کے — ان سے دل اہلِ وطن کا تھا نہ گرمایا ہُوا
تھے ثقات ان سے نفور، اور محترز اہلِ مذاق — دل لگی کا الغرض تھا چاند گہنایا ہُوا
ایسی حالت تھی۔ کہ اُٹّھے طالب بالغ نظر — خدمت اُردو کا جنکو جوش تھا آیا ہُوا
کر کے یکجا ہند و یورپ کے تھیٹر کا کمال — وہ کیا ایجاد جواب سب کا سرمایا ہُوا

پھر وہ سودا نے جو پایا زمبہ اردو نظم میں — اس سے اونچا انکا ناٹک میں کہیں پایا ہوا
حضرت طالب جو اردو میں ڈرامے لکھ گئے — ان سے اینک ہے دلِ اہلِ فن کا گرمایا ہوا
بات وہ پیدا نہ ہونی تھی نہ ہرگز ہو سکی — بہترین اینک ہے انکا ہے جو فرمایا ہوا
ان کے دم سے پارسی ناٹک کی رونق تھی یہاں — بمبئی کا بڑھ کے تھا۔ اُجیّن سے پایا ہوا

حیف صد حیف آج ہمکو چھوڑ کر وہ چل دیئے
ان کے ماتم سے کلیجہ منہ کو ہے آیا ہوا

عالم آشوب

(۱۳ مارچ سنہ ۱۹۲۲ء)

یکم مارچ سنہ ۱۹۲۲ء کو دہلی میں کونسل آف سٹیٹ اور لیجسلیٹو اسمبلی میں حکومت ہند کا بجٹ (میزانیہ) پیش ہوا۔ تیس کروڑ سے زیادہ گھاٹا دکھایا گیا۔ نئے ٹیکسوں کی تجویزیں ہوئیں سارے صوبوں میں بھی گھاٹے کے بجٹ پیش ہوئے۔ وطن کا افلاس مدت سے دل کو دکھ دے رہا تھا یہ نئی صورتیں اس نظم کی محرک ہوئیں۔

چھائے ہیں ملک پر افلاس کے منحوس آثار — تنگدستی کا ہے جن سر پہ خلائق کے سوار
شہر آشوب لکھا کرتے تھے پہلے۔ مگر اب — عالم آشوب کے لکھنے کا ہے مضمون تیار
کہتے ہیں پیسے میں اگلی سی وہ برکت نہ رہی — ہو گیا لکشمی کے سایہ سے خارج یہ دیار
پہلے گر ایک کماتا تھا۔ تو دس کھاتے تھے — اب کماتے ہیں سبھی اور سبھی ہیں نادار
کوئی چھوٹا کہ بڑا ہو نہیں چارہ اس سے — زیست کا قرض پہ ٹھہرا ہے بس اب دارومدار
کیا پس انداز کہ آگے کا نہیں چلتا خرچ — کل کو کیا روئیے جب آج کا دوبھر ہو بار
تن ڈھکیں پیٹ بھریں کنبے کو پالیں کیونکر — عقل عاجز ہے تو بیسود کفایت کا شعار
بے غذائی سے بدن ہو گئے اس درجہ ضعیف — آئے دن کی ہے جو رگ دھانس سدا ہیں بیمار
چار پیسے جو بچائے تھے کبھی کاٹ کے پیٹ — لگ گئے اور بھی ساتھ اسکے طبیب اور عطّار

زندگی میں جڑے روٹی نہ پس مرگ کفن
دین و دنیا کی ہو پھر قید گلے کا کیوں ہار

لا بدی خرچ سوا سو کا ہو آمد سو کی
قرض لینا پڑے انسان کو چار و ناچار

لڑکی اک بیاہی تو بس پھر گئی گھر میں جھاڑو
بیوی کے ہاتھ گلے میں نہ رہا باقی تار

ایک کے ہاتھ تو جوں توں کئے پیلے لیکن
کیا رہا ان کے لئے اور جو دو ہیں تیار

آبرو رہنی ہے ان حالوں میں کیونکر یارب
رات دن ہے یہی فکر اور یہی سوچ بچار

جو بچاتے گئے لڑکے کی پڑھائی میں لگا
آج ہی تو نہیں ہو جائیگا وہ بر سر کار

اپنا بوجھ آپ اٹھالے تو غنیمت جانو
لیکن ایسے جو ملیں سو میں تو بس دو ہی چار

اگلے وقتوں کی یہ گھر حن تھی بدولت جس کی
رہا قائم یہ بھرم اور چلا ہے گھر بار

خیر بکرے کی منائیگی مگر ماں کب تک
اچھے دن آئیں گے کیا ہے جو یہی لیل و نہار

ان کا دھندا نہ چلا۔ ان کا تقاضا نہ ٹلا
جوتی پیزار ہے گھر میں تو ہے باہر تکرار

کس کو دیں۔ کس کو نہ دیں کیا کریں اور کیا نہ کریں
وہ مثل ہے کہ انار ایک ہے اور سو بیمار

ملازمت پیشہ

بیچ کے طبقے کے لوگوں میں ہیں کتنے۔ جن کے
نفعے بے انت ہوں درماہے ہوں یا بیش قرار

نوکری پیشہ جو ہیں ان کا نہ پوچھو احوال
ان پہ رہتی ہے مصائب کی ہمیشہ بھرمار

کیونکہ کرتے ہیں گزر اس سے سمجھ لیں بس آپ
ہونے لگتا ہے پندرھویں سے ہی پہلی کا شمار

سا وہ خوری کی ہے ماہانہ یہ مجمل روداد
پہلے سالن اڑا پھر دال سے چھوٹا ہے بگھار

حال تو یہ ہے کہ آئی نہیں گھر میں تنخواہ
لینے والے ہیں کہ بس سر پہ ہیں آکے سوار

چل نہیں سکتے ضروری جو مصارف ہیں ہی
عیش اور حسرت و ارماں کی ہے بیجا گفتار

نوبت اب یہ ہے مہینے میں ہے باقی ہفتہ
پان بیوی سے تو چھوٹا ہے میاں سے بھی سگار

جو مثل تھی نیا نو دن تو پرانا سو دن
اس پہ عامل ہیں زمانے کے صغار اور کبار

قطع کپڑا ہو نیا گھر میں تو لے وہ اترن
دلق پوشی میں نہ آقا ہے نہ کم خدمتگار

ذکر ہی خرچ کا آیا۔ کہ چڑھالیں آنکھیں
کوئی ہمدرد کسی کا ہے نہ کوئی غمخوار

بن پڑے کس کی مدد، ہاتھ بٹائیں کس کا
خود مصیبت میں ہوں تو ایک ہیں یار اور اغیار

پانچ سو ان کی ہے تنخواہ کہ ہے صرف پچاس
ایک حالت میں بسر ہوتی ہیں انکی اعمار

ہم میں اب کون شریف اور رہا کون رذیل
کسب زر اب جو شرافت کا بنا آئینہ دار

شغلِ آبائی کی بھی قید اٹھا دی سب نے
اب جھجک ہی ہے کس کام میں گوں گو نہ عار

اب کسی پیشے میں حرفے میں نہیں عذر کوئی
جسے کرتا تھا کبھی موچی۔ جلاہا۔ نجار

بیلتے اب نہیں پاپڑ یہاں کیا کیا لیکن
تھا فراغت کا نہ ہونا نہ ہوا ہے دیدار

پورا پڑتا نہیں اس پر بھی تو اکثر کا یہاں
کون ہے جو نظر آتا نہیں قرضہ کا شکار

جب گرانی سے فلاکت کا ہو پلا بھاری
سرگراں ہوں کہ سبک سر ہوں ہر حال ہیں زار

تجارت پیشہ

ملک کی ان کو امارت کا سمجھنا نہ امین
تم کو دیتے ہیں دکھائی جو یہ بڑھیا تجّار

ان کے ہاتھوں ہی نکلتی ہے وطن کی دولت
قوم کے سر پہ چلاتے ہیں یہی تو تلوار

نظر آتے ہیں تعیش کے جو ساماں تمہیں
ملک میں ان کی درآمد کے یہ ہیں ذمہ دار

ہیں یہ دلال اگر حیثیت اصلی دیکھو
غیر ملکوں کی یہ آڑھت کے ہیں فرمانبردار

رہتے ہیں ٹھاٹھ سے اور جاہ و حشم والے
ہر گھڑی در پہ کھڑی رہتی ہے اک موٹر کار

اس پہ بھی دیکھنا ہے یہ کہ ہیں کتنے ان میں
ذاتی سرمایہ جو رکھتے ہیں جو ہیں خود مختار

جیب میں جاتے ہیں اوروں کی منافع سارے
ان کو ہے اپنی کمیشن سے غرض اور سروکار

ساکھ ان کی ہے کچھ اس میں نہ ہے سرمایہ ہی
ہنڈیاں کمپنی کے نام سے دیتے ہیں سکار

کاروبار اپنا ہے تو مثل ہے اس کی قرضہ
آج کل چلتے ہیں اس طرح یہاں کے بیپار

تعلیم یافتہ

ہم کو تعلیم جو دی جاتی ہے کچھ ایسی ہے۔
دین و دنیا کسی گوں کی بھی نہیں وہ مردار

پڑھ کے بن جاتے ہیں دفتر کے ملازم کچھ لوگ
لیکن ان عہدوں کا محدود و معین ہے شمار

نہ تو فن ہائے لطیفہ میں اجلتا ہے دماغ
اور نہ جدت سے ذکاوت کبھی ہوتی ہے دوچار

اختراعات و صناعات۔ فنون اور ہنر
ان سے ان لکھے پڑھوں کو نہیں رہتا سروکار

کرنا چاہیں تو وہ کر ہی سکیں کچھ ہاتھ کا کام
وہ تو اک نوکری پر بیٹھے ہیں بس کھائے ادھار

کیمیا اور طبیعات کا جو مالک ہے
اس سے کہئے تو کھلونے ہی بنا دے دو چار

بھول بیٹھے ہیں بزرگوں کے ہنر اور فن کو
ایک بے ڈھب کے قلم رہ گیا۔ ان کا ہتھیار

اِک اسامی کہیں خالی ہوئی پھر دیکھیں آپ
بابو لوگوں کی دوڑ دھوپ رہ دفتر میں قطار

عرضیاں عرضیوں پر ہیں کہ چلی آتی ہیں۔
منسلک جن سے سفارش کے خطوں کے طومار

ان کی لدوری تو ہے موہوم یقینی ان کی
ان سے سچ پوچھو تو بہتر ہیں کمہار اور چمار

مدرسہ چھوڑ کے وہ سیکھتے گر کوئی کام
اِن دہاڑوں نہ پہنچتے انہیں ہوتا نہ فشار

روز کی روٹی کما لیتے وہ روکھی سوکھی
مارے مارے تو نہ یوں پھرتے وہ رہ کر بیکار

دیکھئے شامت اعمال کی یہ چال نئی
دیکھتے ہیں کہ پریشانی میں ہیں برخوردار

لڑکیوں کو بھی دئے جاتے ہیں تعلیم وہی
جس نے لڑکوں کو خراب اور کیا ہے بیکار

ہنس ہر کاروں کی تعداد بڑھانا تو ہے کیا؟
یہ نئی طور سے کیا جائیں اُجڑ جیسے گھر بار ؟

سمجھ الٹی یہ حکومت کی کہ ہے لوگوں کی
کچھ ہوا آنکھوں کے تو آگئے ہیں بنتے ہی آثار

مزدوری پیشہ اور اہل حرفہ

مطمئن آج نہ مزدور نہ کاریگر ہے۔
اہل سرمایہ کو بھی پالتے ہیں حرف افکار

ان میں اور کام کے لوگوں میں اگر ڈھونڈو تم
تو نہ ہمدردی باہم کے ملیں گے اطوار

کارخانوں کی تو ہے ریل کی ہڑتال کبھی
اور دوکی ہے جدھر دیکھتے ہیں چیخ پکار

اہل سرمایہ کا بھر دیتے ہیں دولت سے جو گھر
اہل محنت سے وہ ہو جاتے ہیں پھر کیس بیزار

جن مشینوں کی بدولت یہ بنے ہیں ایوان
وہی تن رکھو کریں گی انہیں اک دن مسمار

چاہتی ہے دے وہن پاک میں لقمہ بھی مشین
اہل حرفہ کے مساعی ہوں نہ کیوں پھر بیکار

زراعت پیشہ

بیس آنہ بھی ہوئی فصل تو کیا حاصل جب
بیج کے واسطے لینا ہو کسانوں کو ادھار

اک زمانہ تھا یہی شور تھا عالم میں بلند
گانو والوں کا لہو چوستے ہیں ساہوکار

سود پر سود لگاتے ہیں غضب کا بنئے
آٹھ سو دیکے لکھا لیتے ہیں دو ڈیڑھ ہزار

آئے اب ان کی جگہ پر جو زمینداری بینک
تو زمینداروں کی حالت کا وہ کچھ کرتے سدھار

گانو میں آئیں مشینیں نہ کلیں کھیتوں پر
ہے وہی کھاد، وہی ہل، وہ رہٹ اور چمار

موروثی حال جو پہلے تھی وہی ہے اب بھی / کل مساعی جمیلہ ہوئے ثابت بیکار
انتقالات اراضی کا بھی قانون بنا / یہ کیا اس نے زمینوں کا گرایا بازار

نوآبادیوں میں ہندیوں کی حالت

کیوں نہ بھوکے مریں رازق ہو درآمد جنکی / پردہ فاش ان کا ہے پردیس ہو جنکا ستار
بھوکے ننگے پڑے پھرتے ہیں ہزاروں لاکھوں / گرچہ گودام اٹے اور بھرے ہیں بازار
لنکا شائر میں تو سونے کی بنا لیں لنکا / ہند میں پھیلے فلاکت کا وبائی آزار
تنگ آکر کہیں پردیس میں گر جا نکلیں / شاہِ برطانیہ ہی کا جہاں حاوی ہو وقار
ایک کر کے یہ لہو اور پسینا اپنا / جب نوآباد علاقہ کو بنا دیں زردار
نیتیں اہل حکومت کی بدل جاتی ہیں / ہندی بیچاروں کو ملتی ہے دُپٹ اور دُھتکار
حکم ہوتا ہے :- کر دیا تو غلامی منظور / ورنہ چلتے ہو گوروں کے لئے ہے یہ دیار
حال کالونی کا کیا تھا وہ جب آئے تھے یہاں / دیکھئے یہ ان کی بلا وہ تو ہیں مطلب کے یار
اپنے مطلب سے غرض تھی وہ ہوا جب پورا / عہد و اقرار یہ قایم ہے۔ ان کی بیزار
ہیکڑی اور ڈھٹائی کا ہے دنیا میں چلن / حق سے انصاف سے رکھتا نہیں کوئی سروکار
پارلیمنٹ سے بھی داد نہ رسی ہے معلوم / عرض معروض یہ کہتے ہیں :- وہ ہیں خود مختار
ہم تو نوآبادیوں میں ہندیوں کے ہیں ہمدرد / پر یہ شایاں نہیں تحریک کریں سو سو بار
نہ سنیں وہ تو نہیں اس میں ہمارا ذمہ / ان سے ہم کر چکے۔ جو تم نے کہا۔ گوش گذار

بڑے آدمی

ایک حمام میں سب ننگے یہ اپنی ہے مثل / ایک حالت میں ہیں عام آدمی ہوں یا سردار
ان کے سر سیکڑوں تو ان کے ہزاروں لاکھوں / قرض کے بوجھ سے ہر ایک کی حالت ہے نزار
رہن ہے جھونپڑی اس کی تو محل اس کا بھی / اس کی جوتی تو فٹن اس کی بھی آئی ہے اُدھار
دینداری بھی بڑے آدمیوں کی ہے بڑی / گھاؤ نکلے کا ہے مُرغی کو اجل کا آزار

وطن پرستی اور کفایت شعاری

ہے تمدن کا معیشت سے سوا بگڑا حال / دیکھئے جسکو ہے بدلا ہوا اس کا ہنجار

شامت آئی جو چلے ان کا تتبع کرنے
حکم میں جن کے ہیں دُنیا کے دیار و امصار
جنکی سلطانی کا سکّہ ہے زمانے میں رواں
بحر و بر جن کی حکومت کے ہیں فرماں بردار
مُلک گیری وہ کانداری میں جو ہیں مشتاق
جل کے اب انکو جو چاہو کہو۔ "غاصب۔ عیّار"
اپنے گھر کھینچ کے دنیا کی وہ دولت لیجائیں
کا جو بھو جو یہ یہاں گاڑھی کمائی ہو نثار
تم بڑے اور متوسط جو گھروں میں دیکھو
دیسی چیز ایک اگر پاؤ تو پھر ویسی چار
عقل پر اہل وطن کی پڑے پتھّر ایسے
عیش و آرام و امارت نہ ہوں کیونکر فی النار
رکھتے قایم اگر اپنی وہ ٹکے گز کی چال
دیکھنے پڑتے نہ یہ دن انھیں ہوتے نہ خوار
اس میں کچھ قومی تعصب نہ سیاسی رنج ہے
نہ سدیشی نہ بدیشی کا ہے بے جا اصرار
دشمن امن وسکوں اب کوئی چاہے سو کہے
زندگی کا ہے ہماری تو اسی پر آدھار
یہ سوال اپنے لئے زندگی موت کا ہے
قومی ہستی کا اسی پر ہے فقط دار مدار
خورونی اور ٹکا اپنا نہ یوں باہر جائے
پھر ہیں ہم لالوں کے لال اور عقیل و ہشیار

قومی قرضداری

گرم بازاری ہے قرضے کی جدھر دیکھو تم
راج کا کام چلے اس سے۔ اسی سے بیپار
قومی قرضہ ہو سوا جسکا وہ ہے قوم امیر
مالداری کا مسلّم ہوا پیمانہ اُدھار
قرض کی حد کو وہ کہتے ہیں کہ ہے نا کچھ بھی
آج کل قرض تموّل کا بنا ہے معیار
جب مصارف کی رقم آمدنی سے بڑھ جائے
فارغ البالی کی خواہش تو ہے پھر دور از کار

حکومت اور رعیت کی فلاح

باقی فاضل پہ خزانہ کی ہے لکھا معمور
اب سُبکسار ہیں ور بار بھی جو تھے دُربار
حکم ہوتا ہے بجٹ میں نہیں کچھ گنجائش
ہو رعایا کی بھلائی کا اگر فکر اذکار
آبیانہ ہے۔ لگان اور ہے جنگی، پرمٹ
ٹیکسوں کی ہے ہبوب اور محاصل کی پکار
کہتے ہیں خلق سے یہ رکھو۔ یہ ہمیں دے یہ لا
تاکہ ہم لبنیوں کو صاف رکھیں آئینہ دار
صحت تمام بڑھے دُور وبائیں ہو جائیں
قوم ہو جس سے توانا و قوی اور جرّار
کُوئے و برزن کی صفائی کی تو ہے انکو لگن
مرد و زن کھاتے ہیں کیا؟ اس کی بھی ہے کچھ سرکار

جمع سرمائے کئے جاتے ہیں بچوں کے لئے — بہتری ان کی ہو صحت میں بدن ہوں تیار
جن گھروں کے وہ ہیں کیا انکی ہے مالی حالت — اس تجسس میں پڑے وہ جو یہاں ہو بیکار
فاقے کے کرب کا احساس اسے ہو کیونکر — بھوک سے پہلے ہو جس کے لئے کھانا تیار

قحط کے نرخ

یہ نہیں ہے کہ نہیں ہوتی ہیں فصلیں بھرپور — کھیت سے منڈیوں تک غلّہ کے بھی ہیں انبار
ملک میں قحط کے ہی نرخ ہیں جاری لیکن — یا الٰہی یہ ہے کیا بات - یہ کیا ہے اسرار
حاصل فصل جو دیکھیں تو نظر آئے اٹوٹ — سب کہیں خوب ہوئی - خوب ہوئی پیداوار
یہ تو سب کچھ ہے - مگر واقعی حالت یہ ہے — تم رسد لینے کبھی جاؤ جو سوئے بازار
بھاؤ دال آٹے کا ہو جائے تمھیں بس معلوم — وہ سنو نرخ تم اجناس کے ہوں ہوش فرار
ایک گھی دودھ کو ہی دیکھو تو آنکھیں کھل جائیں — ہر بڑے چھوٹے کی خوراک کا ہے جن پہ مدار
چڑھ گیا سیروں سے اب چند چھٹانکوں پر گھی — رہی معکوس ترقی کی یہی گر رفتار
تو عجب کیا ہے کہ ہو اس کا دواؤں میں شمول — اور بیچا کریں کیمسٹ اسے اور عطّار
ڈاکٹر نسخوں میں گھی لکھیں وہ دن دور نہیں — پائے جاتے ہیں گرانی کے یہی کچھ آثار
روئیں کس کس کو کہ ہر چیز کو ہے آگ لگی - — دل کا آزار ہیں جتنے ہیں یہ گنج اور بازار

حاکم و محکوم

کیا خدا سوجھے ہے روح ہی جب قوت بدن — ایک معبد یہ مگر ہوتے ہیں لاکھوں ہی نثار
روکھی تعلیم سے کیا پیٹ بھرے عقل بڑھے — پیٹ بھر ہوگا تو پھر مغز بھی ہوگا بیدار
پیٹ میں کھائیں قلابازیاں چوہے دن رات — تو طمانیت دل اور سکوں ہے دشوار
قحط کے مارے ہوا زیست سے جب انسان تنگ — پھر ہے قانون کا اور حکم کا قدغن بیکار
جب غذا سے ہو شکم عقل سے خالی ہو دماغ — حرکات سبک انسان سے ہوں چار و ناچار
سر پہ پہنچ جاتی ہے پھر تیغ سیاست آ کر — ہے مثل مارتے مرتے ہی کو ہیں شاہ مدار
اسکو برہم زن امن اور جو چاہو سو کہو — ہے جلے دل کی بھڑاس اور بھرے جی کا بخار
جان سے تنگ ہے تو جی میں جو آئے کہہ دے — شیخ شیراز کا یہ قول ہے دُرِ شہوار

یہ بھی ہے وہ کبھی کہہ دیتے ہیں ان کہی بات — بے محل بھی تو نکلتا ہے کبھی دل کا غبار
مصلحت انکی نہ ظلم اور نہ ہے جبر کا عہد — انقلاب انکو پسند اور نہ ہیں یہ غدار
پیچ وہ حاکم و محکوم کہیں ہیں آکے پڑے — جن سے معذور سمجھ بوجھ ہے اور سوچ بچار

عالمگیر اسباب کے افلاس

نار دوزخ کی طرح سنتے ہیں "ہل من" کی صدا — وہ کچہری کہ ہو دفتر۔ کہ ہو گھر یا بازار
دنگ ہو جاتا ہے انسان کہ یہ ہے کیا بات؟ — عقل کرتی نہیں کچھ کام یہ کیا ہے اسرار
یہ تدبر ہے تمدن ہے کہ بد نظمی ہے — قوم کی شامت اعمال کی ہے یا پھٹکار
جو بڑے پایہ کے ہیں اور ہیں عالم فاضل — حال دنیا سے خبردار ہیں اور تجربہ کار
کاغذی زر کا کبھی تو وہ لگاتے ہیں نام — اور دساور پہ کبھی کرتے ہیں عزم پیکار
پونڈ کی ور کی بتاتے ہیں وہ ہیرا پھیری — غیر ملکوں سے درآمد پہ کبھی کرتے ہیں وار
کبھی کہتے ہیں روپیہ کی جو گھٹی مالیت — تنگدستی کا ہوا گرم اسی سے بازار
کوئی کہتا ہے کہ دولت میں تو بنتی ہے ضرور — اس کی تقسیم ہے افراد میں کچھ گنڈہ بدار
عام پھیلا ہوا اس کا تو یہ افلاس مٹے — کوئی مدیون رہے اور نہ کوئی ڈگریدار
کوئی کہتا ہے کہ ہندی ہیں لکیر کے فقیر — ان کی تقدیر نہ سدھری ہے نہ سدھرے زنہار
نیا سائنس غلط اور صحیح اندر جال — مطمح الیسول کی نظر کا ہو نہ کیوں تیرہ و تار
نہ تنوع ہی ہے کچھ صنعت و حرفت میں یہاں — نوکری اور زراعت پہ ہیں دل انکے نثار
بھیڑ چال ان کے چلن کا ہے نمایاں عنصر — ایک کھو دے جو کوئی بنک تو کھولیں گے ہزار
باپ بن بیٹھتے ہیں جلد نکھٹو لڑکے — جس سے آبادی۔ کمائی کا بگڑتا ہے شمار
حوصلے ان کے بلند اور نہ ہمت عالی — ایسے لوگوں پہ نہ چھائے تو بھلا کیوں ادبار
دوڑ دھوپ ان سے نہ ہو جو نکھٹو سے کوسوں بھاگیں — ایک ہی حال میں ڈیں زندگی اپنی وہ گذار
پھاڑ کر دیتا ہے چھپر جو اسے دینا ہو — ان کے دریائے توکل کا ہے ناپید کنار
معجزوں کا ہے زمانہ نہ چمتکار کا وقت — جد و جہد اور سعی لکشمی کا ہیں اوتار
اپنی قسمت پہ یہ بیٹھے رہیں شاکر ہو کر — کس لئے پھر ہے یہ حالات زمانہ سے گہار
دھرم انکا ہے قناعت۔ ہے توکل مذہب — انکے قبضے میں تو ہے مملکت صبر و قرار

ہیچ و پوچ اور ہے فانی یہ جہاں اور یہ زیست
یہ یقیں جن کا ہو گیا ان کو خزاں اور بہار

مشترک کنبے سے ناخوش کوئی فرد کاہل
عام افلاس کا کہنا ہے۔ یہ ہے ذمّہ دار

قومی ثروت کے بڑھانے کے یہ لچھن ہیں کوئی
جوش ان میں نہیں جدّت کا نہیں ان میں شرار

تنگدستی کا بہت ہوتا ہے جب شور بلند
تو سنبھل کر یہ سنا دیتی ہے دُھر پد سرکار

ہندیوں کی ہے بد اعمالی کا یہ پھل سارا
ان کو لچھمی سے زبس عشق ہے سونے سے پیار

جتنا زر پاتے ہیں کر دیتے ہیں سب نذرِ زمیں
یا گھڑا لیتے ہیں زیور کہ ہو بیوی کا سنگار

اس قدر قبضہ کئے انکے دلوں پہ ہے دھروڑ
ہضم کر جائیں وہ قارون کو مگر لیں نہ ڈکار

جتنے منہ اتنی ہی باتیں غرض ایسے ہیں طبیب
نشترِ بحث سے بیمار کا کرتے ہیں اچار

پیچ در پیچ کچھ الجھاؤ پڑے ہیں ایسے
عقلِ انسانی ہے سلجھاؤ میں جن کے بیکار

لابدی اس کا نتیجہ جو ہے وہ ظاہر ہے
عہدِ حاضر سے ہوئے جاتے ہیں سب دل بیزار

ہے حکومت جو تہیدست رعیت کنگال
کون امداد کرے کس کی۔ سبھی ہیں ناچار

جنابِ باری میں دُعا

اے خداوند حقیقی نظرِ رحم ذرا
اپنے بندوں کا تو رزّاق ہے تو ہی ستّار!

بے کراں تیرا کرم۔ رحم ترا بے پایاں
بخشش خلقت کے گنہ تو تو بڑا ہے غفار

تیرے ہی لطف سے رہ سکتی ہے تیری مخلوق
تیرے ہی فضل سے ہو سکتا ہے یہ بیڑا پار

ہفت بند کیفی

(کشمیر - ۲ مارچ سنہ ۱۹۲۲ء)

یہ ترکیب بند اردو لٹریچر میں اپنی نظیر نہیں رکھتا - اعلیٰ تخیّل اور نادر حقیقت نگاری کا کمال ہے - دولت اور افلاس کے موضوع پر طومار لکھے گئے ہیں - لیکن جو طرز اس ترکیب بند میں اختیار کی گئی ہے اور جس خوبی سے موعظت کا کنایہ اس نظم میں پایا جاتا ہے - تعریف سے مستغنی ہے - تمام نوع انساں کو طلب زر کے اعتبار سے سات قسموں پر منقسم کیا ہے - ان طالبوں کی عرض معروض سننے کی ضرورت نہیں - کیونکہ دولت کی دیوی کے جواب ایسے ہیں - کہ ان میں سے نفس سوال اخذ کیا جا سکتا ہے - یہ نظم جناب کیفی کی ان نظموں میں سے ہے جو دنیا کی شاعری کی ذیل میں ممتاز جگہ لینے کی مستحق ہیں -

نوٹ

(۱) پہلا بند: - اس نوجوان کی طرف خطاب ہے جو ابھی سے امیر الامرا بنجانا چاہتا ہے -

(۲) دوسرا بند - اس کی طرف ہے - جو سخت پست ہمت اور کاہل الوجود ہے - چاہتا ہے کہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر دولت مل جائے -

(۳) تیسرا بند - اس شخص کی طرف ہے - جسے دولت ملی - اور رکھ نہ سکا -

(۴) چوتھا بند - اس کی طرف ہے - جسے دولت کی پروا ہی نہیں - اکثر عالم - شاعر اور فلسفی مالدار نہیں ہوتے -

(۵) پانچواں بند - لالچی کی طرف خطاب ہے - جو باوجود اہل دول ہونے کے مزید دولت کی طلب رکھتا ہے -

(۶) چھٹے بند میں کنجوس آدمی کی طرف خطاب ہے - جو کھائے نہ کھانے دے -

(۷) ساتویں بند - اس حق پسند کی طرف ہے جو دولت کا طالب ہے مگر اسکو اپنا خدا نہیں بنا لیتا اور اس کا مناسب استعمال کرتا ہے ⁂

بند نمبر ۱

تو میرے واسطے اس درجہ پریشاں کیوں ہے　　دور سے دیکھ کے صورت مری حیراں کیوں ہے
قول یہ یاد ہے کہ آمدی کے پیر شدی　　میرے ملنے کا ابھی سے تجھے ارماں کیوں ہے
دن کے کاموں میں لگا دل کہ سویرا ہے ابھی　　استراحت کا یہ پو پھٹتے ہی ساماں کیوں ہے
مجھ کو سمجھا ہے مگر منہ کا نوالا کوئی　　اتنا بیتاب تو اے بندۂ آساں کیوں ہے
چٹ سے ہاتھ آؤں گی تو جھٹ سے ٹسک جاؤنگی　　رنج و محنت سے تجسس کے گریزاں کیوں ہے
ٹھنڈے دل سے تو ذرا جھیل تو اے سوز فراق　　برق بیتاب سا تو شعلہ بداماں کیوں ہے
پہلے دامن تو وہ پیدا ہو سماؤں جس میں　　جوش وحشت میں عبث چاک گریباں کیوں ہے
کام ہے ٹھیک ہی وقت پہ جو ہوتا ہے　　اپنی تعجیل مزاجی سے پریشاں کیوں ہے
امتحاں میں نہیں منظور کہ ڈالوں تجھ کو　　صبر کر دم لے ذرا اتنا ہراساں کیوں ہے
دل نوازی ہے مری در خور ظرف طالب　　تو سوا اس سے مرے لطف کا خواہاں کیوں ہے

قابل اور اہل جب اے دوست تجھے پاؤنگی
بن بلائے ہی ترے پاس چلی آؤنگی

بند نمبر ۲

تو نے میرے لئے گر رنج اٹھایا ہوتا　　میرے الطاف کا سر پہ ترے سایا ہوتا
سر جھکائے رہا پیشانی کی تحریر پہ تو　　کبھی دریائے عرق اس پہ بہایا ہوتا
تجھ کو تدبیر سے پرہیز- سعی سے ہے گریز　　دل کبھی رنج و مشقت سے لگایا ہوتا
نیک تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے　　لوح دل پر کبھی یہ نقش بٹھایا ہوتا
بےگماں گوہر مقصود تجھے مل جاتا　　غوطہ محنت کے سمندر میں لگایا ہوتا
سبز البتہ تری کشت تمنا ہوتی　　خون گرم اپنا اگر اس میں کھپایا ہوتا
بن کے اکسیر ترے ہاتھ خود آ جاتی ہیں　　خاک میں آپ کو گر تو نے ملایا ہوتا
تگ و دو سے ہے گریزاں تو پہ خواہش ملیں　　فارغ البالی کا او نکامری پایا ہوتا
رہا آساں طلبی مفت بری کا لپکا　　ہاتھ سے کام کبھی کر کے دکھایا ہوتا

جستجو میری زِ خود رفتہ تجھے کر دیتی   شوق میرا جو ترے سر میں سمایا ہوتا

پاس پیاسے کے بھی نادان کنواں آتا ہے
بلکہ گر پڑ کے وہی آپ وہاں جاتا ہے

بند نمبر ۳

دلِ ناداں کو ترے میری تمنا کیوں ہے   مجھ سے پھر ملنے کا سر میں ترے سودا کیوں ہے
جب ترے پاس تھی - کی قدر نہ تو نے میری   اب تو منہ دیکھنے کو میرے ترستا کیوں ہے
دھکے دے کے نکالا تھا - کبھی یاد تو کر   اب وظیفہ مرا دن رات تو پڑھتا کیوں ہے
ٹھوکریں مار کے جب تو نے کیا خانہ بدر   اب مرے واسطے در در تو بھٹکتا کیوں ہے
کیوں کیا تھا مجھے غیر ملک کے حوالے تو نے   ایڑیاں اب مری خاطر تو رگڑتا کیوں ہے
ٹھیکری کے بھی برابر نہیں سمجھا مجھ کو   راگ اب مدح و ثنا کا مری گاتا کیوں ہے
یا تو وہ تھا کہ ذرا پاس ٹھہرنے نہ دیا   بیقرار اب تو مرے واسطے آتا کیوں ہے
کام برسوں کا تو کر بیٹھا ہے ختم اک دن میں   سرد مہری کا مری ذات سے شکوہ کیوں ہے
عزم و ہمت ہو ترے پاس تو میں دور نہیں   وقت کو گریہ و زاری میں گنواتا کیوں ہے

یہ تو مشکل ہے کہ پہلے کی طرح ہو دل صاف
کر بھی دیتی ہوں میں غفلت کا کبھی جرم معاف

بند نمبر ۴

پاس ترے نہیں ممکن مرا آنا ہرگز   میری وقعت کو نہ تو نے کبھی جانا ہرگز
کاغذی کیڑوں کا بیٹھا ہے ترے دل پر نقش   کارگر ہو نہ مرا رنگ جمانا ہرگز
دھن میں تو اپنی سدا مست رہا کرتا ہے   تو ہے بیگانہ - نہیں - میرا یگانا ہرگز
تیری تخئیل کا میداں ہے کبھی شعر و سخن   اس سے آساں نہیں دل تیرا اٹھانا ہرگز
تو ہے وہ شمع کہ گھر جس کا ہے فانوس خیال   سیر اس نور سے تو ہو نہ زمانا ہرگز
گنج معنی کو ہی تو زیست کا حاصل سمجھا   تیرے ہاں ہو نہ سکے میرا ٹھکانا ہرگز
تو در دولت بنا میری بہن کی جاگیر   ترے گھر میں نہیں ممکن مرا آنا ہرگز

تیری نظروں میں نہیں خاک بھی عزت میری
قابل قدمہوں ہیں۔ تو نے نہ مانا ہرگز

باغ دل کو ہے ترے ایک بہار اور خزاں
گوش دل سے نہ سنا میرا ترانا ہرگز

سلسلے دور کے رہتے ہیں ترے پیش نظر
حال تیرا نہ بنا اس کا نشانا ہرگز

کس لئے آؤں میں۔ آؤں بھی ترے پاس اگر
تو وہ مدہوش ہے جسکو نہیں آپے کی خبر

بند نمبر ۵

گو مرا لطف و کرم تجھ پہ رہا کرتا ہے
ذکر کیا شکر کا الٹا تو گلہ کرتا ہے

ہیں کبھی اور طرف رخ جو ذرا کرتی ہوں
ایک کانٹا سا ترے دل میں چبھا کرتا ہے

تو نے چاہا سو ملا۔ تو نے جو مانگا پایا
کس لئے دہر میں ہنگامہ بپا کرتا ہے

میں ہوں موجود ترے پاس مگر اس پہ بھی
دشمنوں کی مرے دن رات دعا کرتا ہے

ابر رحمت کی طرح گھر پہ ترے چھائی ہوں
پیچھے پیچھے مرے پھر کیوں تو پھرا کرتا ہے

یاد رکھ اس سے کھٹک جاتی ہوں میں جی میری
قدر بڑھ کر مرے منصب سے کیا کرتا ہے

شکر کا کام ہیں لا اسکو جو ملتا ہے تجھے
ماسوا کے لئے کیوں اتنا کھپا کرتا ہے

تیری وافر طلبی زہر ہے تیرے حق میں
دیکھ بد ہضمی سے پر خور مرا کرتا ہے

ہنیں مفقود کی۔ موجود کی ہے تجھ کو تلاش
کیا ہے سودائی ذرا سوچ تو کیا کرتا ہے

تنا تی اور قناعت نہیں طینت میں تری
جتنا ملتا ہے طلب اور سوا کرتا ہے

تجھ کو درکار ہے جو چیز وہ ہے تیرے پاس
پھر تو کیوں رہتا ہے مضطر تجھے کیا ہے وسواس

بند نمبر ۶

پڑ گئی ہیں تو مصیبت میں ترے پاس آ کر
سنگدل ایسا ہے تو! اس کی مجھے تھی نہ خبر

جی گھٹا جاتا ہے اتنا تو نہ کر ناک میں دم
ذرا کھانے دے ہوا جانے دے مجھ کو باہر

سانس نالوں میں یہ کیوں بند کیا ہے ظالم
میرا عاشق تو بنا تھا کہ بنا تھا جیلر

تو نے مٹی میں ملایا ہے مرا حسن و شباب
زنگ ہے چھایا ہوا۔ آئینہ خوبی پر

یہ قفس آہنی - یہ طوق - یہ زنجیریں ہیں
واہ کیا گھر ہے مرا ! کیسے ہیں میرے زیور

تو نے اتنا جو ستایا ہے تو لے اسکا سراپ
ظلم جو مجھ پہ کئے انکے اُٹھا اب تو ثمر

یاد رکھ مجھ کو ستا کر نہ رہا کوئی سکھی
کور دل حال پہ اپنے تو ذرا ڈال نظر

عیش کیا ؟ سمجھا ہے لابد کو بھی تو فاضل
کیوں نہ آرام سے پرہیز ہو - راحت سے حذر

پیٹ بھر روٹی جو مل جائے تو پھر ہیں جھوٹی
آدمیت کی نہ پوشاک کبھی ہو تن پر

رات کی نیند اُڑے دن کا ہو آرام حرام
ظلمت بخت سے تیرہ ہو ترا شام و سحر

میں ہوں آزاد منش مجھ کو کریگا کیا قید
بن گیا دام کا ناداں تو خود اپنے صید

بند نمبر ۷

گرچہ دل مجھ سے بصد شوق لگایا تو نے
اور فرضوں کو بھی اپنے نہ بھلایا تو نے

تو نے بیقدری سے اوروں کی مری قدر نہ کی
یوں مرے دل میں ہے گھر اپنا بسایا تو نے

عشق تیرا ہے غرض اور خودی سے بالا
فرض کو سر پہ غرض کے ہی بٹھایا تو نے

ہے تری چاہ بری نفس کی تحریکوں سے
اس لئے مجھ پہ ہے رنگ اپنا جمایا تو نے

قید بھی مجھ کو کیا ہے تو ہے آزادی
کاٹ کر پر مجھے عالم میں اڑایا تو نے

آنکھ سے مجھ کو گرایا نہ بٹھایا سر پر
میرے رتبہ کو گھٹایا - نہ بڑھایا تو نے

آگے غیروں کے کبھی لا کے مجھے بٹھلایا
اور اپنوں سے کبھی پردہ کرایا تو نے

کبھی سایہ سا مرے پیچھے پھرا ہے برسوں
التجا پر بھی کبھی منہ نہ لگایا تو نے

تیرے ہاں جائے مناسب پہ ہیں عیش و محنت
گھر کو میزان حقیقت ہے بنایا تو نے

اعتدال اور رہا دھرم پہ قایم ترا دل
نہ کبھی حد سے قدم اپنا بڑھایا تو نے

عہد میرا ہے کہ میں تجھ سے نہ منہ موڑونگی
رشتہ انس جو باندھا نہ اُسے توڑونگی

ہندی مُناجات

(دسمبر ۱۹۲۱ء)
کشمیر میں ایک اعلیٰ عہدیدار کی فرمائش پر یہ مناجات لکھی گئی

سرو ویاپی اور انادی تم ہو انترجامی
تُمرے سرن آیا ہے پتاجی یہ مورکھ کھلکامی

تم نے اپنے دینن کے بند ھو بنتی کبھی نہ پھیری — آسا ہے تم گرھن کروگے پرارتھنا یہ میری
پرم پتا میرے رستے ہیں گھر کر آئی اندھیری — جاؤں جدھر کو وہیں رکاوٹ ملتی ہے بہتیری
راہ باٹ کے گیان دیئے سے اندھکار کھو سوامی — سرو ویاپی اور انادی تم ہو انترجامی
تُمرے سرن آیا ہے پتاجی یہ مورکھ کھلکامی

چھائی ہیں اگیان کی آکر چاروں اور گھٹائیں — من لنتھر ہے اُٹھتی رہتیں نئی نئی شنکائیں
کام کرودھ اور لوبھ موہ ہیں گھیرے داہنے بائیں — اہنکار نے بھر رکھی ہیں میرے سر میں ہوائیں
تجھ کرپا بن کیسے ہوں میں موکش بھون کا گامی — سرو ویاپی اور انادی تم ہو انترجامی
تُمرے سرن آیا ہے پتاجی یہ مورکھ کھلکامی

راہ کٹھن ہٹ مار بہت ہے کام بہت ہی بھاری — تیرے بنا ہے پریم کے ساگر کون بنے ہتکاری
کرو سہایتا اے کرپاندھ اس بپتا میں ہماری — سدا ترے گن گائے کروں میں تجھ پر جاؤں واری
کبھی نہ چھوڑوں دوار کی تیرے سیوا اور غلامی — سرو ویاپی اور انادی تم ہو انترجامی
تُمرے سرن آیا ہے پتاجی یہ مورکھ کھلکامی

دے شردھا مجھ کو تو ایسی سدا ترے گن گاؤں — آگیا پر تیری تن من سے اپنا سیس نواؤں
تجھے سراؤں مہما گاؤں انہد راگ بجاؤں — جپ کر نام پوتر تیرا مکتی پد کو پاؤں
دھنیہ دھنیہ پربھو جی میرے تم ہو جگ کے سوامی — سرو ویاپی اور انادی تم ہو انترجامی
تُمرے سرن آیا ہے پتاجی یہ مورکھ کھلکامی

دورِ سوم

۱۹۰۰ء سے ۱۹۲۰ء تک

بسنت کی خبر

۵ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء

(یہ نظم غلطی سے پہلے دور میں درج ہونے سے رہ گئی تھی)

دشت بنے ہیں گلستاں کھیت ہیں کشت زعفراں
اُٹھتی ہے آنکھ جس طرف خلد نگاہ ہے سماں
آج ہوئی ہے کائنات فیض بہار سے جواں
گل ہے کھلائی کیا بسنت
زر ہے لٹائی کیا بسنت

باغ نیا ہے بن نیا گُل کا ہے پیرہن نیا
بتیوں کی پھبن نئی پھول کا بانکپن نیا
ہر کہیں ہے فضا نئی ہے فلک کہن نیا
کیسی ہے جانفزا بسنت
کیسی ہے دلربا بسنت

نشو و نما کا ذکر کیا ہو گیا ہر شجر نیا
برگ نئے ہیں گُل نئے رنگ ہی سب بدل گیا
چہرۂ زمہریر پر نکلا ہے خطِ استوا
شان سے آئی ہے بسنت
دہر پہ چھائی ہے بسنت

پھول ہے ساغرِ شراب غنچہ ہے غمزۂ حجاب
رُوئے زمیں پہ ہر کہیں لنڈھی ہے حسن کی شراب
حُسن ہے اور فروغِ حُسن کون و مکان پہ ہے شباب

مایۂ ناز ہے بسنت
حسن نواز ہے بسنت

دامن دشت و کوہسار — حسن سے بھر گئی بہار
کیوں نہ دلوں کو چھین لے — شاہد گل کا یہ نکھار
مہر ہے ذرّہ ذرّہ آج — قطرہ ہے نافۂ تتار

طرّۂ حور ہے بسنت
رو کش طور ہے بسنت

لو وہ بسنت آ گئی — قدرت حق دکھا گئی
آنکھوں میں بس گئی بسنت — دل کی کلی کھلا گئی
راغ کو باغ۔ باغ کو — رشک ارم بنا گئی

حور ہے اور پری بسنت
کیسی ہری بھری بسنت

سن چکے یہ تو سب مگر — غور کرو تو لحظہ بھر
ہوتے ہو باغ باغ تم — رنگ بسنت دیکھ کر
گھر کا ہے اپنے حال کیا؟ — کچھ ہے بسنت کی خبر

دیکھ رہے تو ہو بسنت
سن لو سنائے جو بسنت

آئی یہاں ہیں آئے سال — کر گئی خلق کو نہال
کر دیا ان کو سربلند — تھے جو خزاں کے پائمال
ہندیوں کا مگر رہا — ویسا ہی تنگ خستہ حال

تم وہی۔ ہیں وہی بسنت
رکھتی نہیں لگی بسنت

کہتی ہوں میں یہ بے درنگ — ہو گئے دل تمہارے سنگ
نشۂ جہل میں ہو مست — سر میں حسد کی ہے ترنگ
پہنے ہو کیسری لباس — دل کا مگر سیہ ہے رنگ

شرم دلاتی ہے بسنت
صاف ستاتی ہے بسنت

دور ہوں یہ کدھ ھنگیاں — چھوڑ دو یہ خانہ جنگیاں
ایک صدف کے ہو گہر — کس لئے پھر دو رنگیاں
دور ہوں متنگدستیاں — دل کی مٹیں جو تنگیاں

ایسی پھر آئے گی بسنت
آکے نہ جائے گی بسنت

فغان عاشق

(لاہور۔ ستمبر ۱۹۱۹ء)

یہ محبت کی سزائیں ہمیں دی جاتی ہیں — جو جفائیں نہ کبھی کی تھیں وہ کی جاتی ہیں
چپ میں اقبال خطا۔ بولے تو گستاخی — ان کی باتیں تو اٹھائی نہ دھری جاتی ہیں
سانس تک کی تو اجازت نہیں کیا ذکر فغاں — آہیں مظلوموں کی سینوں میں گھٹی جاتی ہیں
آنکھیں دکھلاؤ نہ عشاق رضا جو کو صنم — برچھیاں کیوں یہ غزالوں پہ تنی جاتی ہیں
کوئی زخمی۔ کوئی بیجاں۔ کوئی بسمل ہے یہاں — سیفیاں کس پہ یہ سفاک پڑھی جاتی ہیں
ان کا کیا ذکر وہ جو کچھ بھی کریں تھوڑا ہے — سنسنا اٹھتا ہوں باتیں وہ سنی جاتی ہیں
پوچھتا مجھ سے کوئی تیری ادا دل کا خواں — تیر و نشتر کی طرح دل میں چبھی جاتی ہیں
جرم الفت پہ وہ اغیار کو لاتے ہیں گواہ — چالیں ایک سے بڑھ چڑھ کے چلی جاتی ہیں
عشق کا جرم ہی کیا قتل کی خاطر کم تھا — تہمتیں روز نئی کیوں یہ گھڑی جاتی ہیں
دل قید خم گیسو پہ اذیت کیوں ہے — کس لئے مشکیں اسیروں کی کسی جاتی ہیں
غیر سے کرتے ہیں تضحیک وہ جب عاشق کی — برچھیاں سی مرے سینے میں چبھی جاتی ہیں
کیا کریں ان سے رقیبوں کی خباثت کا گلہ — تیغیں ابروؤں کی آنکھ سے کھنچی جاتی ہیں
قول سے کون پھرا۔ ظلم سے کب منہ پھیرا — کیوں نگاہیں تری برگشتہ ہوئی جاتی ہیں

سُن کے سب حال رقیبوں کو یہ قضیہ سونپا
چٹکیاں گھُس کے کلیجے میں یہ لی جاتی ہیں

غیر پر لُطف وکرم ہم پہ ستم ہوتے ہیں
سختیاں۔ کون ہے جس سے یہ سہی جاتی ہیں

اپنی بن بن کے ہر اک بات بگڑ جاتی ہے۔
باتیں بگڑی ہوئی اوروں کی بنی جاتی ہیں

تہمتیں رکھتی ہے تجھ پر جو خدا کی مخلوق
نہ کہی جاتی ہیں مجھ سے نہ سُنی جاتی ہیں

دیکھ ناداں تو عشّاق کو اتنا نہ ستا
گرہیں پڑ گئیں جو دل میں کبھی جاتی ہیں؟

کیا ہُوا دار پہ کھینچے جو ہزاروں منصور
لاکھ ہیں کہنے کی باتیں تو کہی جاتی ہیں

دُور گلزار سے بُلبل کو کیا قید تو کیا
الفتیں دل سے گلستاں کی کوئی جاتی ہیں

دیکھنا لائیگا کیا رنگ شہیدوں کا لہو
ندیاں خون کی گردوں پہ چڑھی جاتی ہیں

جان جانے کا نہیں رنج۔ مگر یہ غم ہے
حسرتیں دل ہی میں سب دل کی رہی جاتی ہیں

عمر بھر دل میں تمنائیں جو پالیں ہم نے
اپنے ساتھ آج وہ مٹی میں ملی جاتی ہیں

صرف تسلیم و رضا ہو کے یہ ثمرہ پایا
تہمتیں ہم پہ زمانے کی تھپی جاتی ہیں

حال عشّاق پہ جتنا ہو تاسف کم ہے
اب وفائیں بھی خطاؤں میں گنی جاتی ہیں

ہجر اور صدمۂ ہجراں کا الم کیا کیفی
عمر کے ساتھ یہ گھڑیاں بھی کٹی جاتی ہیں

نیا زمانہ

یہ نظم ۳ر مارچ سنہ ۱۹۱۸ء کو کہی گئی۔ جو اُس وقت عہد موجودہ کا صحیح فوٹو ہے۔

پیدا ہوئے ہیں دشمنِ ایماں نئے نئے
ہندو نئے نئے ہیں مُسلماں نئے نئے

دیدوں پہ تازہ تازہ چڑھاتے ہیں حاشیے
گھڑتے ہیں لوگ معنیٔ قُرآں نئے نئے

اب کافر کتابی ہیں اہلِ کتاب بھی
فتوے عجیب اور ہیں فرماں نئے نئے

انساں تو کیا خدا کے بھی سجدے سے عار ہے
ہیں چودھویں صدی کے یہ شیطاں نئے نئے

کوثر کے اب خیال میں کچھ بھی مزا نہیں
چشمے نکالے خُلد میں رضواں نئے نئے

سالوس ہے وہی اور جھوٹی ہیں ان کے نام
بندھتے ہیں اہلِ دل پہ یہ بہتاں نئے نئے

مغرب کے فیلسوفوں کے قربان جائیے
بندر بنائے صورت انسان نئے نئے

گھر اپنا ایک دل میں بھی تم سے نہ بن سکا
ہاں کیا ہوا بنائے جو ایوان نئے نئے

ہو اتفاق شیخ و برہمن میں کس طرح
پیدا ہیں اختلاف کے سامان نئے نئے

تھل بیڑا نوح کی بھی نہ کشتی کا لگ سکے
کلجگ میں اٹھ رہے ہیں یہ طوفان نئے نئے

چولا بدل دے کایا پلٹ ہو کے کیسے گُل
گاتی ہے راگ بلبل بستان نئے نئے

جو خال تھا وہ بڑھ کے مسا ہو رہا ہے اب
لاتی ہے رنگ زلف پریشان نئے نئے

ملی حقوق پر ہے فلاح وطن نثار
لوگوں کو خوب ہوتے ہیں وجدان نئے نئے

سودا ہے سر میں آنکھوں میں چھائی ہے خیرگی
ہم دیکھتے ہیں خواب پریشان نئے نئے

صادق نہیں ہے عشق نہ الفت ہے بےغرض
دعوے نہیں یہ آپکو شایاں نئے نئے

سودائی ہے کوئی تو کوئی ست جگی نژاد
اس گھر میں گھس کے بیٹھے ہیں مہمان نئے نئے

جتنے پڑھے نفاق وحسد اس قدر بڑھے
تعلیم کے یہ ہم پہ ہیں احسان نئے نئے

ان کی طرف کسی کی توجہ ذرا نہیں
کھلتے ہیں جو ترقی کے میدان نئے نئے

خال سیہ سے زینت حسن صبیح ہے
بت سیکھیں دلفریبی کے عنوان نئے نئے

چکر کہاں یہ جا کے ٹھہرتا ہے دیکھئے
لاتی ہے رنگ گردش دوران نئے نئے

برگشتہ ہے جو زلف تو ہے پرشکن جبیں
عشاق کی ہیں جان کو خلجان نئے نئے

کوشش یہ ہو رہی ہے سوا مرد انہیں بنائیں
پیدا ہوئے ہیں حامئے نسواں نئے نئے

گانے میں لڑکے۔ لڑکیاں ورزش میں برتر ہیں
تعلیم کے ہیں کار نمایاں نئے نئے

زور آزمائیوں کے ہیں مجرے سٹیج پر
رستم نئے نئے ہیں نریمان نئے نئے

ان کے نکالنے کی بھی تدبیر کیجئے
دل میں جو پال رکھے ہیں ارمان نئے نئے

اہل زباں کا سرد ہے بازار ان دنوں
شاعر نئے نئے ہیں سخندان نئے نئے

ٹھہرا ہے حصر ملت و قوم اب زبان پر
تہذیب کے یہ پھیلے ہیں ارکان نئے نئے

یاران رفتہ کی کہیں اب کس سے داستاں
دنیا نئی ہے اور ہیں انساں نئے نئے

کیفی بہت نہ بزم سخن میں تو بڑھ کے بول
نقاد بن کے بیٹھے ہیں سحباں نئے نئے

بن باس

۲۴ر ستمبر سنہ ۱۹۱۶ء

لکھتے ہیں یہ مورّخ ذی علم و باخبر
صدیوں شہود حضرت عیسےٰ سے پیشتر
جب رُخ کیا تھا آریوں نے سندھ کے اِدھر
پنجاب اور شمال تھا جب ان کا مستقر
تب آریوں کی حد لب دریائے گنگ تھی
اور دیسی ہندیوں سے شب و روز جنگ تھی

ڈنڈک کے جنگلوں کے گھنوں بن کہیں کہیں
رہنے کے اور بونے کے قابل جو تھی زمیں
بن کٹیاں آریوں کی وہاں خال خال تھیں
ان کے علاوہ بستیوں کا کچھ پتا نہیں
تھے دُور دُور تک وہاں جنگل کھڑے ہوئے
قدرت کے تھے خزانے نکمّے پڑے ہوئے

حکم پدر سے گھر سے چلے جب جناب رام
تدبیر اور عزم نے آکر کیا سلام
اور حبِّ قوم نے بہ ادب سے کیا کلام
نکلے ہی ہیں جو گھر سے تو کچھ کر کے آئیں کام
وحشی ہیں اہل ملک انہیں انساں بنایئے
تہذیب اور دھرم کی راہیں بتایئے

تاریخ دیکھیں آپ جو اس چودہ سال کی
وقعت دوچند دل میں ہو اس نونہال کی
ہمدردی- الفت اور تھی ہمت کمال کی
تدبیر وہ- رسائی نہ جس تک خیال کی
دو بھائیوں نے لاکھوں کو اپنا بنالیا
لنکا تک اپنے نام کا ڈنکا بجا دیا

کیونکر یہ کامیابیاں حاصل ہوئی تمام
کس طرح غیر ملک سے لوٹے وہ بامرام
کیونکر انہیں سے رام نے جا کر لئے وہ کام
بڑھ کر نہ جانور سے جنہیں سمجھے خاص و عام
اعجاز تھا نہ سحر تھا بس اتنی بات تھی
ہمدردی اور پریم کی جان اس کی ذات تھی

سمندر جھاگ

اپریل سنہ ۱۹۱۵ء

اپریل سنہ ۱۹۱۵ء میں جب آپ یورپ تشریف لے جا رہے تھے۔ بحیرہ قلزم میں جہاز پر شیا پر سمندر کی دلاویز کیفیت سے متاثر ہو کر یہ نظم ہوئی۔ جنہوں نے سمندر کا سفر کیا ہے۔ وہ اس کی پوری داد دے سکتے ہیں۔

دیکھنا بحر کا منظر ہے دل آرا کیسا ۔ نقشہ یکتائی کا سینے میں اتارا کیسا
اس سمندر میں جہاں تک بھی نظر جاتی ہے ۔ ایک کیفیت دلکش یہ نظر آتی ہے
کام کرتی ہے جہاں تک نگہ وحدت بیں ۔ کہیں نیرنگ کا کثرت میں نشاں تک بھی نہیں
اپنی یک رنگی پہ نازاں تھا بہت چرخ کبود ۔ اس سے ہمرنگی میں کب کم ہے سمندر کا وجود
سر پہ تانے ہے جو خیمہ فلک نیلی فام ۔ فرش یکسر ہے کئے بحر کبودی اندام
لگے بادل کے فلک پر ہیں یہاں اور وہاں ۔ ہر کہیں جھاگ کے گچھے ہیں سمندر پہ رواں
جس طرف دیکھو یہی ایک سماں چھایا ہے ۔ رنگ نیرنگیٔ عالم نے نیا پایا ہے
تذکرہ وحدت و کثرت کا تو سب سنتے ہیں ۔ صوفیہ وجد میں جس کشف پہ سر دھنتے ہیں
منطقی لاکھ کہے اس کی ہے پانی پہ بنا ۔ عالم آب ثبوت قطعی ہے اس کا

جو بہار اس کف یم کی ہے اسے کیا کہئے ۔ وصف سے اس کے ہے کم کتنا ہی اچھا کہئے
کیا دلاویز سمندر کا یہ نظارہ ہے ۔ آب حیواں کا یہ ظلمات میں فوارہ ہے
آسماں نے بھی مگر جوش خوشی میں آ کر ۔ موتی برسائے ہیں یہ بحر کی ہمرنگی پر
بحر دے تھپکیاں اور یوں جھلے پنکھا جو نسیم ۔ لاڈ میں آ کے نہ کیوں سر چڑھیں یہ دُرِّ یتیم
خوشنما جھاگ ہیں کیا بر سر بحر مواج ۔ چوٹیوں پر ہیں پہاڑوں کی مگر برف کے تاج
حسن رعنائی میں کب زرد حنا سے کم ہیں ۔ کب چمک میں ید بیضا کی ضیا سے کم ہیں
دھند کا ابر سے پڑتی ہے یہ امرت کی پھوار ۔ یا شب ہجر میں ہے بوئے وصال دلدار
شب تاریک میں اٹکھیلیاں کرتے ہیں شہاب ۔ ابل اٹھی ہے دل بحر سے سیل سیماب

شمع رخشاں ہے زمرد کے لگن میں گویا
داغ الفت کا یہ سینے سے دھواں ہے اٹھا
سانپ چڑھ بیٹھے زمرد کے پہاڑوں پہ مگر
من اگل کر انہیں آیا نہیں پھر خاک نظر
پشت پر فیل کی ہے نقرئی ہودے کی بہار
یا ہوا خوشہ پہ وہیں سرگرداں پہ نثار
درونداں کی چمک مسی ملے ہونٹوں پر
تیغ مختار ہے یا شمر کے سر کے اوپر
یا ہے مینے کی انگوٹھی میں یہ ہیرے کی ڈلک
یا ہے یہ چشم سیہ مست پرافشاں کی چمک
کان نیلم سے نکل آئے ہیں یا گوہر تر
یا کسی کے موئے مشکیں پہ جھمکتا جھومر
موج کے سر سے اترنے میں بھی ہی اسکا وقار
لٹکے گردن سے ملیچوں کی مدن بان کے ہار
آبشاریں ہیں یہ ٹیلوں کے سروں پر کیسی
الٹی گنگا کے بہانے کی یہ خاصی سوجھی
بخت روشن کا درن کے ہو نہ کیوں سر سہرا
لکشمی باندھے جو لوں اس کے خود آ کر سہرا
نکلے ہیں پیچ و خم موج سے یوں یہ موجی
جیسے بھاگیرتی نکلی تھی جٹا سے شو کی
نئے انداز سے کرتے ہیں رہس یا گھنشام
تاج گوہر ہے جہاں مور مکٹ کا تھا مقام
موتیوں مانگ بھری آئی عروس نیلاب
آیا یوسف تا سر شام زلیخا کو خواب
شائق رزم ہے نیلم پری کس خوبی سے
مشق جلبا نک کی ہوتی ہے خوش اسلوبی سے
دیکھنا سر پہ پہاڑوں کے ہیں یا دل جھمکے
یا ہیں یہ موتیوں کے پار بتی کے جھمکے۔
کہروا ناچتی ہیں بحر کی چنچل پریاں
مسی مالیدہ لبوں پر ہے تبسم رقصاں
بجلیاں کوندتی ہیں ابر کے سر پر چڑھ کر
پریاں اٹھکھیلیاں کرتی ہیں سر قاف مگر
موج اس کو نہ کہو ناقۂ لیلیٰ ہے یہ
یہ نہیں جھاگ کہ محمل کا جھمکڑا ہے یہ
ابر سے کیا یہ سر کوہ نظر آتے ہیں
چلتے چلتے وہ تھکے ہیں یہاں سستاتے ہیں
کیوں نہ ہو ماہیئے بے آب کی حالت دل کی
جلتر نگ ایسا چھڑا تان نہ جس کی ٹوٹی

دیدنی اصل میں کیفی ہے سمندر کی بہار
گوہر نظم کہاں تک تو کرے اس پہ نثار

گُورُو گوبند سنگھ جی

۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۱۵ء

رُو بہ تغییر جہاں کا رہا نقشا کیسا
رنگ بدلا کیا ہر دور میں کیسا کیسا

گیان کی رَو نے کبھی دھر لیا آ کے سب کو
نقش عرفان حقیقت نے جمایا کیسا

دُھن لگی سر کو زمانے کے کبھی بھگتی کی
ساغرِ قلب مئے عشق سے چھلکا کیسا۔

ہو گیا ترک جو انسان کے دل پر حادی
جیتے جی خلق کو مٹی میں ملایا کیسا۔

سکّہ بٹھلا گیا آ کر کبھی اپنا جو بلیک
بال کی کھال کبھی فرق دکھایا کیسا۔

الغرض دور زمانے میں نہ کیا کیا آئے
پُر تواریخ کا ان سے ہے سفینا کیسا۔

پر جو تلقین کیا دھرم گُرو صاحب نے
اُڑ گیا اس سے جہالت کا اندھیرا کیسا۔

فرض و ایثار کا بخشا جو گُرو نے ترکہ
اس کا آدھا نہ کہیں پاؤ گے اتنا کیسا۔

وہ تقدس وہ محبت وہ جلادت وہ جلال
کر گیا حال وہ مخلوق کے دل کا کیسا۔

پھونک دی ایک نئی رُوح دلِ مردہ میں
تھا مسیحائی کا انداز نرالا کیسا۔

ہند میں دو ہی تو گوبند ہوئے ہیں کیفی
معتقد ان کا ہے ہر فرد زمانا کیسا

جُدائی ناممکن

سنہ ۱۹۱۵ء

سردار امراؤ سنگھ صاحب مجیٹھیہ کی فرمائش پر انگریزی سے ترجمہ بالتصرف کیا گیا۔ جو اصل میں شیلے نے سنسکرت سے لیا تھا۔

سوتے دریاؤں سے مل جاتے ہیں سب آ آ کر
اور پھر بحر سے مل جاتے ہیں دریا جا کر

نکہت غنچہ سے ملتی ہے صبا ناز کے ساتھ
اور ہوا نیز آ کے لپٹ جاتا ہے انداز کے ساتھ

بوئے گل بلبل پہ نغمہ کو سر دیتی ہے
قمری اب سرو کی قید اپنے گلے لیتی ہے۔

دور دور اب نظر آتے نہیں چاند اور چکور ‏— رعد سے ملتے ہیں جھنکار کی نسبت سے مور
کہربا کاہ سے آہن سے ملا مقناطیس ‏— پھول ہنس ہنس کے بناتا ہے عنادل کو جلیس
دور دیپک سے دکھائی نہیں دیتا ہے پتنگ ‏— گل سے لپٹے ہوئے آتے ہیں نظر لو اور رنگ
دیکھو گنٹھ جوڑ ہیں منجدھار میں چکوا چکوی ‏— عرصۂ دہر سے معدوم ہوئی ہے دوری
کوئی شے عالم تکوین میں نہیں ہے تنہا ‏— ایک کا ایک سے رشتہ ہے خدا نے باندھا

جب یہ قدرت کے ہے قانون کی تاکید کمال
پھر یہ ممکن ہی نہیں تجھ سے نہ میرا ہو وصال

شکوۂ شاہد

سنہ ۱۹۱۵ء

اردو میں سخن کا یہ بالکل نیا انداز ہے اب تک تو رونا دھونا اور گلہ شکوہ عشاق کا حصہ تھا۔ حضرت کیفی کی جدت آفرین طبیعت معشوق کو بھی اس میں شریک کرتی ہے۔

بن کے عاشق بھی تمہیں عشق سے ان بن ہے وہی ‏— دل تمہارا ہوس و حرص کا مخزن ہے وہی
حسن یوسف کی طرح جو سر بازار بکے ‏— کہتے ہیں حسن دل آزار ہی جوبن ہے وہی
کیا ضرورت کہ شبستان صنم کی ہو تلاش ‏— دل اگر صاف ہو دلدار کا مسکن ہے وہی
بت چھٹے مر کے رہی حور کی دھن حشر تلک ‏— حالت ان بوالہوسوں کی پس مردن ہے وہی
شکل اچھی کوئی دیکھی کہ گیا ہاتھ سے دل ‏— کیوں نہ ہو عاشق جانباز کا لچھن ہے وہی
تن بدن شمع کا جس شعلہ نے ڈالا ہے پھونک ‏— دل میں پروانہ کے کچھ پرتو افگن ہے وہی
چاک جس جوش جنوں نے کیا دامن گل کا ‏— دمکش نالۂ ہر بلبل گلشن ہے وہی
سرو کے پاؤں میں جو حلقۂ زنجیر ہے عشق ‏— باغ میں قمریوں کی زینت گردن ہے وہی

یہ محبت ہے تو کہتے ہیں عداوت کس کو ‏— طعن و تشنیع وہی نالہ و شیون ہے وہی
بد دلی آپ کی دکھلاتی ہے نت رنگ نئے ‏— نظر اپنی تو وہی۔ رخ وہی۔ چتون ہے وہی
رات دن تو تمہیں غیر اور رقیبوں کی ہے دھن ‏— اور کہے جاتے ہو۔ دل میں بت پرفن ہے وہی
کام کا کب ہے نیاز ایسا کہ ہو جس پہ ناز ‏— خاکساری میں بھی نخوت کی وہاں ٹھن ہے وہی

کیونکہ یار اپنا سمجھتے جو ہر اک سے لڑتا — ہو کسی کا جو عدو اپنا بھی دشمن ہے وہی
کوئی رسوا ہو - کوئی خوار ہو - کوئی بدنام — اپنے مطلب کا اک ان لوگوں میں سرطن ہے وہی
گھر سے نکلو جو کبھی سایہ کی مانند ہیں ساتھ — ورنہ ڈیوڑھی پہ بپا محشر شیون ہے وہی
عاشقی پیشہ ہیں - اور قیس کے سجادہ نشین — شور ان کا سر ہر کوچہ و برزن ہے وہی
ان کے ہاتھوں نہیں دن چین تو شب کو آرام — رات دن نالہ و آہ فلک افگن ہے وہی
دوست کے دوست کو دشمن ہی ہمیشہ سمجھے — حسد و رشک ہی دل میں ہے ان بن ہے وہی
حشر میں ہاتھ نہ اس تک کبھی پہنچے تیرا — حور کا جو کہ مصلا ہو یہ دامن ہے وہی

ہاں خبردار تم ان بوالہوسوں سے بچنا
دل نہ دے ان کو صد آفات سے ایمن ہے وہی

۱۴ر فروری سنہ ۱۹۱۰ء

تنگ آئے جو انسان کی بیداد گری سے — دل جا کے لگاؤ کسی حور اور پری سے
حیرت میں ہو نرگس ہو تو نالہ میں ہو بلبل — خارج سے نظر آتے ہو نوع بشری سے
خون ایک جہاں کا مرے سر لادتے ہو تم — واقف نہیں کیا تم میری نازک کمری سے
بالوں کی ہے تمثیل درختوں کی جٹا سے — تشبیہ کبھی چال کی ہے کبک دری سے
معدوم دہن ہے تو کمر ہے کبھی غائب — تلوار ہے ابرو تو نگہ بڑھ کے سری سے
قتل اس نے جو لشکر کئے شہر اس نے اجاڑے — دب کر صف مژگاں نہ رہی فوج جری سے
یہ بے دہنی ہے مری جرأت ہوئی تم کو — جو چاہا سو کہہ ڈالا ہر اک رہگزری سے
یہ آپ کا ہے حسن مذاق اور لیاقت — معذور بھی رکھیں نہیں اس مدح گری سے
بدنام بھی گر ہوں گے - تو کیا نام نہ ہوگا — مطلب انہیں ایک اپنی ہے بس ناموری سے
دل دیکے ملاقات کی پھر کیوں ہے تمنا — ہے کام حسینوں کو اگر مفت بری سے
انسان کو پتھر ہی سمجھتے نہ خدا تم — ہاں کام ذرا لیتے اگر دیدہ دری سے
دل آپ کا تھا لاکھ کا پر صاف نہیں تھا — بےفکر رہو اپنے وہ داغ جگری سے
کیا فرق تھا ہم تم میں - مگر کون یہ دیکھے — بدنام ہم انگلی ہوئے کوتہ نظری سے
رستہ کی خبر اور نہ منزل کا پتا ہے — کیا فائدہ اس بے سر و پا بے سپری سے

جب تاب نظارہ نہیں آنکھوں کو تمہاری | حاصل حرم و دیر کی پھر پردہ دری سے
جب جانتے ہو ہم نہیں ہو سکتے تمہارے | پھر فائدہ اس بیہودہ شوریدہ سری سے

کیفی ذرا مہنہ آئینہ میں جا کے تو دیکھو
یہ حوصلے ہیں اور ہوا انسان ذری سے

سیاہ و سفید

۱۹۱۵ء

مسٹر ہربرٹ مینز آپ کے پرانے دوست ہیں وہ فیروزپور میں ججی کے دفتر کے صدر تھے۔ جناب کیفی ان سے ملنے گئے جس وقت پہنچے وہاں یہ معاملہ پیش تھا کہ گھر میں دودھ کیلئے بھینس لی جائے یا گائے۔ بچے گائے کے حق میں تھے اور ان کی والدہ بھینس کے حق میں۔ حضرت کو حکم قرار دیا گیا۔ آپ نے وہیں یہ اشعار موزوں کر کے لڑکیوں سے پوچھا کہ شعر کیسے ہیں۔ انہوں نے بہت پسند کئے۔ آپ نے فرمایا تو اب بھینس لی جائے۔

کالا نہ کہو مجھ کو کہ میں شام برن ہوں
ہوں شام برن ہے مری آواز رسیلی
میں خال رخ فیض و افادت ہوں سراسر
رنگت کے سبب سے۔ جو مجھے دیتے ہیں طعنے
ایسی ہی سیاہی سے اگر ان کو ہے نفرت
ہے سیمتنی گائے کی مرغوب سبھی کو
زردی سی ہے یرقان کی ان چیزوں پہ چھائی
ہے دودھ کہ ہیں نقرۂ سیال کی دھاریں
میں بخشتی ہوں جسم کو سرخی و سفیدی
ہوں رنگ میں کالی مگر اجلے ہیں مرے کام
ہو عاشق اوصاف کے تم والہ و شیدا
میں آنکھ کی پتلی ہوں میں ہی لالہ کا من ہوں
صدقہ مرے سر بال پہ ہے کاکل لیلی
گھی دودھ سے مکھن سے میں بھر دیتی ہوں گھر بھر
کیوں مو چنے سے چنتے ہیں سر میں سے وہ دھولے
تو پیری میں کیوں ہوتی ہے آئینہ سے وحشت
دیکھو تو ذرا اس کے دہی۔ دودھ کو گھی کو
دیتا ہے یہاں نور حقیقت کا دکھائی
بھاگیرتی کو شو کی جٹا سے جو اتاریں
کیا ہے مرے پنڈے پہ جو چھائی ہے سیاہی
ہوں میں نہ سیہ کار اگرچہ ہوں سیہ فام
آنکھوں میں نہیں نور حقیقت کا ہویدا

تم ظاہری اوصاف کے صورت کے ہو مفتوں
میں باطنی اوصاف کی گنجینہ بنی ہوں

گورو نانک صاحب کا جنم

۷ ر اکتوبر سنہ ۱۹۱۴ء

کاتک کے مہینے میں جو پونوں کی شب آئی ‏ فطرت کی کھلی آنکھ ضیا خلق نے پائی
تڑکا ہوا نکہت کا خوشی دہر پہ چھائی ‏ خلقت کو ملی نیند ضلالت سے رہائی

ہے روح ملائک بھی اسی رات کے صدقے
اس رات کے اور اس کی کرامات کے صدقے

یہ رات ہے یا حلّ خم گیسوئے ہستی ‏ یا خال رخ روشن اخلاص پرستی
اس رات ہے کیا روشنی گردوں سے برستی ‏ ہے صبح ازل اس کے تقدس کو ترستی

یہ رات سعادت میں ہے نوروز سے بڑھکر
ہے تیج میں مہر جہاں افروز سے بڑھکر

یہ رات ہے یا سرمۂ چشمان بصیرت ‏ یا مردمک دیدۂ عرفان و حقیقت
شب ہے کہ سویدائے دل عشق و محبت ‏ یہ رات ہے افشان جبین رخ طاعت

تارے نہیں چھٹکے ہوئے ہیں آج فلک پر
لاکھ آنکھ سے تکتا ہے سما کچھ تو سمک پر

تکتے ہیں یہ کس کو سر افلاک سے تارے ‏ سیّارے کسے ڈھونڈتے پھرتے ہیں یہ سارے
کیوں ہے ہمہ تن چشم قمر شوق کے مارے ‏ کیوں ٹوٹ کے گرتے ہیں زمیں پر یہ ستارے

سکّان فلک کیوں گرے پڑتے ہیں زمیں پر
آمد کی خبر کس کی اُڑی چرخ بریں پر

زلف سیہ لیلیٰ شب تا کمر آئی ‏ نوروز سعادت کی جہاں بیں سحر آئی
اک روشنی اوپر سے اترتی نظر آئی ‏ آکاش سے سب کو یہ سہانی خبر آئی

اب ہے وہ نکلنے کو زمیں پر مہ کامل
تا حشر چمک جس کی نہ ہوگی کبھی زائل

اے اہلِ زمیں ہو گئیں صدیاں تمہیں سوئے — گو خواب میں اُٹھے بھی۔ چلے۔ گر پڑے روئے
یوں کوئی نہ بیداری و ہشیاری کو کھوئے — جب پاؤں تھکے ہاتھ رہِ راست سے دھوئے

ہاں جاگو اکہ اب بھاگ بھی جاگے ہیں تمہارے
بدبختی کے جو دن تھے گئے بیت وہ سارے"

جوبن پہ تھا چاند اور ستاروں کا نظارہ — بھیگی تھی ابھی رات جہاں سوتا تھا سارا
تھا دُور دو اک منزل ابھی صبح کا تارا — ننکانہ میں جاگ اُٹھے سب اور سب نے پکارا

"کیا گھر سے یہ کالو کے نکلتا ہے اُجالا
کیوں ڈالا ہے گرد اس کے مہ و مہر نے ہالا"

لوگوں کو یہ حیرت تھی کہ اسرار یہ کیا ہے — کیوں مہتہ کا گھر مرکز سیّار بنا ہے۔
آکاش کا کیوں دھرتی پہ دربار لگا ہے — ننکانہ میں بیکنٹھ کا کیوں آج سما ہے۔

یہ حال تھا جو نانکی جی آئیں اچانک
فرمایا۔ جگ اُدّھار کو لو۔ آئے ہیں۔ نانک

ثابت یہ زمانے میں ہوا خلقِ خدا پر — کیا کیا گُرو مہراج کی تھے ذات میں جوہر
دنیا کو رہِ راست پہ وہ لائے ہیں کیونکر — کیا دُور تو ہّم کا تعصّب کا کیا شر

بھٹکی ہوئی پھرتی تھی جو گمراہ خُدائی
دینے لگا اب مسلکِ حق اسکو دکھائی

اے رہبرِ کامل یہ ہے سب فیض تمہارا — جو ہم کو ہوا شاہدِ برحق کا نظارا
بدعت پہ تباہی پہ تُلا دہر تھا سارا — بگڑے ہوئے جو دل تھے انہیں تم نے سنوارا

تلقین کیا ست دھرم و [illegible] کر
درشن دئے ست گُرو کے زمانے کو جگا کر

اس طرح کی تھی زندگیٔ پاک کی حالت — اب سنئے کہ جو واقعہ گذرا دمِ رحلت
ہونے لگی سب لوگوں میں یہ بحث یہ حجّت — تجہیز کی تکفین کی کیا کیجئے صورت

چادر کو جو سرکایا تو لاشہ نہ کہیں تھا
اک ڈھیر تھا پھولوں کا بس کچھ بھی نہیں تھا

جنگ عظیم اور ہندوستان

(۱۷ اگست ۱۹۱۴ء شملہ)

جنگ جرمن کے زمانے میں علامہ کیفی نے متعدد نظمیں، غزلیں اور عام پسند گیت وغیرہ لکھے ان میں اکثر "جنگی نظمیں" کے نام سے کتاب کی شکل میں کئی بار شائع ہوئے۔ کرنال کے ضلع میں خصوصی طور پر آپ کی نظمیں بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔ اور رنگروٹوں کی بھرتی میں ان سے بہت مدد ملی۔ جہاں آپ وار لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری تھے۔ اس مجموعے میں صرف چند نظمیں شامل کی گئی ہیں

اے طبع دکھا آج وہ تیزی وہ روانی　　بجلی کی بھی ہو خیرہ نظر شعلہ فشانی
کند اس سے حسینوں کی ہوں مژگان سنانی　　گرد اس سے ہو حسّاد کی تلوار کا پانی

چار آئینوں پہ آئینہ ہو تیری صفائی
خود بینوں کو تارے ابھی دے جائیں دکھلائی

اے توسن خامہ وہ دکھا گرمئے رفتار　　مانند آب سے مضمون کی ہو خنجر خونخوار
جو بات ہو وہ کاٹ میں ہو تیغ جفاکار　　ہو سرد غنیموں کی ابھی گرمئے بازار

جو آئے جھپٹ میں تری پامال ہو یکسر
ہو تیرا قدم دشمن بد کیش کے سر پر

کیا شان جلال آج یہ شمشیر قلم ہے　　قرطاس کے میدان میں نصرت کا علم ہے
خونریزی میں کلک دو زباں تیغ دو دم ہے　　کب نالِ قلم نال سے بندوق کی کم ہے۔

کلک دو زباں ہے کہ ہے تلوار علی کی
دو ہاتھ ہیں مختار کے گردن کو شقی کی

جو دائرہ یہ کھینچے وہ ہو چکر سُدرشن　　ہو اس کی کشش بھی کشش چلۂ ارجن
موسیٰ کا عصا ہو یہ پے ضرب اہرمن　　پیغام اجل اسکی صریر از پے دشمن

ٹھہرے کوئی یارب نہ مرے کلک کے آگے
جب اسکو اٹھاؤں تو عدو خوف سے بھاگے

مغرب سے یکایک یہ خبر ہند میں آئی — جرمن نے ہے یورپ میں قیامت اک اٹھائی
جنچتی نہیں اب نظروں میں کیزر کی خدائی — جھگڑا ہے اگر اس سے تو ہے اس سے لڑائی

یورپ میں نہ چھوڑا کوئی ہو جس سے نہ جھنجھٹ
ایسی بھی طبیعت نہ ہو انسان کی نٹ کھٹ

چھٹتے ہی دیا روس کو پیکار کا پیغام — اور کر دیا برسلز سے بھی جنگ کا اعلام
پیرس کی طرف رہ نہ سکا - بول دیا لام — روما کو اب اصرار سے شرکت کے ہیں احکام

جھگڑا ہے تو ہے سرویا کا آسٹریا سے
تم جس کی طرف چاہنا دل شوق سے ہوتے

لیکن سر کیزر میں خودی ایسی سمائی — دیتا نہیں اب اسکو خدا تک بھی دکھائی
کچھ عہد کی پیماں کی نہیں عہدہ برآئی — کمزور سمجھتا ہے۔ مگر ساری خدائی

اللہ رے یہ عربدجوئی! یہ اکڑ فوں!
یورپ کو مگر سمجھا ہے درماندہ و محزوں

ہو سکتیں بھلا شوخیاں کب تک یہ گوارا — ہفتوں رہی کوشش ہو بہم صلح و مدارا
جب آشتی و صلح سے دیکھا نہ گذارا — فوجوں کو کیا اپنے شہنشہ نے اشارا

خدام شہی کا یہ ہوا عزم جو بالجزم
آمادہ ہوئی فوج ظفر موج پئے رزم

برطانیہ اعظم نے جواب کھینچی ہے تلوار — رنگ اور ہی لانے کو ہے یہ عرصۂ پیکار
ہو جائیگا پانی نشہ جرمن کا وہ پندار — کچھ دن میں سنو گے ہوئی برلین پہ یلغار

اے زبدۂ شاہان جہاں خسرو قیصر
کیا گنتا ہے انگلینڈ کے توبحری و لشکر

یہ ہند جو تیرا ہے نہ دل سے وفادار — تیرے لئے لڑنے کو ہے سو جان سے تیار
ہے پیر و جواں ہند کا آمادۂ پیکار — ہو حکم تو بھیجیں ابھی وہ لشکر جرار

جرمن کی جو توپوں کے دھوئیں دم میں اڑا دے
اڑتے ہیں جو اوپر کو زمیں ان کو دکھا دے

اے شاہ یہ ہے عرض ہماری بہ سماجت — کُل ہند کے ہے دل میں بھرا جوشِ عقیدت
ہے اپنی تمنا کہ کریں شاہ کی خدمت — خدمت کو کمر بستہ ہے سب تیری رعیت
ہم تیرے پسینے پہ بہائیں گے لہو کو
اور ہوش میں لے آئیں گے اس عربدہ جُو کو

انگریز جو نلسن ہے ہر اک اور ولنگٹن — رابرٹس سے کچنر سے اگر کانپتا ہے رن
اقبال سے تیرے یہاں بھیم اور ہیں ارجن — جنگاہ میں جو بیک اجل ہوں پے دشمن
انگلینڈ کی خاطر وہ ہیں سر دینے کو تیار
بیتاب ہیں خدمت کو سبھی پبلک و سردار

فرانس ہندوستانی فوج کا خیر مقدم کرتا ہے۔

(۷ ستمبر سنہ ۱۹۱۴ء)

کون آتے ہیں جو قلب زمیں کانپ رہا ہے — کیا قلب زمیں چرخ بریں کانپ رہا ہے
یورپ کا ہر ایک حصن حصین کانپ رہا ہے — وہ کون ہے رن میں جو نہیں کانپ رہا ہے
کیوں آج ہے لرزے میں سما اور سمک بھی
سجدے میں کماں جھک گیا کیوں تیر فلک بھی

کیوں عرصۂ حشر آج یہ میدان وغا ہے — کیوں صف میں غنیموں کی تلاطم سا بپا ہے
کیوں بم کی طرح قلب عدو آج پھٹا ہے — کیوں ہوش غبارے کی طرح پا بہ ہوا ہے
ہے شور یہ اعدا میں گئی ہاتھ سے بازی
لو سورما وہ ہند کے آتے ہیں وہ غازی

پیرس میں یہ ہر شخص کی جاری ہے زباں پر — رکھ لیں گے وہ جرمن کو ابھی نوک سناں پر
ایسے ہیں وہ جیوٹ کہ ابھی پہنچے نشاں پر — جرّار ہے فوج اور بھی ایسی ہے کہاں پر
چھا جائے گی اب چہرے پہ جرمن کے سیاہی
لو آ گئے وہ ہند کے جانباز سپاہی

کیا نور ظفر ان کے برستا ہے نشاں سے   بالا یہ جوانمردی و ہمت ہے بیاں سے
چُستی کا ہو وصف ان کی ادا کیونکہ زباں سے   دیکھے تو کوئی پہنچے کہاں آکے کہاں سے

بادل کی طرح اُٹھے ہیں طوفاں سے آئے
بجلی کی طرح چمکے گھٹا بن کے ہیں چھائے

تو آگئے مشرق کے وہ جنگی وہ دلاور   ذکر ان کی شجاعت کا ہے عالم کی زباں پر
جنگاہ سے لوٹے وہ ہمیشہ ہی مظفّر   سودان تھا وہ چین تھا۔ یا مصر کہ بربر

یلغار سے ان کی دِل بدخواہ گھٹے ہیں
جب بڑھ گئے وہ رن میں تو پیچھے نہ ہٹے ہیں

تیّار بہت ہیں مگر ایسے نہیں دیکھے   جیدار بہت ہیں مگر ایسے نہیں دیکھے
خونخوار بہت ہیں مگر ایسے نہیں دیکھے   جرّار بہت ہیں مگر ایسے نہیں دیکھے

بادل سا ہے چھایا ہُوا ان کے علموں سے
برلین کو اب روندینگے گھوڑوں کے سموں سے

یہ آگ کے برسانے ہیں۔ بجلی ہیں۔ قیامت   دنیا میں ہے مشہور بہت انکی شجاعت
کھاتی ہے قسم ان کے تہور کی جلادت   یہ جس پہ گرے آگئی اس ملک کی شامت

یورپ کی زباں پر یہ سخن عام ہے جاری
ایسے ہیں جرّی سو یہ ہے ایک ان میں سے بھاری

کانپا ہے کلیجہ دِل دشمن میں دہل ہے   جب سے تمہیں دیکھا ہے حواسوں میں خلل ہے
ایک ایک بہادر ہے وہ بے مثل یہ دل ہے   آلہ ہے وِدل کا کہ یہ تیغ اور رفل ہے

گوشہ نہ ملیگا کوئی اب رن میں عدو کو
ہم ہوش میں لے آئیں گے اس عربدہ جُو کو

برطانیہ سے آئی تھی جب فوج کمک کی   تو پہلے سے دونی ہوئی ہمت تھی ہماری
یہ عہد کا پاس اور حمیّت ہو تو ایسی   ہو وقت پہ امداد۔ مرّوت ہو تو۔ ایسی

اب حوصلہ ہے آپ کے آنے سے دوبالا
دیتے ہیں غنیموں کو ابھی دیس نکالا

ہے قوم فرینچ آپ کی امداد کی قائل — تاریخ میں یہ واقعہ ہے ذکر کے قابل
تہذیب نے سب حرف غلط کی حد فاصل — اور کر دیا ہم دونوں کو دو قالب و یک دل

اک دن تھا کہ ہم دونوں صف آرا تھے دکن میں
شمشیر بہ کف صف بہ صف آج آئے ہیں رن میں

آؤ تمہیں سر آنکھوں پہ ہم اپنے بٹھائیں — اور دیدۂ و دل فرش رہِ یار بنائیں
جو دل میں ہمارے ہے بھرا کیونکہ بتائیں — دل چیر کے مہمانوں کو کیا اپنا دکھائیں

قدموں پہ تمہارے جو پڑی گرد سفر ہے۔
اخلاص کی آنکھوں کے لئے نور نظر ہے۔

ولکم سپہ قیصر ہندی کے دلیرو — تیار شکار آپ کی خاطر ہے یہ شیرو
منہ سنگدلوں کے سر سنگین سے پھیرو — بھاگے تو چکاپو[1] میں اسے توپوں سے گھیرو

آؤ اُسے نیچا ابھی سب مل کے دکھائیں
جو سر میں ہوا ہے۔ دھوئیں اب اسکے اڑائیں

ماں بیٹے کو رخصت کرتی ہے۔

(۱۴ دسمبر سنہ ۱۹۱۴ء)

(یہ بھی جنگی نظموں میں سے ہے)

چلا گھر سے جب سپاہی اُسے ماں نے یوں پکارا — مری بات سُن کے جانا۔ مری جان میرا پیارا
تجھے کیا بتاؤں کیونکر میں یہ تجھ سے کہہ رہی ہوں — ترے ہجر کے الم سے مرا دل ہے پارا پارا
مرے لاڈلے۔ یہ میرا تجھے فرض ہے بتانا — مرے دل کا چین ہے تو۔ مری آنکھ کا ہے تارا
جو چلے ہو رن کو بیٹا۔ تو یہ بات یاد رکھنا — کہ قدم ہٹے نہ بڑھکر کہیں جنگ میں تمہارا
یہ جو تیغ ہے کمر میں ذرا اس کی لاج رکھنا — اسے ہاتھ میں نہ دینا کہیں غیر کے خدا را

---

[1] چکا پُو۔ میدان جنگ میں ایک قلعہ اس طرح باندھا جاتا ہے کہ اپنی فوجوں کو چار حصوں میں تقسیم کر کے چار مربعوں میں اس طرح مرتب کیا جاتا ہے کہ ان کا ایک زاویہ آپس میں بالمقابل ہو۔ اس میں جو گھِر جائے اس کی سلامتی ناممکن ہے۔ مہابھارت کی جنگ کے بعد جاپانیوں نے روس کی جنگ میں اس قلعہ کا استعمال کیا۔

کبھی دکھ سے تم نہ ڈرنا۔ نہ عدو سے خوف کرنا
نہیں مرنے مارنے بن کبھی جنگ میں گزارا

ملے مار کر جو عزت ملے مر کے سرخروئی
یہ لکھا ہے ایسا سودا کسی ڈھب نہیں خسارا

مرے لڑکے گر سپاہی تو شہید جنتی ہے
اسے گھاٹ تیغ کا ہے سری گنگا جی کا دھارا

یہ ہمیشہ یاد رکھنا کہ ہوا اُن کی نسل سے تم
جنہیں رن میں پیچھے ہٹنا نہ ہوا کبھی گوارا

مرے دودھ کا ہے تم پر ابھی فرض یہ سمجھنا
جو لہو گرا بدن سے تو یہ فرض بھی اُتارا

مری جاں وہ کام کرنا کہ بہادروں کے دل میں
ترا نام ایسا چمکے کہ سویرے کا ستارا

وہ بہادری دکھانا کرے واہ وا زمانہ
ہو خوش اپنا شاہ قیصر کرے فخر دیس سارا

تو وہ کام کر کے آئے۔ کہ جہاں میں نام پائے
ہو نصیب فتح تجھ کو۔ تجھے رب کا ہو سہارا

سنیں ماں سے جو یہ باتیں بڑھا حوصلہ پسر کا
قدم اپنی ماں کے چومے جبھی جنگ کو سدھارا

ہمارے شاعر

دہلی ۲۲ مارچ سنہ ۱۹۱۴ء

سخن سنجی ـــــ اور ـــــ عشق بازی

سخن سنجی ہے کیا؟ تیغ نظر کا وار ہو جانا
زبردستی کسی گل کے گلے کا ہار ہو جانا

کسی باآبرو کا آتے جاتے روکنا رستہ
کسی کوٹھے کا دائم سایۂ دیوار ہو جانا

الجھ پڑنا کبھی دربان سے۔ رہگیر سے لڑنا
کسی کے گھر کا اپنے آپ ڈگریدار ہو جانا

کبھی پتھر لئے اک غول لڑکوں کا جلو میں ہے
تماشہ بن کے زیب کوچہ و بازار ہو جانا

کبھی چاک گریباں مطلع خورشید محشر ہے
کبھی داغ جگر کا منبع انوار ہو جانا

طواف دیر میں چکر لگانا رات دن کا ہے
کبھی بیت الحرم کے در کا چوکیدار ہو جانا

کسی کے ہاتھ میں خواہی نخواہی تیغ دے دینا
کمر کس کر شہادت کے لئے تیار ہو جانا

کبھی دست جنوں اور جوش وحشت سے ویر ہونا
تو دم میں پرزے پرزے دامن کہسار ہو جانا

کبھی مد نظر ہے حسن بازاری کا نظارہ
کبھی آ کر مزے میں حور کا دلدار ہو جانا

کبھی اک بُت کے ہاتھوں بے طرح مجبور ہوجائیں
کبھی اللہ میاں کا دہر میں مختار ہوجانا

نظر آئی کبھی کعبہ میں تصویر صنم ان کو
کبھی بُت خانہ میں اللہ کا دیدار ہوجانا

پئیں کیوں خونِ دل لخت جگر کیوں اپنا چابئیں
سکھایا ہے تمہیں یہ کس نے مردم خوار ہوجانا

جو کہتے ہیں وہ کرتے کیا۔ نہیں احساس تھی اس کا
نہ سمجھو دل لگی کچھ عشق کا بیمار ہوجانا

کبھی محفل میں لڑنا کیوں ادھر نا کا ادھر جھانکا
کبھی نقش کف پا کی طرح ناچار ہوجانا

کبھی آنکھوں میں دم ہونا کبھی ہر موئے مژگاں کا
ہجوم درد وغم سے ابر دریا بار ہوجانا

عاشقانہ بَرطہ

سبق دینا کبھی عرفان و طاعت کا فرشتوں کو
کبھی وردی کش جام مئے خمار ہوجانا

کبھی تہمت ہے تقوے پر کبھی بہتان ایماں پر
کبھی مخدوم عالم۔ زبدۃ الاحرار ہوجانا

دھواں اٹھا کہیں سے اور نہ چنگاری کہیں دیکھی
مگر داغوں سے ممکن دل کا ہے گلزار ہوجانا

کبھی تو مہر عالمتاب کی آنکھوں کا تارا ہیں
کبھی اک ذرّہ ناچیز و بے مقدار ہوجانا

کفن پہنے کبھی مقتل میں ہنستے کھیلتے جانا
کبھی اپنے دل مردہ کا ماتم دار ہوجانا

جفائے یار کا اپنی وفا کا مرثیہ گانا
ذلیل اچھوں کو کرنا اور خود بھی خوار ہوجانا

ابھی درد فراق یار میں بے موت مر جائیں
ابھی جام وصال یار سے سرشار ہوجانا

مجاز ان کا اگر مسلک ہے تو حالت یہ طاری ہو
خودی کو محو کر کے یار کا دوچار ہوجانا

ان کا معشوق

کبھی پُرفن بنانا اور کبھی الڑھ بنا دینا
کسی کا سادہ دل ہونا کبھی عیّار ہوجانا

ذمائم جو زمانے میں ہیں خلقی اور اخلاقی
دماغ اور دل میں انکے یار کے انبار ہوجانا

دہن معدوم دلبر کا۔ مگر لبریز گالی سے
کمر غائب مگر زیب کمر تلوار ہوجانا

سر بازار لانا کھینچ کر پردہ نشینوں کو
کسی کی آبرو کا مفت دعویدار ہوجانا

مسیحائے زماں کا یار کو منصب کبھی دینا
کبھی اک بات سے اس کی جگر افگار ہوجانا

کبھی ہے قتل کا الزام چوری کی کبھی تہمت
یہ عاشق ہونا ہے یارب اک تھانہ دار ہوجانا

چڑھے ہیں چلّے تیغیں تل رہی ہیں چلتے ہیں خنجر
یہ ہے لندھور بن جانا کہ ہے دلدار ہوجانا

کبھی تو مردے جی اٹھیں کبھی ہو قتل عام اس سے | کمال خرق عادت یار کی رفتار ہو جانا
تصوّر میں بھی آئے حُسن اصلی تو وہاں کیونکر | جہاں "ہر ہفت" کی ہر لحظہ ہو بھرمار ہو جانا

مکرُوہاتِ عشق

کبھی معصوم بچوں کو نگاہِ لوث سے تکنا۔ | ہلالِ حُسن ہو گا بدر- یہ اصرار ہو جانا
نہ کمسن ان سے چھوٹے اور نہ مونچھ اور داڑھی والے | یہ اُلفت یا کسی عِلّت کا ہے بیمار ہو جانا
خدا جانے مذاق اسمیں ہے کیا اور کیا جوانمردی | کہ ہر بانکے جواں کا حُسن کی سرکار ہو جانا
کھلے بندوں خط عارض کے مضموں باندھے جاتے ہیں | بُرا ہے اس قدر اخلاق سے بیزار ہو جانا
یہ ہے عشاق کی کرتوت یا ہے پاک شہدوں کی | ہے اوباشی کی لت - یا عشق کا آزار ہو جانا

سُخن گُسترانہ کلام

خدا کا علم آساں ہے کہ مشکل سہل ہے لیکن | ہمارے شاعروں کو وہم کا اوتار ہو جانا
سہر دیواں غزل اک حمد میں لکھکر سمجھ بیٹھے | زمین خُلد کا آساں ہے پٹّہ دار ہو جانا
کلام ان کا مخرّب خلق احسن حسن انفس کا | شریفوں کو بجا ہے اس سے استحقار ہو جانا
اسی کو وہ سمجھ بیٹھے ہیں معراج سخن سنجی | کہ جو کچھ لکھیں اس کا داخل اخبار ہو جانا
مجالس میں عزا کی آہیوں کا ذکر سنتے تھے | یہاں ہے واہیوں سے گرمئِ بازار ہو جانا
حماقت ہے کہ ہے بیغیرتی- وحشت کہ سودا ہے | یہ ہے دیوانہ ہو جانا - کہ ہے مکّار ہو جانا
جو حالت تم پہ گزری ہی نہیں ذکر اس کا پھر کیسا | کمالِ شعر گوئی تو نہیں- عیّار ہو جانا
تہی ہے ابتدا اور انتہا گر شعر گوئی کی | تو بہتر اس سے ہے انساں کا لیے گفتار ہو جانا
بیر کسی مصرف کا رہنا اور نہ کوئی کام کر سکنا | اسیر وہم باطل ہو کے بس بیکار ہو جانا
تخیّل کی بھی صحبت ہے جو بدنیکوں کو کرتی ہے | نتیجہ بد خیالی کا ہے- بدکردار ہو جانا
جو آئیں مدح کرنے پر تو ادنےٰ ملک والوں کا | فریدوں فر سکندر بخت و جم دربار ہو جانا

ادب اور اخلاق کا خوُن

وہ شاعر کیا نشانہ جو نہ ہو عشق و رقابت کا | خلاف واقعیت بات کا اظہار ہو جانا

جو چیزیں راندۂ درگاہ تہذیب و شرافت ہیں فضیلت کی وہی ان کے لئے دستار ہو جانا
سنیں ان کی زباں تو چادر ڑی والے بھی شرمائیں مگر قسمت میں اس فن کی بھا اتنا خوار ہو جانا
مذاق عامیانہ اور طرز سوقیانہ ہے وہ جو کچھ لکھیں اس میں فحش کی ٹھیکار ہو جانا
کہے ننگ خلائق ان کو گر کوئی تو کیا شکوہ یہ کیا ہے گر نہیں سوسائیٹی پر بار ہو جانا
نہیں خلق وادب کا خون کرنا یہ تو پھر کیا ہے یہ کیا ہے گر نہیں بد خلق و ناہنجار ہو جانا
سخنگوئی ہے یہ تو یا وہ گوئی کس کو کہتے ہیں نہیں اچھا ادب سے اس قدر اغیار ہو جانا

غزل گوئی

غزل مانا ہے صنف ابتدائی شعر گوئی کی مگر لازم ہے اُستادوں کو اس سے عار ہو جانا
بھلی بچوں کی تتلاہٹ ہے لیکن تم جو تتلاؤ اطبا اسکو لثغہ کا کہیں آزار ہو جانا
ثقات انکے سنیں ہفوات تو کانوں میں انگلی دیں شریفوں کے لئے ہے عیب اتنا خوار ہو جانا
جو باتیں ایک بازاری سے خلوت میں نہیں سنتے غزل میں ان کا وجہ فخر ہے اظہار ہو جانا
وہی پارینہ ترکیبیں وہی فرسودہ مضموں ہیں وہی صدیوں کے پس خوردہ کا جیفہ خوار ہو جانا
جوانی میں وہ سنتے تھے جو باتیں کوٹھے والوں سے انہیں کا بے تکلف داخل اشعار ہو جانا
سنائیں تو ذرا وہ شعر گھر والوں کو وہ اپنے بقول انکے ہے جنکو گوہر شہوار ہو جانا
جنہیں کہتے در و دیوار سے بھی لاج آتی ہے انہیں باتوں کا زیب نظم گوہر بار ہو جانا
کبھی تو اور اصناف سخن پر بھی قلم اٹھتا جو بھا قسمت میں قید بندش اشعار ہو جانا
کبھی اخلاق پر کہنا نہ قدرت کے مناظر پر لکد کوب خرام ابلق رخسار ہو جانا
مرادف شاعری کی ہو جو شاہد بازی و رندی تولد بد فطرت و اخلاق سے ہے عار ہو جانا
غزل میں جدتیں جو ہو رہی ہیں ان سے نفرت ہے نہیں منظور خواب دوش سے بیدار ہو جانا
اڑے بیٹھے ہیں تعریف غزل پر اور کہتے ہیں وہ ہے معشوق سے بات اس کا ذکر اذکار ہو جانا

فصاحت و بلاغت وغیرہ

بھلا معلوم ہو جو ان کے کانوں کو ہی صاد اس پر قیامت ہے فصاحت کا یہی معیار ہو جانا
لطافت نغز گفتاری کی دھن سر میں سما جائے تو دریائے سخن پر آ کے بو تیمار ہو جانا

بلاغت اور اغلاق انکے لیکھے دو نہیں چیزیں ۔۔۔ غلو میں ہیں اس قدر اڑنا کہ دور از کار ہو جانا

قصیدہ لکھنے بیٹھیں اصطلاحیں علم کی بھر دیں ۔۔۔ بس اک دم سے حکیم و صوفی و جفار ہو جانا

یہ دقت ہے بڑھی مشکل پسندی اس قدر ان میں ۔۔۔ ہے آساں سہل کا ان کے لئے دشوار ہو جانا

تصوف پر توجہ حضرت عالی کی ہو جائے ۔۔۔ تو دو شعروں سے رشک رومی و عطار ہو جانا

نوجوان شاعر

جو ہیں نومشق ان کا باوا آدم ہی نرالا ہے ۔۔۔ وطیرہ ان کا استادوں سے بے غدار ہو جانا

کمال شاعری تکمیل دیواں کو سمجھتے ہیں ۔۔۔ ردیفیں ختم سب کر لیں تو پھر تیار ہو جانا

غزل انکی گر موزوں سے گر نشر ہو جائے ۔۔۔ تو ان کا سہل ہے چلتی ہوئی تلوار ہو جانا

زحاف و حشو کو سمجھیں نہ سقم و ذم کے پہلو کو ۔۔۔ اگر تقطیع کو کہئے تو صاف انکار ہو جانا

تڑپنا اور مچلنا شعر کہتے ہیں انہیں مطلب ۔۔۔ تنافر کیا تنتر کیا۔ اور کیا اضمار ہو جانا

سمجھنا شائگاں کو اور نہ ایطا کی حقیقت کو ۔۔۔ عروض و قافیہ کے علم سے نادار ہو جانا

غلو پر اور ہے لفظی رعایت پر مدار ان کا ۔۔۔ انہیں کی جا بجا اشعار میں تکرار ہو جانا

نہ مضموں ہاتھ آیا تو زباں کا شعر کہہ ڈالا ۔۔۔ کسی صورت سخن کے جام سے سرشار ہو جانا

جوانی۔ اس پہ جوش عشق۔ پھر شوق سخن سنجی ۔۔۔ عجب کیا زعم کا پھر سر کو دست افشار ہو جانا

نہ دو داد انکے شعروں کی تو پھر آپے سے باہر ہیں ۔۔۔ کہیں ٹوکو۔ تو بس آمادہ پیکار ہو جانا

بتائیں ڈھنگ اصلاح سخن کا آپ اگر ان کو ۔۔۔ وہیں تیار ذم اور ہجو کا طومار ہو جانا

اگر دو چار غزلیں اتفاقاً ہو گئیں اچھی ۔۔۔ تلمذ مشورے سے پھر ہے لابد عار ہو جانا

نہ مائل۔ سائل و بیخود نہ شاعر کی انہیں پروا ۔۔۔ نہ طالب ساقی و شیدا سے استبصار ہو جانا

نہ ساحر سے نہ مضطر سے غرض ہے استفادہ کی ۔۔۔ نہیں اچھا یہ نومشقوں کو استکبار ہو جانا

جو جی میں آیا لکھ مارا جو منہ پر آیا کہہ ڈالا ۔۔۔ برا ہے اس قدر آزاد و خودمختار ہو جانا

نہ استادوں کی عزت ہے نہ پابندی قواعد کی ۔۔۔ ہے انکے حق میں سم موزوں دو چار اشعار ہو جانا

نصیحت اور صلاح نیک ان نازک مزاجوں کو
کہیں یاروں کی خاطر پر نہ کیفی بار ہو جانا۔

افریقہ میں ہندوستانی

۱۲ ر دسمبر سنہ ۱۹۱۳ء

اس برس جنوبی افریقہ سے وہاں کے ہندوستانیوں کا ایک وفد ہندوستان آیا تھا۔ تاکہ ان کی جو حق تلفیاں افریقہ کی حکومت نے کیں۔ ان کی داد خواہی کریں۔ مسٹر گوکھلے دورۂ افریقہ میں وہاں کی حکومت نے جو وعدے کئے تھے۔ ان کے پورا نہ کرنے کا بھی ذکر آتا ہے۔ "انڈین ڈیلی ٹیلیگراف" کا بھی پیٹنا ہے۔

کیا کہیں سب ہیں یہاں جی کے جلانے والے
نالے آہوں سے سوا آگ لگانے والے

اس مصیبت سے تو اب کاش اجل آجاتی
مر گئے پر تو ستانے نہ ستانے والے

اب کوئی دم کے ہیں مہمان ہم اس دنیا میں
دیکھ جاؤ ہمیں دنیا سے ہیں جانے والے

ہے مدد اور حمایت کا یہ وقت۔ اہل وطن!
آپ ہی ہیں تن مردہ کے جلانے والے

لاکھ ہوں آنکھ سے دور اس کا یقین ہے ہمکو
وقت پر آپ نہیں ہم کو بھلانے والے

رنج جو جو سہے آکر یہاں افریقہ میں
دل کو پتھر کے بھی ہیں موم بنانے والے

یہ غلامی ہے۔ کہ ہے نوکری۔ یا مزدوری ؟
ہیں کہاں راگ وہ تہذیب کا گانے والے

کیا ڈھٹائی ہے وہ کہہ کہہ کے مکر جاتے ہیں
لاکھ ہیں بھی تو نہیں آنکھ چرانے والے

جو صفائی کی بناتے تھے بہت کچھ باتیں
وقت پر نکلے وہ آئینہ دکھانے والے

حق کو ناحق سے الگ کر کے جو انصاف کریں
ایسے منصف ہیں کہاں سب ہیں جھنکانے والے

کون سمجھے گا کہ قیصر کی رعایا ہیں ہم
نام پر اس کے ہیں خون اپنا بہانے والے

ہند خارج ہے کہ افریقہ ہے امپائر سے
یہ تو فرمائیں حکومت کے چلانے والے

ہے یقین داد ملے گی وہیں ہم کو کیفی
ہیں ہم اب شاہ کے دربار میں جانے والے

کیا وزارت سے گلہ تیرا اگر..یں
آنکھ کا شکوہ بھووں سے کیا کریں

کس کے آگے جا کے رونا روئیں ہم
کیا کریں اب یا الٰہی کیا کریں

ہم کو اے افریقہ وعدوں میں نہ ٹال
کب تک ان باتوں سے ہم بہلا کریں۔

تجھ کو مالا مال ہم نے کر دیا۔
کس طرح خود روز ہم فاقا کریں

تیرا وعدہ عہد معشوقانہ ہے
کیا یقیں وعدۂ فردا کریں

اب نہیں پابند جو معہود کے
ٹیکس کا غم اس لئے جھیلا کریں

ہم پہ تو قیدیں لگاتا جا ہزار
اور نہ ہم آہ و فغاں اصلا کریں

حکم سے تیرے ہیں ردّ شرعی نکاح
تیری کس کس بات کا شکوا کریں

ہم بہت بیمار ہوں یا ہوں ضعیف
کام لیکن روز کا تیرا کریں

یہ غلامی ہے کہ ہے یہ نوکری
فیصلہ اہل خرد اس کا کریں

جب نہ تو انسان ہی سمجھے ہمیں
بات پھر مطلب کی تجھ سے کیا کریں

جرم ہے بیداد کی فریاد بھی
ظلم سب چپ چاپ ہی جھیلا کریں

ہو شکایت جس سے جو کرتا ہو جبر
کیا اسی کے سامنے دعوے کریں

ہے تمہارا آسرا اہل وطن!
گر مدد تم سے نہ مانگیں۔ کیا کریں

آہ اب ہم پر خدائی تنگ ہے!
کیا کریں ہم اے عزیزو کیا کریں

وقت پر اٹھے مدد کو ہارڈنگ
کم ہے ان کا شکریہ جتنا کریں

بادشا کی تو بھی امپائر میں ہے
دل پہ تیرے کیونکہ نقش اس کا کریں

ہند کو شاید سمجھتا ہے تو غیر
آؤ قیصر سے یہ حل عقدا کریں۔

کیفیؔ اب لازم ہے سب کو چھوڑ کر
بادشہ سے عرض حال اپنا کریں۔

رام بھگتی کی مہما

(۱۶ اپریل ۱۹۱۳ء)

فرمایا کہ لوگ بھی کتنے بدمذاق ہیں والمیک اور تلسی داس کے لکھنے کے بعد مجھ سے رام چندر جی کے متعلق نظم کی فرمائش کرتے ہیں۔ ایک اخبار نے ناک میں دم کر دیا۔ ناچار یہ نظم لکھکر ان سے جان چھڑائی۔ خدا جانے ان کے راستے میں کوئی ریگستان پڑا تھا۔ یا نہیں۔ مگر مجھے تو نظم کو سجانا تھا۔

اِک دشت تھا مہیب بلاخیز و پُرخطر
حد اور کنارہ جس کا نہ آتا تھا کچھ نظر
اس دشت لق و دق میں نہ تھا کوئی بھی شجر
جلتے تھے اس فضا میں پرندوں کے بال و پر
روئیدگی کے نام سے کانٹوں کی ڈھیریاں
اور طائروں کے بدلے اندھا دھند آندھیاں

صحرا میں ایک چھایا ہوا ہُو کا تھا سماں
جاندار کا کہیں نظر آتا نہ تھا نشاں
خارج مگر حدود سے اس کی تھے انس و جاں
جمدوت[1] کا گزر نہ ہوا تھا کبھی وہاں
گھر تھا عدم کا یا کف دست ایک دشت تھا
گویا عمل سے صانع قدرت کے تھا جُدا

ریتے سے تھی ڈھکی ہوئی یکسر وہ سرزمیں
تھے اونچے نیچے ریت کے ٹیلے کہیں کہیں
ان کو بھی فعل طبع حسینان نازنیں
تھا اِک جگہ قرار و سکوں نام کو نہیں
ان میں اڑن کھٹولوں کی تھی خاصیت عیاں
اک ٹیلا جو یہاں تھا ابھی۔ جا پڑا وہاں

ہر ہر قدم پہ بھول بھلیّاں کا تھا خطر
چکرا نہ آتے ایسے بیاباں میں گر خضر
منزل کا تھا نشاں نہ تھا نقش رہگزر
بڑھتا ہی جاتا طے کوئی کتنا کرے سفر
وہ دشت تھا کہ وحشت دروپد کا چیر[2] تھا
بیحد مثال قدرت رب قدیر تھا۔

[1] جمدوت۔ موت کے فرشتے۔ [2] چیر۔ اوڑھنی چنری۔

گرمی کی رُت تھی۔ ٹھیک دوپہری کا وقت تھا　　ایسا مقام اس پہ قیامت یہ تھی بپا
تھی جان کو سکھاتی جو چلتی وہاں ہوا　　اس دشت میں ہر ایک قدم پر تھی سو بلا
ہو سکتا جانور کا وہاں کس طرح گزر
ریگ رواں بھی رکھتی قدم پھونک پھونک کر

پانی کا دُور دُور نہیں تھا وہاں نشاں　　گرمی کی اور تپش کی وہ شدت کہ الاماں
بھٹی کی طرح تپتے زمین اور آسماں　　پر طائر نگاہ کے بھی جلتے تھے وہاں
ہر ذرّے میں تپش تھی وہاں آفتاب کی
فوّارے تھے بگولوں کے نہریں سراب کی

باغ آگ کا تھا دشت کے اندر جو قطعہ تھا　　انگاروں پر تھی لوٹتی چلتی اگر ہوا
شیشہ تھا آتشی وہاں ہر ذرہ ریت کا　　موج ہوا میں شعلہ اگن جھڑ[1] کا تھا بھرا
گرمی سے اسکی آتش نمرود سرد تھی
لُو کی بھبک سے باد جہنم بھی گرد تھی

حاسد کے دل کی طرح بھڑکتی ہوا میں آگ　　دیپک کا جھکڑوں کی صدا میں بھرا تھا راگ
موج ہوا کی برق تپاں سے لگی جو لاگ　　سورج کے رتھ کے گھوڑوں کی ڈھیلی پڑی تھی باگ
تھا شوق انہیں کہ جا کے وہ ٹہلیں زمین پر
اور راہو کی طرف شاہ خاور کی تھی نظر

خورشید جنتر کا نپتا اس جا قیام سے　　بچکر نکلتا اندر لوان اس مقام سے
جھپکی تھی شو کی تیسری آنکھ اس کے نام سے　　گویا تھی چشم پوشی اسے فعل کام سے
بھاگیرت اس جگہ جمد اگنی کا روپ تھا
تھی پدمنی کی شو کی جٹا میں چھپی چپتا

اُس وقت۔ اُس مقام میں جس کا ہے یہ بیاں　　چھوٹا سا آریوں کا تھا اک قافلہ رواں
خاتون ایک اور تھے دو اس میں نوجواں　　ترکش بندھے تھے پشت سے اور دوش پر کماں
چلّے کی طرح تیوریاں ان کی چڑھی ہوئی
تیغیں ہمتیں بھی ساتھ کمر کے بندھی ہوئی

[1] اگن جھڑ [illegible] اس کا یہ نام پڑا۔

تلوار جس روش سے چلے کارزار میں ‏ منڈلائے جیسے چیل وہاں کوہسار میں
تیشہ زباں ہے اینڈنا جیسے کچھار میں ‏ بڑھتا ہے سیل جیسے کسی رودبار میں

ان دونوں نوجوانوں کے بڑھتے تھے یوں قدم
جس طرح حکمی تیر کہیں چل کے لے نہ دم

معلوم ہے کہ کون تھے تینوں وہ نیکنام؟ ‏ تھی جن کی گرد راہ زمانے کا احتشام
اس قافلے میں آگے تھے سب کے جناب رام ‏ لچھمن جی پیچھے پیچھے چنداول کے دیتے کام

دو موتیوں کے بیچ میں چپنی ہو جس طرح
دونو کے درمیان میں سیتا تھی اس طرح

تھے اپنی رو میں جارہے تینوں وہ خوش خصال ‏ موسم کا دھیان تھا نہ کچھ اس دشت کا خیال
یکبارگی یہ رام پکارے بہ صد ملال ‏ لچھمن ٹھہر جانکی جی ہیں بہت نڈھال!

حالت ہے غیر پیاس سے ان کی ذرا تھمو!
پانی کہیں ملے تو دو ایک گھونٹ لاکے دو!

لچھمن جی بولے سن کے یہ ۔ باخاطر حزیں ‏ پانی! یہاں تو آنکھوں میں نم تک ذرا نہیں
پانی یہاں نظر نہیں آتا مجھے کہیں ‏ ارشاد کیجئے تو اے سنسار کے امیں

چلا چڑھا کے تیر کروں ایک سر ابھی
نہ توڑ دوں جو کہئے ابھی میں زمین کی

رگھبر نے جب یہ بھائی کے منہ سے سنا سخن ‏ تو مسکرا کے آپ نے فرمایا۔ "جان من
مجھ پر ذرا نہیں اثر شادی و محن ‏ کرتا تھا۔ اس کے واسطے کیا مجھ کو کچھ جتن

اک کھیل کی تھی بات نہ امر محال تھا
اک پل میں عرصہ کٹتا جو یہ چودہ سال کا

لیکن یہ میں نے جان برادر ہے ٹھان لی ‏ کرلی ہے اختیار جو یہ شکل آدمی
اس واسطے کہ آدمیوں کی ہو انتی ‏ سدھرے اور سنتا دھرم کی مرجاد کی گئی

ہوگا نہ کوئی کام چمتکار کا یہاں
ہوں میں بھی اک بشر نہیں سلطان اسے جہاں

پھر بولے رامچندر - لو وہ مورچھت ہوئیں   پیاری سیا جی - کیوں نہیں تم منہ سے بولتیں
یہ آبلے - یہ خار - کف پا - یہ نازنین   ہے ہے غشی ہے اتنی کہ کچھ بھی خبر نہیں

پانی کہاں سے لاؤں میں اب آہ کیا کروں
کیونکر یہ حال زار ترا دیکھتا رہوں

لچھمن یہ حال دیکھ کے دوڑے اِدھر اُدھر   پانی ملے کہیں سے تو لے آئیں ڈھونڈ کر
زانو پہ لے کے بیٹھے سیا جی کا رام سر   کیا کیا دئے دلاسے مگر اسکو کیا خبر

سیتا وہ گویا رام کہانی تھی سن رہی
القصہ دیر تک یہی رگھبر کو دھن رہی

اتنے میں ایک دور سے آئی انہیں صدا   لچھمن کی وہ پکار تھی جب غور سے سُنا
وہ کہہ رہے تھے مل گیا - ہاں پانی مل گیا   آجاؤ دینا ناتھ میرے پاس تم ذرا

اتنا میں تھک گیا ہوں کہ اب مجھ میں دم نہیں
گرمی سے بھونتی ہے میرے پاؤں کو زمیں

اُٹھے اٹھا کے دوش پہ سیتا کو رام جی   لچھمن جی تھے جدھر اسی جانب کی راہ لی -
کچھ دور تو انہوں نے وہ طے راہ شاق کی   آواز اِک اور اتنے میں انکو سنائی دی

"پانی کی جھاری یہ تو نہیں میرے واسطے
ہرگز نہیں پیوں گی یہ ہے رام کیلئے

درشن کی پیاس ہے تری لونڈی کو رامجی   یہ پیاس ٹھنڈے پانی کے پینے سے کب بجھی
حسرت یہی - ہے برسوں کی یہ آرزو مری   پلکوں سے جھاڑوں گرد میں رگھبر کے پانو کی

پانی پلاؤں ان کو کھلاؤں یہ میٹھے بیر
کیوں میری بار رامجی کی تم نے اتنی دیر

کیا غم تمام پیاس سے اپنا اگر ہو کام   مدت سے جپ رہی ہوں تمہارا ہی پاک نام
یہ پانی اور یہ بیر تمہارے لئے ہیں رام   چکھ چکھ کے بیٹھے بیٹھے ہیں چھانٹے ہوئے تمام"

جذب اس قدر بھرا تھا صدائے الیم میں
اک جوش اٹھا رام کے قلب علیم میں

ـــــــــ
¹ مورچھت ہونا - غش کھانا -

لچھمن کو چھوڑ کر ہوئے رام اس طرف رواں — دو اک قدم گئے تھے کہ دیکھا عجب سماں
بیہوش ہے پڑی ہوئی اک بھیلنی وہاں — سدّ رمق ہے اس کے بدن میں اگر ہے جاں
چھاتی سے ایک پانی کی جھاری لگی ہوئی
بیروں کی پوٹلی ہے گلے سے بندھی ہوئی

یہ دیکھکر جو حال ہوا رام چندر کا — ممکن نہیں زباں قلم کر سکے ادا
پاس اس کے جا کے بیٹھا اجدھیا کا بادشا — وہ دل کی کیفیت تھی کہ منہ تھا سلا ہوا
اک زانو پر تھے سیوری کا سر لئے ہوئے
سیتا کا دوسرے سے سرھانا کئے ہوئے

ایک ایک بوند رام کی ہر آنکھ سے گری — سیتا کے اور سیوری کے رُخ پہ وہ پڑی
انگڑائی لے کے ہوش میں آئی وہ بھیلنی — سیتا کا غش بھی دور ہوا آنکھ کھول دی
پوچھا یہ جانکی نے کدھر کو ہم آ گئے"
اور سیوری نے اٹھ کے قدم رام کے لئے

اس بھیلنی نے دھوئے چرن رام چندر کے — اور سوکھے کترے بیر وہ سب آگے رکھ دئے
رگھبیر بیر کھانے لگے پریم بھاؤ سے — بولے سیا سے تم بھی لو میٹھے ہیں یہ بڑے
اتنے میں لیکے پانی وہاں لچھمن آ گئے
یہ کیفیت جو دیکھی تو کچھ بوکھلا گئے

اک رنگ ان کے چہرے پہ آیا اور اڑ گیا — اک بل بھی آ کے تیوری پہ لچھمن کی پڑ گیا
رگھناتھ مسکرائے جو دیکھا یہ ماجرا — ارشاد پھر زباں مبارک سے یہ کیا
کون و مکاں کا گرچہ شہنشاہ رام ہے۔
سچے بھگت کا اپنے وہ لیکن غلام ہے۔

حسب حال

(۲۵ جون سنہ ۱۹۱۳ء)

مدت سے ہے تو خلد کا ساماں کئے ہوئے
دل نذر حور و صدقۂ غلماں کئے ہوئے

دل میں دبا کے شوق وصال پری جمال
عشق بتان گلشن رضواں کئے ہوئے

خواہش ہے دیکھے اک بت جادو نظر ادھر
گیسوئے عنبریں کو پریشاں کئے ہوئے

کندن کی طرح جس کا دمکتا ہوا بدن
آنکھوں سے اک جہان کو حیراں کئے ہوئے

درِّ ثمیں بھی جس کے بدن کی چمک سے گرد
دو رخ سے دو جہاں کو درخشاں کئے ہوئے

بیٹھے ہوں زیر سایہ طوبےٰ یہ ہے امنگ
ان گلرخوں کو تابع فرماں کئے ہوئے

جام مغاں سے اس لئے پرہیز ہے تجھے
ہے بادۂ طہور کا ارماں کئے ہوئے

تو فقر اور فاقے کے دکھ جھیلتا تو ہے
پر آرزوئے میوۂ رضوان کئے ہوئے

پوشاک چھوڑ کر جو ہوا ہے تو دلق پوش
ہے حلۂ بہشت کا ساماں کئے ہوئے

لوٹت غرض نہاں ترے تقوے و زہد میں
تو حرص کو ہے سینے میں پنہاں کئے ہوئے

جامہ ہے پہنے ترک کا تو ظاہرا۔ مگر
ہے عزم تخت و مہر سلیماں کئے ہوئے

پھٹتا جو دل تو سوزن مریم نہ دور تھی
تو ہے عبث یہ چاک گریباں کئے ہوئے

بیٹھا ہے کیوں یہ جو دل میں جگر میں نہیں ہیں زخم
"ساماں صد ہزار نمکداں کئے ہوئے"

جاناں ہی جب ترا نہیں کوئی تو کیوں یہ دھن
"بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے"

دل میں نہیں جو درد تو پھر کس لئے ہے تو
برپا یہ حال و قال کا طوفاں کئے ہوئے

القا ہو کیا تجھے۔ ہو تجھے کیا مکاشفہ
دل میں تو ہے غرض کو تو مہماں کئے ہوئے

سُرگ اور ارم میں جا کے بھی تجھ کو ملیگا خاک
دل کے حریم کو ہے تو ویراں کئے ہوئے

تجھ کو خدا سے واسطہ؟ مطلب نجات سے؟
ہے جان و دل کو ہدیہ شیطاں کئے ہوئے

نفس دنی کے پھندے میں ہے تو پھنسا ہوا
اور عزم ہے بہشت کا ناداں کئے ہوئے

وصل صنم ملا نہ وصال خدا ملا
دو نو جہاں کو اپنے ہے ویراں کئے ہوئے

پہچانا آپ کو ہی نہ جانا خدا کا راز
مدت سے ہے تو دعوئے عرفاں کئے ہوئے

یہ فکر ہے کہ فکر سے عقبےٰ کے ہو رہا
برگشتہ دو جہاں سے داماں کئے ہوئے

بخشش پہ اس نعیم کی بیٹھا ہوا ہے تو — سامان دعوت لب و دنداں کئے ہوئے
لیکن ملیگا تجھ کو نہ کچھ جب تلک ہے تو — حرص و ہوا کو مرکز ایماں کئے ہوئے
کیا روح و مادہ کے پڑا ہے تو پھیر میں — اپنا دل و دماغ پریشاں کئے ہوئے
کیا حشر ہو ترا جو یہی تیرا حال ہے — ہے خواہشوں کے صدقے دل و جاں کئے ہوئے
صایم کبھی ہوا جو ادا کی کبھی نماز — سمجھا خدا کے سر پہ ہے احساں کئے ہوئے
ایماں کی ہوا بھی نہ تجھ کو لگی تو کیوں — برپا ہے جنگ گبر و مسلماں کئے ہوئے
سمجھا ہے تو کہ مکر ہے قیمت نجات کی — ازبس ہے جنس خلد کو ارزاں کئے ہوئے
گندم کے بدلے جو کو نہ لیگا ترے کوئی — آراستہ تو لاکھ ہو دکاں کئے ہوئے

کیفی نہ اب تو حرص و ہوا میں تو دن گنوا
مرقد میں لیٹنے کا ہے ساماں کئے ہوئے

ہوائی جہاز

۲ نومبر سنہ ۱۹۱۲ء

کرشمہ ہے کمال فطرتی کا عقل انسانی — ہے اسکی روشنی اک جلوہ انوار سبحانی
نہیں شک اس میں یہ شمہ ہے عقل کل کی قوت کا — ملی انساں کو رب سے یا کسی سے شکل انسانی
کمی بھنڈار میں داتا کے جیسے آ نہیں سکتی — یوں ہی ہر جگ میں ہم پاتے ہیں اسکی بھی فراوانی
مرکب اسکو نسیاں اور خطا سے جو سمجھتے ہیں — انہوں نے اس کی حد جانی نہ اس کی تھاہ پہچانی
نظام دہر ابتر ہو نہ یہ گر کار فرما ہو — جو سچ پوچھو تو دنیا میں اسی کی ہے جہانبانی
سمندر نے گئے موتی پچھاور اسکے قدموں پر — جگر بھنچر کا اس کے رعب و طاقت سے ہوا پانی
زمیں کے کوہ اور ہامون ہیں اسکے سامنے مٹی — سمندر کی ہے پانی پانی اس کے آگے طغیانی
ملائک اور جن کیا ہیں عناصر اس کے قبضے میں — یہ ہے سچی جہانبانی یہ ہے اصلی سلیمانی
لئے وہ کام خاک و آب و آتش سے کہ حیرت ہے — ہوا پر گھوڑے دوڑا لئے تو اب ہے عقل انسانی
زمیں کے کام کر کے ٹھیک سارے عقل و دانش سے — فلک پر پے سپر ہونے کی اب انسان نے ٹھانی

نگاہِ عالمِ بالا میں تھی گلی عقلِ انسان نے — ہے اس کے شعبدوں سے اب ملائک کو بھی حیرانی
ہے سانسا دیکھکر یہ رنگ دایو اور اندر کو — توجہ کی ہے انسانوں نے اُنکی جانب ارزانی
عجب کیا اپسراؤں کی جواب سج دھج بدل جائے — ہوائی لیڈیوں کی دیکھکر یہ وضع جاپانی
تعجب کیا ہی ہوں اب ہوں لندن اور پیرس سے — سوئے باغِ ارم یا جلکے اندراس بہ آسانی
عجب کیا ہو جو پریوں کو پسند اب یا پیرس کا — زمیں پر جن کا سایہ تھا۔ کبھی وجہ پریشانی
کوئی دن میں بہشت اُترا ہوا اس خاک پر ہوگا — یہاں آیا کریں گی سیر کو حورانِ عدنانی
علم گاڑیگی اب دل پر مہ و خورشید کے جاکر — تعین اور تقید سے بری ہے عقلِ انسانی

یہ سب کچھ راگ گا کر بھی نہ تو نے اپنی دھن چھوڑی
کبھی کیفی نہ کوئی بات تو نے عقل کی مانی

رادھے شام

۹ راگست سنہ ۱۹۱۲ء

کس گل کی ہے آمد کہ جہاں رشکِ چمن ہے — کیا رشکِ چمن غیرتِ گلزارِ عدن ہے
کیفِ مئے عشرت سے جواں چرخِ کہن ہے — یہ رات بھی کیا زُبدۂ اوقاتِ زمن ہے
اٹھلاتی ہوئی برج میں چلتی ہیں ہوائیں
آکاش پہ ڈالے ہوئے جھومر ہیں گھٹائیں

یہ رات سعادت میں ہر اک دن سے سوا ہے — نوروز کی شان اس کے تقدس پہ فدا ہے
نورِ نظرِ چشمِ بصیرت ہے ضیا ہے — تسکینِ دہِ ہر قلبِ تپاں۔ رُوح فزا ہے
خورشید جہاں تاب کی ہے آنکھ کا تارا
اس رات کا ہر وقت سے اونچا ہے ستارا

اس روہنی نکشتر میں ہے موہنی ایسی — تنویر میں ہیرے کی نہ ہوگی کبھی ایسی
نورِ دلِ عشاق یہ شب ہے بنی ایسی — ہے رات کے پردے میں بھری روشنی ایسی
سورج نے بھی منہ ڈھانکا ہے جلبابِ شفق میں
لی اس نے اماں ڈوب کے مغرب کے افق میں

پروانہ کو ہے شمع سے اس شب نہ سروکار
ہے چاند چکوروں کا نہ اس رات طرحدار
بلبل نہیں عشق گل گلزار کی بیمار
قمری کو نہیں دلبرئے سرو کا آزار

جو بند مجازی تھے وہ سب لوٹ رہے ہیں
مایا کے جو قیدی تھے وہ اب چھوٹ رہے ہیں

آکاش پہ گھنگھور گھٹا جھوم کے چھائی
اندر نے گگنوں نے خبر آمد کی سنائی
گندھرب واپسراؤں نے بھی آرتی گائی
سج دھج کے سواری شہ کو نین کی آئی

اس شان سے آمد ہوئی اس سرور دیں کی
افلاک سے عظمت بڑھی متھرا کی زمیں کی

تھا شکل وہ ایشر کی کہ وشنو کا تھا اوتار
تھا کوئی پیمبر کہ ولی یا تھا فسو نکار
اس بحث سے قضئے سے نہیں ہمکو سروکار
دنیا میں ہے کس شخص کو اس بات سے انکار

ایشر کو بھلا سکتے ہیں ہندو تو بھلا دیں
لیکن نہیں ممکن کہ کنھیا کو بھلا دیں

اس ذات مقدس میں عجب جذب و اثر تھا
ان پیارے کنول نینوں میں اعجاز نظر تھا
وہ مور مکٹ مرکز خورشید و قمر تھا
اس ذات کا دل لبنۂ ہر اک فرد بشر تھا

اک دم بھی سنا بنسری کی جس نے صدا کو
بیخود ہوا اور بھول گیا ماؤ شما کو

گر برج میں دیکھو تو وہ دل دار جہاں ہے
گر دوار کا جاؤ تو نرلیش ایسا کہاں ہے
بھارت میں وہ حق بخشی و تدبیر کی جاں ہے
گیتا میں ہے دریائے معارف کہ رواں ہے

سب اس میں ہیں وہ سب میں ہے اور سب سے جدا ہے
خالق بھی ہے۔ مخلوق بھی۔ بندہ ہے خدا ہے

وہ جذب تھا گوپال کی بنسی کی صدا میں
پاؤ گے نظیر اس کی نہ تم ارض وسما میں۔
جو اس سے لگے دل نہ پھنسے حرص وہوا میں
طاقت یہ کہاں تیر میں۔ چکر اور گدا میں

سر منکر و فاسق کے انہوں نے جو اتارے
بگڑے ہوئے دل اس نے خلائق کے سنوارے

اودھو نے جب احکام سفر کرشن سے پائے — پہنچا وہ مہابن میں کہ جوگ انکو سکھائے
بول اُٹھے یہ سب گوال جو اودھو نظر آئے — اے کرشن کہاں تم رہے۔ دن اتنے لگائے؟
تھا دل میں جو کرشن اودھو نظر انکو پڑے کرشن
ہر شخص کے لب پر تھا ہرے کرشن! ہرے کرشن!

کہتے رہے وہ لاکھ۔ نہیں ہوں میں کنھائی — میں کرشن نہیں اس کا ہوں بھیجا ہوا بھائی!
تم لوگوں کے برلاپ کی پہنچی جو دہائی — تو میں نے مہاراج سے یہ آگیا پائی
بھگتی سے میں دل برج کے لوگوں کا ہٹاؤں
اور جوگ سے اور گیان سے لو ان کی لگاؤں"

پھر گوپیاں بولیں کہ بس اتنا نہ بناؤ — یہ مصری یہ ماکھن ہے اسے بھوگ لگاؤ
مٹکی یہ دہی کی ذرا ٹھوکر سے لنڈھاؤ — مچلو ابھی تم راڑ کرو۔ چھیڑو۔ ستاؤ۔
سب حرکتیں ہیں یاد پرانی وہ تمہاری
مرلی کی ذرا دھن تو سنا ہم کو مراری!

گرد اس کے کھڑے ہو گئے سب مرد و زن پیر — آنکھوں میں بسی جنکی تھی گردھاری کی تصویر
گھبرائے ہوئے اودھو تھے ہر سمت وہ دلگیر — نرغے سے نکلنے کی نظر آئی نہ تدبیر
اودھو نے یہ دیکھا تو خیال اسکو یہ آیا
مادھو کا یہ فقرہ تھا جو یوں مجھ کو بنایا

گردھر کا ہے عشق انکے دلوں میں وہ زبردست — سر کی نہ خبر پاؤں کی ہے۔ ایسے ہیں سرمست
ہو سکتا ہے پورب میں یہ سورج ہو کبھی است — ممکن نہیں بھگتی کا مگر جوش یہ ہو پست
پھر بولا کہ رادھا جو کہے مجھ کو کنھیا
تو بھائیو۔ سچے ہی تم اور میں جھوٹا

رادھا کی کٹی میں جو وہ لوگوں کا گیا شام — اس بھیڑ میں ہر ایک زباں پر یہ تھا۔ آہا شام!
سب قصہ وہ رادھا نے سنا جب تو کہا "شام؟ — ہیں شام آگیا چھوڑ کے کب ہم کو بھلا شام
یہ شام ہے وہ شام ہے۔ میں شام ہوں۔ تم شام!
دیکھو مجھے روز اور کہو۔ ہو گیا گم شام!!

اک بیخودی اودھو پہ یہ سُن کر ہوئی طاری | خود رفتوں کی مدہوشوں کی حالت ہوئی ساری
رادھا کے قدم چُوم کے بولا کہ۔ مُراری! | وہ بنگئی ہے عشق میں تصویر تمہاری

خود رفتہ ہو رادھا کو جو تم دیکھ لو بھیّا۔
ہو شک تمہیں تم ہو کہ وہ سچ مچ ہے کنھیّا

جواہر نظم

(۱۰ر جون سنہ ۱۹۱۲ء)

نہ جانے کیوں شعراء میں رشک و حسد کا مادہ غالب ہے یہ اچھا رحمانی تلمذ ہوا۔ حضرت کیفی کا کلام اور چلن اس عیب سے پاک ہے پنڈت جواہر ناتھ ساقی دہلوی علّامہ کیفی کے ہمعصر تھے۔ اکثر مشاعروں میں شرکت ہوتی۔ شہنشاہ جارج پنجم کی آمد کے موقعہ پر ساقی کا فارسی قصیدہ دربار کمیٹی نے بہترین قرار دیا اس موقعہ پر آپنے یہ نظم کہی تھی۔

اے ساقی خرد ور کیفی کے یار جانی
تو روح عشق برحق تو سوز درد کی جان
علم و حکم کا تیرے قایل ہے اک زمانہ
دیکھے ترا قصیدہ تو دم بخود ہو عرفی
ان میں سے ہے تو جن سے قایم ہے شان دہلی
رُوح رواں ہے ساقی بزم سخن کا
ایک ایک شعر تیرا ہے معدن بلاغت
دلبر ہے اہل دل کا عیسےٰ ہے مردہ دل کو
مرزا کے بعد دہلی خالی سی ہو گئی تھی
دربار تاجپوشی پر وہ قصیدہ لکھّا
ایران کی زباں میں جوہر دکھائے ایسے
مُہر شہی نے جسکو دی جائے اولیں ہے

تو بزم رفتگاں کی باقی ہے اک نشانی
طرز سخن سے ظاہر ہے سوزش نہانی
وہ کون ہے کہ جس نے عظمت نہ تیری مانی
سُنکر غزل کو تیری رونے لگے فغانی
کرتی ہے فخر تجھ پر قیصر کی راجدھانی
جاں بخش مردہ دل کو ہے تیری شعر خوانی
بالغ عیار تیرا اسلوب نکتہ رانی
ہے باغ دل میں تیری کیا کیا نہ گل فشانی
اس سوکھے کھیت کو پھر تو نے دیا ہے پانی
جس سے ہوئی مسلّم ہے تیری نکتہ دانی
خوش ہو گئی ہے رُوح خاقانی و قاآنی
تمغے سے اور سند سے کی تیری قدر دانی

ساقی تجھے مُبارک یہ فخر اور تشخص
نازل ہوں تجھ پہ دائم افضال آسمانی

طلوعِ سحر

(۲۰؍ مارچ ۱۹۱۲ء)

تھا دور ایک منزل ابھی لشکرِ سحر — سرہنگ شب نے بھانپ کے دنیا کو دی خبر
شبنم کے قاصد آئے غباروں میں بیٹھ کر — ان سے صبا نے سن کے خبر کی وہ مشتہر
سرگوشیاں تھیں غنچوں میں "ہے کس کا انتظار"؟
جو رایتِ شفق ہوا مشرق سے آشکار

چپکے سے کیا نسیمِ سحر نے سنا دیا — غنچوں کے دل کو فرطِ طرب سے کھلا دیا
بادِ سحر نے معجزہ اپنا دکھا دیا — شبنم کے چھینٹے دے کے چمن کو جگا دیا
غنچے بھی کھل کھلا کے گلستاں میں ہنس پڑے
انگڑائی لے کے سرو بھی جیسے ہوئے کھڑے

رنگِ شفق سے تھا جو افق تک زرنگار — یکمشت گل نے کیسۂ زر کر دیا نثار
دلکش عروسِ باغ کا تھا حسن اور نکھار — صدقہ ہزار جاں سے تھی عندلیبِ زار
منہ شاہدانِ گل کے جو شبنم نے دھوئے تھے۔
سنبل کے بال بال میں موتی پروئے تھے

چھایا ہوا تھا دہر میں اک نور کا سماں — دھویا ہوا تھا آبِ رخِ حور سے جہاں
انجم کا آسماں سے کھسکا تھا کارواں — مہتاب کے بھی منہ پہ اڑی تھیں ہوائیاں
شب زندہ دارِ چرخ کا بھی رنگ فق ہوا
غالب ہر ایک رنگ پہ رنگِ شفق ہوا

نکلا جو خیمہ سے شہ گیتی ستانِ صبح — حاضر ہوئے سلام کو درباریانِ صبح
فوجِ شعاع لے کے بڑھا قہرمانِ صبح — لہرا رہا تھا پیلِ فلک پر نشانِ صبح
ڈنکا ہوا طیورِ چمن کی صفیر کا
اک غل تھا آمدِ شہ گردوں سریر کا

فوج شعاع کی ہوئی آمد کی جب یہ دھوم — تو ہو گیا فلک سے ہوا لشکر نجوم
مشرق میں یوں ہوا شہ خاور کا جب قدم — آنکھوں پہ رکھے سب نے قدم اسکے چوم چوم
اک دم میں شب کی تیرگی کافور ہو گئی
دُنیا چمک کے اِک کرۂ نور ہو گئی

ظہور انسان

یہ نظم ۶ اپریل سنہ ۱۹۱۲ء کو کہی گئی۔ خدا حضرت کیفی کو مدتوں سلامت رکھے کس موضوع کو کیا جامہ پہنایا ہے اللہ اکبر۔ سائنس کو شاعری کے پہلو میں لاکر بٹھا دیا۔ جو اصحاب اردو شاعری کے امکانات کے قایل نہیں وہ اس نظم کو غور سے مطالعہ کریں۔ خشک سے خشک اور مشکل سے مشکل موضوع کو دلچسپ بنا دینا اور تغزل کے رنگ میں ڈھال دینا سہل کام نہیں۔

جب اس عالم کی تکوین اور پیدائش کا وقت آیا — تو سب سے پہلے نور اس مہر عالمتاب نے پایا
حرارت اور کشش اس درجہ اس خورشید نے پائی — کہ جو شے تھی وہ اس کی جانب اپنے آپ کھچ آئی
محیط و مہر کے عنصر ہوئے قربان سب اس پر — طواف دائمی کرنے لگے گرد اس کے پر کھچ کر
ستارا مہر عالمتاب کا آفاق میں چمکا — بنا وہ خطۂ قدرت میں مرکز سارے عالم کا
بخار اور مائیات اس کے ادب سے چلتے تھم تھم کر — جمادی بن گئے آگ اور پانی تک بھی جم جم کر
جو سیلانی تھے سیالات ان کو ضبط میں لا کے — عطا کی کیمیائی عنصروں کو شکل ارض اس نے
نظام شمس کے اندر گئی جب یہ زمیں جکڑی — تو پھر نشو و نما کی مادے نے شکل اِک پکڑی
طبیعت میں بھری تھیں شوخیاں اور اچپلاہٹ تھی — غضب کی برق وش تھی اور چنچل تھی قیامت کی
بہت مدت سے قدرت نے اس کے حال پر چھوڑا — مگر بیٹی سے ماں نے رشتۂ الفت نہیں توڑا
اسے بھی رفتہ رفتہ اپنے دن سن کا خیال آیا — مزاج اس کا ذرا ٹھہرا طبیعت نے سکوں پایا
ہوئی خواہش اسے بھی اپنے تن کی پردہ پوشی کی — بنی پوشاک اسکی گھاس پات اور جڑی بوٹی

یہ بوٹیدار چُنری بھی رہی جب اُنگ پر اوچھی
تو پھر جنگل کی چادر اسنے سر سے پانو تک اوڑھی

مگر پھل پھول جو اس کے تھے ضائع کیسے ہو جاتے
نہ کیوں حیوان اس سے استفادہ کو جنم پاتے

مفکر گر ذرا سوچے تو یہ بھی کیسی حالت تھی
تصور میں کچھ آسکتی ہے خلقت کی جو صورت تھی

بھری تھی نکہتِ اول جب اس غنچہ میں اور گل میں
مخل صیاد تھا کوئی نہ جب گلگشتِ بلبل میں

چکوروں کو ہمیشہ چاند سے جب وصل رہتا تھا
قفس میں گل سے بلبل کو نہ ہرگز فصل رہتا تھا

جو پروانوں کو تھی تو حبِّ خالق کی لگن ہی تھی
نہ تھی جب شمع ہی جلتی نہ کوئی انجمن ہی تھی

ندی کے راگ میں تھی موہنی کی دھن بھری ساری
بلا تمیزِ وقت اور رُت کے وہ رہتا سدا جاری

ہوا دن رات سُر دیتی اُسے اور اس کا دم بھرتی
جہاں جاتی وہ اس کا راگ گاتی اور ثنا کرتی

زمیں پر پھول پھل اوپر یہ مہر و ماہ اور تارے
غرض دنیا کو روشن کر رہے تھے مل کے یہ سارے

جو سنگھ اور میش میں آفاق پر اک ربط باہم تھا
زمیں پر شیر اور بکری میں بھی کیا پیار کچھ کم تھا

مگر تکوینِ عالم نے نہ پائی اس پہ بھی تسکیں
یہ پیدا کر کے سب کچھ بھی نہ عالم کی ہوئی تزئیں

بھٹکتا پھر رہا تھا جوہرِ قدسی عناصر میں
سمایا تھا نہ نورِ پاک عالم کے مناظر میں

کمی یہ سلسلہ میں ارتقا کے جب نظر آئی
تو پھر تکمیل نے فطرت کی شکلِ انسان کی پائی

سُوکھا ساوَن

۱۲؍ اگست ۱۹۱۱ء

یہ نظم مختلف البحور ہے۔ یا کہیے کئی مثنویوں کا مجموعہ ہے۔ ہوا یہ کہ اس سال شمالی ہند خصوصاً پنجاب میں اساڑھ میں کچھ بارش ہو کر ساون سوکھا رہا۔ آخر میں کہیں جا کر کچھ چھینٹا پڑا۔ علامہ کیفی کی یہ نظم انکی قادر الکلامی اور واقعہ نگاری کی بے نظیر مثال ہے۔ مختلف حصے مختلف کیفیتوں کے مظہر ہیں۔

یہ کیفیت کبھی پہلے نہیں دیکھی تھی ساون میں
برستی کھیت پر ہے آگ خاک اُڑتی ہے گلشن میں

اساڑھ اور جیٹھ سے بھی بڑھ کر اب کے ساون آیا ہے
خزاں کا جس کے قدموں سے سماں دنیا میں چھایا ہے

نہیں سبزی برائے نام بھی ہے مرغزاروں میں
دم بسمل کی ہے مانند پانی آبشاروں میں

وہ کیا گھنگھور ساون کی گھٹائیں ہو گئیں یارب | کہاں برسات کی ٹھنڈی ہوائیں کھو گئیں یارب
سموم اور صرصر جانکاہ اب ساون میں چلتی ہے | برستی ہے آگ اوپر سے زمیں نیچے سے جلتی ہے۔
یہ ہو دو آتشہ عالم جو حرقت اور حدت کا | تو پھر کیوں سرد ہو جائے نہ دل رندوں کی ہمت کا
ہے آتش زیر پا اول تو اور پھر سو دعاؤں سے | چلی بھی گر ہوا رک کر تو اس میں لو کے ہیں جھونکے
ہیں صحرا کا جواب۔ اب رود۔ دریا۔ ندیاں۔ نالے | لب ساحل پہ خشکی اور گرمی سے ہیں تتخانے
یہی حالت رہی تو حال کیا ہوگا غریبوں کا | نہیں آتا مگر قدرت کو دھیان ان کم نصیبوں کا
کہو طاعون کے گر دفع کی تدبیر تم اسکو | رہیں گے جب نہ انساں ہی تو با پھر کھائے گی کسکو
ہمیں کیا کام قدرت کا نہیں حکمت سے گر عاری | یہاں تو کوچ کی سوئے عدم ہوتی ہے تیاری
ظہور وہ جب تک اس قدرت کی ہوگا پاک حکمت کا | لبوں پہ جان دم آنکھوں میں ہوگا ساری خلقت کا

اک آگ فلک سے ہے برستی | اک بوند کو خلق ہے ترستی
اے چرخ ترا نہ دل پسیجا | پتھر کا ترا ہے کیا کلیجا
کچھ ڈر نہیں اس میں ہم ہیں بشاش | غصے ہی میں۔ تو برس پڑے کاش
بجلی تو تڑپ جو چلبلی ہے | کیا گوش صنم میں کہہ رہی ہے
اے رعد کڑک سنا وہ باجی | پتا بادل کا کردے پانی
سورج میں فقط ہے تاب ہی تاب | زنجیر کا سلسلہ ہے بے آب
تالاب کی دیکھکر رکھائی | صحرا میں نکل کے مچھلی آئی
کیا اس سے زیادہ ہو تباہی | دریا میں ملی ہے ریگ ماہی
پانی نہروں میں اب کہاں ہے | ہاں دشت میں ریگ کچھ رواں ہے
چشم عاشق تو ہی برس پڑ | کل نوح سے کر رہی تھی گڑ بڑ
شاعر کے وہ سب ڈھکوسلے تھے | چار آنسو بھی آنکھ سے نہ نکلے
ہے تیغ نظر بھی اب تو بے آب | اب سیم بنا ہے جل کے سیماب
آئینہ کا بھی ڈھلا ہے پانی | تاریک ہے شکل زندگانی
پانی نہ ہے مزاج شعلہ خویاں | اب گل ہے چراغ شمع رویاں
اندھے کنوئیں سب کنوئیں ہوئے آہ | کرتے ہیں تیمم اب لب چاہ

خشکی سے اماں نہیں کہیں بھی ‌ ‌ ‌ بے آب ہے ہائے زمیں بھی
بھٹی کی طرح زمیں ہے تپتی ‌ ‌ ‌ جانداروں کی جاں ہے کلپتی
کیا عزم ہوں ان دنوں سفر کے ‌ ‌ ‌ پر جلتے ہیں طائرِ نظر کے
اس طرح جو چرخ کینے پہ ہو ‌ ‌ ‌ آنسو پی پی کے کیا بسر ہو
سیارہ شناس آہ کے ساتھ ‌ ‌ ‌ کہتا ہے زمیں پہ مار کر ہاتھ
مریخ و زحل ذنب میں آکر ‌ ‌ ‌ جا بیٹھے ہیں اب حمل کے اندر[1]
ساون کا تو رو رہے ہو رونا ‌ ‌ ‌ بھادوں بھی کہیں نہ جائے سوکھا

یہ کیسا چڑھا اب کے ساون خدایا ‌ ‌ ‌ سماں جیٹھ کا جس نے دل سے بھلایا
کہاں ہیں وہ گھنگھور اودی گھٹائیں ‌ ‌ ‌ کہاں ٹھنڈی ٹھنڈی سہانی ہوائیں
کہاں بادلوں کا گرجنا فلک پر ‌ ‌ ‌ کہاں بجلیوں کا کڑکنا چمک کر
کہاں امڈے گھرے وہ متوالے بادل ‌ ‌ ‌ زمیں پر کہاں چپہ چپہ وہ جل تھل
ہے پانی اگر اب تو ہے چشمِ تر میں ‌ ‌ ‌ پتا ہے اگر آب کا تو گہر میں
فلک سے جو خشکی کا پایا اشارہ ‌ ‌ ‌ کنوؤں کا بھی پانی ہوا دم میں تارا
کوئی بھاڑ میں ایسے ساون کو جھونکے ‌ ‌ ‌ کہ جس کی ہواؤں میں ہوں لو کے جھونکے
ہوئے خشک تالاب نالے گھٹے ہیں ‌ ‌ ‌ جو دریا ہیں ساحل سے پیچھے ہٹے ہیں
جمی لب پہ ساحل کے اب پپڑیاں ہیں ‌ ‌ ‌ نکلتی حبابوں سے اب بجلیاں ہیں
جو بارش کی اٹھتیں صدائیں جہاں سے ‌ ‌ ‌ تو برسی ہے آگ اور خاکِ آسماں سے
نہ اگلا سا رنگ اور بو ہے گلوں میں ‌ ‌ ‌ نہ وہ نغمہ سنجی ہے اب بلبلوں میں
پپیہے کی آنکھ اب سوئے آسماں ہے ‌ ‌ ‌ یہی دے رہا ہے صدا - پی کہاں ہے
نہ جھنکار ہے مور کی جنگلوں میں ‌ ‌ ‌ نہ ہیں وہ کلیلیں ہرن کی بنوں میں
تدروں کو اٹکھیلیاں اپنی بھولیں ‌ ‌ ‌ عنادل کو وہ بولیاں اپنی بھولیں
نہ کوئل ہی باغوں میں اب کوکتی ہے ‌ ‌ ‌ پڑی کوہساروں میں وہ ہوکتی ہے
ہے ٹوٹا ہوا مور کا دل اب ایسا ‌ ‌ ‌ کہ صحنِ چمن اس کے لیکھے ہے ٹیڑھا
جہانگیر ایسی ہوئی خشک سالی ‌ ‌ ‌ درختوں کی جاتی رہی تو ہریالی

[1] منگل، سنیچر اور راہو مکھ میں آ گئے تھے اور جب ایسا ہوتا ہے تو بروئے علمِ ہیئات بارش نہیں ہوا کرتی۔

بنے زعفراں پوش سبزان گلشن
دکھاتی ہے فصلِ خزاں اپنا جوبن

بیاں جسم کی کیا حرارت کا کیجے
اگر آبلہ پھوٹے تو آگ نکلے۔

وہ امریوں کی سیر ساون کے جھولے
دلوں سے زن و مرد کے صاف بھولے

نہیں بھاتے میگھ اور ملار اب کسی کو
ہے کجری سے بے اعتنائی سبھی کو

کسی سے نہیں راگ کی پینگ بڑھتی
نظر اب نہیں بات کوئی بھی چڑھتی

وہ پھیلی ہے خشکی جہاں میں سراسر
گماں زہد کا اب ہے تر دامنی پر

یہ کیا راجہ اندر کی ہے مہربانی
ہے جگ میدھ یگ کی مگر اس نے ٹھانی ؎۲

بیاں کیا ہو سکے گرمی کی حالت
قیامت ہے قیامت ہے قیامت

سنا تھا آگ اور پانی کا ہے بیر
جو پانی اب برس جائے تو ہو سیر

نہیں بچوں کی حالت دیکھی جاتی
زباں ہے منہ سے باہر نکلی آتی

وہ مارے پیاس کے ہیں یوں بلکتے
کہ جیسے ماہیئے بے آب تڑپتے

ہوئی ہے تو س سے زیرا انکی حالت
دئے جائیں کہاں تک انکو شربت

تو اچولھا جو بی بی کا ہے اوندھا
میاں کا بھی پڑا ہے سوکھا حقہ

بھلا حقہ سے کون اب مغز مارے
کہ جب ہر سانس سے نکلیں شرارے

ڈھلا دن اور اجل ماما کی آئی
کہ چولھا گور دیتا ہے دکھائی

پسینا تن پہ۔ پنکھا ہاتھ میں ہے
نہ آب و ہوا برسات میں ہے

یہ نکلی جس بھی اک دھکے کی ٹٹی
رہا کمرہ چھڑکنے پر بھی بھٹی

ہوا خوا ہی اڑی پنکھے کی ساری
کہ اس لئے کی ہے لو کی پاسداری

گزارہ شیر نے شربت پر ہے سب کا
بنا ہے مدّ فاضل گھر میں چولھا

بھلا برفوں سے کب یہ آگ بجھتی
یہ آب سرد سے اور الٹی بھڑکی

اسی برفاب کا سارا یہ پھل ہے
کہ پیدا ہاضمہ کا اب خلل ہے

ہوا ہے ماسکہ اکثر کا مختل
جگر بھی ہو گیا عضو معطل

کسی کو لگ گئے اسہال کبدی
کسی کی آ گئے ہیضہ نے خبر لی

کہیں پیچش کہیں تخمہ نے گھیرا
کسی جا نفخ نے ڈالا ہے ڈیرا

؎۲ وہ یگ یا جشن جس میں سارے جہاں کی قربانی دیجاتی ہے اسومیدھ یگ وغیرہ پر تصرف کیا گیا ہے۔

مصیبت جب ہے انسانوں پہ آتی　　تو ہے چاروں طرف سے گھر کر آتی
ہر اک کے آئے اوسان جا رہے ہیں　　وہ چہرے پھول سے کمھلا رہے ہیں
کبھی دیکھی نہ یہ موسم کی سختی　　یہ لائی رنگ اپنی سبز بختی

چرخ بدخو یہ کیا ستمرائی!　　تیری آنکھوں کا ڈھل گیا پانی
تجھ کو آتا نہیں ذرا بھی ترس　　بھول کر ہی سہی کبھی تو برس
کھیت میں کام کیا کسانوں کا　　ایک بھی جب نہ کھل کے مینہ برسا
ڈھور ڈنگر کے ڈھانچ آئے نکل　　بھوک کی آگ میں گئے ہیں پگھل
پیٹ بھر کر نہ جب ملے چارہ　　کیا چرے بس بیچے بیل بے چارہ
اس سے حالت ہو گیا جہاں کی خراب　　گئو ماتا کا دودھ سے ہے جواب
تنگ سارے وحوش و انساں ہیں　　ہوش گاوِ زمیں کے پرّاں ہیں
اور دیکھئے زمین سے کیا آس　　اب کے ساون میں کیمیا ہے گھاس
جان سے تنگ آ گئے دہقاں　　مینہ کا پاتے نہیں ہیں جب ساماں
۵۳ ڈک کے قولوں کو یاد کرتے ہیں　　اس طرح دل کو شاد کرتے ہیں
دل مگر سب کے ہو رہے ہیں نراس　　اوس سے بھی کبھی بجھی ہے پیاس
آج کل جاؤ گاؤں میں تم اگر　　تو تماشہ یہ دیکھو وقت سحر
ایک اونچی جگہ پہ پیر و جواں　　جمع ہو کر ہیں سب نظارہ کناں
دیکھتے ہیں ہوا کا رُخ سارے　　ابر کے پیچھے گنتے ہیں تارے
اک جھگڑ بھی ان میں ہے موجود　　وہ پس از حمد و وصف ربّ ودود
پہلے تو کچھ خموش رہتا ہے　　پھر یہ لاٹھی ہلا کے کہتا ہے۔
جو یہ بادل ذرا ادھر کو ٹلے　　اور ہوا یہ ادھر کو ہو کے چلے
اس میں آ کر ملے جو پُروائی　　برسے بھرپور مینہ ارے بھائی
اور جو ساون یہ چل دیا خالی　　پیٹیں پھر سر کو بھٹکر ہالی
برسے بھادوں تو کیا بھلا ہو گا۔　　خاتمہ سب خریف کا ہو گا ہو
جب نہ پائے امید کے آثار　　ہو گے مایوس تو لے سارے گنوار

۵۳ ڈک کو تیں [illegible] کا نام ہے۔

ڈک کو تھے سو سو گالیاں دیتے — اور بھبڑ لی کے لتے تھے لیتے
کیوں نہ مایوس ہو کے بگڑے من — سوکھا ٹالے جو اس طرح ساون

خلقت کا ہے ناک میں دم — آنکھ میں بھی باقی نہیں نم
سب کو ہے دھڑکا آیا کال — اب کیا ہوگا اپنا حال
شادی بیاہ رُکے ہیں سب — کس کو خوشیاں سوجھیں اب
سیانوں کا ہے بگڑا رنگ — ہیں معصوم بھی سب دلتنگ
سب کی آنکھ آکاش پہ ہے — رحمت کے پرکاش پہ ہے
خالی نہ جائے ان کی دُعا — کہتے ہیں بچے ہاتھ اُٹھا

برسو رام جھبڑا کے سے
بڑھیا مر گئی فاقے سے۔

قصیدہ دربار تاجپوشی

دسمبر سنہ ۱۹۱۱ء میں شہنشاہ جارج پنجم نے بنفسِ نفیس تشریف لاکر دہلی میں دربار تاجپوشی کیا۔ اس موقعہ پر ملک کی ہر زبان کے شعراء کو اس تقریب سے متعلق نظم لکھنے کی دعوت دی گئی۔ اردو نظموں میں علامہ کیفی مدظلہٗ کا یہ قصیدہ بہترین قرار دیا گیا۔ حضرت کیفی نے تمام عمر میں یہی ایک مدحیہ چیز لکھی ہے۔

آمدِ شاہ بہاری کا سُنا شور جو کل — باغِ عالم میں پڑی ایک سرے سے ہلچل
ہو سکے کب صفتِ موکبِ سلطانِ بہار — دیکھکر جسکو ملائک نے کہا صلِّ وَ جَل
سب کے آگے تھا الصدشان نشان کا ہاتھی — پیل گردوں پہ علم کھولے ہوئے تھے بادل
تھے پرے ابر کے گھوڑوں پہ ہوا کے جو سوار — شوخی طراری میں بجلی سے سوا تھے چنچل

کڑکا اپنا جو کہا رعد کے گرد گیتوں نے ۔۔۔ اشہب چرخ کا چمکا نہیں کیا کیا کوتل

صاعقہ نے وہ تڑاقے کی اڑائی تسلک ۔۔۔ کہ گیا خرمن آرام خزاں کا سب جل

پر شہیب ایسی بھی گردوں کے دمامہ کی صدا ۔۔۔ کہ زمیں گاو زمیں کے گئی قدموں سے نکل

کڑکے وہ رعد کے چاوش کہ گونج اٹھا چرخ ۔۔۔ فوج حُسّاد چمن کا بھی گیا قلب دہل

آئے فراش سپہر امڈتے ہوئے ہر سو سے ۔۔۔ خیمہ اک نصب کیا سر بفلک دل بادل

شرق اور غرب سے جاروب کش آئے چالاک ۔۔۔ خس و خاشاک گیا ساحت گیہاں سے نکل

مخبر آمد شاہی تھا نقیب طاؤس ۔۔۔ اس کی جھنکار ہوئی آمد شہ کا سگنل

آیا سقائے فلک ساتھ لئے ابر مطیر ۔۔۔ ایسا چھڑکاؤ کیا ہو گیا دم میں جل تھل

اس طرح شاہ بہاراں کی سواری آئی ۔۔۔ پھر گئی آنکھوں میں شان کرم عز و جل

داخلہ باغ میں اس شان و تزک سے جو ہوا ۔۔۔ خیر مقدم کا وہاں بھی ہوا سامان سجل

سرو و شمشاد سنبھالے تھے یمین اور یسار ۔۔۔ تھا جو طاؤس جلو میں تو ہراول ہریل

اٹھے سکان چمن سر کی تواضع کے لئے ۔۔۔ سرو قد اٹھ کے صنوبر ہوا سب سے اول

سبزہ بیدار ہوا غنچہ نے کھولیں آنکھیں ۔۔۔ لیس بلبل کے بگل سے تھے سوار اور پیدل

نکلا سنبل بھی خیاباں سے لئے اپنا چنور ۔۔۔ چتر شاہی لئے تالاب سے آ پہنچا کنول

مور چھل لیکے چلا فخر سے رقصاں طاؤس ۔۔۔ جس کی رفتار پہ پریوں کا بھی دل جائے پھسل

لیکے سورج مکھی ورتاج[۱] یہ صد شان چلا ۔۔۔ بادکش لیکے صبا آئی بہت مستعجل

چوبداروں کی روش لیکے چلا سرو عصا ۔۔۔ ٹھاٹھ گلشن میں رہا گرچہ سدا اس کا اچل

مور آئے جو سپر دل پر لئے کلغی شاہی ۔۔۔ نازبو طرہ لئے شوق سے پہنچی پیدل

زر گل نذر کی خاطر لئے گلبن اٹھے ۔۔۔ لالہ اسپند بنا اور بنا گل منقل

فرش رہ راہ عقیدت سے ہوئی جو نرگس ۔۔۔ اس کے اس فخر پہ حاسد ہوئے آہوئے چل

زر بچھاور کیا گل نے تو شمن نے موتی ۔۔۔ سبزے نے آ کے بچھایا وہیں فرش مخمل

غنچوں نے آمد شاہی کی سلامی سر کی ۔۔۔ کرنا پھونکی پپیہے نے جو کوکی کویل

آبشاروں نے کیا آئینہ بندی کا انتظام ۔۔۔ آتش گل نے درخشاں کئے سب دشت و جبل

رعب و تمکین شہی کا نہ رہا اسکو خیال ۔۔۔ سنکے یہ مژدہ بڑا جوش سے فوارہ اچھل

چادر آب رواں نہر نے دی اپنی بچھا ۔۔۔ چاندنی ہاتھوں کو بس رہ گئی اپنے مل

[۱] سورج مکھی کے پھول کو فارسی میں ورتاج کہتے ہیں

اس قدر شوق تھا دیدار شہی کا سب کو — دخت رز توڑ کے نکلی تھی در شیشہ محل
بلبل و طوطی و طاؤس نے گایا و لکم — مل کے سُر شیر و شکر ہو گئے تیور و کومل
شان میں آج کے دن کی وہ سناؤں مطلع — جوہری جس کو سخن کے کہیں سب نے ادل

مطلع ثانی

آج ہے فصل بہاراں کا گلستاں میں عمل — کھل گیا بلبل تصویر کے دل کا بھی کنول
خط گلزار میں لکھوں جو ثنائے شہ گل — روش باغ کی مانند ہو دلکش جدول
گلشن میں آج ہر اک شان ہیں جنت کی نظیر — ہر چمن فیض بہاراں سے بنا ہے اچھبل
زاہد خشک کا دل ہو گیا پانی پانی — اس طرح جھومتے آئے ہیں فلک پر بادل
طبع مشاط کی جدت ہے وہ یا جوش نمو — آہوئے چشم کی شاخوں میں بھی پھوٹی کونپل
کھولدیں آج عناصر کی صبا نے آنکھیں — آتش گل کے دھوئیں سے ہے لگایا کاجل
آج مستی کی ہوا میں ہے کچھ ایسی تاثیر — کہتی ہے سرو سے قمری کہ ذرا دیکھ سنبھل
اودی اودی ہیں وہ گھنگھور گھٹائیں چھائیں — زہد میں زاہد صد سالہ کے آیا ہے خلل
کچھ صبا نے کہا اور ہنس پڑیں ساری کلیاں — بلبل زار کا فقرہ گیا اک بات میں چل
اب تو سنبل کو ہے الجھن نہ ہے لالہ کو جلن — کیا گئے جملہ خواص آج عناصر کے بدل
تلتی ہے موتیوں میں آج کلی موتیے کی — آب و تاب اس کی زمانہ میں ہوئی ضرب مثل
خوشۂ تاک سے پروین کو ملا ہے جھومر — عرش پر رکھے دماغ آج یہ مٹی کا محل
جوڑے باغ آنکھ نہ کیوں کاہکشاں پر پارے — انجم رخشاں بھی حبابوں سے ہوئے ہیں اوجھل
ہیں مہادیو شہادت میں اٹھائے گنگا — آب نہر ایسا لطیف اور ہے ایسا نرمل
قمری و طوطی و بلبل باہم نواسنج طرب — گنگناتا ہے ترانہ کوئی گاتا ہے غزل
مترادف ہیں گلستاں میں بہار اور برسات — چیتی اور کجری کا ٹھہرا ہے تفاوت مہمل
میگھ گاتا ہے کوئی۔ کوئی بہار اور ملار — نغمہ سنجوں کا گلستاں میں بندھا ہے دنگل
تان سین اسکو کوئی سمجھے کوئی مصری رام — ہوشربا ریز ترنم جو یہ طوطی بمثل
بارے سرخاب جگر تفتہ کی پیاس آج بجھی — کیوں نہ ہر قطرۂ باراں ہو اُسے گنگا جل
اندھے ساون کے ہیں یکرنگی کے شیدا گویا — نظر آتی ہے انہیں چار طرف ہریاول

آج کثرت میں وہ وحدت کا اثر ہے ساری
ہر درخت آج دکھاتا ہے سماں جھرنے کا
سیر کے پنکھے کا ہر برگ شجر پر ہے گماں
پھول والوں کی نہ کیوں سیر ہو سیر گلشن
آب پر ہوتی ہے کی اب صفت طفل بہر شک
شان خلاق وہ پیدا ہے ہر اک چیز میں آج
آج کل پینگ بڑھی ہے وہ گل و بلبل میں
دیکھکر آج عروسان چمن کا جوبن
سن کے توصیف نوا سنجئے مرغان چمن
حوض کی آب پہ کوثر بھی ہے پانی پانی
تن بدن سے تو پھٹا پڑتا ہے جوبن اس کا
صدقہ بھونرا ہے تو بلبل بھی ہے قرباں اسیر
آج گلشن میں ہے وہ نشہ عشرت کا اثر
مسکراتی ہے کلی۔ مارتی ہے نرگس آنکھ
اس قدر ولولہ انگیز ہے اب باد بہار
سیر چڑھا جام سے۔ گر جام میں بینا سی گرا
صرف نرگس ہی کی گلشن میں نہیں چار آنکھیں
لگ چلی تاک سے اور جھومتی پھرتی ہے نسیم
وہ پلک ور رہا ہے سلطان بہاراں کی نظر
کر دیا ایک ہی گردش میں زمانے کو نہال
مقدم شاہ بہاری کی صفت ہو کس سے
تھا میں اس عالم محویت کامل میں غریق
ہوش میں آ تو اسے محو گل و نسریں و سمن
دیکھ تو آئی ہے کیا ہند کے گلشن میں بہار
نور کا مطلع سناؤں وہ تجھے اے مدہوش

دو کی جا دیکھتی ہے ایک ہی چشم احول
اس کی ہر شاخ سے جھڑتا ہے وہ پانی نرمل
اس کی آب اور جھلا جھل پہ نظر جائے پھسل
جائز از روئے بیاں گر ہے مجاز مرسل
گود میں سیپ کی جاتا در غلطاں ہے مچل
گر مرے پارہ تو اکسیر بنے اس کا بدل
شاخ گلبن کے ہیں جھولے پہ بہم دست و بغل
غرق دریائے خجالت میں ہوا ہے سنگل
راجہ اندر کے اکھاڑے نے بھی چھوڑا دنگل
کھاتا ہے اس کی لطافت کی قسم گنگا جل
کیا سنبھالے جوئے باغ آب رواں کا آنچل
شاہد گل ہے گلستاں میں اک اٹھتی کونپل
غنچے کہتے ہیں صبا سے کہ ذرا دیکھ کے چل
مست چالوں پہ صبا کی یہ چمن میں ہے چہل
نشہ مے میں تو صراحی میں وہ اٹھتی ہے ابل
اٹھتے جوبن کی طرح بادہ بھی جاتا ہے اچھل
سبزہ خفتہ بھی اٹھ بیٹھا ہے اب پل کی پل
ایک اک دانہ انگور ہے اک اک بوتل
باغ عالم کا گیا رنگ سب اک پل میں بدل
ہاتھ خالی جو تھے وہ بن گئے اب اہل دول
آج جنگل میں ہوا فیض سے اس کے منگل
کہ صدا کانوں میں اک آئی کہ اے مست ازل
اٹھ کے سن تو سہی کہتی ہے یہ کیا بانگ دہل
وہمی گلشن سے نکل چھوڑ تخیل اک پل
ہو سکے مطلع خورشید بھی جس کا نہ بدل

مطلعِ ثالث

آج ہی ہند میں کیا عیش و مسرت کا عمل — مقدمِ شاہ سے نقشہ گیا عالم کا بدل
ہند میں آج شہنشاہ کے آئے ہیں قدم — شاہِ خاور سے منور ہوا۔ یا۔ برجِ حمل
لائی ہیں قیصرہ بھی ہمرہ قیصر تشریف — شفقت اور نیکیاں جن کی ہیں یہاں ضرب مثل
ذات ہے مجمع اوصاف حمیدہ جن کی — خلق حسنہ کا نہیں جن کے۔ زمانے میں بدل
رات دن جن کی قلمرو کے ہے صدقے خورشید — پھر بھی وسعت کا معمانہ ہوا اس کی حل
فرِ سلطانئے قیصر کا بیاں ہو کس سے — شہریاران جہاں اس کے ہیں اک عبدِ اقل
زبدۂ تاجوراں زیب وہ تخت و نگین — دفترِ ماضی و حالیہ کا فرد اکمل
منظرِ خسرو عادل سے برستا ہے وہ نور — جس سے آئینہ دلِ زہد کا پائے صیقل
مدح حاضر ہیں وہ لکھوں میں اب اشعار لطیف — سامنے ٹھہریں جو نقادِ سخن کے افضل
راز عالم ہے عیاں کار خلافت سے رواں — بخشا قسام ازل نے وہ تجھے علم و عمل
ادنےٰ منشی ترا ہم پلہ ابوالفضل کا ہے — تیرا عامل ہے ہر اک رشکِ وہ ٹوڈر مل
آج گر رستم و سہراب سے ہوتے شہزور — باندھ لاتا انہیں دم بھر میں ترا اک کرنل
رعبِ شاہی وہ ٹپکتا ہے ترے چہرے سے — سہم کر کوہ بھی ہو سامنے تیرے خردل
ہے کیڈٹ کور کا بانکا وہ جواں ایک سے ایک — اکبری مان کا بھی سینے میں دل جائے دہل
ایسا ہے کر و فر اور شوکت و جبروت تیری — جس سے اوسان ہوں شاہانِ جہاں کے مختل
منبع جود و سخا مرجع اہل حاجات — قبلہ بذل و عطا کعبۂ امید و امل
دید سلطان ہیں قسمت سے ہوئی آج نصیب — ہند کے دل کا کھلا فرط مسرت سے کنول
صرف انساں ہی نہیں دید سے شاداں — بحر و بر آج خوشی میں ہیں برج کا منڈل
کون ہے جو نہیں سلطان کے قدموں پہ نثار — سیر گلشن کو توجہ ہو جو تیری بمثل
رگ گل رشتہ بنے جگنو بھی دے جوت جگا — داخل طشت چمن آ کے ہوں کیسر صندل
آتشِ گل کو دم بادِ صبا بھڑکا دے — لالہ بھی کھول کے دل اپنا نکالے گوگل
غنچۂ یاسمن انگشت بنے اور پھول کھلیں — جب بنیں ہونگے وہ نذر شہ مسعود ازل
موگرا سوز دل صاف سے کا نور بنے — آرتی کا تری ساماں یہ کرے باغِ سبھل

ٹیکا گیند اکرے اور مونتیا پہنائے ہار
برگ اشجار بجانے لگیں خوش ہو کر جھانجھ
پھونکے طاؤس مسیحا نفس ایسا ناقوس
اس طرح آرتی ہو تیری چمن میں اے شاہ
تخت تا بخت دہلی تھا بہت چشم براہ
تھا بھورا جہاں زینت وہ بزم شاہی
تغلق اور خلجی کا ہے یاد جسے جاہ و جلال
تخت وہ وہی ہے جسے شاہ جہاں نے زینت
منتظر تھا ترے قدموں کا کبھی سے وہ تخت
آج دن اس کے پھرے پھر وہ ہوا ہے آباد
تاجپوشی ہو مبارک تجھے شاہ قیصر
تیرے درشن سے ملی ہم کو جہاں کی لذت
فخر وہ آج ہمیں بخشا ہے تو نے اے شاہ!
کیا ہے یہ تخت۔ ہے اس تخت پہ قیصر کا جلوس
دل میں ہے ہند کے اے شاہ ترا تخت بچھا
ہو سکے کس سے بیاں شوکت دربار شہی
نہیں ممکن کہ زمانے میں ملے تیری نظیر
طول اچھا نہیں کر ختم دعا پر کیفی
یا خدا زیب خلا دہر میں جب تک ہی ہوا
ابر کے مس سے بنے چرخ پہ جب تک بجلی
ہند پر سایہ کئے ہے یہ ہمالہ جب تک
آریہ ورت میں گنگا رہے جب تک کہ رواں
جب تلک عدل و عطا شان جہانبانی ہے
باوفائی سے رعایا کا ہو جب تک کہ فروغ
قیصر و قیصرہ باکام رہیں عالم میں

پھول برسائے چنبیلی ہمیں بھر بھر آنچل
باغ گونج اٹھے پدم ایسے بجائے مندل
تھم باغبانی کا کرے جو دل مردہ پہ عمل
راز انساں کی عقیدت کا تو پھر ہے اٹکل
زیب وہ جس کے عدد شستر سے ہوئے ہیں اکمل
جس کے سایہ میں کئے چندر نے وہ نکتے حل
داوری کر گئے صدیوں جہاں شاہان مغل
خوش مذاقی کا ہے اک جس کی نشاں تاج محل
اختر سعد سے قسمت گئی آج اس کی بدل
اس پہ نازل ہوا اب پھر کرم عز و جل
شجر عہد ترا سبز رہے لائے پھل
بن گئے ہم ترے دیدار سے ارباب دول
نقد جاں اس پہ ہو قرباں تو ہی زیبا۔ یہ محل
جسکو احساس کا جذبات کا کہتے ہیں محل
کوئی طاقت جسے کر سکتی نہیں متزلزل
کانپتے جس کے تصور سے ہیں مریخ و زحل
لاکھ ڈھونڈیں مہ و خورشید کی لیکر مشعل
کیونکہ ہے اس کے سخن سنجی ہی لغو اور مہمل
بحر کی بنتے ہیں تبخیر سے جب تک بادل
خیرہ نظروں کو کرے برق کی جب تک جھل بل
جب تلک برف کا سر پر رہے اس کے آنچل
اور رمتا رہے پانیوں میں گنگا جل
جب تلک خسرو عادل ہے مسعود ازل
جب تلک امن و اماں سے ہے ترقی دول
قاف سے قاف تک ان کا رہے حکم اور عمل

جارج پنجم رہیں تا حشر سلامت یارب
خرّم و شاد رہیں راج رہے ان کا اٹل

انقلاب

(۹ر اکتوبر ۱۹۱۱ء)

یہ نظم اُس وقت کے نسوانی مذاق کی سچی تصویر ہے عورتوں کی آرائش اور تزئین نئے کلچر کے زیر اثر اڑ گئی تھی۔ مسی اور مہندی کے ساتھ پردہ بھی اڑ رہا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یوں سمجھئے کہ چادر کا پہلا رنگ دھو کر اتار دیا گیا تھا۔ اور نیا رنگ ابھی تک نہیں چڑھا تھا۔ نیا رنگ چڑھ کر جیسا کہ اب نکھرا ہے آپ دیکھتے ہی ہیں۔

اگلی سی اب حسینوں میں رعنائیاں نہیں
وہ دلفریبیاں وہ دل آرائیاں نہیں

یکرنگی ایسی حضرت نیچر کو بھا گئی
اگلی سی حسن و عشق میں جھک جھوریاں نہیں

دزدِ حنا اسیر ہے قید فرنگ میں
دل پر دراز دستیاں اس کی عیاں نہیں

حدّاد سیخ جعد بناتے ہیں رات دن
سوداز دوں کے پانو میں اب بیڑیاں نہیں

رنگِ حنا بھی جس کف نازک کو بار تھا
اب بوٹ اور موزے بھی اس کو گراں نہیں

رہرو کا راہ دیکھ کے جس سے پتا چلے
اب نقش پا میں پہلی سی وہ شوخیاں نہیں

ٹھوکر سے اب حسینوں کی کیا حشر ہو بپا
پازیب اور چھڑوں کا ہی باقی نشاں نہیں

کالر ہے چشم شوق سے اسکو نہاں کئے
گردن کی اب صراحی میں وہ مستیاں نہیں

فیشن جو رنگ پان و مسی کے خلاف ہے
تو پوڈر اور پینٹ پہ بھی مہربان نہیں

تحریر سرمہ ٹھہری ہے اب سر بسر غلط
برقِ نگہ میں اگلی سی وہ تیزیاں نہیں

افشاں بھی مہ جبینوں کی نظروں سے گر گئی
انجم میں نام کو بھی چنیں و چناں نہیں

مشاطہ اور سولہ سنگار اب نہیں بکار
گلگونہ روئے حسن پہ شعلہ فشاں نہیں

عارض پہ زلفیں دوش پہ گیسو نہیں رہے
بھائی وہ سادگی ہے کہ جس کا بیاں نہیں

گھونگھٹ صفیں مژہ کی ہیں کھاتے ہوئے مگر
بھالے میں اب نگاہ کے نوکِ سناں نہیں

ابرو کی تیغ میں وہ روانی نہیں رہی
تیر نظر میں اب وہ بھری بجلیاں نہیں

ہتھیار چھوڑ بیٹھے حسیں اپنے کیا سبب
قانون اسلحہ تیغ ادا پر رواں نہیں

ٹینس کا شوق اور کبڈی سے ذوق ہے
تفریح کا مقام وہ بام مکاں نہیں

کانوں سے گر کے بازوؤں میں آگئیں مگر
اب حُسن کے بھنور میں کوئی مچھلیاں نہیں

وہ دن گئے کہ قول یہ شاعر کا ٹھیک تھا
غائب کمر حسینوں کی ہے اور دہاں نہیں

وہ سہم وہ جھجک وہ حجاب اب نہیں رہا
فانوس برقی شمع کا کچھ پاسباں نہیں

پردہ جو اُٹھا بیچ سے تو اڑ گئی دوئی
اب شوق دید کی وہ جگر کاویاں نہیں

ممبر پہ چڑھ کے آپ وہ کرتے ہیں وعظ و پند
اب ناصح شفیق کی حاجت یہاں نہیں

تصنیف لیکچر۔ اور رہے ہر دم مطالعہ
وہ جلنے دیتے ایک گھڑی رائیگاں نہیں

عاشق کو اب حسینوں سے ملتا ہے یہ جواب
کہدو کہ دلربائی کی فرصت یہاں نہیں

اٹلس سے نام خلخ[1] و نوشاد مٹ گیا
نقشوں میں اب چگل[1] کا کہیں بھی نشاں نہیں

اب شاہدانِ پیرس و لندن کا راج ہے
اگلا سا گھر بتوں کا یہ ہندوستاں نہیں

برپا یہاں بھی ووٹ کی ہو جنگ زرگری
اشکال کا کسی کو بھی اس میں گماں نہیں

کیا دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا بدل گئی
گویا وہ اب زمیں نہیں وہ آسماں نہیں

کیفی یہ رونا روئیں تو ہم کس کے سامنے
اب کوئی ہمصفیر نہیں رازداں نہیں

---

[1] خلخ۔ نوشاد۔ اور چگل۔ کلاسیکل شاعری میں حُسن کیلئے ضرب المثل ہیں۔

یہ نظم فروری سنہ ۱۹۱۱ء کو لکھی گئی۔ دنیا بھر کے شعراء نے بقدر ہمت اسی موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے لیکن صلاحیت ہواسات نے جو حضرت کیفی کا خاص رنگ ہے اس نظم کو اسی موضوع کی دیگر بے شمار نظموں سے ممتاز کر دیا ہے۔ شاعر کو عشق ہر انداز میں قابل ستائش نظر آرہا ہے خواہ حقیقی یا مجازی یا مامتا ہو۔ اور وہ ازبس دل نشیں طریق سے تاریخ اور روایات زمانہ سلف سے مثالیں پیش کر کے یہ ظاہر کرتا ہے کہ عشق خواہ بندے کو خدا سے ہو یا کسی سرور دیں کو اپنی امت سے۔ خواہ معشوق مجازی سے ہو یا اپنی اولاد سے بیٹے کو باپ سے ہو۔ یا بیوی کو خاوند سے ہو۔ مگر غرض سے ملوث نہ ہو۔ پرستش کے قابل ہے۔

بزم میں ہے تذکرہ میں آج کیا کہنے کو ہوں
دل میں ہے جو کچھ مرے وہ برملا کہنے کو ہوں

دعوت روح آج میں احباب کے کرتا ہوں پیش
خواں یغما پر عزیزوں کو "صلا" کہنے کو ہوں

ہوں میں کہنے کو جنوں ہی ہے کلید قفل دل
اور اس چاک گریباں کو قبا کہنے کو ہوں

تم تو اینٹ اور پتھر دل کو پوجتے ہو رات دن
عشق کو لیکن میں اب نور ہدیٰ کہنے کو ہوں

رحم آتا ہے مجھے حالت پہ معشوقوں کی آج
کیونکہ میں عشاق کو جادو نوا کہنے کو ہوں

چاہتا ہوں وصل سے تعبیر کرنا موت کو
وصل سے ہجراں کو لذت میں سوا کہنے کو ہوں

ضبط اور جذب اثر کے راز کو کرتا ہوں فاش
نالۂ شبگیر کو تیغ ادا کہنے کو ہوں

میں کہونگا تھی زلیخا شرم اور تمکیں کی جان
گوہوں کی حرکتوں کو میں حیا کہنے کو ہوں

میں دکھاؤں گا کہ ایک اور ایک ملکر ایک ہے
دو کو لاتعداد اور بے انتہا کہنے کو ہوں

گوش محویت سے سن رکھو سناتا ہوں جو میں
آج میں ایک قصۂ حیرت فزا کہنے کو ہوں

تم نے آنا بھی کبھی سوچا کہ یہ کیا چیز ہے؟
جوہر ارض و سما ہے عشق یا ناچیز ہے؟

اپنے آئینہ میں شکل یار دکھلاتا ہے عشق ۔۔۔ اپنے جوہر میں رُخ دلدار چمکاتا ہے عشق
لاکھ بھوساگر کو سکھ ساگر بنا دیتا ہے یہ ۔۔۔ یکدلی یکرنگی ۔ انسانوں میں پھیلاتا ہے عشق
توپخانوں سے نہیں کرتا یہ قایم اتحاد ۔۔۔ دل میں چنگاری عداوت کی بجھا جاتا ہے عشق
نوک پیکاں سے کبھی کھینچا نہ اُسنے نقش صلح ۔۔۔ خواہشوں کو صورت بارود بھسماتا ہے عشق
اس کی تسخیر غیریت کی ایک خاصیت ہے اور ۔۔۔ غیر کی آنکھوں میں اپنی شکل دکھلاتا ہے عشق
اس میں کچھ باقی نہیں رہتا تمیز و اختلاف ۔۔۔ عاشقوں کو جامہ معشوق پہناتا ہے عشق
دل کسی صورت پہ مٹ جائے تو ہوتا ہے یہ حال ۔۔۔ ہر مرقع میں وہی تصویر کھینچ آتا ہے عشق
اپنے آپے کی نہیں رہتی ہمیں سُدھ اس لئے ۔۔۔ لوح دل پر سے دوئی کا حرف کھا جاتا ہے عشق
شخصیت عاشق کی خاکستر ہوئی جس آگ سے ۔۔۔ سینہ معشوق میں بھی اسکو بھڑکاتا ہے عشق
تیر جس ترکش سے آکر دل میں بیٹھا ایک کے ۔۔۔ دوسرے کا دل اسی پیکاں سے برماتا ہے عشق

جب کوئی ہو جائے داخل عشق کے دربار میں
پھر تمیز اسکو کہاں رہتی ہے رام اور مار میں

جلوہ افگن عشق دل میں ہو تو پھر کیا چاہیئے ۔۔۔ مرکز کون و مکاں اس دل کو کہنا چاہیئے ۔
کوری باتیں ہیں حکیموں کی نہ ان پہ جاؤ تم ۔۔۔ عشق کیا شے ہے؟ کسی عاشق سے پوچھا چاہیئے
یہ دیا تھا[۱] آکے اودھو نے کشن جی کو جواب ۔۔۔ تیرے بھگتوں کی تجھے گرد دلوانی رادھا چاہیئے
ہو کمال عشق میں کس کی طلب مطلوب کون ۔۔۔ جائے تصویر آئینہ میں شکل زیبا چاہیئے ۔
عاشق صادق تجسس میں پھرا کرتے نہیں ۔۔۔ چیز جو کھوئی ہوئی ہو اسکو ڈھونڈا چاہیئے ۔
عشق اپنے سے جو ہو جائے تو پھر کیا پوچھنا ۔۔۔ کیف اس جام محبت کا بھی دیکھا چاہیئے ۔
آج کل بھی محبت گرچہ نادر چیز ہے ۔۔۔ اب بھی یوسف ہیں بہت لیکن زلیخا چاہیئے
ہو محرک عشق کی خواہش تو وہ کب عشق ہے ۔۔۔ دائرے سے عشق کے خارج تمنا چاہیئے
آب حیواں پی کے پینا چاہتے ہیں سم کا گھونٹ ۔۔۔ موت سے قبل اہل دنیا کو مسیحا چاہیئے ۔

---

[۱] کشن جی کا زمانہ طفولیت برج کے علاقہ میں گذرا ۔ پھر وہ دوارکا چلے گئے ۔ مگر برجباسیوں کے دل اسی معصوم جذبہ محبت کا گہوارہ بنے رہے ۔ محویت کا یہ عالم ہو گیا کہ لوگ زندگی کے معمولی اشتغال تک چھوڑ بیٹھے رادھا کی کیفیت امتیازی تھی ۔ اودھو کشن جی کا بڑا معتقد تھا مگر اس کا مسلک دوسرا تھا ۔ انہوں نے اسکو بھیجا کہ برج والوں کو اس رستہ سے ہٹائے

ان بتوں کے عشق ہی میں تم اگر پتھر بنو۔ — اس سے بڑھ کر اور دنیا میں تمہیں کیا چاہیئے

تم سمندر میں اگر غوطہ لگا سکتے نہیں
تو کبھی اس بے بہا گوہر کو پا سکتے نہیں

عشق کے عالم میں کیا دخل اختلاف اضداد کا — ایک رتبہ ہے یہاں پہلاد اور فرہاد کا
کیا مجازی اور حقیقی ہیں یہ تفریقیں غلط — عشق عشق بے غرض ہے قول ہے استاد کا
جب نہیں احساس دکھ سکھ کا تو پر مانند ہے — اس چمن میں کام کیا ہے بلبل ناشاد کا
وصل کی خواہش ہے تو پھر وصل کے عاشق ہو تم — عشق سے کیا کام ہے اس کام کی اولاد کا
شکوہ کرنا ہے تغافل کا تو تم جانو مگر — مت اچھالو نام عشق نام ذہنگ آزاد کا۔
توبہ توبہ عشق اور یہ شکوہ جور و جفا — عشق کیا ٹھہرا کہ ٹھہرا خنجر اک جلاد کا
اسکو ہر شے میں شبیہ یار آتی ہے نظر — ہاتھ کب تکتا ہے عاشق مانی و بہزاد کا
سالمات عنصری میں شکل یار آئے نظر — پھر دماغ اسکو کہاں ہو یا دیا فریاد کا
آئینہ میں بھی کبھی دیکھی ہے تم نے شکل غیر — کیا دل صافی میں دخل اغیار یا حساد کا
گر مجسم دل بنو آب و ہوائے عشق میں — تو اٹھاؤ لطف تم اس جانفزا افتاد کا

اس لگی کو آگ جس دل میں لگے جانے وہی
آپ کو کھویا ہو جس نے اس کو پہچانے وہی

بیستوں پر ہو گئی جب تک نہ دار و بیر زن — ذات شیریں کی جدا تھی اور جدا تھا کوہکن
دم سے تیشے کے دوئی کی ہو گئی دم میں نفی — ہو گئے ایک روح مطلق تھے جو یکجان و دو تن
بر جباسی آ گئے جمنا پہ نہانے جب کبھی — عکس اپنا ان کو آتا تھا نظر شکل کشن
باپ یول اٹھا نہ مائدہ میں ڈوبنگا جان ڈال — جب ہمایوں موت کے بستر پہ تھا صید محن
کس طرح معشوق عاشق بن گئے اک شکل عشق — ہیں شہادت اس کی خاک بغداد اور آب جمن
ہم نے دیکھا بت بنا عاشق صنم کے سامنے — آپ سے انسان کب ہوتا ہے کوئی حرف زن
عشق صادق نفس امارہ کو کرتا ہے فنا — عشق وارماں عشق و حسرت میں ان کا ہی کٹھن
عاشقوں کو زندہ جاوید کر دیتا ہے عشق — نذر کرتے ہیں انہیں برگ و نوا دار و رسن
عشق میں معشوق اور عاشق نہیں ہوتے گر ایک — ساتھ پروانوں کے کیوں جلتی ہے شمع انجمن
جان دیتی ہے پھڑک کر گر قفس میں عندلیب — پھٹ کے دل مٹی میں ملتے دیکھے گلہائے چمن

عشق شرطِ زندگی ہے عشق ہے شرطِ نجات
اس کے ہی ست پر ہے قائم کُل جہانِ کائنات

گُل ہے ننگِ باغ چاک اس کے جو دامن میں نہیں
بُلبلِ بیزار دام اچھا ہے گلشن میں نہیں

ایک حالت عشق میں سرو اور قمری کی ہوئی
پاؤں کی بیڑی بنی جو طوق گردن میں نہیں

ہو گئے جو صرفِ عشق اس دہر کے سرتاج ہیں
داغ کھایا دل نے جو کب ماہِ روشن میں نہیں

ہو کہنیا کے نہ کاکل کی مہک جس میں بسی
پھول ہنی کوئی بھی ایسی مہابن میں نہیں

عشق کا رتبہ کہیں اعلےٰ ہے علم و جاہ سے
اور فرق ابن صبا[1] میں اور راون میں نہیں

یہ خودی کی حس جلاتی ہے خس و خاشاک وہ
دل میں پروانہ کے ہے جو آگ گلخن میں نہیں

سینۂ عشاق نے جسکو دبا رکھا نہ ہو
ایسی چنگاری کوئی وادیِ ایمن میں نہیں

جس سے جو ئے اشک ہاتھے کے پسینے کو بہائے
اتنی طاقت بھی ستم ہے برقِ خرمن میں نہیں

عشقِ خالص ہو گیا ہو جس کے دلمیں جلوہ گر
امتیاز اس کے لئے شیخ و برہمن میں نہیں

دیر و کعبہ کیا ہے اک ذرّہ میں عکس روئے دوست
فرق چشمِ عشق میں مسکن سے مسکن میں نہیں

حسن سے گر عالمِ تکوین نے پائی ہے شان
عشق نے پھونکی ہے اسمیں رُوح اسکے تن میں جان

دیکھکر گلزار میں یہ گُل یہ نرگس یہ چنار
یاد آتے ہیں رُخِ رنگیں و چشمِ دوست یار

قامتِ دلدار پھر جاتا ہے آنکھوں میں وہیں
دیکھو تم سرو سہی کو جب کنارِ جوئبار

کھینچتی ہے نقش آنکھوں میں خرامِ ناز کا
اپنی اٹھکیلی کی چالوں سے نہ رہرو کو بہار

تم الجھ جاتے ہو سنبل سے بس اتنی بات پر
رکھتا ہے قدرے وہ شکل گیسوانِ تابدار

دیکھکر غنچہ دہانِ یار کی آتی ہے یاد
کرتے ہو موتی کبھی اک سلک دندان پر نثار

گر چڑھی ہوتی تمہارے سر کو دُرد جامِ عشق
تو تمہیں یکساں تھے گلزار اور دشتِ خاردار

یاد آنا ایک شے کا بھولنے کا ہے ثبوت
دھیان آتا ہے فراموشی کو کرتا استوار

دائرے میں عشق کے آتے تو تمکو ایک تھے
گیسوئے معشوق اور یہ عنبر و مشکِ تتار

ہو مجازی یا حقیقی شرط تسخیرِ ذات ہے
ہے فنائی ذات ہی پر عشق کا دار و مدار

ایک کو دو دیکھنا ہے چشمِ احول کا خواص
ہے دُوئی اور غیریت سے دیدۂ بینا کو عار

اپنے آپے پر بھلا عاشق کی کب جاتی ہے نظر
ماسوا کون و مکاں میں جب نہیں آتی نظر

[1] ابن صبا ہنود ان کی گنتی سے

مل گیا مٹی میں جو دل عالم آرا ہو گیا — عرش کی آنکھوں کا طفل اشک تارا ہو گیا

خودکشی ہے عشق صادق میں مسیحائی کی شرط — اپنا دشمن جو ہوا خلقت کا پیارا ہو گیا

تم کہاں پھر اور کہاں دیر و حرم کے سنگ خشت — دل میں جب عشق حقیقی جلوہ آرا ہو گیا

گھاٹ اس تلوار کے اترا جو عاشق تر گیا — دھار تیغ عشق کی گنگا کا دھارا ہو گیا

قعر میں بحر محبت کے ہوا جو تہ نشیں — ساحل امید سے اسکو کنارا ہو گیا

آشنایان محیط عشق کو اس سے غرض — تشنۂ ساحل کو کوثر کا سہارا ہو گیا

من کو مارو تو خدا جانے وہ کیا سے کیا بنے — دیکھ لو اکسیر خالص مر کے پارا ہو گیا

بیم اور امید کی باقی نہیں رہتی لگن — جس کے دل میں عشق کا روشن شرارا ہو گیا

ہو گیا عشق مجازی میں بھی حاصل جب کمال — تو وصال و ہجر پھر یکساں گوارا ہو گیا

تخت پر عشق حقیقی کے ہوا جو جلوہ گر — اس کے سایہ سے جہاں پر نور سارا ہو گیا

اس کے آگے اور میں تم کو بتا سکتا نہیں
اور بتاؤں تو سمجھ میں ہرگز آسکتا نہیں

اے صدائی بستیں اتنی تجھے فرصت کہاں — جو سنے عشق و محبت کی تو مجھ سے داستاں

تیرے لیکھے طفل مکتب ہیں وششٹ اور بالمیک — نور باطن سے ہوا جن کے منور کل جہاں

قیس سودائی ہے اور فرہاد پتھر پھوڑ ہے — ہیر کا جیون ترے آگے ہے سڑن کا بیاں

تیرا فتویٰ ہے کہ افسانہ ہے جنگ کربلا — ہے کشش لیلا پہ تجھ کو الف لیلہ کا گماں

قول ہے تیرا کہ ہے منصور مولود خیال — شاعروں کی ہیں یہ پہلاد اور دھرو خوش گپیاں

شان ہے تجھ کو جو کہدے ہاں مگر اے نیکبخت — ایک دنیا کی تواریخوں کو جھوٹے گی کہاں

عشق کے آئینے کو اس نے دوامی دی جلا — جو چتا سے قلعہ چتوڑ کی اٹھا دھواں

غازۂ روح محبت ہے جہاں آرا کا عشق — تار ہتکڑی کا بنیں جس سے پدر کی بیڑیاں

تھی ہراول میں شکست اور تھی چنداول میں ظفر — عاشق اسلام کا کوفہ جو پہنچا کارواں

نقطۂ تکمیل پر پہلاد کا پہنچا جو عشق — منظر نور حقیقت ہو گیا سارا مکاں

سربسر ہے عشق بے لوث اور محبت بے غرض
تو لگی رہ کام میں اپنے تجھے اس سے غرض

نمائش لاہور سنہ ۱۹۰۹ء

لاہور میں کانگرس کے ساتھ نمائش بھی ہونے والی تھی۔ گورنمنٹ نے نمائش کی سرپرستی منظور کی اور حکام نے اس کی مالی امداد میں حصہ لیا۔ ایک جلسہ میں جو اسی غرض سے جالندھر میں ہوا یہ نظم حسب فرمائش حکام وقت پڑھی گئی۔ یہ نظم ایک سبق ہے ان شعراء کے لئے جنہوں نے شاعری کو محض تخیل کی کوٹھڑی میں بند کر کے اس کے دروازے پر لفظوں کے طلسم کا قفل لگایا ہوا ہے ہمارے مخدوم علامہ کیفی معاملہ اور کام کے موضوع پر لکھنے میں بھی قدرت کامل رکھتے ہیں۔

وہ جلسہ کہ جس کا یہاں اک شور بپا ہے۔ جس کے لئے ساماں یہ بہ صد شان ہوا ہے
حاضر جہاں اس شہر کا ہر چھوٹا بڑا ہے۔ کیا شہر کہ مرکز وہ دوآبہ کا بنا ہے
جلسہ ہے کہ اک غنچہ ہے خاصان زمن کا
یا مجمع سنجیدہ محبّان وطن کا

افسر بھی ہیں اس جلسے میں حاکم بھی ہیں سارے سردار بھی موجود ہیں لیڈر بھی تمہارے
اور وہ پڑھے لکھے وہ زمیندار ہمارے کل ہند سمجھتا ہے جنہیں آنکھ کے تارے
دیہاتی ہیں قصباتی ہیں۔ شہری بھی یہاں ہیں
انگریز بھی موجود ہیں۔ دیسی بھی یہاں ہیں

مقصود ہے اس جلسے کا کیا؟ یہ تو بتاؤ۔ اس مجمع میں ہونے کو ہے کیا؟ کچھ تو سناؤ
کس واسطے سب کہتے ہیں آؤ یہاں آؤ کیوں حکم ہے کیفی کو کہ اک نظم سناؤ
مشتاق بہت تم ہو۔ تو ہم تم کو بتا دیں
منظور ہے کل ہند کو زردار بنا دیں

ہے ملک کو جو نکبت و افلاس نے گھیرا ہے ہند میں جو بے زری و یاس کا پھیرا
خواہش ہے دلدّر کا ہو کافور اندھیرا ہر گھر میں جمے لکشمی کا آن کے ڈیرا
یعنی ہو یہاں صنعت و حرفت کی ترقی
موقوف اسی پہ تو ہے دولت کی ترقی

لاہور میں ہونے کو نمائش جو ہے اعلیٰ ۔۔۔ لوٗل اس سے یقیں ہے کہ صناعت کا ہو بالا
ہو صنعت وحرفت کا بھی کام اس سے دوبالا ۔۔۔ لوگوں نے یہ ڈھب خوب ترقی کا نکالا

بہبود خلائق کا نظر آیا جو منظر
تو اس کے مربی ہوئے لفٹنٹ گورنر

امداد نمائش کی ہے اس جلسے کو منظور ۔۔۔ تم دل پہ جو رکھو تو نہیں بات یہ کچھ دور
یعنی کہ ہو اس کام سے ہمدردئے موفور ۔۔۔ اس واسطے ہے آپ کی خدمت میں یہ مذکور

اس کام میں لازم ہے کہ امداد ہو سب کی
ہو اپنی مدد آپ تو رحمت بھی ہو رب کی

اس ملک میں اک شور ہے کچھ روز سے برپا ۔۔۔ یعنی کہ ہے چاروں طرف افلاس کا رونا
ہے تن کو لنگوٹی تو نہیں سر کو دوپٹا ۔۔۔ روٹی جو چلی آج کی تو کل کو ہے فاقا

پڑھ لکھ کے گئی تاب وتواں اور بہاری
کیوں مدرسے صنعت کے نہیں کرتے ہیں جاری

مدت سے یہی شکوہ تھا ہر ایک زباں پر ۔۔۔ لوٹے لئے جاتا ہے۔ ہمیں لینکا شائر
منچسٹر و برلن کو کھچا جاتا ہے سب زر ۔۔۔ پھر دیسی صناعت کی ترقی ہو تو کیونکر؟

سمجھیں گے جو دیکھیں گے نمائش کو بہ امعاں
کس پیشہ میں کس فن میں ترقی کا ہے امکاں

بتلاتے ہیں جو آپ کو ہمدرد سودیشی ۔۔۔ جو اپنے وطن کے ہیں دل وجاں سے ہتیشی
منظور جنھیں ملک میں دولت کی ہے بیشی ۔۔۔ بھاتی نہیں کوئی بھی جنھیں چیز بدیشی

ہے حب وطن دل میں جو ہیں اہل خرد وہ
تو وقت ہے اب آ کے کریں اس کی مدد وہ

ہاں عاشق وشیدائے وطن بن کے دکھا دو ۔۔۔ حب وطن! اب تم ہمہ تن بن کے دکھا دو
پنجاب کے رخشندہ رتن بن کے دکھا دو ۔۔۔ کہتے جو ہو منہ سے وہی بن بن کے دکھا دو

پھر دیکھو تو کیا کھاتا ہے پلٹا یہ زمانہ
صنعت کی ترقی سے ہو بھرپور خزانہ

ہے دیس سے الفت تو کر دیس کی خدمت | وہ کام کر جس سے بڑھے ہند کی دولت
یعنی کہ ہو سرسبز یہاں صنعت و حرفت | اصلی یہی خدمت ہے وطن کی۔ یہی الفت

انساں ہی وہ کیا جو نہ ہو شیدائی وطن کا
بلبل ہی وہ کیا جسکو نہ ہو عشق چمن کا

باغِ دل

یہ نظم ۱۳ دسمبر ۱۹۰۹ء کی تصنیف ہے۔ اس کا تمہیدی بند اس دھوم کا ہے کہ اساتذہ متقدمین کے اچھے سے اچھے قصیدہ کی تشبیب میں کھا جا سکتا ہے موضوع یہ ہے۔ کہ انسان تزکیہ نفس اور اپنے ذات کے علم میں ہی ترقی کرتے کرتے منزل مقصود پر پہونچ جاتا ہے۔

ہے دل میں انجمن کو آج رشک گلستاں کردوں | دہانِ غنچہ سے رازِ دل بلبل بیاں کردوں
صریرِ خامہ سے ایسا جگاؤں آج میں جادو | کہ ہر برگ شجر سے دفتر معنی عیاں کردوں
تشبیہ غنچہ سربستہ معنی وہ کھینچوں میں | کہ حیرت سے قلم مانی کا انگشت زباں کردوں
عروسانِ چمن کو سبزے سے نختوں ہم آغوشی | کروں وا چشم نرگس بند سوسن کی زباں کردوں
چکوروں کی لگن کا داغ ڈالوں چاند کے دل میں | گدازِ شمع سے میں سوز پروانہ عیاں کردوں
پہناؤں گردنِ سروِ سہی میں طوق قمری کا | دہن میں غنچہ کے پیدا عنادل کی زباں کردوں
دم بادِ صبا میں گنگناہٹ ہو پیچ سنبل کے | تبسم میں کلی کی بند بلبل کی فغاں کردوں
خرامِ ناز میں وہ بجلیاں بھر دوں تذروں کے | کہ دامن چادرِ مہتاب کا مثل کتاں کردوں
سمن کے سینہ صافی میں ڈالوں داغ لالہ کا | رگِ گل سے صنوبر بلبلوں کا آشیاں کردوں
بھروں دھن شام کی صُرخی کی کوئل کے ترنم میں | حسینانِ چمن کو بیخودی میں گویاں کردوں
نظر کی حد مٹا کر اسکو لامحدود کر دوں میں | نمایاں اس زمیں پر اک انوکھا آسماں کردوں
اٹھا دوں سرسبز نیرنگیٔ عالم کے پردے کو | شفق کو آتشِ قلب شاہِ خاور کا دھواں کردوں

میں کروں بند اک کوزے میں ان ساتوں سمندر کو ‌‌ — حبابوں سے میں جوئے شیر کا چشمہ رواں کر دوں
چڑھاؤں خود فراموشی کا ایسا رنگ محفل پہ — یہاں گر زاہد خشک آئے تو پیر مغاں کر دوں
مٹا کر عالم احداث کے وہمی کرشموں کو — تمہارے واسطے تیار اک تازہ جہاں کر دوں
چراغ طور سے فانوس اٹھے لن ترانی کا — مثال مہر طلعت از بام راز کن فکاں کر دوں
وہ کھینچوں شاہد معنی کی رنگا رنگ تصویریں — کہ بہزاد ان کے آگے سب نیرنگ زماں کر دوں

لگا دوں چار چاند اس چرخ کو نور مضامیں سے
جبین کہکشاں کو رنگ دوں کلک نگاریں سے

تماشہ آؤ دکھلاؤں تمہیں باغ معانی کا — جہاں کانٹے کو حق حاصل ہے گل کی دل ستانی کا
یہ ہے وہ باغ صدقے جس کے ہی سوجان سے رضواں — ہے فخر اندر کار تنہ جس کے در کی پاسبانی کا
صبا ہے پانو دھو کر آب حیواں سے جہاں جاتی — ملک چھڑکاؤ کرتے ہیں جہاں کوثر کے پانی کا
تدرو قمری و بلبل میں فرق شخصیت گم ہے — نشاں پایا ہے سب نے مثل عنقا بے نشانی کا
برستے ہیں وہاں شبنم سے موتی خندۂ گل پر — چٹکتی ہے کلی تو چہچہہ ہے شادمانی کا
خزاں سے مثل سرو آزاد گل بوٹے وہاں کے ہیں — کہ ناممکن ہے دخل اس باغ میں فصل خزانی کا
وہاں سبزے کی چار آنکھیں ہیں فرط ہوشیاری سے — وہاں ہے بحر عرفاں بلبلہ ہر ایک پانی کا
ہے اس کا پتا پتا اہل دل کو دفتر معنے — ہے اس کا غنچہ غنچہ آئینہ راز نہانی کا
نہ منہ پھٹ ہے وہاں سوسن نہ نرگس تشنہ و حیراں — وہاں عذر جہالت ہے نہ دعوے راز دانی کا
کھلیں گل جو پڑے شاخ شجر کا سایہ پانی میں — یہ عالم نامیہ کی ہے۔ وہاں ریشہ دوانی کا
ریاض روح پرور میں ہے عنقا بلبل نالاں — خوشی کا راگ گانا اس جگہ ہے کام بانی کا
وہاں لالہ کے دل میں "سورۂ والشمس"[1] لکھا ہے — چٹکتا ہے جو غنچہ نغمہ اٹھتا ہے "اپانی"[2] کا
پہنچ کیا ہو وہاں چلتے ہیں پر مرغ تخیل کے — زمیں سے اس کی رتبہ پست بام آسمانی کا
رسائی طائر علم و حکم کی کب وہاں تک ہو — فضا میں اس کی کب ہے دخل مرغ لامکانی کا
پہنچ پیک خیال پا شکستہ کی نہیں اس تک — نہیں کام اس سواد پاک میں کچھ نکتہ دانی کا
فروغ آتش گل میں ہے گم مشہود و شاہد بھی — گل و بلبل میں ذکر اس جا نہیں کچھ لن ترانی کا
نظارہ ہے جمال روح گل کا ذرے ذرے میں — کف خاک چمن نسخہ ہے اکسیر معانی کا

[1] قرآن کی ایک سورہ [2] اپنشد کی ایک بیت جو اپانی یا دھوسے شروع ہوتی ہے۔

تِرا دِل ہی تو ہے وہ باغ جسکی چھب انیلی ہے
یہ بیلا ہے - یہ چمپا - دیکھ یہ جُوہی چنبیلی ہے۔

طلب سچّی خوشی کی ہے تو اس گلزار میں آ کر
رگِ گل میں تو موجِ بحرِ عرفاں کا نظارا کر

یہ باغِ دِل ہے اسمیں ہے عمل عشقِ حقیقی کا
نظارہ اس کا جب ہو پہلے حاصل چشمِ بینا کر

پھنسا ہے تو تو یار اور غیر - کفر و دیں کے جھگڑوں میں
تو اے کھوئے ہوئے گھر کے وہاں دیکھیگا کیا جا کر

دوئی اور غیریت سے تو سدا تکلیف پائیگا
کِسی کا ہو کے رہ یا تو کسی کو یار اپنا کر

نہیں بادل سے تیری ذات سے بجلی نکلتی ہے
جو دانا ہے تو بہرِ برقِ خرمن مت اکٹھا کر

جو ڈھونڈے سے نہیں ملتا وہ مل جاتا ہے سینے میں
تو سوتے جاگتے محویّت کامل کو پیدا کر

کِسی شے سے نہ فعلِ فطرتی ساقط کبھی ہوگا
یہ دانائی ہے یہ کام اس سے قابو میں لا کر

بصیرت کی طلب ہو تو نہ رکھ تو چشمِ نظارہ
اگر ہو دید کی خواہش تو للہ شے کا نظارہ کر

مٹا ہے گر کسی صورت پہ تصویر اس کی بن جا تو
اگر محوِ خودی ہے آپ کو ہر شے میں دیکھا کر

پھنسا ہے دل کسی بت کے اگر گیسوئے پُرخم میں
تو سنبل میں بھی زلفِ یار کی لپٹوں کو سونگھا کر

سما جا اس میں جا کر تو اگر ہے اہلیت تجھ میں
تغافل کا نگاہِ ناز کی ہرگز نہ شکوا کر

جو ہے بازیچۂ وہم و گماں کا محوِ نظّارہ
تو چشمِ نرگسِ حیراں سے ہر پتلی کو دیکھا کر

نہیں گر تابِ ہجراں کی تو خواہش وصل کی مت رکھ
جو ہاتھ آ کر نکل جائے کبھی اس کا نہ پیچھا کر

انانیت نہ ہو تجھ میں تو کیا دھڑکا رقیبوں کا
جو ہے منظور یار اپنا تو غیروں کو اپنا کر

نہ ہوگی آس تو ڈر یاس کا کب پاس پھٹکیگا
تمنا وصل کی ہوگی تو چھا جائیگا ہجر آ کر

یہی ہے خود پرستی آپ کو ہر شکل میں دیکھے
یہی ہے دیکھنا؛ دیدہ ور کچھ بھی نہ دیکھا کر

یہ کہہ دینا تو ہے اک بات میں تو دو نہیں دانیں
تصوّر اور عمل میں اپنے تو یہ رنگ پیدا کر

کریگا صاف لوحِ دل تو وہ نقش اس میں پائیگا
کہ ساری ذہن کی مفروض شکلیں بھول جائیگا

دوئی کو دل سے کھو دیتی ہے وحدت ایسی ہوتی ہے
نظر آتا ہے غیر اپنا - محبّت ایسی ہوتی ہے

تمیزِ زلف و عارض خال و ابرو کچھ نہیں رہتی
فروغِ حسن کی تاثیر و برکت ایسی ہوتی ہے

نظر آتا ہے نورِ روئے جاناں اسکو ہر شے میں
نگاہِ محوِ نظّارہ کی حیرت ایسی ہوتی ہے

مبرّا ہے غرض کے لوث سے فکر اور فعل ان کا
جو از خود رفتہ ہیں ان میں لطافت ایسی ہوتی ہے

رقابت اور غیرت کا بوجھ اس سے نہیں اُٹھتا / خیالِ حسنِ جاناں کی نزاکت ایسی ہوتی ہے
نظر معشوق آتا ہے پڑے گر آنکھ اپنے پر / کمالِ عشق میں عاشق کی صورت ایسی ہوتی ہے
برابر ہے اسے تارِ نفس تارِ گریباں کے / جنونِ عشق میں عاشق کی وحشت ایسی ہوتی ہے
ہجومِ کثرتِ عالم میں رہ کر ہیں الگ اس سے / یہ ہوتے ہیں موحّد اور وحدت ایسی ہوتی ہے
خبر رکھتے ہیں کل کی آپ سے وہ بے خبر ہو کر / ہے عرفاں کے سرمستوں کی غفلت ایسی ہوتی ہے
پیئے اک جام جو اس کا وہی اس کا مزا جانے / بتاؤں کیا تجھے اس مے کی لذت ایسی ہوتی ہے
خبر کیا میری تیری اپنی سُدھ تک بھی نہیں رہتی / جب انہد باج بجتا ہے تو حالت ایسی ہوتی ہے
نہ دل ہو طالبِ وصل اور نہ شوقِ دید آنکھوں کو / اسی کو عشق کہتے ہیں۔ محبت ایسی ہوتی ہے
جو جاتا اور سیکھا لوحِ دل سے یک قلم دھوئے / یہی ہے علم کامل اور حکمت ایسی ہوتی ہے
خزف ہے اس کے آگے کوہِ نور تاجِ سلطانی / متاعِ درد کی در اور قیمت ایسی ہوتی ہے
اگر ہو جائے تارا آفتاب اس تک نہیں پہنچے / خیالِ بیخودی کی شانِ رفعت ایسی ہوتی ہے
پڑا ہے یہ ترا سارا جہاں اک اس کے کونے میں / ریاضِ دل کی پہنائی و وسعت ایسی ہوتی ہے
نسیمِ گیسوئے حورانِ عیں سے ہے غنی کرتی / نسیمِ بوستانِ دل کی نکہت ایسی ہوتی ہے

اگر اس باغِ دل کا تو کبھی محوِ تماشا ہو
تو علمِ ذات حاصل کر کے خود اپنے پہ شیدا اکمل

خیر مقدم گرامی

ستمبر سنہ ۱۹۰۹ء میں جناب مولوی غلام قادر گرامی صاحب مرحوم لمبی رخصت لیکر حیدر آباد سے اپنے وطن جالندھر میں تشریف لائے اس موقعہ پر ایک عام جلسہ خیر مقدم میں یہ نظم پڑھی گئی۔ اس جلسہ کے بانی بھی کیفی صاحب ہی تھے۔

فرشِ رہ آنکھیں ہیں سب کی اے عزیزِ دوستاں / ذات پر تیری ہے نازاں آج کل ہندوستاں
اے گرامی گھر میں پھر آنا مبارک ہو تجھے / ہے وطن سے یہ محبت تیری عظمت کا نشاں
قصبۂ کنجاہ کو بخشا غنیمت نے جو فخر / اس سے اونچا آج جالندھر کا ہے نام و نشاں

تخت پر تھا مصر کے پر دل ہیں تھا کنعاں کا عشق
تیرے دل میں ہے ہوا یوسف سے حُبِّ دوستاں

کب بدخشاں سے نکل کر لعل لے کی بازگشت
بوئے گُل کا باغ سے جا کر نہ لوٹا کارواں

مُشک یوں تاتار سے نکلا کہ قیدی قید سے
بزم سے جا کر نہ آیا عود کا واپس دھواں

لیکن اپنے مولد و منشا سے تجھکو ہے جو عشق
قالبِ حُبِّ وطن کی ہے وہی رُوحِ رواں

انتخاب ہفت کشور گرچہ یہ پنجاب ہے۔
چار چاند اس کو لگے ہیں تجھ سے اسکی آب ہے۔

اے دیارِ ہند اے شعر اور حکمت کی زمیں
اے مرے پیارے وطن اے رشکِ خلدِ بریں

تیرے اوصاف ایسے اعلیٰ اور ہیں نادر مثال
بھولنا چاہیں بھی ہم تو بھول انہیں سکتے نہیں

کیشو[۱]۔ تلسی۔ سُور اور کالی کو رہنے دیجیے
جن کو آنکھوں پر بٹھاتی ہے صدی یہ بیسویں

وہ زباں اپنی تھی۔ اسمیں جو سخن کی داد دی
مستحق وہ اس قدر توصیف کی شاید نہیں

فارسی میں ہو گئے لیکن یہاں جو باکمال
نغمہ سنج ان کی ثنا میں بلبلانِ پارس تھیں

خسرو و فیضی اور غنی۔ بیدل۔ غنیمت اور ضمیر
انکی سحر آہنگیاں مفتونِ عجم کو کر گئیں

حسرتی۔ آزردہ۔ صہبائی و نیّر اور قتیل
مایۂ نازِ قدیماں تھے یہ سب متاخرین

اور وہ شیرِ بیشۂ نازک خیالی و ادب
میرزا غالب زباں جس نے سب کی بند کیں

اہل ایراں لئے گراں کے آگے مارا دم نہیں
تو کسی سے آج یہ نامی گرامی کم نہیں

تو سپہرِ نثر گفتاری کا ہے مہرِ منیر
مطلعِ خورشیدِ معنی ہے ترا روشن ضمیر

رُوحِ جامی و نظامی مست تیرے شعر پر
دامِ الفت میں تری فردوسی و ہاتف۔ اسیر

گر نظیری اور خاقانی کا پڑھتا کہیں کلام
تو نہ اکثر پائیں گے تیری بلاغت کی نظیر

جھومتا ہے مست ہو کر بلبلِ شیراز بھی
طوطئے ہندوستاں کی سُن کے یہ دلکش صفیر

تجھ سے کسبِ نور کرتا انوری ہوتا اگر
تو سپہرِ باکمال کا ہے وہ مہرِ منیر

ہے غلام قادرِ مطلق دل و جاں سے جو تُو
یہ ملا قادر کلامی کا جبھی تجھ کو سریر

ہے فصاحت اور رنگینی میں گر یکتا کلام
تو نزاکت اور لطافت میں مضامیں بے نظیر

---

[۱] کیشو، تلسی داس اور سُور داس۔ یہ تینوں ہندی کے اور کالی داس سنسکرت کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔

فکرِ عالی اس بلندی پر پہونچتی ہے تری — جس کے آگے اہلِ ایراں کی بھی ہے ہمت فقیر

اب کہاں یہ رنگ نیشاپور اور شیراز میں
اب نہیں شوخی صفاہاں کے بُتِ طناز میں

ہے ترا دیوان گلزارِ دل آرائی کا باب — ہے ترا ایک ایک شعراے نکتہ پرور انتخاب

تجھ کو آنکھوں پر بٹھائیں مردمِ اہلِ نظر — ہے ہر اک مصرعہ ترا ابروئے جاناں کا جواب

مطلعِ خورشیدِ معنی مطلعِ روشن ترا — اہلِ دل جس سے کریں نورِ دروں کا اکتساب

خالِ رخسارِ فصاحت نقطۂ مشکیں ترا — غازۂ روئے اثر تیرے سخن کی آب و تاب

گر غزل ہے تو نظیری اور حافظ کا بدل — گر قصیدہ ہے تو خاقانی و عرفی کا جواب

مثنوی ہے تو ظہوری اور جامی سے سجل — سر پٹکتا ہے روانی دیکھکر جس کی چناب

گرمِ جولاں توسنِ خامہ اگر ہو رزم میں — تھامیں فردوسی نظامی دوڑ کر تیری رکاب

کلکِ گوہر بار تیری ہو جو زینت بخشِ بزم — اشکِ حسرت چشمِ نیساں میں ہے درِ خوشاب

جس زمیں میں لکھدئے تونے کبھی دو چار شعر — ہوگئی وہ چرخِ ہفتم سے سوا عالیجناب

لکھدیا اسپر گیا تیرا عجم میں جب کلام — "آیتِ شہرت بدون النسخ چوں ام الکتاب"

تر زباں بزمِ سخن میں جب گرامی ہوگئے
سمجھے سب پھر زندہ جامی و نظامی ہوگئے

آج کل بدلا ہوا ہے بے طرح رنگِ زمن — اختراع و نسخ کا شیدا ہوا چرخِ کہن

خیرہ ہیں آنکھیں تو چھائی سہر میں بھی ہے خبر گی — لیمپ نے بجلی کے ٹھنڈی کردی شمعِ انجمن

کام کی لیکن دماغوں میں سمائی کیونکہ بات — پر سرِ پہ خاک تھا ہم سے جو چرخِ پُر فتن

دھن نہ بدلے کیوں نواسنجوں کی اب ہر بزم میں — چنگ، بربط، بین کی جا ہیں پیانو، آرگن

آنکھ ہے بدلی ہوئی نرگس کی سوسن کی زباں — بولتے ہیں بولی ٹھولی اب نئی مرغِ چمن

دفترِ پیشینیں کا اب تقویم پارینہ ہے خطاب — معرضِ تغییر میں ہے اس قدر اپنا وطن

چاہیئے تھا ہم سمونے گرم و سردِ شرق و غرب — اعتدالِ طبع کی ترتیب کا کرتے جتن

کون کہتا ہے علومِ نو سے ہو پہلو تہی — پر مٹاتے ہیں جہاں سے کیوں قدیمی علم و فن

کیا عجب ہو جائے گر نیچر کا جادو کارگر
ابلیس کی اب برق نہ سے قطب کے مینار پہ

کیا سلف میں خوبیاں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں — صفحۂ تاریخ پر ہاں کچھ نمایاں ہو گئیں
اب نہیں آتی کسی کو ان کی بھولے سے بھی یاد — سب وہ اگلی صحبتیں خواب پریشاں ہو گئیں
وہ فضائل اب کہاں ہیں ہند کی تہذیب میں — جن پہ شرق و غرب کی اقوام قرباں ہو گئیں
اب ہے باقی ادیب اگلے نہ وہ علم و ادب — صورتیں اب انکی نقش طاقِ نسیاں ہو گئیں
چرخ کجرفتار کیا طبقہ دیا تونے اُلٹ — تیری چالیں گردشِ چشم حسیناں ہو گئیں
دین جن کا شعر تھا اور جن کا مذہب تھا ادب — نیتیں انکی بھی اب رندوں کا ایماں ہو گئیں
سوز ہو دل میں تو ہو آہ و فغاں میں بھی اثر — آہیں دل کی اب چراغ زیر داماں ہو گئیں
روشنی نے غرب کی سر اور خیرہ کر دیا — برکتیں ہم تک جو پہنچیں فتنہ ساماں ہو گئیں
جو پڑا عقدہ گرہ بندِ قبا کی بن گیا — گتھیاں جو کھل گئیں زلفِ پریشاں ہو گئیں

ابتری ہر زندگی کی شق میں ہے پھیلی ہوئی
شاعری بھی حیف! اسکی صید اب ہونے لگی

گر یونہی تغیر کا شیدا جہاں ہو جائے گا — اب سے دور اک دن قیامت کا سماں ہو جائیگا
گر یہی چولا بدلنے کا اسے لپکا رہا — تو برہنہ ایک دن ہندوستاں ہو جائیگا
بیچ ہوا ہے باغ کی تو شاہدِ گل ایک دن — سبزہ کی مانند بیگانہ یہاں ہو جائیگا
نرگس و سنبل۔ صنوبر ہوں گے سب وقفِ خزاں — لان ہینس کی جگہ یہ گلستاں ہو جائیگا
اب گرامو فون میں گونجے گی غنچوں کی چٹک — باغ پر احسانِ صبا کا رائیگاں ہو جائیگا
چارہ آنکھیں کس کی اب نرگس سے ہونگی باغ میں — کون سوسن سے چمن میں ہمزباں ہو جائیگا
خندہ گل کی ادا پر لوٹ ہوگا کس کا جی — بلبلوں سے کون اب ہمداستاں ہو جائیگا
ہے نوا سنج آجکل سُن لو گرامی کو کہ پھر — نغمۂ بلبل سے خالی بوستاں ہو جائیگا

سنتے ہیں اک تازہ لٹریچر بنا ہونے کو ہے
دیکھتے ہیں ہم کہ یہ فن ہی فنا ہونے کو ہے

گرچہ اکبر اور پتھورا ہے نہ فیضی اب نہ چند[۱] — نغمہ سنجانِ کہن پھر ہیں غنیمت ہیں جو چند
اور ان کا اے گرامی قدر تو سرتاج ہے — بلکہ اگلوں کے ہے رتبے سے ترا رتبہ بلند
گر ظہیر اور داغ نے دہلی کی بخشی اسکو شان — ذات سے تیری دکن ہے رشکِ شیراز و خجند[۲]

۱؎ چند۔ پورا نام چندر بردی، رلئے پتھورا کے دربار کا ملک الشعرا۔
۲؎ اس کے آگے کے چار شعر سہو سے رہ گئے جو صفحہ ۵۱۱ میں ملاحظہ ہوں

گر نہ حضرت کی مدد ہوتی تو کر دیتا فنا — مشرقی علم و ادب کو کس مپرسی کا گزند

کیوں نہ ہو کل ہند میں بے مثل دربار دکن
گوہر شہوار پنجاب اس کا ہے رخشاں رتن

اے ز فن شعر غوغا در جہاں انداختہ — جان تازہ در دل مردہ دلاں انداختہ
چاک در داماں گل سوز نوایت در فگند — بلبلاں را نغمہ ات اندر فغاں انداختہ
ہند را سرمایۂ ناز ست ذات پاک تو — او کلاہ خرمی بر آسماں انداختہ
سکہ زد نظم تو از پنجاب تا ملک دکن — شاعری آوازہ ات در اصفہاں انداختہ
نے ہمی نازد بہ ذاتت کشور ہندوستان — بل سپر پیش تو ملک نیشرواں انداختہ
بلبلان را رفت آئین غزل خوانی زیاد — تا گرامی طبع تو طرح بیاں انداختہ
بود نظم فارسی در ہند چوں شمع سحر — گفت تو در تابش تازہ رواں انداختہ
تا بہ اوج فکر و الا یت رسد بیک خیال — قدرت حق آسماں بر آسماں انداختہ

ہے دعا کیفی کی تجھ پر لطف حق دائم رہے۔
تو جہاں میں، شعر میں تیرے اثر قائم رہے۔

ترانہ حقیقت

یہ نظم اپریل سنہ ۱۹۰۹ء کی تصنیف ہے۔ پہلا بند قصیدہ کی تشبیب کی طرح تمہیدی ہے اور غزل کے تمام مدارج پر چھایا ہوا ہے۔ اس نظم میں کیفی کردار اور سوالات دینی پر روشنی ڈالتے ہوئے ریاکاری اور رسمی اعتقادات کی قلعی کھولی گئی ہے۔

کبھی چشم صنم سے قتل کا ایما بھی ہوتا ہے — دل عاشق شہادت سے پھرے ایسا بھی ہوتا ہے۔
نقاب الٹا جو رخ سے گیسوئے پرخم ہوئے حائل — یہ عقدہ حل نہیں ہوتا۔ اگرچہ وا بھی ہوتا ہے
وفا کے امتحاں پر بھی نکل آتی ہیں سو شاخیں — کبھی سوز فراق شعلہ رو ٹھنڈا بھی ہوتا ہے۔
کسی کو خود بھری محفل سے ٹھکرا ہیں اٹھا دیتے — تباہ و سرکشی کا کچھ اسے یارا بھی ہوتا ہے۔

جو پورے اترے ہر اک امتحاں میں وصل میں پھر بھی
اسی کی دلبری پر یہ عاشق ہیں کہ مرتے ہیں
حسد کا خار دیکھا ہے۔ کبھی دل میں عنادل کے
چکو ہیں ہیں پر افشانی میں ہی تسکو سحر کرتی
ہوئی ہے آزاد جیتے جی نہ عشق سرو سے قمری
مجازی کی بھی کیفیت ہے غیرت مٹا دیتی

حیا کا اسطرف سی حیلۂ بیجا بھی ہوتا ہے
کبھی جیتے جی ایفاء وعدۂ فردا بھی ہوتا ہے
بغل میں شاہد گل کی اگر کانٹا بھی ہوتا ہے
کبھی انکی طرف مائل ہمہ تن بیا بھی ہوتا ہے
غلامی کا کہیں اگر دن میں طوق ایسا بھی ہوتا ہے
عزیز قیس لیلے اسماں سگ لیلی بھی ہوتا ہے

فسانے رات دن سنتے ہو یہ عشق مجازی کے
کرشمے تم کو پھر چونکائیں کیوں عشق حقیقی کے

کرشموں کو محبت کے تو اک افسانہ سمجھا ہے
بتوں سے آشنائی کی رہا نا آشنا حق سے
جو خالق کی محبت ہو تو خلقت تجھکو پیاری ہو
سویدا ہے دل حسن آفریں ہم اسکو سمجھے ہیں
مٹاتا ہے نظر سے خیر کی کو اور خودی سر سے
پڑیں پتھر سمجھ پر تیری تو سمجھا تو کیا سمجھا
شہ گل تخت گلبن سے اتر کر اس سے ہے ملتا
وصال روح و تن اک عارضی شے ہے نہ بھول اسکو
بھلا ہو اک کے اک عہد تجھے ملجائے گی جنت؟
دل و دست و زباں سے کام لے تو بے غرض ہو کر

رموز عشق کو ناداں سمجھیگا نہ سمجھا ہے۔
جو سب کا ہے اسی کو نا سمجھ بیگانہ سمجھا ہے۔
سراپردہ ہے دل کا جسکو تو اک شانہ سمجھا ہے۔
جسے تو خال رخسار بتاں کا دانہ سمجھا ہے۔
تو کیا اک کھیل یہ پیمانۂ رندانہ سمجھا ہے۔
کہ دانائے رموز دہر کو دیوانہ سمجھا ہے۔
تو جس سبزے کو اس گلزار میں بیگانہ سمجھا ہے
مسافر خانہ ہے وہ تو جسے کاشانہ سمجھا ہے
متاع خلد کا دولت کو کیا بیعانہ سمجھا ہے
تو مکتی کو بھی کیا بازیچۂ طفلانہ سمجھا ہے

اسیر حس ہے جب تک اور پابند علائق ہے
سمجھنا ہے غلط دل میں فروغ عشق صادق ہے

اگر شہرت کی خواہش پاؤ گے تم نامدار و نہیں
خزاں میں بھی جو عشق گلہیں خار شاخ گل جھیلے
حیات جاوداں ہے خستگی افسردگی دل کی
ابھی تیغ ادا کھچ جائے تو کھل جائے عالم پر
کوئی شیدائے گل ان میں نہیں ہے سب مری جگ ہیں

تو سود امیر و طاعت کل ملے طاعت گزار و نہیں
ملیگی ایسی بلبل آپ کو شاید ہزاروں میں
وہی ہیں زندۂ جاوید جو ہیں دل فگار و نہیں
کہ ہیں وہ ارفتہ جاں کون کون ان جاں نثاروں میں
سناتے پھرتے ہیں نغمے عنادل جو بہار و نہیں

کہا رندوں نے کچھ اور دل مثال خم ابل اُٹھا — یہی صبر و سکوں ہے آج کل پرہیزگاروں میں
ہاں ہمیں زندگی کو کہتے ہیں زندہ دلی جاہل — نہ پائی مطلقاً گر روحانیت ان جانداروں میں
حواس خمسہ کا چاروں طرف سے اس پہ نرغہ ہے — ملا ایسا دل مضطر بھی ہے پانچوں سواروں میں
بہت ہیں دور یہ اس سے کہ وہ موجود ہر جا ہے — بنے شیخ و برہمن بھی ہیں اس کے پاسداروں میں
یہاں تو خود فراموشی ہی شرط ہوشیاری ہے — بنے پھرتے ہیں کیا یہ اہل دنیا ہوشیاروں میں

ذرا سی آرزو پر تو تمہارا دم نکلتا ہے
اور اس پر زعم ہے ہر سانس میں "سوہم"[۱] نکلتا ہے

حرم کو گھر خدا کا اور صنم کو ہم خدا سمجھے — اسی کو معرفت اور گیان کی بس انتہا سمجھے
جو ہوتا عشق صادق دل میں پتھر سے بھی گھر کرتا — بتوں کو جب نہ اپنا کر سکے بولے خدا سمجھے
دیا پیسہ جو آج اک ٹھان کر کل لاکھ پائینگے — سخاوت کو بھی ہم بیوپار کا بیع و شرا سمجھے
ابھی تک ہم نہ سمجھے حیطۂ افعال کی وسعت — کئے کا اپنے پھل پایا تو اسکو ہم سزا سمجھے
لکھا ہوسی کا بس سمجھے خداداد ہے مثل اپنی — نہ لکھا پڑھ سکے اپنا تو قسمت کا لکھا سمجھے
جو حصہ آئی باقی فاضل اپنی پچھلی میزان کی — تو جاہل اسکو لطف خاص اور حق کی عطا سمجھے
بھلا پیغمبری ہر آگ لانے والا پاتا ہے — کرم کے پھل کو دین اللہ کی حکم قضا سمجھے
یہ مانا حشر میں مرنے کے بعد اٹھنا تو لابد ہے — مرادف انتقال روح کا کیونکر فنا سمجھے
نہ سمجھے وہ حقیقت زندگی اور موت کی اب تک — اجل کو جو طبیب اور موت کو دکھ کی دوا نہ سمجھے
پڑیگا تم کو یہ بھگتان مر مر کے بھی بھگتانا — یہ ڈگری ہے بلا میعاد تم اسکو ہو کیا نہ سمجھے

نہ جب تک نور خود اس چاند میں جلوہ نما ہوگا
تناسخ سے ہلال و بدر کے کیونکر رہا ہوگا۔

عبث روتا ہے اے وحشی گریباں اور داماں کو — لباس اپنا سمجھ تو دامن کوہ و بیاباں کو
پھنسے ہیں سبحہ و زنار کے جنجال میں دونوں — نکالیں کس طرح اس قید سے گبر و مسلماں کو
رہائی خواہشوں سے خواہشوں کا ترک ہے ابدل — ہوا میں مشتعل دیکھا زیادہ نار سوزاں کو
نکلتا ہے یہ جتنا اس قدر ہی بڑھتا جاتا ہے — بجا ہے کہیئے تار جنتری گر دل کے ارماں کو
تصنع کا نہیں محتاج ہرگز شاہد قدرت — جھکائی کہکشاں نے اپنی پیشانی کب افشاں کو

---

۱ فلسفہ وحدانیت کا اسم اعظم۔ معنی۔ میں وہ ہوں۔

ہنیں چڑھتی کبھی سنگ فساں پر تیغ ابرو کی — ضرورت اسکی ہے البتہ شمشیر صفاہاں کو
عرض کی گرچہ ہستی ہے مسلم ذات جوہر سے — بغیر اس کے مگر جوہر نہ پائے شکل امکاں کو
مگر یہ دونوں اک صورت سے ہیں ملزوم و لازم بھی — یہی ہے راز تکوین جہاں سوجھے گر انساں کو
حرارت سے جمادی شکل حیوانی پکڑتا ہے — نہیں حاجت ذرا اس کی اگرچہ مہر تاباں کو
بقائے قطرہ ہے جیسے سمندر میں فنا ہونا — یونہی انسان کھو کر خود کو پائے ذات سبحاں کو

مٹائے شخصیت کو جو۔ وہ پاتا ہے خدا آخر
بقا سے تھی فنا اول۔ فنا سے ہو بقا آخر

حرم اور دیر میں تم نے نہ جس کا پرتوا دیکھا — وہ نور پاک ہم نے ذرے ذرے میں چھپا دیکھا
عبث تو نار کے گلزار ہو جانے پہ مفتوں ہے — شرار دل میں تو کیا جانے اہل دل نے کیا دیکھا
پدر کا علم حاصل کر تو میراث پدر پائے — لب عیسیٰ بھی محتاج دم آب بقا دیکھا
سما سکتی ہے وحدت میں کہاں تمئیز کفر و دیں — یہ دعوے ہی غلط ہے مدعی نے کب خدا دیکھا
بنے سب ایک سے اعداد پھر بھی وہ اکیلا ہے — جہاں کے کیف و کم کا جوڑ ہم نے سب لگا دیکھا
کرو گر بند کان اور آنکھ تو اسکو سنو دیکھو — تماشا اسکو سمجھو تم لئے ہے جو کچھ سنا۔ دیکھا
چھپا ہے وہ ہر اک شے میں کہاں سوال تم جو ظاہر ہو — مٹی ماوَمنی جن کی اسی نے یہ ملا دیکھا
وہ کب پھنستا ہے اعجاز اور اوتار ونکے بندھن میں — بہت کچھ خرق عادت کو بھی ہم نے آزما دیکھا
تھا فخر جم جو دیدار جہاں باں جام میں ہوتا — جہاں تو یوں بھی ہے اہل جہاں نے بارہا دیکھا

بہت ہیں یوں تو اس دنیا میں صورت دیکھنے والے
نہیں ملتے مگر نور حقیقت دیکھنے والے

جو صبح و شام ناقوس و اذاں کا غل مچاتے ہیں — وہ کب سوتے جگاتے ہیں جاگتوں کو وہ سلاتے ہیں
ہیں یہ سب خارج از آہنگ جتنے شبد سنتے ہیں — نہ ہر اک کو سناتے ہیں جو سچا راگ گاتے ہیں
یہ قیدیں ایک حد تک ہیں ضروری۔ مان لیں لیکن — جواں ہو کر تو تتلاتے ہیں منہ پر دھول کھاتے ہیں
فنا فی العشق ہو جانا کمال عشق صادق ہے — وہ از خود رفتہ ہیں عاشق جو اس کا بھید پاتے ہیں۔
تو اب سچ اکبر تھا اگر اک دل میں گھر کرتے — یہ کس کے واسطے لوگ اسقدر معبد بناتے ہیں
بنایا اس نے انساں اپنے ہاتھوں سے یہ مبہم ہے — مگر انساں عالم آفرین خاصا بناتے ہیں
گھڑے ہیں ایسے افسانے کہ توبہ ہی بھلی ان سے — خدائی تو لگا رکھی تھی خدا کو بھی بناتے ہیں

کسی سے کوئی کبھی ملتا نہیں سُر تال اور لَے میں — غرض سب منگھڑت کے اپنے اپنے راگ گاتے ہیں
بیاں اس کا ہوا کیا ہو یہ گُپ چُپ کی مٹھائی ہے — جو مست اس دُھن میں ہیں کب اونچی تانیں وہ لگاتے ہیں
سنیں گر گوشِ دل سے تو ہے اک اک لفظ اک دفتر — جو باتیں راز کی ہم آپ کو بتلائے جاتے ہیں

خودی جب محو ہو جائے دفورِ عشقِ صادق ہے
نہیں رہتا ہے کچھ بھی فرق معشوق اور عاشق میں

فنا فی العشق ہونیکا کبھی گر امتحاں ہوتا — مسیح و خضر کو مرنا حیاتِ جاوداں ہوتا
خودی کے خون کو فرہاد تیشہ اگر چلتا — تو اک قطرے سے جوئے شیر کا چشمہ رواں ہوتا
اگر خود شمع جل کر بزم کو روشن نہ کر دیتی — تو جمگھٹ اس پہ وارفتہ پتنگوں کا کہاں ہوتا
جگر کاوی کا صدمے پہ صدمہ جھیلتا موتی — تو پھر کس طرح زیبِ گردن و گوشِ بتاں ہوتا
دفورِ نور سے ہی چشمِ مردم ہو گئی خیرہ — وہ پردے میں چھپا رہتا تو آنکھوں میں عیاں ہوتا
جو وہ ہوتا وہی تو مجھ کو تجھ کو کب نظر آتا — جو رہتا میں ہی میں کب چشمِ عالم سے نہاں ہوتا
مجازی اور حقیقی میں سرِ مو فرق ہے ہمدم — نہ پڑتی آنکھ لیلیٰ پر تو پھر مجنوں کہاں ہوتا
جو صبحِ گُل کی شیدا تھی تو کانٹا بھی اسے گل تھا — خزاں میں لب پہ بلبل کے نہ یہ شور و فغاں ہوتا
ہوا کو جو کہ ہے موجود ہر جا دیکھ سکتے ہو؟ — جو ہے اس میں بھی چشمِ باد تو میں کب عیاں ہوتا
عجب ہے گونگے کی بات کھل کر کیا کہے کوئی — جو ہوتی بات کہنے کی تو کچھ مطلب بیاں ہوتا

نہ دل اور دردِ دل رہتا نہ دلدار و عدو رہتا
کمالِ عشق ہو جاتا تو میں رہتا نہ تو رہتا

مجذوب کی بڑ

یہ دلاویز نظم ۴ر اگست ۱۹۰۸ء کو کہی گئی۔ اس میں روئے سخن کس کی طرف ہے۔ یہ آخری بند سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس نظم کا ہر بند انجیل کی آیت "خدا محبت ہے" کی تفسیر اور مسائل فلسفہ الٰہیات کی تعبیر ہے۔

اُڑانے کو تو بلبل نے بہت طرزِ فغاں میری — کہاں سے لائیگی یہ سوزشِ دردِ نہاں میری

ہما کو حوصلہ کب تھا۔ کہ میری آگ میں جلتا سلگتی ہیں ابھی تک سوزِ دل سے ہڈیاں میری
نہ کھنچتا دار پر ہوتا جو منصور اس زمانے میں کہ معنی بنکا ہیں دفتر کھولتی خاموشیاں میری
نہ ہوگی بند یہ شعلہ فشانی اور شرر ریزی بہ رنگ شمع کاٹیں گر سرِ محفل زباں میری
سویدا ہی دل اپنا ہے سکون و جذب کا مرکز بلائیں رات دن لیتے ہیں مہر و فرقداں میری
دلِ عشق آشنا کو ہیں حرم اور بتکدہ یکساں زمیں ششدر رہے یکرنگی سے نیرنگِ زماں میری
میری وابستگی سے ہیں شگفتہ باغ میں غنچے سکھاتی ہیں بلبل کو ہیں خاموشیاں میری
کرینگے قدر یاد آئیں گی جب آپکو میری باتیں نہیں ہوں گا میں مگر ہوگی زباں پہ داستاں میری
اگر میں ہوش میں ہوتا تو پھر کیا جانئے کیا ہوتا فروغِ دیدۂ عالم ہیں یہ مدہوشیاں میری
پلک پر وہ لگے ٹکڑے ہیں تیر ہیں لختِ جگر لب پر سمجھ میں کب تمہاری آئیگی یہ داستاں میری

تم اے مفتونِ نیرنگِ جہاں جانو گے کیا مجھ کو
نہ جب تک آپکو پہچانو۔ پہچانو گے کیا مجھ کو

مرادِ دل ہے کہ اک گنجینہ ہے اسرارِ پنہاں کا سویدا ہے کہ مرکز ہے محیطِ چرخِ گرداں کا
حرارت جو زمیں کے قلب میں مخفی و مکنوں ہے وہ اک پرکالہ ہے عاشق کے دل کے داغِ سوزاں کا
ضرورت کیا مجھے سیرِ گل و ریحاں کی اے بلبل دلِ پر داغ پر عالم یہاں ہے باغِ رضواں کا
چمن میں گل ہے گلچیں بو ہے بو میں فرحتِ دل ہے کھلا تو یہ کھلا اہلِ نظر پر راز بستاں کا
کسے لوں اور کسے پھینکوں۔ پنہا ہوں اور کسے چاہوں میری آنکھوں میں تو ہے خار بھی گل اس گلستاں کا
حواسوں پر ہو قابو تو ہے نفرت اور رغبت کیا ہے یکساں نفس کش کو نیک بد ہر فردِ انساں کا
کمالِ عشق میں یہ ہوگئی ہے کیفیت دل کی نہ ہے امیدِ وصل اور ہے نہ اسکو خوفِ ہجراں کا
تڑپ جاتی ہے بجلی اور سورج کانپ اٹھتا ہے یہ عالم دیکھکر عاشق کے دل کے سوزِ پنہاں کا

بھرا ہے دل میں جو سوزِ محبت کس کو دکھلاؤں
نظر اپنی میں چشمِ دہر میں کس طور بن جاؤں

مثالِ سبزہ بیگانہ میانِ گلستاں ہوں میں نگاہِ غور سے دیکھو تو اس گلشن کی جاں ہوں میں
صدا ہوں میں شکستِ رنگِ گل کی گاہے گلشن میں تو شاخِ گل پہ گاہے عندلیبوں کی فغاں ہوں میں
کبھی ہے آسماں پر مثلِ فوارہ دماغ اپنا کبھی مائل بہ پستی کوہ سے سیلِ رواں ہوں میں
ہیں اہلِ سر چشمہ تسنیم و کوثر چشمِ بینا میں سرابِ دہر کے وارفتہ کو ریگِ رواں ہوں میں

گر خفا ہوں کبھی میں رعد ہو کر بام گردوں پر
صدا پر درد دل میں پا دل کے کبھی برق تپاں ہوں میں

نظر پسماندہ آتا ہوں اگرچہ گرد سی صورت
دل جویا کو آواز درائے کارواں ہوں میں

نہاں ہوں گر تو یوں جیسے کہ بو پھولوں میں پنہاں ہو
عیاں ہوں تو شرارہ طور کی صورت عیاں ہوں میں

وہاں ہوں میں جہاں اپنی خبر رکھنی نہیں ممکن
بتا دوں کس طرح تمکو کہ کیا ہوں اور کہاں ہوں میں

بتا دوں کیونکہ اے اہل جہاں تمکو کہ میں کیا ہوں
جدا سب سے ملا سب سے ہوں نیرنگ تماشا ہوں

سمجھتا اس چمن میں کون انداز فغاں اپنا
نہ بلبل ہمصفیر اپنی نہ گلچیں راز داں اپنا

وہ زاہد بے مغز خشک ہیں کیسے سما جائیں
بتاتا ہے جو باتیں راز کی پیر مغاں اپنا

علائق کی رہیگا قید زنجیروں میں تو کب تک
اگر ان سے رہا ہوتا تو تھا کون و مکاں اپنا

جو ہو مخلوق کے خادم تو ہو ممتاز خالق کے
جو تم سارے جہاں کے ہو تو ہے سارا جہاں اپنا

تماشہ ہے مٹا کر آپ کو گل آپ بن جائے
بھلا کب اہل صورت سمجھیں یہ راز نہاں اپنا

بقا دل سے فنا دل سے وصال و ہجر ہے دل سے
جہنم ہے یہی اور ہے یہی باغ جناں اپنا

ببول اور شاخ گل یکساں ہے شاخ زعفراں ہمکو
بنائیں کونسی ٹہنی پہ بلبل آشیاں اپنا

جلی خود اور جلائے شمع نے کیوں اتنے پروانے
بنائی بزم میں وہ کاش اک دل ہمزباں اپنا

نوا بلبل کی سنکر کیا ہوا جو چپ لگی گل کو
یہ لازم تھا بنائی باغ کو ہمداستاں اپنا

ازل سے اسمیں غوطے کھا رہے ہیں عالم و دانا
کھلا یہ راز اسی پر جس نے اپنے آپ کو جانا

خودی کو جو مٹا بیٹھے نظر انکی خدا تک ہے
کہ شوق دیدۂ ناداں نگاہ نارسا تک ہے

فغاں اور اشکباری کیسی اور کیا گریہ و زاری
یہ کیفیت تو عشق صبر و تمکیں آزما تک ہے۔

اگر ہو عشق صادق شکوہ رنج و تعب کیسا
نظر چشم ہوس کی نالہ و آہ و بکا تک ہے۔

نہیں ذوق نظارہ بھی کچھ ان صورت پرستوں کو
نظر انکی تو رنگ عارض و زلف دوتا تک ہے۔

ملی جب فقر کی دولت تو شاہی کیا ہے دنیا کی
ضرورت شمع کی سلطان خاور کی ضیا تک ہے۔

صفائے قلب حاصل کر کہ آپ اسمیں نظر آئے۔
ضرورت آئینہ کی تو فقط دل کی صفا تک ہے۔

یہاں ہے وہ دیا روشن نہیں محتاج آتش کا
تجلی ماہ کی تو نور مہر پر ضیا تک ہے۔

دل روشن سے کیا نسبت ہے اس خورشید رخشاں کو
کہ نور مہر بھی تو دور صبح و مسا تک ہے۔

اگر دل میں تجلائے حقیقت جلوہ گر ہو جائے
تو نیرنگئ عالم کی تجھے ساری خبر ہو جائے

پئے سیر و تماشا کیا تم اس گلزار میں آئے — ہوئے گل کے نہ چشم نرگس بیمار میں آئے
سمائے چشم عاشق میں عجیب اک بات ہے یہ تو — مزا جب ہے نظر عاشق نگاہ یار میں آئے
گلستاں کی کرو گر سیر تم چشم بصیرت سے — ثمر دانہ میں دیکھو اور نظر گل خار میں آئے
یہ مانا عارضی ہے پر ہے نقل اصل تو زاہد — وہ مدہوشی جو قلب و دیدہ سرشار میں آئے
سکون روح کا پیدا سماں ہو اسکی موجوں میں — تلاطم گر ترے دل کے یم ذخّار میں آئے
دوئی کو گر مٹا دے تو خودی کو گر اڑا دے تو — تو شکل یار پھر تجھکو نظر اغیار میں آئے
کہاں تھے ہم؟ یہیں تھے اور یہیں ہونگے جہاں جائیں — کہاں جائیں نظر ہر شے جو شکل یار میں آئے
نہیں یہ گلستاں آہ و بکا شور و فغاں کی جا — رہے بس دم بخود بلبل جو اس گلزار میں آئے

ہے یم سے ابر۔ اس سے رود پھر واصل ہے وہ یم سے
بتاؤ پھر تمیز و فرق کیا ہے۔ اس میں اور ہم میں

غرض کی لوث سے انسان کا دل گر بری ہو جائے — تو پھر کون و مکاں پر اسکو حاصل افسری ہو جائے
کھلیں جب راز دل کے ان سے پھر ہو جائے کیا اوجھل — کھلونا ایک بچوں کا یہ سحر سامری ہو جائے
نہیں ہے منتج محبوب ظاہری بھی عشق صادق میں — کہ فیض عشق سے کبجا بھی اندر کی پری ہو جائے
کھلی ہو جس کے دل کی آنکھ پھر کیا اس سے پردہ ہو — اسے راز حیات و موت امر سرسری ہو جائے
ہوا جو خاک راہ عشق میں اسکو ملی عظمت — کہ حاصل مر کے ہی تانبے کو عالی گوہری ہو جائے
پھنکے جو سوزش دل سے حیات جاوداں پائے — کہ جتنی بار جائے آگ میں ڈھالو کھری ہو جائے
وہی ہیں عشق میں معشوق جو ہیں عاشق صادق — اگر تو من کو مارے تجھ کو حاصل دلبری ہو جائے
دل گل میں ہو داغ لالہ پھر کیا خار کا کھٹکا — کہ محو عشق خوفوں اور خطروں سے بری ہو جائے

محبت کی سمجھتا کون ہے یہ رمزیں اور راہیں
یہاں تو پا بجولاں حلقۂ گیسو میں ہیں آہیں

تو اے اشکال گونا گون عالم کے تماشائی — بتا تو ہیں یہ سب نیرنگیاں کس رنگ سے چھائی
گل و شبنم یہ کیا ہیں؟ باغ کیا ہے؟ کون مالی ہے؟ — کبھی گلزار عالم میں یہ سوچا تو نے سودائی
لڑائی آنکھ نرگس سے کبھی سنبل سے تو الجھا — نہ سمجھا راز معنی کو تو اے صورت کے شیدائی

۱؎ معدنیات کی قسم سے جیسے لوہا، تانبہ وغیرہ

ہنسا ہے خندۂ گل سے تو رو دیا شورِ بلبل سے — جو اسوں کے فسوں کی سیر ناداں کیا تجھے بھائی
شہود شاہد اصلی مشاہد ہیں نظر آئے — جو حاصل ہو تری چشمِ دروں کو نورِ بینائی
عیاں کثرت میں ہو وحدت نہاں وحدت میں ہو کثرت — یہ شانِ لاشریک اور ہے یہی اندازِ یکتائی
بتوں کی شکلِ زیبا پر تو کیا مفتون و شیدا ہے — محیطِ کُل نے کب زندانِ صورت میں جگہ پائی
ڈھنڈورا شہر میں لڑکا بغل میں ہے مثل تیری — دکھائی دے جو دیکھے آپ میں وہ شکلِ رعنائی

یونہی دیکھو تو دنیا ایک ناٹک ہے فسانہ ہے۔
نظر ہو اصل پر تو پھر حقیقی کارخانہ ہے۔

سنی تم نے جو یہ مجذوب کی بڑ یارِ فرزانہ — سمجھ لینا نہ اسکو اک گل و بلبل کا افسانہ
مگر روئے سخن اپنا تھا ان سے جو ہوں صاحبِ دل — جو محسوسات اور جذبات سے بالکل ہوں بیگانہ
غرض کا لوث ہو جنہیں نہ غیریت کی تاریکی — شرابِ معرفت سے جو ہوں بیخود اور مستانہ
مگر مکتب میں قدرت کے ابھی تک ہیں جو ابجد خواں — سبق اخلاق کا لازم ہے ان کو پہلے سکھلانا
دکھانا ہے انہیں نقشہ ثوابوں اور عذابوں کا — بجا ہے انکو نرک اور سرگ کا افسانہ بتلانا
صحیفوں میں جو لکھا ہے رہیں پابندۂ اسکے — کتبِ اخلاق کی ان کے لئے اعلیٰ ہیں پیمانہ
لگائیں کٹ کھنوں کی مشق میں دل بستگی جو ہیں — مگر معہود دل ہو پنجہ کش[1] سے پنجہ لے جانا
اکھاڑوں میں وہ پا کر تربیت یوں آئیں دنگل میں — وہ صالح اور زاہد بن کے پھر چکھیں یہ پیمانہ

نہیں مفتوں ہر اک چڑھ یا جمالِ ماہِ تاباں پر
نہیں گرتا ہر اک بھنگا لپک کر شمعِ سوزاں پر

---

[1] سید محمد رضوی مرحوم دہلوی۔ اپنے عہد کے بہترین نستعلیق نویس اور زبردست پنجہ کرنے والے ۱۸۵۷ء میں جاں بحق ہوئے۔ پنجہ کش یا میر پنجہ کش ان کا لقب تھا۔

قومی عمارت

مارچ سنہ ۱۹۰۸ع

یہ نظم اتنی پسند اور مقبول ہوئی کہ کئی رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوئی۔

بتاؤ کون سا ہے وہ مکاں سارے مکانوں میں
کہ جس کی سربلندی کے ہیں چرچے آسمانوں میں

ہے وسعت جس کی بنیادِ جہاں سے منزلوں باہر
تو جھنڈے اس کی رفعت کے گڑے ہیں آسمانوں میں

نہ جس کے کنگرے پر فاختہ کو کو سناتی ہے۔
جو باغِ بے خزاں ہے اس جہاں کے گلستانوں میں

وفائے گل کی دیتے ہیں شہادت غنچے سو منہ سے
گلہ کا شور جہاں برجستہ ہی بلبل کے ترانوں میں

نہیں ہے جس کے کاشانوں میں قید مذہب و ملت
گزر شیخ و برہمن کا ہے جس کے آستانوں میں

بلا تخصیص رنگ و دیں ہے کل خلقت مکیں جس کی
جہاں بس اک صدا پیدا ہے ناقوس اور اذانوں میں

کلیسا مسجد و بت خانہ ہیں سب سایہ بیں جس کے
نہیں ہے اختلاف اس قصر عالی شان کی تانوں میں

یہ قومیت وہاں کے ساکنوں کی ہے کہ ہندی ہیں
وہ چاہے جھونپڑوں میں ہوں وہ چاہے ہیں چھاؤنیں

تعصب اور غیریت ہے کوسوں دور جس گھر سے
جہاں بیگانہ بھی آئے تو داخل ہو یگانوں میں

یہی اے ساکنانِ ہند وہ قومی عمارت ہے۔
کہ جس کی ساخت کی اہل وطن کو اب ضرورت ہے۔

اگر احساس عزتِ قوم ہے کچھ ہند والوں میں
زمانے نے سکھایا ہے اگر کچھ اتنے سالوں میں

اگر حبِ وطن کی آگ کی ہے دل میں چنگاری
عمل کی ہے اگر نیت بھی کچھ ان کہنے والوں میں

اگر ہیں اس عرق ریزی میں خونِ دل کے کچھ قطرے
اگر کچھ دل کے ٹکڑے بھی ہیں ان شوریدہ نالوں میں

محبانِ وطن کا ایک ہے گر ظاہر و باطن
اگر کچھ کرنے والے بھی ہیں اتنے کہنے والوں میں

کسی کو ہے جو توفیقِ عمل بھی اس کے معنی پر
پڑھا ہے جو سبق تم نے تمدن کے رسالوں میں

اگر ہے اک زباں میں بھی اثر جوشِ صداقت کا
جو اک بھی عاملِ کامل ہے اتنے باکمالوں میں

کسی دل میں اگر حبِ وطن کی آگ جلتی ہے
اگر ہے پاسِ حفظِ قوم ان فرخندہ حالوں میں

جو ہے مردہ دلوں میں ایک بھی جاں پھونکنے والا
مسیحا ہے اگر کوئی بھی اتنے خوش مقالوں میں

تو پھر قومی عمارت کا بنا ہے خدا مکاں میں
خدا توفیق دیتا ہے اگر ہمت ہو انساں میں

یہ وہ قومی مکاں ہے جو کبھی رشکِ جناں ہوگا ترقی کا یہیں سے ہند کی سکہ رواں ہوگا
یہ وہ گلزار ہے کانٹا بھی جس کا گل کھلائیگا مشامِ دہر جسکی بو پہ صدقے بے گماں ہوگا
کھلیں گے داغ الفت لالہ ساں پہلو میں ہر گل کے یہاں بلبل کا اک اک گل کے دلمیں آشیاں ہوگا
نظر میں اپنی عالم ہوگا۔ عالم میں سخن اپنا یہاں ہر پھول نرگس اور ہر غنچہ دہاں ہوگا
خزاں کا اس چمن میں ڈر نہ کھٹکا باد صرصر کا یہاں آزاد مثل سرو سارا گلستاں ہوگا
پھریرا اس کا لہرائیگا بام عرش اعظم پر بلندی میں مکاں یہ اس قدر عالی نشاں ہوگا
یہ وہ حصن حصیں ہے مار جسکی قطب تک ہوگی اسی کے سایہ میں محفوظ یہ ہندوستاں ہوگا
یہی ملجا و ماوا ہوگا۔ ہر گبر و مسلماں ہوگا یہاں ہیں قاضی الحاجات اس کا آستاں ہوگا

رفاہ ہندوستان حریت جس سے عبارت ہے
یہیں رہتی ہے وہ اور اس کا گھر قومی عمارت ہے

اگر ہے عشق دلمیں جذب کی وہ شان پیدا کر کہ ہر اک موئے تن کے بدلے سو پیکان پیدا کر
اگر قومی حمیت جوش زن ہے تیرے سینے میں تو دل میں نفس کے ایثار کی تو شان پیدا کر
پڑا ہے کفر و دیں کے کیا جھمیلوں میں تو اے ناداں خدا جس سے ملے وہ دین وہ ایمان پیدا کر
خیال اک غنچہ سربستہ عمل پکا ہو اسٹا تو اس حق الیقین کی زندگی میں شان پیدا کر
تو خود غرضی کو چھوڑ اور جان خلقت ہی میں خالق کو تو ایسے ترک پر قادر ہو ایسا گیان پیدا کر
شہادت کیلئے آیا ہے کس برتے پہ مقتل میں تو ہر ہر رگ میں پہلے اپنی سو سو جان پیدا کر
حیات جاودانی کی تمنا ہے اگر تجھ کو فنا فی القوم ہو جانے کا تو سامان پیدا کر
اگر مخدوم بننا چاہتا ہے پہلے بن خادم کہ ہے خدمت سے عظمت یہ یقین ناداں پیدا کر
مثال شانہ اول سینہ صد چاک تو بن جا الجھنے کا پھر اس زلف صنم سے دھیان پیدا کر
سراپا سوز دل تو شمع ساں پہلے دکھا نکہ پھر اپنے دل میں بزم آرائی کا ارمان پیدا کر
رفاہ ملک میں تیرے مساعی کارگر ہوں گے تو اپنی ذات میں صبر اور اطمینان پیدا کر
ہویدا اتحاد اضداد نیرنگی میں یکرنگی ظہور وحدت اس کثرت میں ہو وہ شان پیدا کر
محیط دہر میں امداد کر کشتی شکستوں کی وفا کے آشناؤں کی ذرا پہچان پیدا کر

وہی ہیں زندۂ جاوید جو اوروں پہ مرتے ہیں
وہی مخدوم عالم ہیں جو خدمت سب کی کرتے ہیں

اگر چشم بصیرت کثرت نظارہ میں وا ہو
تو سرمد وجد در ہر نظر دل میں ہویدا ہو

اگر ہر رنگ میں اک رنگ ہی ہم کو نظر آئے
تو پھر وحدت کا جلوہ عالم کثرت میں پیدا ہو

جو ہر مخلوق میں ہم نور خالق جلوہ گر دیکھیں
تو پھر عالم میں کیوں یہ کشمکش کی جنگ برپا ہو

اگر حبّ وطن ہو دل میں کیوں ہو یاس کا موقع
الم کتنا ہی ہمت آزما ہو روح فرسا پیدا ہو

وہ پھوٹے آنکھ جس میں ہو نہ جوشِ اشک ہمدردی
وہ دل ہو خوانِ خارِ غم نہ جس دل میں کھٹکتا ہو

کسی بھائی کو دکھ میں دیکھ کر بھائی کو ہو صدمہ
کہیں حبّ وطن کا جذبہ یہ دل میں تو پیدا ہو

حیات جاودانی ہے وطن کی جاں نثاری میں
وہ دن آئے کہ ارباب وطن کا یہ عقیدہ ہو

نہیں وہ خادم قومی جو آزردہ ہو بیدل ہو
یہ شرط عشق ہے دل پر نہ میل آئے نہ شکوہ ہو

نوید جاودانی ہے فنا فی القوم ہو جانا
جو گم کر دے خودی کو تو تو خود ہر شے میں پیدا ہو

یہ حالت حبّ قومی میں نہ جب تک آپ کی ہوگی
نہ یہ قومی عمارت چار اینٹوں سے کھڑی ہوگی

نمائش کے لئے کوئی وطن کا نوحہ خواں کیوں ہو
نہ ہو جب درد ہی دل میں تو پھر لب پر فغاں کیوں ہو

نہ دو گے جان جب تک جان وطن میں کیسے ڈالو گے
نہ قرباں ہو جو خلقت پر مسیحائے زماں کیوں ہو

سپوتوں میں جو اس کے ہو بہم ایثار ہمدردی
تو پھر مصروف ماتم مادر ہندوستاں کیوں ہو

وطن کی آگ میں جلنا اگر طاقت سے باہر ہے
یہ ٹھنڈی گرمیاں کیوں ہوں یہ آشوب بیاں کیوں ہو

زبانی داخلہ تعمیر قومی میں نہیں چلتا
نہیں سرگرم ایثار قوم تو منہ میں زباں کیوں ہو

جو نالہ دل سے نکلے کیوں نہ جا کر گھر کرے دل میں
جو خالص حبّ قومی ہو تو کوئی بدگماں کیوں ہو

یہ کیا ہے گر نہیں ہے قوم کو گمراہ کر دینا
جو دل ہو سرد پہلو میں زباں آتش فشاں کیوں ہو

نہیں دکھ جھیلنا منظور تو آؤ نہ میداں میں
نہیں سودا محبت کا تو اس صف میں دکاں کیوں ہو

وطن کو کر دیا بدنام کم ظرفی نے یاروں کی
نہ لب پر میرے شعر غالب جادو بیاں کیوں ہو

"کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو"

عمارت قوم کی ہرگز نہیں اک دن میں بن سکتی
ہو جس کے دل میں الفت صبر سے وہ سرگراں کیوں ہو

منازل رفتہ رفتہ ہی بنیں گے قصر قومی کے
نہ جس میں تاب ہو اس کی وہ صرف امتحاں کیوں ہو

ہوا ہے یہ بھی نیکوں کو کہا ہے بد زمانے میں
جفائیں سہنی پڑتی ہیں بہت کچھ دل لگانے میں

ہے وقت اب کام کا اُٹھو تم اور میدان میں آؤ — نکالو حوصلے دل کے نہ جی محنت سے اکتاؤ
کرو جی توڑ کر محنت۔ کرو سر جوڑ کر کوشش — تو ناممکن ہے ثمرہ تم نہ اس کا ایک دن پاؤ
بناؤ ولکے یہ قومی عمارت قوم کی خاطر — جو بنیادیں ہوں اسکی راہ میں حائل انہیں ڈھاؤ
سکھایا ہے تمہیں یہ دین حق نے اسکو مت بھولو — خودی کو تم جو کھو دو۔ آپ کو ہر چیز میں پاؤ
کرو حبِ وطن سے اکتسابِ جلوۂ یزداں — فنا فی القوم ہو کر آپ میں وہ نور چمکاؤ
تمہیں کیا خوف ہے سر کا تمہیں کیا جان کا ڈر ہے — تمہیں تو جان ہو عالم کی اے میرے مسیحاؤ
مفصل کہہ چکا ہے تم سے کیفیؔ کو جو کہنا تھا — بس اب اٹھو کرو کچھ کام بھی اور نام کر جاؤ
جو توڑو شیشۂ پندار جامِ عیش ہو حاصل — ملے خود محتسب سے مے صفائے دل جو دکھلاؤ
اسی قومی عمارت سے بلند اپنا نشاں ہو گا — بناؤ اسکو یارانِ وطن۔ نیو اسکی اٹھواؤ

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

صدائے کیفی

سنہ ۱۹۰۷ء

اے ساکنانِ بھارت! اے زبدۃ البرایا — تم کو کبھی عزیزو اتنا بھی دھیان آیا
تم گل ہو کس چمن کے۔ گوہر ہو کس صدف کے — تم کس کے نام لیوا۔ ہو ہند کی رعایا
کس کان کے جواہر ہو تم ذرا تو سوچو — اسلاف کون تھے وہ وہی یہ جنھوں نے کمایا
یہ درد کی کہانی کب سے بھلائی تم نے — پرکھوں کا نام تم نے افسوس کیوں بھلایا

کیسے بزرگ تھے وہ عیسے نفس تمہارے — جان آ گئی مُردہ دل میں یہ نام جب سنایا

مُردہ رگوں میں دوڑا اک جوش کا جرارا — بار خدا زبان پر کس کا یہ نام آیا

تہذیب و ملکداری ۔ خود داری اور دھرم میں — اہلِ جہاں میں سب سے اونچا تھا ان کا پایا

اے برہمن! میں تجھ کو اتہاس کیا سناؤں

اے شیخ! یاد تجھ کو ۔ تاریخ کیا دلاؤں

آئیں بہت بہاریں اس گلشنِ جہاں میں — نیرنگیاں دکھائیں قدرت نے بوستاں میں

نرگس نے سحر پھونکا نظّارگی پہ اکثر — سوسن نے قند گھولا ہے بارہا بیاں میں

غنچہ نے بارہا کی دل کی کلی شگفتہ — بلبل نے کب نہ ڈالا سوزِ اثر فغاں میں

کب سرو کی اکڑ سے سنبل نہ پیچ میں تھا — فوّارے نے نکالے رخنے نہ کہکشاں میں

وہ دل میں گل کے غم کا کانٹا چبھا نہ نکلا — لالہ کے داغ دیکھے جو سینۂ تپاں میں

گل نے یہاں مہک کر بلبل نے واں چہک کر — اک جانِ تازہ اکثر پھونکی ہے گلستاں میں

سبزے نے رنگ لا کر وہ آئینہ دکھایا — بیگانہ کر دیا ہے اپنوں کو بوستاں میں

دنیا کی سیر ساری اپنی ہے دیکھی بھالی

گلزارِ ہند لیکن ہے تیری وضع نرالی

جو ہندو و مسلماں بستے ہیں اس جگہ پر — ہے کل کی بات وہ تھے دنیا میں نام آور

روما کہ جس کا شہرہ تا مشرقین پہنچا — اسلاف نے تمہارے اس کا جھکا دیا سر

اے بھائیو! گئے تم کیا بھول وہ زمانہ — جب تم سے کانپتا تھا ۔ ملکِ فرنگ تھر تھر

زیرِ نگیں تھا یوناں ۔ افریقہ ۔ چین و یورپ — اسلام کا پھریرا تھا اک جہاں کے سر پر

ایرانیوں نے پایا ۔ بکرم سے سیتھیا نے — پائی ہیں جو شکستیں ۔ دنیا کو ہیں وہ از بر

پہنچا نشانِ شاہی پیرو و مکسیکو تک — سارے جہاں میں پھیلے تھے آریوں کے لشکر

سلطان تھے وہ مگدھ کے وہ تاجدار اودھ کے — جن کے علَم قلم سے تھا اک جہاں مسخر

راجا تھے پرتھوی کے سلطان تھے جہاں کے

ہے کل کی بات ۔ تم تھے خورشید آسماں کے

تھیں گرچہ پہلی شانیں کچھ مختلف تمہاری — مفتوح اور فاتح کی تھی تمیز بھاری

وہ ربط ضبط لیکن بر روئے کار آیا — محکوم اور حاکم کی بات بھولی ساری

شیدا اگر یہ اس کا تھا جوشِ عاطفت سے — اخلاص سے وہ اس کی کرتا تھا جاں نثاری
دونوں نے ہند کو تھا اپنا وطن بنایا — بھارت کی ہر زمیں تھی۔ دونوں کو دل سے پیاری
گو اختلافِ ظاہر تھا مذہبوں میں اُن کے — پر ایک ہی خدا کے دونوں تھے وہ پجاری
آنکھوں میں ان کی یکساں تھی ہیچ جاہِ دُنیا — شاہی تھی ان کے آگے اک سخت ذمّہ داری
تھا نورِ صدق دل میں نیکی بھری عمل میں — تھا اس لئے ہی ان پر مبذول فضلِ باری

اس طرح سات صدیاں ہم نے یہاں گذاریں
اک دوسرے پہ جانیں اکثر ہیں ہم نے واریں۔

بد قسمتی سے آیا اپنی وہ اب زمانہ — اپنا بنا پرایا۔ بیگانہ ہے یگانا
نکبت جو چھائی ہم پر ہم نے بھلائے یکسر — وہ اتحاد بیتیں۔ وہ رابطہ پُرانا
تاریخ سے جو ہم کو کچھ یاد رہ گیا ہے — تو عہد مرہٹوں کا۔ اور نگ کا زمانا
میں یہ نہیں کہوں گا۔ تم ان کو بھول جاؤ — لیکن نہیں طریقہ لازم اسے بنانا
تاریخ کے اگر تم ہو اس قدر ہی شیدا — تو اس سے مل سکیگا۔ تم کو بڑا خزانا
تم کو خبر ہے پہنچا امداد کو ہمایوں — جب تنگ ہو گیا تھا۔ چتوڑ پر زمانہ
اک بادشا مسلماں تھا اس پہ حملہ آور — اک ہندو بیوہ اس کی تھی توپ کا نشانا
تھا کون اس کا شوہر؟ وہ سور بیر سانگا — بابر کے سامنے جو اُٹھا مخالفانہ

تھی کیا کشش جو اس کے بیٹے کو کھینچ لائی
کرناوتی۔ ہمایوں سمجھے وہی بہن بھائی

تھی جتنی پہلے اُلفت اب اتنی غیریت ہے — جن میں محبتیں تھیں ان میں مخالفت ہے
تھا جن کا چولی دامن کا ساتھ مدتوں سے — بے وجہ ان میں ان بن ہے اور مخاصمت ہے
جب گرمجوشیاں تھیں اب سرد مہریاں ہیں — تھی پہلے وہ محبت۔ اب یہ منافقت ہے
پھوٹ اور حسد نے ذلت اس درجہ ہم کو بخشی — وقعت اٹھی جہاں سے اپنی بنی یہ گت ہے
دل ہو گئے ہیں پتھر اپنوں سے اپنے ایسے — بھائی پہ ہے جو آفت۔ تو اپنی عافیت ہے
گر ہو مقابلہ ہی تو علم اور ہنر میں — ٹکڑوں پہ بھیک کے کیا باہم منافشت ہے
جو کام کی ہیں باتیں دونوں نے وہ بھلائیں — بیکار کی عزیزو۔ جھنجھٹ یہاں بہت ہے

اس شر سے تا اک حد تک نوبت یہاں جو آئی
اک دفعہ اصلوں نے قانون میں بڑھائی [1]

[1] دفعہ ۱۵۳ الف تعزیرات ہند کی طرف اشارہ ہے

ہاں! اک ذرا تو سوچو اے میرے ہندی بھائی
ناخن کی گوشت سے کب ہوسکتی ہے جدائی

تم ہندو و مسلماں اس ملک کے ہو وارث
بھارت کے پوت ہو تم وہ ہے تمہاری مائی

ہے برتری تمہاری - ماتا کی برتری سے
اس کی بڑائی سے ہی تم سب کی ہے بڑائی

ناز و نعم سے پالا اس نے تمہیں برابر
اپنا لہو چسایا - اور اپنی جاں کھپائی

کیا اس لئے ہی بھائی ماتا نے ہم کو پالا
آپس میں اس کے آگے ہم یوں کریں لڑائی

مادر کے دل کو بھائی پہلو میں اپنے ڈالو
تو پھر کرو نہ باہم یہ جنگ آزمائی

جانکاہ ہے رنڈاپا طاقت شکن بڑھاپا
اس بے کسی میں ماں کی خدمت ہے فرض بھائی

کچھ نیک و بد کو سوچو نام خدا جواں ہو
دیکھو کہ کل کہاں تھے اور آج تم کہاں ہو

اے کاش! اب سے مسلک ہو جائے یہ ہمارا
نیکی بجائے یاراں فرصت شمار یارا

سن لو یہی زمانہ تم کو سنا رہا ہے۔
آثار دہر کا ہے تمکو یہی اشارا

ملنے میں فائدہ ہے پھٹنے میں خرخشا ہے
اک اتفاق کا ہے بس قوم کو سہارا

خود غرضیوں کو چھوڑو۔ منہ دشمنی سے موڑو
اے بھائیو! تمہیں ہے اپنا وطن جو پیارا

بھائی ہے تم کو یہ کیوں بدخواہی بھائیوں کی
دل موم سا تمہارا۔ کیوں ہوگیا ہے خارا

اپنوں سے یہ رکھائی۔ آپس میں یہ لڑائی؟
حافظ کا قول تم نے یہ دل سے کیوں بسارا

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف - با دشمناں مدارا

قدر اس سے دوگنی ہوگی۔ آفاق میں تمہاری
ایکے سے اپنا ہوگا۔ قوموں میں پلہ بھاری

اے تیزیٔ زباں سے بجلی گرانے والو!
اے تابش قلم سے شمعیں جلانے والو۔

یہ وقت کام کا ہے - کچھ خدمت وطن ہو
ہاں تم کہاں چھپے ہو۔ میداں میں آنے والو

ہاں جان تازہ ڈالو - تم قوم مردہ دل میں
اے سحر سے زباں کے مردے جلانے والو

اے عالمو! اجالو تم دل کو جاہلوں کے
اے تم زمیں کو دم میں گردوں بنانے والو

اے ناصحو! کمر تم ہمت کی کس کے اٹھو
اے گمرہوں کو سیدھا رستہ دکھانے والو

ہاں مال و زر لگا دو اس کار خیر میں تم
راہ خدا میں اپنی دولت لٹانے والو

اے دیس کے محبو! اے خادمان قومی!
اے قوم اور وطن پر جاں تک گنوانے والو

مل کر بلا دو باہم بچھڑے ہوئے ہیں بھائی
اپنے وطن کی گر تم ہو چاہتے بھلائی

خیر مقدم امیر کابل

۱۹۰۷ء

ہز میجسٹی امیر حبیب اللہ خاں والئے افغانستان کی تشریف آوری کے موقع پر یہ نظم لکھی گئی۔
مخزن فروری ۱۹۰۷ء میں چھپی۔

کیوں لگی ہیں سب کی آنکھیں آج خیبر کیطرف
گوش صایم جیسے ہو اللہ اکبر کی طرف

یا چہاوٹ کی جھڑی کے بعد جیسے ناتواں
دیکھتا ہے مطلع سلطان خاور کیطرف

کون سا مہماں قدم رنجہ یہاں کرنیکو ہے
دیکھتے ہیں ہم کبھی گھر اور در کی طرف

ہے گزرنے کو یہاں سے کون شاہی قافلہ
ہر نظر اٹھی ہے کیوں سرحد کے منظر کی طرف

شوق سے جاتا ہے کیوں ہر اک نظر سرحد کے رخ
کبک لپکے جس طرح ماہ منور کی طرف

خیر مقدم کیلئے کس کے کھڑے ہیں ہر طرف
شاہ قیصر کے عمائد اور اراکین صف بہ صف

اے درہ خیبر کے ہم تجھ کو بھلا سکتے نہیں
یاد ویریں ہم تری دل سے مٹا سکتے نہیں

تو ازل سے ہے ہمارے گھر کے پھاٹک کی کلید
مثل دور چرخ جسکی چال پا سکتے نہیں

آریوں کو مدتیں گزریں دیا تو نے گزر
جن کی آمد کا مورخ دن بتا سکتے نہیں

تو نہ ان کو راہ دیتا تو نہ پاتے پھر کبھی
علم و حکمت کے وہ معدن ہاتھ آ سکتے نہیں

گر محافہ کو نہ گندھاری کے تو دیتا گزر
تو جدا ہستنا پور فتح دریودھن یہ پا سکتے ہیں

تو نہ گھر کی بلکہ بھارت کی ہے قسمت کی کلید
تو نے ہی ہم کو دکھائے روز سعد و نا سعید

---

[1] کوروں کی ماں گندھاری قندھار کے ہندو راجہ کی بیٹی تھی۔

حملہ گشتاسپ کی ہم نے سنی ہے داستاں[2] اور سکندر کی بھی آمد کا پڑھا ہے سب بیاں[3]
ہم نے مینندر کے دھاوے کی سنی ہے سرگذشت[4] جسکی متھرا اور کچھ تک فتح کا پہنچا کراں
ہم کو ستھیا کی چڑھائی کی حقیقت بھی ہے یاد[5] جس کا لہرایا تھا گنگا کے کناروں تک نشاں
حال جو جیپال کے دل کا ہوا معلوم ہے[6] غزنوی دھاڑوں کا آگے آنکھ کے ہے کل سماں[7]
حملۂ غوری کی بھی تاریخ ہے پیش نظر[8] جس نے ہندی راج کے سر پر گرائیں بجلیاں

تجھ کو لیکن اے درِ خیبر محافظ ہند کے
حملہ آور آریہ مسلم تھے دونوں ایک سے

تو نہ تیمور[9] اور مغلوں[10] کو اگر دیتا گزر کب شہ محمود تغلق چھوڑتا دلّی سا گھر
کیونکہ کر سکتا فنا وہ لودھیوں کے راج کو تو سموں کو چومتا بابر کے گھوڑوں کو نہ گر[11]
گر نہ دیتا تو قزلباشوں کو ہندستان میں دخل فتح نادر شاہ کب پاتا محمد شاہ پر[12]
نام لکھتا کون پانی پت کے جنگ سوم میں لشکر ابدالی کا پاتا گر نہ خیبر سے گزر[13]
ہند کی تاریخ کے دفتر سے پاتے ہیں یہ بات تو رہا سیل حوادث کا سدا سے رہگزر

آج اے خیبر! مگر تیری نرالی شان ہے
تو گذرگاہ حبیب شاہ ہندستان ہے

---

[2] مہاتما بدھ کی زندگی میں فارس کے بادشاہ دارا گشتاسپ نے ہندوستان پر حملہ کیا۔
[3] ۳۲۷ ق م میں مقدونیہ کے بادشاہ سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا۔
[4] مینڈر یونان کے سوتیر خاندان کے بادشاہ نے سنہ ۱۸۱ ق م میں حملہ کیا۔
[5] یہ لوگ کوہ قاف کے قریب کے رہنے والے تھے۔ ان کے سب سے مشہور سردار کا نام کنشکا تھا۔ اور ان لوگوں نے کئی دفعہ ہند پر حملے کئے۔ جو مسیح سے سو برس پہلے شروع ہوئے تھے۔
[6] لغایت [7]
[8] تاریخ ہند کے مشہور واقعات ہیں۔
[9] سنہ ۱۳۹۸ء میں تیمور نے حملہ کر کے محمود تغلق کو گجرات بھگا دیا۔
[10] خاندان غلاماں خلجی اور لودھی کے عہد میں مغل وقتاً فوقتاً پنجاب پر دھاڑے مارتے رہتے۔ کبھی دہلی کی فصیلوں تک پہنچ جاتے تھے۔
[11]-[13] نسبتاً حال کے واقعات ہیں۔

آج تک خیبر سے جو اس ملک میں آتا رہا — اس کا مقصد اور تھا اور مدعا تھا دوسرا
لیکن اے سلطاں سوا تیرے یہ کسکو تھا شرف — آ رہا ہے تو جو مہماں بن کے شاہِ ہند کا
والد یا جد ترے آئے یہاں اس شان سے — یا ہوا آج اس تجمل سے یہاں آنا ترا
میزبانی میں اراکینِ ہند کے مصروف ہیں — ہر کہیں ہیں جشن اور جلسے تری خاطر بپا
کوئی بتلائے کبھی ایسا ہوا ہے ہند میں — شاہ کابل کے لئے جو کچھ کہ اب ہے ہو رہا

واقعاتِ ہند کا تونے بھلایا ہے سبق
تونے تاریخ قدیمہ کا الٹ ڈالا ورق

مژدہ اے دلِ ہند میں وہ شہریار آنیکو ہے — وادیوں میں جس کے قدموں سے بہار آنیکو ہے
جس کا شہرہ روس اور انگلینڈ میں مدت سے تھا — آج ملکِ ہند میں وہ تاجدار آنیکو ہے
یوسف مصرِ خلافت جس کا ہے سالار آج — کارواں وہ ہند میں عالی وقار آنے کو ہے
خیر مقدم کیلئے کس کے ہیں توپیں رزق برق — کون میدانِ جلادت کا سوار آنیکو ہے
ہاں ادب کا وقت ہے تھم دم لے ذرا اے شوقِ دید — جس کا تھا آنکھوں کو اک بس انتظار آنیکو ہے

رعد توپوں کا افق سے جاکے واصل ہوگیا
شاہِ کابل حدِ ہندستاں میں داخل ہوگیا

سرزمینِ ہند پر ہے اب شہِ عالی مقام — میکموہن سب سے آگے بڑھ کے کرتا ہے سلام
خیر مقدم کرکے وہ شاہ حبیب اللہ کا — قیصرِ ہندوستاں کا اسکو دیتا ہے پیام
لاکھ تمکین اور مودت جس پہ ہو جائے نثار — وہ جواب اس کا ہے دیتا خسروِ ذی احتشام
تمکنت کے ساتھ حسنِ خلق و شاہی مکرمت — اس پہ ہے شایستہ موزوں کسقدر ہے کا کلام
اس نے دو باتوں میں اپنا کر لیا ہر ایک کو — ہوگئے سب شاہ کے لطفِ تکلم کے غلام

شان و شوکت وہ کہ ہے شاہانِ مشرق کا نشان
اور پھر وہ سادگی جو خاص مغرب کی ہے شان

اے شہِ کابل نہیں تو صرف امیر المومنیں — بلکہ اپنے ہندوں کا بھی ہے آقا اور امیں
عدل اور الطاف پر تیرے ہے سو جاں سے نثار — جس قدر ہندو رعایا ہے ترے زیرِ نگیں
ہندوؤں پر اور مسلمانوں پہ یکساں ہے کرم — امتیاز و فرق تونے ان میں کچھ رکھا نہیں
تونے دہلی میں جو فرمایا تھا[1] از راہ لطف و داد — اس سے بھارت ورش کو یہ ہوگیا پختہ یقین

[1] اشارہ ہے ان کلمات کی طرف جو گاؤ کشی کے متعلق فرمائے گئے تھے۔

گاتے ہیں کابل کے ہندو جو تری مدحت کے راگ — نام کو اس میں بناوٹ اور غلو مطلق نہیں

ہے بشہا مسلک ترا بے شک یہ خواجہ کا کلام
"با مسلماں اللہ اللہ - با برہمن رام رام"

خیر مقدم مرحبا اے خسرو عالی حشم — ہند را بنواختی نازم ترا سر تا قدم
صورت جاہ و جلال و مقصد اہل کمال — منظر انوار رحمت مبصر حسن شیم
منبع فیض و مروت معدن صدق و صفا — جوہر عدل و سیاست عنصر لطف و کرم
آستانت موضع دولت نہ اکنوں است و بس — دارد ایں قصر معلیٰ نقش تاریخ قدم
شرح احوال تو الحق بو العجائب دفتر یست — ہر کسے کے مے تواند کرد شکر ایں نعم

اے حبیب اللہ محب قیصر عالی مقام
تو ہے محبوب خلائق اور ممدوح انام

ہے یقین جب واپسی ہو گی تری سوئے وطن — ختم کر کے یہ سفر با فضل ربّ ذو المنن
تو رہے گی یاد اس سیر و سیاحت کی مدام — جاگزیں خاطر والا رہے گا یہ چمن
جو تعلق ہند و کابل کا رہا ہے مدتوں — کب فراموش اسکو کر سکتی ہے تاریخ زمن
اپنا مہماں جس نے سمجھا قیصری مہمان کو — رکھے مہمان شہی کے جسنے آنکھوں پر چرن
جس کے دل پر نقش ہے انداز تمکین شاہ کا — دائما تیرا رہے گا۔ یاد جسکو بانکپن

زینت تاریخ ہی - یہ واقعہ ہو گا نہیں
خوبیاں تیری رہیں گی اپنے دائم دل نشین

سنہ ۱۹۰۶ء

اے شعر تیری کس سے ثنا ہو
مدحت سرائی ہو کس سے تیری
عالم یہ سارا تجھ پر فدا ہے
جو دل ہے شیدا تیرے اثر کا
ہوتا نہ گر تو یوں جلوہ فرما
تو ناد و دیا معدوم ہوتی
کیف غنا سے کب جاگتی روح
نظم سخن کا کب رنگ جمتا
جو گن ہیں تیرے کیونکر گناؤں
علم و ادب کا ہے تو ہی زیور

اے شعر اجمل تو ہر زباں کی
حسن بیاں کا غازہ ہے تو ہی
نقاش ہے تو جذبات دل کا
عشق و محبت کا ہے پنگورہ
عرفاں سے تن کی روح و رواں ہے
بے شبہ جوہر ہے معرفت کا
تیرے اثر سے جو دل نہ کھنچ جائے
گر دل نہ جس کی ہل جائے تجھ پہ

انسانیت سے ہوگا وہ خارج
ماثور انساں ہیں تیرے سارے

بے شک گلِ تر رونق چمن کی
ہے بحر کی آبرو در گوہر تر
گلشن میں دیکھا گل کوئی ایسا؟
محفوظ ہو جو بادِ خزاں سے
صرصر سے ہو جو حفظ داماں میں
منقارِ بلبل سے ہو جو مصئوں
ہر گل کے پیچھے کانٹا اگر ہے۔
ہوتی کے سر پہ ہے بال کی آر
ہے شعرِ تر ہی باقی و دائم
اس سے فنا اور ہے نیست عاری

ناپید تھے جب ریل اور سٹیمر
کتم عدم میں تھا تار برقی
اور ڈاک سے تھا واقف نہ کوئی
نکلے نہ تھے جب یہ چھاپہ خانے
اخبار کی تھی شدہ تک نہ ہم کو
جو شعر نکلے اس وقت دل سے
اس وقت وہ ہیں سرتاج ادب کے
سرمشق ہیں وہ سب شاعروں کے
اب تک ہے دل پہ تاثیر اُن کی
قائم رہے گی روز ابد تک
کیسے مٹے گا یہ نقش دل سے

یہ یاد رکھنا لیکن عزیزو
یہ شان اسکی جو شعر اصلی
ہیں جسکو بھولے شاعر ہمارے
تعریف سمجھے وہ شعر کی یہ
ہو وزن جس میں اور قافیہ ہو
ہوں جس میں چند اک لفظی رعایات
ہو خرق عادت مافوق فطرت
اس میں نہ کچھ ہو قدرت کی تنظیر
جذبات صادق سے ہو یہ عاری
احساس دل کا بیگانہ اس سے
تخیل جس کی ناقص عمل کی
ہو سربسر اک تصویر وہمی

وہ موشگافی۔ توبہ الٰہی!
وہ ہے گہنے مانگے کے لادیں اس پر
وہ مستعار اسکو کپڑے پہنائیں
ہو شکل اصلی وہمی ہیولےٰ
غائب حقیقت ہو شعر کی سب
آرائشوں کا ہو اک پلندہ
جدت نہ مضمون تازہ ہی کوئی
یہ شعر ہے یا قیدی ہے جس کا
محبس ردیف اور زندان قوافی
شعر ایسا موزوں بھی ہو۔ اثر سے
ہوگا معرّا مطلب سے خالی

اے شعر گوئی کیا سحر ہے تو
قربان تجھ پہ شاہوں کی شاہی
کیا جانے تجھ میں جادو ہے کیسا
ہر دل پہ تیرا سکّہ جما ہے۔
جو سچے شاعر گزرے جہاں میں
بالسر شتی کے اب بھی بھگت ہیں
ہم سے بیاں ہو کیا شان انکی
گو پاس ان کے حشمت نہ زر ہو
لیکن غنا کے وہ بادشا ہیں
سلطان ہیں وہ اقلیم دل کے
ایسوں نے سوتی قومیں جگائیں
بندے کرائے آزاد انھیں نے
حبّ وطن کا مژدہ سنایا
الفت دلوں میں کی جلوہ افگن
اکسایا دل میں جوش ترقی
دھویا دلوں سے بغض و حسد کو
روحانی طاقت چمکائی دل میں
وہ حرّیت کا جھنڈا اڑایا
فاتح تھے قاصر جس پر ظفر سے
شاعر نے پایا اس دل پہ قبضہ
اس کا ہر اک کام ایسا کہ جس سے
معذور و عاری تدبیریں ساری

اے نکتہ سنجو! ان کے قدم پر
ہے فرض و لازم تم سب کو چلنا

ترک اب خیالِ معشوق کر دو۔
معشوق اپنا پیارا وطن ہو
بیرادر رقابت آپس کی چھوڑ دو
اِک جوش پھونکو سارے دلوں میں
مُردہ دِلوں کو زندہ کرو تم
داغِ کہن کو دھو ڈالو دِل سے
جدّتِ عمل میں اونچی ہو ہمت
تن من لگا دو اپنا جو اس میں
تو سرشتی کا ہو لُطف تم پر
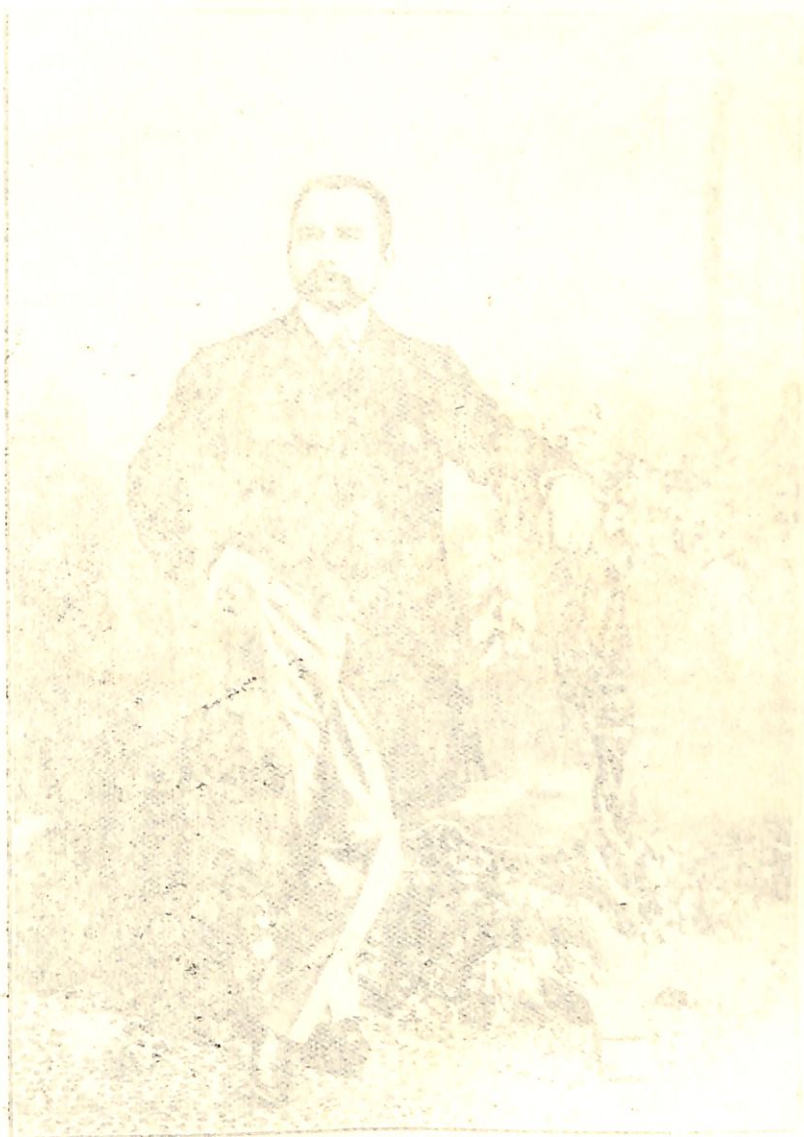
دَورِ دوم

۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۹ء تک

الوداع نواب محمد حیات خان نجم الہند

۱۸۹۶ء

سردار (بعد میں نواب) محمد حیات خان ۔ سی ۔ ایس ۔ آئی ۔ جالندھر میں ڈویژن جج تھے ۔ جبکہ ۱۸۹۶ء میں کیفی صاحب جالندھر آئے ۔ آپ کے آنے کے چند ماہ بعد سردار صاحب ملازمت سے سبکدوش ہوکر وطن مالوف واہ کو تشریف لے گئے ۔ اس موقعہ پر اہالیان شہر کیطرف سے کمپنی باغ میں موصوف کو ایک گارڈن پارٹی دی گئی ۔ جس میں آپ نے یہ نظم پڑھی ۔ اور شہر کی طرف سے سردار صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی ۔ سردار صاحب ہمیشہ اس نظم کو اپنے پاس رکھا کرتے تھے ۔

بدلی ہوئی کیوں آج گلستاں کی ہوا ہے ۔ سہمی ہوئی کیوں ہر روش باد صبا ہے
کیوں یاس کا چھایا ہوا ہر شے پہ ہے عالم کیوں باغ میں مایوسی و حسرت کا سماں ہے
آزردہ ہوئی آج یہ کیوں سرو سے قمری کیوں پھول سے دل بلبل شیدا کا پھرا ہے
کیوں گرمئی صحبت سے ہے جی شمع کا ٹھنڈا کس واسطے دل بزم حبیباں کا بجھا ہے
انگشت تحیر ہے یہ کیوں سرو لب جو کیوں خار الم دل میں ہر اک گل کے چبھا ہے
بیگانہ ہیں سبزان چمن سبزہ نمط کیوں دلگیر یہ کیوں غنچہ نمط آج ہوا ہے
کیوں چادر آب آئینہ کی شکل ہے ششدر فوارے کا کس خوف سے دل ہول رہا ہے
کس بلبل دلدار کا ہے کوچ چمن سے جو پیرہن شاہد گل آج قبا ہے

ہے کس شہ گل کی چلی گلشن سے سواری
سرد آہیں جو بھرتی ہے کھڑی باد بہاری

منہ موڑے حیات اس سے تو اے بخت سکندر ظلمات بنے آج نہ کیوں شہر جلندھر
کیا جاتا ہے تو توڑ کے دل جاتا ہے سب کا یہ دل وہ ہے جس دل میں ترے عشق کا ہے گھر
گل شہر اسی واسطے مغموم ہے سردار ہے صدمہ جدائی کا تری شہر کے دل پر

حاکم تو بہت آئے۔ اور آتے ہی رہیں گے
اوصاف میں ہوں گے کئی ایک ایک سے بڑھکر

جو تجھ میں محاسن ہیں کہاں پائیں گے لیکن
ان میں نہیں ممکن کوئی تیرے ہو برابر

ظالم کے لئے تیغ تھا تو دست اجل کی
مظلوم کے حق میں سپر رحمت داور

وہ کون سا ہے وصف جو پایا نہیں تجھ میں
تو جامع اوصاف حمیدہ ہے سراسر

سر اعلیٰ و ادنیٰ کے لئے تھا جو ترا خم
ہر خورد و کلاں اس سے ہی سمجھا تجھے سرور

دلدادہ رہی تیری جو محکوم رعایا۔
دل خوش ترے برتاؤ سے سارے رہے افسر

سوچا نہ کبھی تو نے یہ ہندو ہے کہ مسلم
تھے عدل میں کل ملت و دیں تجھ کو برابر

سرمایۂ فخر ایک فقط کیا ہے ہمارا
اے خان تو حکام کی ہے آنکھ کا تارا

اے داشتہ در سایہ ہم تیغ و قلم را
وے ساختہ آرائش ہم فضل و کرم را

دست تو ز بس الفت شان داد بہ یک جائے
در منصب تو وصل بود تیغ و قلم را

از بسکہ بود یاد تو در طینت اشیا
نسیان تو شرمندہ کند شہرت جم را

در کارگہ عدل تو از بس ہنر آموخت
عدل تو بہ فرزندی برداشت ستم را

از بسکہ ز روئے تو ستد داروئے صحت
عیسیٰ بہ طبابت بنشاند سقم را

زد کوس حیات ابدی خصم تو چوں دید
سرمایہ ہستی ز وجود تو عدم را

بخرام و نظر کن کہ بہ جولانگہہ مدحت
غور قلمم زادہ گلستان ارم را

طرح تو کجا بادہ نطقم نہ کف آرد
آنجا اثر نوشش بود نشۂ کم را

ایران کے شاعر نے یہ جو کچھ کہا ہے
وہ حرف بحرف آپ ہی کے حق میں بجا ہے

تو پیروں میں پیر اور جوانوں میں جواں تھا
تو تیر عدالت میں تو محفل میں کماں تھا

جو وصف ہیں تجھ میں وہ کہیں پا نہیں سکتے
ثانی ترا حکام میں صوبہ کے کہاں تھا

جس طرح کہ خورشید کرے شمع کو بے نور
یوں تجھ سے مٹا شہرت کسریٰ کا نشاں تھا

بیدار تھا وہ مغز۔ ذکی ایسی طبیعت
دھوکا تجھے دینے کا کسی کو نہ گماں تھا

گر تیری عدالت سے گیا جیت کے اک شخص
تو دوسرا ہارا یہ بھی توصیف کناں تھا

اس عدل کی پائیں گے نظیر اور کہیں کب
یہ وصف تو تیری ہی عدالت کا نشاں تھا

پھر اس پہ وہ جبروت۔ وہ تمکین وہ شوکت
لرزاں اثر رعب سے ہر پیر و جواں تھا

مداح و کیل اور موکل ترے دونوں
توبارہ کی تھا جائے ادب۔ بنچ کی شاں تھا۔

پیشانی بھی رہتی تھی کھلی دل کی طرح سے
نورستہ خاور تری چتون سے عیاں تھا

بیگانہ عدالت میں تھا صحبت میں یگانہ
صمصام اجل رزم میں اور بزم کی شاں تھا

کیا نجم ہے تو سلطنت ہند کا سردار
تارا ہے تو ہر آنکھ کا۔ ہر شخص کا دلدار

قسمت ہمیں بھولی ہے پہ تم بھول نہ جانا
یوں دل کو لگا۔ دل میں نہ تم آگ لگانا

مانا کہ جو کچھ کہتے ہیں ہم خود غرضی ہے
پر تم تو ہو فیاضی و شفقت میں یگانا

جس طرح کہ اب جاتے ہو تم پیٹھ دکھا کر
یونہی نہ سر مہر کبھی منہ بھی دکھانا

دوری میں حضوری ہے جو ہو راہ دلوں میں
تم نے تو وہ آبہ کو کبھی غیر نہ جانا

کس طرح بھلا بھول سکو گے ہمیں پھر تم
مانا کہ ہے بگڑا ہوا اب ہم سے زمانا

آنکھوں کی طرح دل سے نہ رکھنا ہمیں تم دور
ہاں دل کی طرح پھر کبھی اس شہر میں آنا

تم کیلئے یہاں شہر کو اک شان لگی تھی
تھی ذات تری شہر کی عزت کا بہانہ

تم ہم میں نہیں یاد تمہاری تو رہے گی
مشکل ہے ان الطاف و مکارم کو بھلانا

اب ہے یہ دعا خسا تو آفاق سے کیفی
تا حشر تمہارا رہے باکام زمانا

ہو بخت درخشندہ سدا یار تمہارا
خالق رہے دنیا میں مددگار تمہارا

قحط کے یتیموں کے لئے اپیل

سنہ ۱۸۹۷ء

سنہ ۱۸۹۶ء و سنہ ۱۸۹۷ء میں صوبجات متوسط (سی-پی) میں سخت قحط پڑا- لوگ بھوکوں مر گئے- پچاس ہزار سے زیادہ بچے یتیم اور لاوارث رہ گئے- اس اپیل کا نتیجہ نہایت مفید ثابت ہُوا- پنجاب سے کئی ڈیپوٹیشن گئے اور ہزاروں بچوں کو پرورش اور تربیت کے لئے لائے- جالندھر میں ایک جدا یتیم خانہ قائم ہُوا- ایسے یتیم خانے کئی جگہ کھولے گئے- یہ ہے شاعری کا عملی مفاد- اس نظم نے پنجاب اور یوپی کے دل ہلا دئے اور انہیں ادائے فرض کی تحریک کی-

ہمیں معلوم کہ بھارت کی ہے قسمت کیسی | سر پہ آئی ہے عزیزوں کے یہ آفت کیسی
چھا گئی قوم پہ ہے- یہ مصیبت کیسی! | یہ مصیبت ہے تو پھر ہوگی قیامت کیسی؟

ٹوٹ کر چرخ سے کیسی یہ بلائیں آئیں
اثر موت لئے الٹی دعائیں آئیں

نہ سُنا جائے گا ہمدم نہ سُنا جائیگا | ٹھیس یہ قصہ ہر اک دل کو لگا جائیگا
یہ بھلا سنتے ہی منہ کو جگر آ جائیگا | حال یہ وہ ہے کہ بے حال بنا جائیگا

داستان غم جاں سوز سنائیں کیونکر
آپ رو رو کے نہیں ہم نہ رلائیں کیونکر

آپ کے پاس نہ جائیں تو کہاں پھر جائیں | چیر کر اپنا دل خستہ کسے دکھلائیں
مرثیہ غم کا یہ ہم سامنے کس کے گائیں | اور امید ہے کس سے کہ مدد فرمائیں

نہ دہائی دیں- تو پھر تم کو خبر ہو کیسے
دودھ ملتا نہیں ماں سے بھی بنا رونے کے

دل میں سوچو تو ذرا ایسے یتیموں کا الم | جن کی مائیں ہوئیں فاقوں سے ہم آغوش عدم
کال نے ان کئی برسوں میں وہ ڈھائے ہیں ستم | کہ مرے ان کے پتا بھوکوں کے مارے پیہم

آہ! یہ روئیں بھی- تو کون ہے سُننے والا
ان کی تکلیف پہ سر کون ہے دھننے والا

ملک متوسط اس آفت کا نشانہ ہے آج　　تنگ جس پر کہ ہر اک طرح زمانہ ہے آج
جس کی بپتا کا نہ کوئی بھی ٹھکانہ ہے آج　　پاس جن کے نہیں اک غلہ کا دانہ ہے آج

اس کی رو سے کہ جو حالات ہیں معلوم وہاں
لاکھ کے لغبھگ یتیم اور ہیں معصوم وہاں

ایسے حالات خراب ان کے سُنے جاتے ہیں　　دردمندوں کے کلیجے تو پھٹے جاتے ہیں
جی عزیزوں کے یہ سن سن کے کٹے جاتے ہیں　　کہ غریب اپنے جو بھائی ہیں مرے جاتے ہیں

جن کا دنیا کے ہے پردے پہ نہ کوئی وارث
ہے خبر گیر کوئی اور نہ والی وارث

ہے مددگار کوئی ان کا تو نومیدی ہے　　کوئی غمخوار ہے گر ان کا تو مایوسی ہے
کوئی وارث ہے نہ کنبے کا رہا کوئی ہے　　ان کا گاہک ہے اگر کوئی تو مشنری ہے

پھر یہ ہندو غریبوں پہ کہاں کا ٹوٹا
کیا ہی ان بلیوں کے بھاگ سے چھینکا ٹوٹا

الغرض جان کے ہے ساتھ ہی ایمان کا ڈر　　وہ کہ ہم جان سے بھی لیکھتے ہیں جسکو بہتر
گر گیا دھرم تو پھر جان کی ہے کیا آدر　　جان اور دھرم یہاں دونوں پہ چھایا ہے خطر

اس لئے بھائیوں کی اپنے مدد ہے درکار
کیوں کہ ہے اس کے سوا کوئی نہ انکا آدھار

قحط نے ڈھائے وہاں کیا قیامت کے ستم　　باقی چھوڑا ہے نہ لوگوں میں ذرا نام کو دم
کھیتی باڑی کا ہے کیا ذکر ہو جب میتہ کی قسم　　پھر جو حالت ہو غریبوں کی وہاں ہے وہ کم

جب کہیں وقت ضرورت پہ نہ پانی برسے
دانہ دانہ کو نہ کیوں خلق خدا کی ترسے

بچوں کو چھوڑ کے ماں باپ نکل جاتے ہیں　　حافظ ان کا ہے خدا دل کو یہ سمجھاتے ہیں
بھوک سے جب کوئی چارہ وہ نہیں پاتے ہیں　　مرکے بس ماندہ بسمل کو وہ تڑپاتے ہیں

حال جو سنتے ہیں واں کے وہ کھڑے روتے ہیں
رونگٹے جسم پہ سچ مانو کھڑے ہوتے ہیں

ہائے سڑکوں پہ پھڑکتے ہوئے لاشے لاکھوں جلتے ہیں بن میں بلکتے ہوئے بچے لاکھوں
مرگئے پیٹ سے باندھے ہوئے بھاٹے لاکھوں آہ تک کر نہ سکے منہ سے بھلے ایسے لاکھوں
ان پہ بپتا ئیں جو آئی ہیں بیاں کیا کیجے
کیونکہ پتھر کا یہ انساں کا دل کر لیجے

اب ذرا غور کرو اے میرے ہندو بھائی کب تلک ان سے رہیگی تمہیں بے پروائی
بیکسوں پر جو دیا تم کو اسوقت آئی تو یہ تم یاد رکھو ہو گی بڑی رسوائی
ٹکڑا کیا پاس نہیں ان کھلے ہاتھوں کیلئے
کیا مدد کی ہے کمی ایسے اناتھوں کیلئے

تم دیا وان ہو۔ دھن وان ہو۔ اور وِدیا وان ہیں تمہارے دل روشن میں بھرے گن اور گیان
تم آہنسا کو سمجھتے ہو۔ یقینی نرِوان دھرم کو دیتے ہو ہر چیز سے تم بڑھ کر شان
ایسی ہنسا سے ضرور ان کو بچاؤ گے تم
سرد مہری سے نہ دھرم ان کا گنواؤ گے تم

زر ہے دنیا میں بڑی چیز یہ ہے سچی بات زر نکلتا ہے تو دل ڈوب ہی جاتا کئی ہات
عیب ڈھکتے ہیں رواں ہوتی ہیں اس سے حاجات ہے اثر گر جو خدا سے تو اسی کی ہے ذات
پر یہ ہش رکھو جو کہتے ہیں عقیل و ہشیار
زر ہے گر جان پہ تو جان ہے ایماں پہ نثار

جان بسمل کیلئے ہوں جہاں لاکھوں جوکھوں اور انسانوں پہ انساں ہو مرتے بھوکوں
جو یتیم ان کے نیچے رنج اٹھا کر لاکھوں ان کے دھرم اور عقیدے کو بہت خطرے ہوں
ایسی حالت میں جو زر دار کریں صرفہ نہ زر
سمجھو دل کی جگہ پہلو میں ہے انکے پتھر

ہندوؤں کی تو ہے مشہور زمانے میں دیا دل کی نرمی کا تمہاری ہے جہاں میں چرچا
نام دھرماتما مشہور ہے۔ اور ان داتا دیکھ سکتے ہو نہ حیواں کی بھی تم ہنسا
کیونکہ مرتا ہوا بھوکا انہیں دیکھو گے تم
اپنے مذہب سے بھٹکتا ہوا انہیں دیکھو گے تم

بھائیوں پر یہ بڑا وقت پڑا ہے بھائی — قوم ہندو پہ یہ صدمہ تو کڑا ہے بھائی
جی ہی جائے تو نہ ڈر اس کا بڑا ہے بھائی — خوف تو دھرم کا اب آن پڑا ہے بھائی
سیکڑوں بچے پتنت روز ہوئے جاتے ہیں
اور ہندو ہیں کہ چپ چاپ سہے جاتے ہیں

اس کڑے وقت پہ بھی گر نہ مدد دوگے تم — پھر قیامت میں خبر ان کی مگر لو گے تم
جان اور دھرم جو ان کے نہ بچاؤ گے تم — تو بھلا کون سا پُن جگ میں کماؤ گے تم
اب نہ آؤ گے تو کس وقت پہ کام آؤ گے
پیٹھ دکھلا کے انہیں منہ کیسے دکھلاؤ گے

وداع گوتم

۱۹۰۰ء

گوتم نیچر کا مطالعہ کرتا ہے اور دنیا میں دکھ ہی دکھ پاتا ہے۔

دنیا سے خطاب

ہے مصائب کے بھنور میں مبتلا دیکھا جہاں — ہو نہیں سکتا جدا جس سے کسی کا جسم و جاں
ڈالتا ہوں جب بصیرت کی نظر تجھ پر ذرا — مجھ کو پاتا ہوں حیات و موت اور دکھ میں پڑا
دے رہے ہیں جو الم اور درد اور الجھن تجھے — کام کچھ کرنے نہیں دیتے ہیں یہ بندھن تجھے
کام دنیا ہے جہاں تک وہ وہ باریک ہیں — غرق آتی ہے نظر سیلاب غم میں کل زمیں
شادمانی جس کو کہتے ہیں نہیں بیش از سراب — جس کو سمجھے ہو خوشی ہے عارضی کیف شراب
ہیں یہ چیزیں سمجھتے ہو جنہیں بہروپ ہیں — بد تریں میں پھر عجب کیا غم کے پنہاں روپ میں
ہر جوانی کا بدا پیری یہاں انجام ہے — جو خوشی ہے اختتام اس کا غم و آلام ہے
عشق کا انجام ہجراں ہے مقرر اس جگہ — نیستی ہستی کا ثمرہ ہے مقدر اس جگہ
موت پر بھی تو نہیں انساں ہر گز رستگار — ہو گئی ہیں ہستیاں مر کر بھی اسکو بے شمار

پھر علائق کا وہی ہے سلسلہ جان کو لگا
پئے بہ پئے شادی و غم میں ہے جو رکھتا مبتلا
پانو اس کا اس محیط شادی و غم سے کہیں
مثل پرکار ایک دم بھی باہر آ سکتا نہیں

بیوی سے خطاب

میری پیاری سونے والی مجھ کو مت کہنا برا
اب میں یہ سب چھوڑ جاتا ہوں کہ ہے وقت آگیا
یہ لب جاں بخش تیرے دے رہے ہیں یہ صدا
آگیا اب دکھ سے دنیا کی رہائی کا سما
کار بیہودہ کی خاطر ہیں بلاوے آ رہے
چرخ پر پیغام آتے ہیں نظر لکھے ہوئے
میرے اس دنیا میں آنے کا یہی تو تھا قرار
اور اسی منزل پہ پہونچائیں گے یہ لیل و نہار
میں نہیں لونگا انہیں میرے ہیں جو تاج و نگیں
مجھ کو دنیاوی سر و ساماں کی کچھ چاہت نہیں
وہ قلمرو واسطے میرے نہیں پیدا ہوئی
جو کہ پیاسی ہو مرے آب دم شمشیر کی
پھنسیں یہ میری رخنہ کا جنگ و ملک گیری میں کہیں
دشمنوں کے خوں سے آلودہ کبھی ہوگا نہیں۔
ہاتھ جو اُٹھے نہ اس میں کچھ ادائے جبر ہو۔
پانو جو رکھوں زمیں پر اس میں فقر و صبر ہو
خاک کافی ہے زمیں کی میرے بستر کیلئے
اس کے ویرانہ بیاباں ہیں مرے گھر کیلئے
جتنی چیزیں اسکی ہیں ادنےٰ و کمتر اور حقیر
وہ بنیں میری انیس و ہمدم دیار و مشیر
شاہی خاصوں سے تو میرے دل کو نفرت ہو گئی
جو بلا سے کوئی دے اس پر قناعت ہو گئی
مخمل و کمخواب و اطلس کی نہیں پروا مجھے
جو فقیروں کی ہے پوشش ہے وہی زیبا مجھے
مارتا ہوں ٹھوکر ایسے تخت کو اور تاج کو
میں نہیں پیدا ہوا مایا کے کام اور کاج کو
میں چلا جاہ و حشم۔ دولت کا ساماں چھوڑ کر
راج پاٹ اور تخت و تاج اور حکم شاہاں چھوڑ کر
دفتر فتح و شہی میں نام یہ سادہ مرا
خونی حرفوں میں نہ آئیگا نظر لکھا ہوا
آشتی اور صلح سے لوں کام۔ ٹھانی ہے یہی
گھر کروں لوگوں کے دل میں حکمرانی ہے یہی
اس طرح اب چھوڑ کر یہ عیش کاشانے کو میں
جا رہا ہوں خلقت عالم کا غم کھانے کو میں
میں نے اس کار اہم پہ اس لئے باندھی کمر
کیونکہ فریادیں جہاں کی جو کہ ہے خستہ جگر
چار سُو سے میرے کانوں میں ہیں ہر دم آ رہی
بادلوں کی طرح دکھ کی ہیں گھٹائیں چھا رہی

میں کروں گا دور کل عالم سے یہ دکھ۔ غم سبھی
عالم امکاں میں لا سکتی ہے گر اسکو سعی

اس کی ہمت دیوتاؤں میں ہے یا اصلا نہیں
ہاں انہوں نے کیا کیا بہبودِ انساں کے لئے ؟
کیوں وہ جھکواتے ہیں سر سجدے میں ہر جاندار کا
تاکہ پوجا ہو سپھل اور یگ کا ہو کامل اثر
آہ وہ کیا دل کو خوں کر دینے والا ہے سما
یوں ہے جان و مال کھپتا معبدوں میں ہر سحر
تو وہ کیا سنتے ہیں کسی کو جو بچا سکتے نہیں
دکھ کہ جو لاتا ہے عقل و ہوش انساں میں خلل
پھر نکلتی ہے زباں سے وہ دعا یا استتی
یہ مناجاتیں۔ دعائیں اور آہ و زاریاں
کون سی برسائی ہے رحمت انہوں نے خلق پر
زندگی کے درد و غم۔ عشق اور ہجراں کی سناں
محرقہ تپ جو جھلس دیتی ہے جسم و جان کو
رفتہ رفتہ چیچک چیکے کھانے والا وہ مرض
یعنی پیری۔ مادرِ صد عیب کہتے ہیں جسے
ہولناک اکال عالم سخت مبرم ہے جو شے
بعد مردن کی بتائی جاسکیں کیا حالتیں
کوئی مجھ کو یہ تو بتلائے کہ کون ان سے بچا
الغرض دکھ زیست کی حالت اور اس کے بعد کے
ساتھ آتے ہیں نئے جنموں کے اندوہ جدید
ناک میں لاتا ہے دم۔ القصہ یہ آواگون
جب کسی صورت کسی کو اس سے چھٹکارا نہیں
پھر بھلا فاقوں سے اور قربانیوں سے فائدہ
شانتی آنند اس پر بھی نہ جب وہ پا سکے
دیوتا۔ ہاں یہ تو ممکن ہے کہ کچھ بد کچھ ہوں نیک
دیوتا کون ؟ ان کو دیکھا بھی کسی نے یا نہیں
کون سا آرام بخشا روح اور جاں کے لئے
مانگتے ہیں کیوں ہم حصہ وہ پیداوار کا
بے زبانوں کے وہ قربانی میں کٹواتے ہیں سر
دیوتا کو چڑھ رہا ہو جب چڑھاوا جان کا
جبکہ وشنو۔ سورج اور شو کے ہیں نعرے حلق پر
اچھے سے اچھے کو بھی دکھ سے چھڑا سکتے نہیں
جس سے دکھیا آدمی کا قلب جاتا ہے دہل
جس میں ہوتی ہے خوشامد۔ دہشت اور رشوت بھری
چڑھ رہی ہیں رات دن اوپر کو مانند دخاں
زیست کی کم کی انہوں نے کیا اذیت خلق پر
دور انہوں نے کب کئے جس کہ ہو مشکو رجاں
اور دق گھن کی طرح کھا جائے جو انسان کو
ہو گیا ہے جس میں پھنسنا سب کو لابد الغرض
ان میں کس کس سے کوئی انساں بچا۔ کوئی کہے
نام جس ظالم کا مشہور زمانہ موت ہے
جبکہ پھیلتا ہے تباہی کا آئے چرخ میں
نیک و بد۔ دیندار و بیدیں۔ کوئی اچھا یا برا
ان سے کب کوئی بچا۔ کب اس طرح کوئی بچے
ہوں نئی پیدائشوں سے خواہشات نو پدید
جس سے بچنے کا میسر ہے نہیں کوئی جتن
جنم کے پھندوں سے چھٹنے کا کوئی چارا نہیں
اس دعا سے حاصل ان چاہنا ہو گی فائدہ
کس لئے انساں چوپایوں کی چھریوں جان سے
ضعف میں لیکن عمل کے سبب سے بچا ہیں وہ ایک

سب کے سب بیرحم ہیں اور رحم کے قابل ہیں سب
مثل انسان دور تبدیلی میں پا در گل ہیں سب

اے گرانبار الم۔ اے خستہ بشکستہ کمر! | اے زمیں اے معدن آفات اور ماتم کا گھر!
اے ترے قرباں کرتا ہوں شباب اپنا میں آج | تیری خاطر چھوڑتا ہوں آج میں یہ تخت و تاج
الوداع اے تاج و تخت و جاہ شاہاں الوداع! | الوداع اے قلعۂ و گلزار و ایوان الوداع
رخصت اے عشرت سرائے خسروی۔ جاہ و حشم | رخصت اے پیاری مری۔ اے باوفا گلرو صنم!
ہاں مجھے ہر چیز سے تیری جدائی شاق ہے | کیونکہ تو سرمایۂ صد نازش اخلاق ہے
لیکن اس دنیا کے دکھ سے ہمرہ کل انس و جاں | میں بچاؤں گا تجھے بھی اے مری جان جہاں
اور اسے بھی جو تری آغوش میں ہے پل رہا | میرا بچہ غنچۂ سربستہ باغ عشق کا
کچھ دنوں میری جدائی تجھ کو گزریگی کڑی | ہائے تیرے دل کو دکھ دیگی بہت کچھ یہ گھڑی
میری بیوی۔ میرے بچے۔ والد ماجد مرے | کچھ دنوں صدمے اٹھالینے ہیں تمہیں اسوقت کے
قبل از مدت مگر اظہار ہوگا نور کا | سارے عالم میں کھلا گلزار ہوگا۔ نور کا
جس سے ہو جائیں گی روحیں پاک اور روشن ضمیر | پائیں گے جس سے ہدایت دھرم کی میر و فقیر
رخصت اب بس اب میں نے اپنے دل میں ہے یہ ٹھان لی | میں نہ آؤنگا نہ آؤں گا۔ یہاں واپس کبھی

پا نہ لوں جب تک میں وہ شے ہے جو منظور نظر
اور پاؤں گا اسے کوشش میں گر کچھ ہے اثر

امرتسر کی ٹمپرنس سوسائٹی ہر سال دسہرہ کے ہفتہ میں سالانہ جلسہ کیا کرتی تھی۔ اس کا مقصد لوگوں کو ہر قسم کے منشیات و مسکرات کے ترک کی ترغیب دلانا تھا۔ اسی موقع پر کبھی ناٹک کے کھیل بھی ہوتے تھے۔ چونکہ جناب کیفیؔ ان عیوب سے پاک اور پرہیزگاری کے زبردست حامی تھے ایسے ہی موقع پر سنہ ۱۸۹۷ء کے سالانہ جلسہ میں آپ نے یہ نظم پڑھی۔ جو پُرتاثیر ثابت ہوئی۔ اسی موضوع پر آپ کا ایک ڈرامہ بھی ہے جس کا نام ہے "چلّو میں اُلّو"۔ جو پنجاب میں کئی جگہ سٹیج ہو چکا ہے۔ یہ ہے شعر اور ادب کا صحیح اور مفید استعمال۔

یا خدا نشہ کی انساں کو نہ عادت ہو کبھی — بھول کر بھی نہ کسی شخص کو یہ دھت ہو کبھی
مرض الموت ہو لیکن نہ یہ علّت ہو کبھی — جیتے جی موت کی سہنی نہ اذیت ہو کبھی
ہے یہ وہ چیز کبھی اس کو زباں پر نہ دھرے
زہر پی لے مگر اسکو نہ کبھی نوش کرے

کیا کہوں تم سے کہ گھر اس نے بگاڑے کیا کیا — اور شریفوں کے گھرانے ہیں اجاڑے کیا کیا
رشکِ گلزار ارم باغ اکھاڑے کیا کیا — شیر مرد اس نے ہزاروں ہی پچھاڑے کیا کیا
یہی وہ شے ہے کہ چلّو میں جو اُلّو کر دے
جس کا ایک قطرہ ہی پیمانۂ ہستی بھر دے

ہو گی دنیا میں نہ شے کوئی نشہ جیسی خراب — سچ ہے داناؤں نے نام اسکا جو رکھا ہے شراب
دیکھو اِک شر ہے بشر میں تو ہے کیا شر کا مآب — دوسرا شرّ شراب آملے تو کیا ہو حساب
بھنگ۔ افیون۔ چرس۔ ہجو کروں کس کس کی
ایک سے زہر ہیں گانجھا کہ برانڈی وسکی

ہے یہ وہ چیز کہ ہوں دونوں جہاں جس سے تباہ — روسیاہی بھی ہو اور نامۂ اعمال سیاہ
بد بلا ہے یہ۔ بس اس سے تو بچائے اللہ! — کتنے گھر لاکھ کے اک دم میں کئے اس نے تباہ

یا الٰہی کسی انساں کو یہ آزار نہ ہو!
کوئی اس دام مصیبت میں گرفتار نہ ہو!!

گُل بہت دشت کو گلزار بنانے والے   غنچہ جو ہر دل پژمردہ کھلانے والے
سر سبز گلشن قدرت کو سجانے والے   دھیان میں بھی جو خزاں کو کبھی نہ لانے والے
ایک قطرہ سے وہ اس ابر کے کمھلائے ہیں
ایک جھونکے سے اس آندھی کے وہ مرجھائے ہیں

اس سے حُسن اور جوانی کی وہ شوکت نہ رہی   پہلی صحت نہ رہی اگلی سی طاقت نہ رہی
تازگی رُخ کی اُڑی اور طراوت نہ رہی   وہ پھبن ہی نہ رہی اور وہ رنگت نہ رہی
کھو دیا حسن نشہ نے ستم ایجادوں کا
اُڑ گیا رنگ دھواں بن کے پری زادوں کا

کیا کہوں کرتے ہیں یہ نشہ کے رسیا کیا کیا   نو گرفتاروں کو دیتے ہیں یہ جھانسے کیا کیا
سبز باغ ان کو ہیں یہ لوگ دکھاتے کیا کیا   "سنئے وہ مے کے ہیں اوصاف بتاتے" کیا کیا
فکر کونین کی رہتی نہیں میخواروں میں
غم غلط ہو گیا- جب بیٹھ گئے یاروں میں

نوجوان اس سے جو بالطبع حذر کرتے ہیں   سہمتے بھی ہیں جھجکتے بھی ہیں- اور ڈرتے ہیں
کیا کیا یہ پیر مغاں سوانگ نہ پھر بھرتے ہیں   ایسی باتوں سے یہ تیار انہیں کرتے ہیں
"پی بھی جا یار- نہ کر پیش و پس جام شراب
لب پہ توبہ- ترے دل میں ہوس جام شراب

وہ سیہ کار جو رہتے ہیں سدا جام بدست   جو ڈھٹائی سے کہیں جاتے ہیں- بن مست الست
سنئے فرماتے ہیں مستی میں وہ کیا کیا بد مست   "مے کہ بدنام کنند اہل خرد را غلط است"
بلکہ مے می شود از صحبت ناداں بدنام"
واہ کیا عقل ہے! اس عقل کو دوروں ہی سلام

طاقت و تاب و توانائی کو چر جاتا ہے   زہر کا کام یہ اک گھونٹ میں کر جاتا ہے
ہے بہادر وہی جو نشہ سے ڈر جاتا ہے   جان سے جائے پہ نکل جس کا یہ ڈر جاتا ہے

گھن کی مانند ہے یہ جسم کو کھانے والا
جاں کو بھاپ بنا کر ہے اڑانے والا

ہے یہی شے کہ جو داناؤں کو ناداں کردے — ہے یہی شے کہ جو انساں سے حیواں کردے
ہے یہی شے کہ پراگندہ جو ایماں کردے — مشکلِ مرگ یہی شے ہے۔ جو آساں کردے

ڈوب کر پھر نہ ابھرتے ہیں اسی شیشے میں
جن پڑھے لکھے اترتے ہیں اسی شیشے میں

ناسمجھ ایسے ہیں) انساں بہت سے سادے — قول ہے جن کا۔ کبھی پی لی تو کیا خوف اس سے
رد کیے۔ ٹوسکیے۔ ان کو تو ہیں یہ فرماتے — "روز پیتا نہیں۔ پی لیتا ہوں گاہے۔ ماہے

وہ بھی تھوڑی سی۔ مزا منہ کا بدلنے کے لئے"
اور تھکن دن کی مشقّت کی نکلنے کے لئے

سانپ کا بِس نہیں ہوتا ہے کئی ایک گیلن — خاک کر دیتا ہے گھر اِک شررِ شعلہ فگن
رائی بھر چھتّرا بنا دیتا ہے پھلتی سا بدن — نشہ پھر نشہ ہے ماشہ ہو کہ ہو وہ اِک من

ہے یہ لنکا۔ یہاں جو ہے وہ ہے باون گز کا
لطمۂ موجِ فنا اس کا ہے اِک اِک قطرا

کانپتے ہاتھ۔ دھڑکتا ہوا دل۔ ضعفِ بصر — دردِ سر سست دماغ اور جلن آٹھ پہر
گردے اور پھیپھڑے بگڑے ہوئے ماؤف جگر — نشۂ مے کے ہیں یہ چند نتیجے اکثر

بھوک تو نام کو بھی یہ نہیں رکھتا باقی
کیونکہ روحانیتِ جسم ہے خوراک اسکی

یا تو اول ہی میں یہ جسم کو چڑ جاتا ہے — ابتدا ہی میں خبر خاتمے کی لاتا ہے۔
یا بظاہر جو کسی شخص کو راس آتا ہے — اندر اندر ہی سرنگ اپنی یہ دوڑاتا ہے

جبکہ ہوتی ہے نتائج کی پہل گھٹیا سے
وصل رہتا ہے دمِ مرگ تلک کھٹیا سے

زرد رو اور پراگندہ سر اور گندہ دہن — رعشہ ہاتھوں میں پڑا اور لگی دل کو دھڑکن
تمتمایا ہوا منہ اور وہ آنکھوں کی جلن — خفتہ مغز اور جگر کا وہ سدا بھاری پن

اک شرابی کا یہ ہے سر سری فوٹو دیکھو
جاں پیاری ہے تو اس سے بچو۔ دیکھو دیکھو

بھول کر بھی نہ اسے ہاتھ لگانا ہرگز　　یہ بھنور موت کا ہے۔ اس میں نہ آنا ہرگز
زہر پی لینا اسے منہ نہ لگانا ہرگز　　نوجوان دوستو۔ پاس اس کے نہ جانا ہرگز

تم کو لازم ہے کہ نیکی کے تم اوتار بنو
زُہد و پرہیز و ریاضت کے طرفدار بنو

وطن پاک کی امید بندھی ہے۔ تم سے　　آرزو قوم کی وابستہ ہوئی ہے تم سے
ہو نصیبوں میں بھلائی کہ بدی ہے تم سے　　آس بہبودیٔ قومی کی لگی ہے تم سے

تم ہی اس بیڑے کو ہو پار لنگھانے والے
نام پرکھوں کا تمہیں تو ہو چلانے والے

کیا کہوں تم سے عزیزو یہ ہے کیسا پانی　　آبِ خنجر سے ہے قاتل یہ زیادہ پانی
پی گیا جو اُسے پھر اس نے نہ مانگا پانی　　ٹھیک ہے کہتے ہیں لوگ اسکو جو کالا پانی

سچ ہے اک روز تو ہر ایک کو مرنا ہے ضرور
اجتناب ایسی بُری شئے سے تو کرنا ہے ضرور

مے کا بھولے سے بھی تم شغل نہ کرنا ہرگز　　پاؤں اس خطرے کے رستے میں نہ دھرنا ہرگز
مفت برباد جوانی کو نہ کرنا ہرگز　　دیکھنا دوستو۔ بے موت نہ مرنا ہرگز

اس سے پرہیز پہ اعضا کی ہے طاقت موقوف
صحت جسم پہ ہر شئے کی ہے صحت موقوف

کاش تم جو ہو دھرم۔ دین لیاقت والے　　نیک دل۔ اہل خرد۔ اور ہو ہمت والے
صاحب حوصلہ۔ باوضع۔ بصیرت والے　　سب ہے الفت قومی کے بنو متوالے

کیفِ میکدۂ خدمت قومی ہو جاؤ
سرخوش بادۂ ہمدردی و نیکی ہو جاؤ

قومی دُہائی

۱۸۹۴ء

مریضِ غم کی عزیزو ذرا خبر لینا — کٹھن ہے جسکو کہ مرمر کے بھی سحر لینا
لبوں پہ آتی ہے گرجان بھی تو رُک رُک کر — ہے دم کشی سے جسے سانس پورے کر لینا
ہے جس کے حق میں کہ دامِ بلا یہ تارِ نفس — عذاب گور ہے کروٹ اِدھر اُدھر لینا
ہے تارِ بسترِ غم اس قدر ہے پتلا حال — بجا ہے اسکو سمجھ نازنین کمر لینا
تم اسکو آنکھوں سے دیکھو تو رحم آجائے — مریضِ غم کو ذرا دیکھ اِک نظر لینا

سمجھتے ہو کہ یہ درماندہ دم مریض ہے کون؟
تمہاری قوم ہے یہ۔ دوستو خبر لینا!

قریب پہنچے ہیں منزل کے قافلے سارے — ہُوا ہے ضعف سے مشکل اسی کو گھر لینا
تھکے ہیں بھٹکے ہوئے۔ دشت میں ہیں سرگرداں — خبر زِ راہِ کرم انکی اے خضر لینا
امیرو! وقت ہے خاک اور خوں میں لوٹنے کا — تم اپنے آئینہ خانوں میں پھر سنور لینا
دراصل جوہرِ انسانیت ہے ہمدردی — بلا نہیں ہے یہ اوروں کی اپنے سر لینا
خبر لو پہلے تم ان کی جو بھوکے مرتے ہیں — تم اپنے جیبوں کو پھر سیم و زر سے بھر لینا
غیورو! وقت ہے یہ قوم کی حمایت کا — پھر اپنے اختر داژوں کا شکوہ کر لینا

یہ وقت ہے کہ کمر کس کے باندھو ہمت کی
پھر اپنے نالوں سے لرزاں فلک کو کر لینا

بُھلا کے ذاتی بکھیڑوں کو قوم پر جاں دو — صلہ ہے داورِ محشر سے کچھ اگر لینا
خدا اسی کا ممد ہے کرے جو اپنی مدد — دلوں پہ قول یہ کر نقش کا الحجر لینا
جو چاہتے ہو کہ ہاتھ آئے منزلِ مقصود — تو اتفاق کے رہبر کو آگے دھر لینا
اگر باہم ہو محبت اخوت آپس میں — تو پھر ہے آپ کو شایاں رہِ سفر لینا
یہ وقت ہے کہ کرو کام مل کے تم سارے — جو قضیئے جھگڑے ہیں پھر ان کو طے کر لینا
ہے اختلاف باہم ملتوں میں یہ مانا — پر اصل میں تو ہے سب کو خدا کا گھر لینا

خطر ہے راہ میں اک ساتھ سب بڑھے آؤ — یہی ہے بانگ درا اس پہ کان دھر لینا

یہ لازمی ہے کہ دل سب کا ہاتھ میں لیں ہم — کبھی تھا جس میں کہ شمشیر اور تبر لینا
قدم قدم پہ یہاں ہفت خوان ہے پیدا — اے میرے رستمو ہمت بلند کر لینا
اٹھاؤ تم جو یہ بیڑا تو ہاں سمجھ کے اٹھاؤ — لو ہاتھ میں جو یہ تلوار سوچ کر لینا
تو آب آبروئے اور نان غیرت اپنے ساتھ — اور اس سفر میں ہتھیلی پہ جان دھر لینا
نہ ٹوٹ جائے کہیں مثل عہد محبوباں — جکڑ کے باندھ مسافر ذرا کمر لینا
کرے جو وار کبھی تیغ گردش دوراں — تو اسکی روک کو سینے کی تم سپر لینا
گذرنا جان سے اس راہ سے گزرنا ہے — مگر ہے گنج پس رنج یاد کر لینا
ملے ہیں اس میں نہ معلوم کون کون بزرگ — تبرکاً یہ کف خاک رہگذر لینا

جو چاہتے ہو کہ کیفی کچھ آگے عرض کرے
تو دونوں ہاتھوں سے تھام اپنا تم جگر لینا

شوکت ہند

دہلی سنہ ۱۸۹۰ء

پہلا بند

اے نرنکار اے نرنجن تیری مایا کے نثار — جس سے ہے سنسار میں نیرنگیٔ لیل و نہار
آب و گل میں اس کے تبدیل اور تبدل کی سرشت — ذرے ذرے میں ہے اس کے بے ثباتی کا شکار
کون ہے جس پر نہ اس کا وار دنیا میں چلا — کون ہے جو دام کا اس کے نہ ہو گذرا شکار
نام تک بھی انکی نسلوں کا نہیں اب جانتے — ایسے ہو گذرے ہیں دنیا میں بہت سے نامدار
چرخ کو تھا رشک جنکی شان عالی دیکھکر — ایسے مٹی میں ملے ہیں سینکڑوں والا تبار
جب یہ اک قانون قدرت ہی تو پھر اے خاک ہند — گردش دوراں کا تجھ پر کس طرح چلتا نہ وار
تیری شان آہ اے اریہ ورت ایک مستثنیٰ نہ تھی — چشم زخم دہر کا ہوتا نہ کیوں اک دن شکار

وہ بلندی اور یہ پستی وہ کمال اور یہ زوال
ہر کمال رازوال ہے کہہ گئے ہیں ہوشیار
دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا واحسرتا!
رفتہ رفتہ یہ تنزل تیری شان آئے کردگار
وہ چمن جو روح تھا۔ گلزار قدرت کی کبھی
اس سے کچھ ایسی گئی آئی نہ پھر مڑ کر بہار

مرثیہ گوئی اگرچہ بگڑے شاعر کا ہے کام
مستحق چار آنسوؤں کی ہیں سلف کے نیک کام

دوسرا بند

گر سنائیں آج کل ہم کچھ بھی حال پاستاں
تو یقیناً تم اُسے سمجھو خیالی داستاں
گھٹ گئے ہیں آجکل ہم گرچہ مانند ہلال
ہے زوال اپنا کمال بے مثالی کا نشاں
نیم وحشی ہو گیا ہے گرچہ اب اس کا لقب
ایک دن استاد عالم تھا یہی ہندوستاں
کس کا دل گروہ تھا جو ہوتا ہمارا ہم سفر
کب ہماری پاسکا تھا کوئی گرد کارواں
واقعوں سے ہی ہے مبرہن شان عظمت آپکی
کیا بیاں کی حاجت اس میں ہے یہ عالم پر عیاں
جم گئے جب جا قدم جھنڈا بھی اس جا گڑ گیا
تھی منگا پور سے ہماری فتح و نصرت ہم عناں
تھی چمک برق فنا کھانڈوں کی اپنے برق کو
مانتا فولاد ہندی کا تھا لوہا کل جہاں
علم تھا ہم میں کپل کا اور تہور رام کا
تھا ہمارے علم و طاقت سے مسخر کل جہاں
تھا توکل حق پہ اور ہمت پہ اپنی اعتبار
بیلکے چل دیتے تھے پردیس ایک ترکش اور کماں
ملک گیری کی عوض تھا ملک داری اپنا کام
تیغ اکثر اپنی ہوتی تھی حفاظت میں رواں

موجد ہیئات طبیعات و ریاضی تھے ہمیں
سب سے اول مملکت داری کے بانی تھے ہمیں

تیسرا بند

کیا بتائیں تم کو ہم کیا کیا فضیلت ہم میں تھی
بھیم کی طاقت جدھشٹر کی صداقت ہم میں تھی
مانتا تھا اپنے ترسولوں کا لوہا اک جہاں
چھتریوں کی وہ جسارت اور جلاوت ہم میں تھی
چندربنسی اور سورج بنسیوں کے نام سے
چرخ پر لرزاں تھے مہر و مہ یہ صولت ہم میں تھی
قطب آسا ہم نہ ہلتے تھے کبھی میدان سے
ایسی پامردی تھی اور یہ استقامت ہم میں تھی

اپنے تو اپنے تھے غیروں کو سمجھتے تھے عزیز
جوش ہمدردی یہاں تک اور محبت ہم میں تھی

زہد اور پرہیزگاری میں تھے یکتائے زماں
آدمی تھے پر فرشتوں کی سی خصلت ہم میں تھی

تھے قوانین رسم و اخلاق زماں سے منطبق
مصلحت اور عقل پر مبنی شریعت ہم میں تھی

یوں تو تھیں دنیا کی حاصل ہمکو ساری نعمتیں
سب سے بڑھکر ایک استغنا کی دولت ہم میں تھی

تھی توجہ فتح ملکی کی طرف یاں کم سے کم
گرچہ تسخیر جہاں کرنے کی طاقت ہم میں تھی

ہاں ہمارا کام تھا تسخیر و تالیف قلوب
اس لئے اس درجہ روحانی ریاضت ہم میں تھی

حفظِ جان و مال و عزت راج نیتی کے نیم
تھے جہاں میں اولیں تہذیب پھیلانے کو ہم

چوتھا بند

تھی وہ بھیشم کی جلادت اور حرب ارجنی
جس سے کانپتی تھی زمیں اور چرخ کی چھاتی چھنی

ہاتھ قبضے پر نہ تھا چورنگ تھا جسم عدو
کانپتی تھی برق تھے تلوار کے ایسے دھنی

گرز کے صدمے ہلا دیتے تھے بنیاد زمیں
چرخ کا دِل چھیدتی تھی اپنے بھالے کی انی

سُور بیری کے ہماری غیر بھی تھے مدح خواں
ایک ادنیٰ کھیل تھا پیل افگنی شیر افگنی

راجپوتوں کا تہوّر دہر میں مشہور ہے
کس کو ہو سکتی ہے کچھ بھی اس میں جائے دم زنی

پاس عزت پاس عفت مرد و زن میں ایک تھا
کتنی بھارت ورش میں ہو گذری ہونگی پدمنی

جوہر استقلال و ہمت کا تھا ہم میں اسقدر
کب ادھوری چھوڑتے تھے بات جو دل میں ٹھنی

تھا ہر اک دل میں نمایاں جوہر صدق و صفا
دوستی میں دوستی تھی دشمنی میں دشمنی

نور حق سے تھی منور قلب اہل قوم تھا
گیان اور گن کی یہاں پھیلی ہوئی تھی روشنی

بے سبب رنج و دلآزاری نہ تھا اپنا اصول
تب مخالف سے بگاڑی جان پر جب آ بنی

کیا بتائیں اہل عالم تم کو ہم کیا چیز ہیں
اب تو ہم سب سے گئے گذرے ہیں اور ناچیز ہیں

پانچواں بند

ہم نے ہی یونانیوں کو سب سکھائے تھے علوم
ہے ہمارے فلسفہ اور علم کی عالم میں دھوم

ہند میں ہی کچھ نہ تھا محدود اپنا اعتبار — تھا ہمارا شہرہ ہر جا کیا عرب کیا مصر و روم
شش جہت میں تھے ہمارے جلوہ گر کھٹ شاستر — روشنی چاروں طرف ویدوں سے پھیلی بالعموم
ہیں یہ رائج علم جتنے ان کے موجد ہیں ہمیں — فلسفہ منطق زباں دانی - ریاضی و نجوم
آفتاب علم و دانش ہند میں رخشاں تھا جب — جہل کی عالم پہ چھائی تھیں گھٹائیں جھوم جھوم
ہم گرے رہتے تھے آ پڑتی تھی جب ہم پر کڑی — ہم نہ گھبراتے تھے جب ہوتا مصائب کا ہجوم
سچی آزادی تھی یکسر ملک میں پھیلی ہوئی — تھیں غلاموں اور کنیزوں کے نہ بکنے کی رسوم
کاہلی خانہ نشینی کی نہیں تھیں عادتیں — جب ضرورت ہوتی کُل دنیا میں ہم آتے تھے گھوم
مملکت داری یہاں تہذیب سے تھی ہم ردیف — سر جھکا کر علم کے دولت قدم لیتی تھی چوم
تھا عَلَم کے ساتھ علم اور علم کے ہمرہ عمل — مرکز برکات اسمانی تھا اپنا زاد بوم

نام آور سارے عالم میں تھے دانایان ہند
یاد ہو گی اے زمانے تجھ کو بھی وہ شان ہند

چھٹا بند

شہرہ اپنا تھا فقط کیا ایک ہندوستان میں — دھاک تھی اپنی بندھی ایران اور توران میں
مہر حکمت سے ہمارے روشنی عالم میں تھی — جس کا ایک ذرہ ہوا پر تو فگن یونان میں
جو بتاتے ہیں ہمیں خرمن کا اپنے خوشہ چیں — ہو کے مدہوش اپنے حب قوم کی ہیجان میں
اس ڈھٹائی سے نہ دھوکا دے سکیں گے خلق کو — خوشہ چینی انکی خود ثابت ہے ہندوستان میں
الغرض یہ سچ ہے موجد ہیں ہمیں ہر علم کے — ہم تھے استاد جہاں اس عالم امکان میں
گر مسائل فلسفہ کے ہند میں ہوتے نہ حل — کون رکھ سکتا قدم یورپ سے اس میدان میں
کون ہو سکتا ہے منکر واقعی حالات سے — روشنی مشرق سے پھیلی ہے فرنگستان میں
بزم کیا اور رزم کیا دونوں میں تھے ہم بے عدیل — گر قلم میں نوش تھا تو نیش تھا پیکان میں

گر چہ اب بھی ہے وہی دنیا وہی چرخ و زمین
غور سے لیکن جو اب دیکھا تو باقی کچھ نہیں

ساتواں بند

اے زمانے اک نگاہوں میں یونہی تھے ہم حقیر — ایک دن وہ تھا کہ تھے ہر صنف میں ہم بے نظیر

٭ [illegible] — کئی برس تک ان کے بعض لیتے تھے ہندوستان میں۔

نور ایماں سے مجلّی تھا یہاں ہر ایک دل — تھے غنی اک دہرم کی دولت سے شاہ و فقیر

عین دانائی پہ مبنی تھا ہمارا اخذ و ترک — کون سے دن ہم ہوئے تھے یوں لکیروں کے فقیر

وضع کے پابند تھے تو دوستی میں جاں نثار — تھے تواضع میں کماں تو راستی میں مثل تیر

جو نکلتا تھا زباں سے اپنی ٹل سکتا نہ تھا — ہاں یہ ممکن ہے کبھی مٹ جائے پتھر کی لکیر

ذات سے واقف تھا وہی تھا جو آگاہ صفات — تھے وہی روشن دماغ اس جا کہ تھے روشن ضمیر

دولت دیں سے نہ تھی دولت کوئی بڑھ کر پسند — ہاتھ پھیلائے درِ حق پر تھے سب میر و فقیر

تھی نہ بخشش میں ہمیں اپنے پرائے کی تمیز — ہمسے اکثر بادشاہی لے گئے ہیں راہ گیر

منزلت بڑھ کر حکومت سے تھی حکمت کی یہاں — عالموں کو سر جھکاتے تھے سدا صاحب سریر

دامن دیں پاک تھا آلودگی سے سربسر — تھے نہ ہم دام تعصب اور توہم کے اسیر

اپنا مذہب کل جہاں کے مذہبوں کی جان تھا
بلکہ دنیا کے مذاہب کی وہ گویا کان تھا

آٹھواں بند

دیکھکر خوان نعم کو کب اچھل جاتے تھے ہم — تارِ زر پر نغمۂ وحدانیت گاتے تھے ہم

تھا یہ استغنا کہ بس اک ذات باری کے سوا — کب کسی کے سامنے یوں ہاتھ پھیلاتے تھے ہم

تھا مزا سب نعمتوں کا ہیچ اس کے سامنے — دانے ڈھونڈے جنگلوں میں سے جو چن لاتے تھے ہم

تھی معیشت کی کمی ہم کو نہ توڑا قوت کا — ریت میں بھی ہاتھ ڈالے سے طلا پاتے تھے ہم

تھا یہ غیرت کا حرارہ اور یہ جوشِ تمکنت — گر ذرا ہی کوئی پاتا تو تڑپ جاتے تھے ہم

کام جو لیتے تھے پورا کر کے اسکو چھوڑتے — یوں مشقت اور محنت سے نہ کچیاتے تھے ہم

باخبر کر کے مقابل پہ کیا کرتے تھے وار — سر پہ دشمن کے سدا للکار کر آتے تھے ہم

تھا سِر مو بھی نہ اپنے قول اور فعلوں میں فرق — دل میں جو ہوتا زباں پر بھی وہی لاتے تھے ہم

جھوٹ طوفاں ہمکو شیخی عار بی آتی نہ تھی — جو زباں سے کہتے اسکو کر کے دکھلاتے تھے ہم

ہم زمانے بھر کو دیتے تھے سبق اصلاح کا — اور گردش انتہی کے سب کو بتلاتے تھے ہم

جانتے تھے رنگ ڈھنگ ایک ایک اس سنسار کا
ہم پہ ہر عقدہ کھلا تھا خلق کے اسرار کا

نواں بند

علم و دانش سے زمانے میں تھے نیکو نام ہم — تھے نہ یوں بدنام ہاں اے گردش ایام ہم
ہو کے حیراں کہہ اٹھو گے کیا وہی بھارت ہے یہ — تم کو گنوائیں اگر گذرے ہوؤں کے نام ہم
تھا یہ استقلال و ہمت چھیڑ دیتے تھے جو کام — اے عزیزو اس میں پھر رہتے تھے کم ناکام ہم
ہر تکلف سے مبرا تھی ہماری چال ڈھال — عیش و عشرت سے سدا رہتے تھے ترک تمام ہم
ڈھانک دیتے تھے وہیں جوش اخوت سے اسے — عیب کو کرتے نہ تھے یاروں کے طشت ازبام ہم
اس لئے دنیا میں کم ہوتی تھی ناکامی ہمیں — سوچ لیتے تھے ہر اک آغاز میں انجام ہم
اپنا یہ ایماں نہ تھا پھر کرتے دشمن سے دغا — ہاں لیتے صلح کا اک بار جب پیغام ہم
دل بھی تھا مضبوط اپنا دست و بازو کی طرح — تھے نہ یوں سست اعتقاد اور بندۂ اوہام ہم
تھی حکومت گرچہ شخصی پر جماعت کا تھا رنگ — آپ ہی محکوم تھے اور آپ ہی حکام ہم
اس قدر درگت نہ ہوتی اور نہ ایسی دردشا — مانتے گر اپنے سچے دھرم کے احکام ہم

ہیں جو تھی سربسر مخلوق کے آرام پر
پائی غیروں نے ترقی چل کے جن احکام پر

دسواں بند

وار جب کرتی تھی ہم پر تیغ دوراں سینکڑوں — پھر بھی ہوتے ضبط سے کار نمایاں سینکڑوں
اس طرح اپنے حوائج میں نہ تھے بے دست و پا — مشکلیں غیروں کی ہم کرتے تھے آساں سینکڑوں
اس قدر مہماں نوازی اور تھی دریا دلی — آدمی گھر کے جو دس کھاتے تو مہماں سینکڑوں
راستی اور پاکبازی کے تھے یاں سب کے اصول — ہم نے مانا آدمی تھے ہم میں ناداں سینکڑوں
یہ طریقہ تھا ہمارا اور خوش اخلاقی یہ تھی — ثنا کی اک دو نے ہمارے تو ثنا خواں سینکڑوں
جو بڑھا آگے قدم رن میں نہ پیچھے مڑ سکا — سینے پر کھا کھا کے ہم لڑتے تھے پیکاں سینکڑوں
چپہ چپہ ہے ہماری فتح مندی کا گواہ — ہم نے مارے ہیں ہی دشمنوں میں میداں سینکڑوں
رام ارجن بھیم پرتھی راج بکرم اور بھوج — ہو گئے ہیں سینکڑوں اس شان کے ہاں سینکڑوں
تھا ہمارے نام سکہ ملک علم و فضل کا — مصر اور ایران سے تھے طفل دبستاں سینکڑوں

ہند جن سے تھا منوّر جیسے انجم سے فلک
زینت دشت و جبل تھے اہل عرفاں سینکڑوں

جائے عبرت ہے یہ اوج ایسی ترقی اور کمال
دیکھکر اب تم کو یاد آتی ہے شان ذوالجلال

گیارھواں بند

در ہمیشہ رن میں رہتے تھے ہمیں ہر آئینہ
ہے تہوّر اور شجاعت اپنی سب پر آئینہ

چار آنکھیں رن میں کرتا ہم سے تھی کس کی مجال
رعب اپنا سب کے تھا چار آئینوں پر آئینہ

ہم سے کی جس نے دغا پھل اس نے پایا آخرش
کھینچتا ہے اپنے بدخواہوں پہ خنجر آئینہ

تھے سبھی حیراں ہماری پاک بازی دیکھکر
تھا صفائے دل ہماری دیکھ ششدر آئینہ

دستکاری اور صنعت میں تھے ہم بس تیز دست
لیگیا تھا ہند ہی سے تو سکندر آئینہ

صاف دل تھے تھی نہ آپس میں کدورت اور دوئی
عکس کیا ہو دیکھ لو رکھ آئینہ پر آئینہ

پاک نفسی اپنی ہو سکتی نہیں محو اس سے ہے
دہر میں مشہور جبتک پاک منظر آئینہ

وقت پر آئینہ دکھلاتے نہ تھے یاروں کو ہم
تھا ہمارے سینہ صافی کا جو ہر آئینہ

ہم کو خود بینی خود آرائی سے نفرت تھی زبس
غوطہ زن دریائے حیرانی میں تھا ہر آئینہ

دل میں جو ہوتا تھا اپنے لب پہ آتا تھا وہی
تھے نہ اوروں کی ہم طوطئے ہر آئینہ

اس قدر عظمت پہ ہم کو خاکساری فخر تھی
آئینہ کو قلب کی آئینہ داری فخر تھی

بارھواں بند

دیکھ کر بھائی کو دکھ میں ہم کو چین آتا نہ تھا
سامنے بھوکا ہو پھر خوان نعم بھاتا نہ تھا

ایسے مفلس بھائیوں کو ہم اٹھا دیتے تھے گر
رابطہ جن سے نہ تھا کچھ اور کوئی ناتا نہ تھا

ساتھ کھانے پر اگر ہوتے نہ دو اک میہماں
ہم کو کھانے میں ذرا بھی تو مزا آتا نہ تھا

کوئی اہل قوم پڑ جاتا مصیبت میں اگر
جان تک بھی دھیان میں ہمدم کوئی لاتا نہ تھا

تھا عروج اور مرتبہ اونچا وہ اہل ہند کا
آپکا ہمسر زمانے میں کوئی پاتا نہ تھا

اک برابر کا سا رشتہ بھائی پن کا سب میں تھا
چودھری اور پنچ ہم میں کوئی کہلاتا نہ تھا

ہاتھ اونچا تھا مگر آنکھیں سدا نیچی ہی تھیں — جھکے محسن پھر کبھی اوپر کو کھنچ جاتا نہ تھا
تھی فقیری میں ہماری شان حق کی جلوہ گر — تو امارت میں ہماری دبدبہ شاہانہ تھا۔
تھی تواضع اس قدر مہماں کا دل لیتے تھے چھین — ہند میں جو آ گیا اک بار پھر جاتا نہ تھا
فکر بہبودی سدا اہل وطن کی دل میں تھی — دیکھ کر ایک ایک کو رشک اس طرح کھاتا نہ تھا

جوش قومیت ہمارا ملک میں مشہور تھا
شہرہ اپنی حب قومی کا قریب و دور تھا

تیرھواں بند

لگ گیا ہے مدتوں سے گرچہ اب اس کو گہن — مہر دیں تھا دہر میں اپنا کبھی پرتو فگن
تھا ہمارے دھرم کا اکناف عالم میں اثر — مرجع آفاق تھے اپنے مہا یگ اور ہون
سو سیانے ایک مت تھا چھوت آپس میں نہ تھی — یاں ہم آہنگئ قدرت کی طرح تھا یونین
بات جو کرتے تھے ہم خالی نہ تھی وہ لطف سے — سادگی میں بھی نکلتا تھا ہماری بانکپن
سر پہ جو پڑتی تھی آساں یا کڑی سہتے تھے ہم — تھا مگر ہر وقت دل سے شکر رب ذوالمنن
جب کسی اہل وطن پر آنچ آتی دیکھتے — آگ میں بھی کود پڑتے تھے یہ تھی حب وطن
پھر تھے تو آہنی رائے اور جواں فولاد دست — ہم میں ایسے رائے زن تھے اور ایسے تیغ زن
جن کی ہیبت کے اثر سے شیر جاتے تھے دہل — کیا ہوئے افسوس وہ شیر افگنان پیلتن
سور بیر اور سورما وہ آریوں کے کیا ہوئے — دھرم کے رکشک تھے جو اور اچھوتوں کے [illegible]
کیا ہوئے وہ پہلوانان قوی بال و جری — جن کی ہیبت سے لرزتا تھا پڑا چرخ کہن

مارتے تھے زور جو ہمت کے پالے کیا ہوئے!
ملک کی عزت پہ وہ جان دینے والے کیا ہوئے!

چودھواں بند

کیا سراہیں تجھکو اے ہندوستان نامدار — ذہن میں بھی اب نہیں آتا جو تھا تیرا وقار
سرو کیا تھا فرد بوٹا تیرا اے باغ ہند — ہر روش سے تیری تھا باغ ارم کے دل میں خار
تجھ میں وہ گن تھے کہ ہیں اغیار تک [illegible] — خاک پاک ہند ہیں اوصاف تیرے بے شمار

تیرے آئین و قوانین کا ہے یہ سارا طفیل
نام کسریٰ کا جو دنیا میں ہوا نصفت شعار

ایک دن وہ تھا ترا لگا نہ کھاتا تھا کوئی
کر دیا آج انقلاب دہر نے اجڑا دیار

اعتراف احساں کا ہے گر اقتضا انصاف کا
تو ہے تیرا بندۂ احساں جہاں میں ہر دیار

گرچہ آج اے آریہ ورت ایسی درگت ہے تری
ایک دن دنیا میں تھا تو مایۂ ہر افتخار

راستبازی تھی تری آفاق میں ضرب المثل
تھا مسلط دل پہ غیروں کے بھی تیرا اعتبار

قطب سے تا قطب ہے تیری بزرگی کا ثبوت
قاف سے تا قاف ہے عالم ترا مدحت گذار

تھا درخشاں مہر علم و فضل تیری خاک پر
جبکہ تھا ابر جہالت سے جہاں تاریک و تار

ذکر اوصاف گذشتہ گرچہ ہلکی بات ہے
بھول جائیں کس طرح لیکن کہ کل کی بات ہے

پندھرواں بند

رنگ بدلے گی یہاں رفتار دوراں سینکڑوں
گل کھلائے گی نئے باد بہاراں سینکڑوں

لعل پیدا معدن قدرت سے کرتی جائے گی
تابش خورشید و سعئ ابر و باراں سینکڑوں

ابر رحمت اپنے اک چھینٹے سے کرتا جائیگا
رشک گلزار ارم دشت و بیاباں سینکڑوں

کرتی جائیگی شگفتہ ہر برس باد بہار
اپنے اک جھونکے سے یاں اجڑے گلستاں سینکڑوں

خاصۂ طبعی نہ بدلے گا عناصر کا کبھی
خاک سے اٹھیں گی صورت ہائے پنہاں سینکڑوں

کب رکیں گے شغل سے مشاطۂ قدرت کے ہاتھ
روئے ہستی پر چنی جائیں گی افشاں سینکڑوں

پیچ و تاب عشق کو دن رات چھوڑیگا شہود
شاہد ہستی کے رخ پر زلف پیچاں سینکڑوں

ہر کہیں کرتے رہینگے اونہیں پیدا دہر میں
حوصلہ اور ہمت مردانہ میداں سنکڑوں

آئیں گے دنیا کے دنگل میں بڑے خم ٹھونکتے
رشک سام و رستم و گیو و نریماں سینکڑوں

پائیں گے تولید بطن مادر گیتی سے روز
غیرت سقراط و افلاطون دوراں سینکڑوں

لیکن اے یکتائے عالم ہند جنت آشیاں
تیرا ثانی تا ابد پیدا نہ ہووے گا یہاں

سولھواں بند

مہر علم مغربی اب سبکو پیارا ہو گیا
جیسے ماہ شام وصل آنکھوں کا تارا ہو گیا

توڑتے ہیں گرچہ تارے عرش کے اہل فرنگ — انتہائے اوج پر ان کا ستارا ہو گیا
گرچہ ہے صدیوں سے ابتر حال اہل ہند کا — ہے تنزل کا ہمارے نام اجارا ہو گیا
گرچہ اب نحس اختری ہے ہند پر چھائی ہوئی — اور گردش میں ہمارا اب ستارا ہو گیا
پھوٹ نے آپس کی اپنا حال پتلا کر دیا — مدتوں سے گرچہ گھر ویراں ہمارا ہو گیا
ہے حسد کی آگ گھر گھر ملک میں پھیلی ہوئی — شعلہ زن دل میں نفاقوں کا شرارا ہو گیا
دفتر ایجاد اور ترقی کا پریشانی میں ہے — دامن دولت ہمارا پارا پارا ہو گیا
ہم میں حشمت ہی رہی باقی نہ جاہ و مکنت — بند صنعت کا یہاں بازار سارا ہو گیا
ہو گئے محتاج غیروں کے کفن تک کے لئے — ساخت پر اب غیر ملکوں کی گذارا ہو گیا
گرچہ گنتی اپنی اب اقوام عالم میں نہیں — حال عبرتناک اب ایسا ہمارا ہو گیا

لیکن اب بھی ہیں سرِ حکمت جو بتلاتے ہیں ہم
اس سے یورپ امریکہ تک کو چونکاتے ہیں ہم

ستترہواں بند

ہم کو پہچانے گی کیا تو اے صدی انیسویں — اب نہ وہ دن ہیں نہ وہ راتیں نہ وہ چرخ و زمیں
جو عناصر کارکن پہلے تھے اس برہمانڈ میں — شاید اب وہ کائنات دہر میں عامل نہیں
سربسر بدلی ہوئی ہے باغ عالم کی ہوا — پر ہیں ریگ وقت پر پسماندہ نقش پا کہیں
کیا بتائیں تجھ کو کس کس کان کے ہم لعل ہیں — کیا نہیں چھانی ہے تو نے ہند کی کل سرزمیں
ہم کو تھا جس جوہر اقدس سے حاصل امتیاز — اب تلک پاتے ہیں ہم میں انکو سچے نکتہ چیں
دان پر اُپکار پرمیشر کی بھگتی اور دیا — ہم میں ہیں تھوڑے بہت موجود اب تک ہر کہیں
جو خوشی ہوتی ہے خدمت اور مدد میں غیر کی — ہم سمجھتے ہیں اسے خوشیوں میں اب تک بہتریں
ہے قدامت وصف قومیت تو مخزن دینیت — ہیں نشانی عہد پیشیں کی جہاں میں اک ہمیں
دھرم میں آیا نہ کچھ حسن عقیدت سے خلل — گردشیں ہم پر نہ کیا آفات نازل کر گئیں
صورتیں آئیں نہ کیا کیا اپنے بعد اسٹیج پر — لیکن آج ان میں سے اکثر کا پتا ملتا نہیں

اولیں مذہب ہو دیرینہ تریں ملت ہو جو
مستحق کیا اک توجہ کی نہیں وہ دوستو

اٹھارہواں بند

سچ بتا اے بخت واژوں اب کہاں لیجائیگا — کیا پرے تحت الثریٰ کے بھی کہیں پہونچائیگا
ہے تنزل سا تنزل غور تو کر ہمنشیں — اس قدر حال تبہ دیکھا نہ دیکھا جائیگا
نور سے مہر ترقی کے گیا اپنے نہ عود — پھر نہ سورج کوئی ایسا چرخ پر گہنائیگا
دیکھ یہ روداد ہر آنکھ اشک خوں بھر لائیگی — ہر کلیجہ صدمہ حسرت سے منہ کو آئیگا
قوم مٹے ہستی سے مٹیں افسوس کیا کیا صورتیں — چشم وا ہوگی مرقع جب یہ دیکھا جائیگا
ذرے ذرے سے عیاں نیرنگیٔ لیل و نہار — مدعی جب آنکھ کھولے گا تو سب کھل جائیگا
ہے ترقی سے تنزل اور تنزل سے عروج — یہ اصول احوال اقوام جہاں سے پائیگا
اے دل ناداں یہ دلداری کی باتیں کب تلک — کب تک اس فکر سلف سے دلکو تو بہلائیگا
کس طرح چھاتی پہ سل رکھ لیں کریں پتھر کا دل — ہم سے تو رونا عزیزو یہ نہ رویا جائیگا
کیونکہ ہم مردوں میں کرلیں تجکو شامل ہائے قوم — ہم سے تو یہ مرثیہ ہرگز نہ گایا جائیگا

بس خموش اے کیفی محزوں نہ قدرت کی بھول
آپ رو رو کر عزیزوں کو رلانے سے حصول

انیسواں بند

تم نے حال اپنے بزرگوں کا جو یہ دل سے سنا — کہنے والے کا نہیں ہرگز یہ اس سے مدعا
نشہ ماضی کے ملتے ہو کے تم دیکھا کرو — عالم رویا میں کلجگ میں وہ ست جگ کا سما
ہم کبھی ایسے تھے جن کی ہمسری ممکن نہیں — اس غرور اور زعم میں ہونا نہ ہرگز مبتلا
گو یہ سچ ہے وقت رفتہ ہاتھ پھر آتا نہیں — کاش سن سن کر یہ دوراں سلف کا ماجرا
خون میں اک جوش آئے دل میں اک غیرت سمائے — اور ہم کو ہمت مردانہ کا ہو آسرا
وہ نہیں ہیں گرچہ ہم پہ یادگار انکی تو ہیں — نقش خاک راہ سے منزل کا چلتا ہے پتا
وہ حرارت اور جدت ہم نے مانا اب نہیں — خون تو وہ ہی رگوں میں ہے ہماری آریا
ہوچکا جو کچھ ہے پہلے اب بھی ناممکن نہیں — ہائے مایوسی نہ کر تو اس طرح بیدست و پا
ہاں اب اے امید تو مردہ دلوں میں جان ڈال — دل بڑھا ہمت بڑھا اور حوصلہ سب کا بڑھا

ہم اگر لیں کام ہمت اور استقلال سے　　پائیں پرمانند ہو پرماتما کی یہ دیا
ہو جو ہمت منزل مقصود پھر کیا دور ہے۔
عزم راسخ ہی عزیزو نور شمع طور ہے۔

متفرق پارے

فروری ۱۸۹۳ء

عورت کی ذات

سرگشتہ و پریشاں و رماندہ رنج و غم سے
ہوتا ہے جبکہ انساں اس دشت زندگی میں
پاتا ہے استری میں آسائش اس الم سے
پاتا ہے برکت اس میں اور تازگی اسی میں

(مہابھارت)

بچوں سے گرچہ گھر ہو تمہارا بھرا پڑا ہو　　اور خرمی آور دنیا سے بھرا ہوا
لیکن گھر آدمی کا ہے بیوی بنا جہاں　　خالی ہے اور روح حقیقی نہیں وہاں
ہے اہل خانہ رونق کا شانہ ہر کہیں　　ویرانہ ہے جو زن وہاں جلوہ نما نہیں

(مہابھارت)

فلک سے زخم جو پہنچے زن اندمال کرے
جو شوہر اس کی رکھے شدھ خجستہ حال کرے
اگرچہ حق سے نہیں اپنے بہرہ پاتی ہے
رجوع غیر سے ہرگز نہیں وہ لاتی ہے

(اتیہاس)

ارھنگی زن ہے مرد کی۔ اور بہترین دوست
پُرمہر زن ہے فصل بہاراں بے خزاں
یگی و عشرت اور بشاشت کی۔ باوفا
زن اس کی بہترین ہے مددِ بہر فصل رب
تنہائی میں ہے شیریں زباں ہوی اک ندیم
اور باپ ہے جہاں کہ نصیحت کا کام ہے
اک ماں ہے جبکہ سرپہ مصائب کا ہو ہجوم
اور دشت زیست کے ہے سفر میں آیک چین

(مہابھارت)

قول عقلائے حال و پیشیں
بھرتے ہیں دنانز اس سخن سے
ہے صبر ستو وہ۔ جرات احسن
بر داشت بھلی مصیبتوں میں
اس عرصۂ زیست میں ہر اک چیز
حرف تسکیں ہے پیش کرتی
مصنوعی دلائل اور ترغیب۔
غم تا کہ غلط ہو آدمی کا ہو
پر دل پہ کہ تیغ غم سے ہو چور
کم ہوتی ہے با اثر کہ اکثر
لگتی ہے وہ اک صدا نا خوش
نا آشنا بالکل اس کے دُکھ سے
محسوس کرے نہ دل میں جب تک ہو
اوپر سے سکوں کا وسیلہ
وہ فرح نہفتہ دافع ضعف۔
اور رُوح ضعیف کا سہارا

(ملٹن)

اے عزیزو حشر الحق مرد و زن کا ساتھ ہے
قید میں کیا اور آزادی میں کیا؟ ہیں وہ رفیق
پھر اگر وہ ہے ضعیف الخلق۔ ناچیز اور حقیر
علم ان رو زدوں نہیں اک چشمہ سربستہ ہے
لونڈی پن کی۔ اور گنہ وہ پہل ہٹ۔ اور کینے کے

دیوتا یا دیو ہوں ہاتھ اس کا اسکے ہاتھ ہے
ابھرے یہ تو وہ بھی ابھرے یہ ہو تو وہ بھی غریق
مرد کی نشو و نما ہو سکتی ہے کب اے بصیر
زن! اسے پی تا کہ عادت تجھ سے جو وابستہ ہے
دور ہو جائیں اے زن تیرے صافی سینے سے

(ٹینی سن)

اے دوستو۔ عزیزو! وطن سے جو دور ہو۔
اچھی ہے کیا یہ زیست رواج قدیم پر
بڑھ کر کہیں تجمل و شوکت میں کیا یہ بن
فائق نہیں ہے محلوں کی شان الیم پر
آدم کی معصیت کی سزا بھوگتے ہیں ہم
تبدیل فصل۔ برف کا چنگال سخت گیر
اور کڑکڑاتے جاڑے کی سن سن ہوائے تیز
وہ جبکہ میرے جسم میں گھستی ہے مثل تیر
اب تک میں اس کے صدمے سے لرزاں ہوں مثل بید
خوش ہو کے کہہ رہا ہوں مگر بے مبالغہ
ملتا سبق ہے ان سے کہ میں کیا ہوں؟ کون ہوں
تفتیش ماہیت کا ہے ہوتا گمان سا
ہے شاخ دشمنی کا جو سچ پوچھو میٹھا پھل
جو مثل مار ہیبت و سم سے بھرا ہوا ہو
با اینہمہ ہے سر میں اک انمول من نہاں
گر زندگی ہماری کشاکش سے ہو جدا
پاتی ہے وہ زبان۔ دفاتر۔ اپاسنا
پیڑوں میں۔ بہتے پانی میں اور کوہ میں سدا

(شکسپیئر)

رازو نیاز محبّت

سنہ ١٨٩٣ء

آہ میں کیوں اس قدر ہوں مضطرب اور دل حزیں — چین ہے ہے اک کسی پہلو مجھے پڑتا نہیں
نیند آنکھوں سے اُڑی دل سے مسرت کھو گئی ۔ — اضطرار شام فرقت بس قیامت ہو گئی

کیا ہے وہ جو باعث دردِ دلِ جانکاہ ہے — ہائے کہتا ہوں مگر منہ سے نکلتی آہ ہے
ہو نہ ہو زخمی مجھے یہ عشق قاتل کر گیا — تو وہ تیر بلا و رنج و غم دِل کر گیا
اور دلِ خستہ کو ایک جھپکی میں بسمل کر گیا

کھب گیا دل میں خدنگ عشق پہلو چور ہے — ہے تسلّط عشق کا آرام دِل سے دُور ہے
ہاں میں سرتابی کروں یا رکھ دوں اب خنجر پہ سر — ہے رہ تسلیم واجب سینہ کرنا ہے سپر
ہے محبت میں مناسب راہ تسلیم و رضا — صبر ہی سے بوجھ ہوتا ہے سبک آلام کا
شعلہ حرکت سے بھڑکتا ہے نکلتے ہیں شرر — دم میں ہو جاتا ہے سرد اسکو نہیں چھیڑو اگر
پیش پا افتادہ کو تو عشق ٹھکراتا نہیں — جو کچلے، لیکن کبھی رحم اس پہ یہ کھاتا نہیں
سر ہے حاضر ہے اے محبت! عفو کر اگلی خطا — بخشدے اور درگزر کر دے جو بیجا ہو گیا
یہ زبردستی ہے کس پہ؟ میں ہوں حاضر سر بکف — بزدلی ہے گردن خصم پہ ہو گر خنجر بکف
ہاں ذرا انصاف دلبر! اس شرطِ الفت ہوا ادا — یا مجھے ترک محبت کا سبب اصلی بتا
سرد مہری اور سلوکوں کا ترے شکوہ نہیں — میں کبھی حرف شکایت لب تلک لایا نہیں
میں نے ثمرہ شادمانی کا نہیں دل کو دیا — ہونیوالا ہے کبھی تو فضل شاہ عشق کا
کہ قبول اسکو رہے جو عمر بھر تیرا غلام — سوز جس دل میں رہے گا ۔ جاں نثاری کا مدام
میں کہ مانا صاحب حشمت نہیں نامی نہیں — نذر ہے جو پاس ہے وہ بھی تو خستہ اور حزیں
ہے مگر امداد سلطانِ محبت کی مجھے ۔
اور وہی اک دن کریگا مہرباں مجھ پہ تجھے ۔

(ادوڈ)

بے ثباتیِ حُسنِ صورت

۱۸۹۳ء

حُسن و خوبی کا بھی دُنیا میں ہے چرچہ کیسا — اس کا جم جاتا ہے ہر آنکھ پہ نقشا کیسا
اچھے منظر کا ہر انسان ہے شیدا کیسا — اس کا حاوی ہے زمانے پہ کرشمہ کیسا
ہو وہ انسان ہیں یا پھول ہیں یا پتھر ہیں
موہ لیتا ہے وہ نظارے کو بس دم بھر میں

یہ تو سب کچھ ہے مگر غور سے دیکھو گے اگر — بدر کی طرح سے اسکی بھی ہے ضو چار پہر
کون سا پھول ہنسا باغ جہاں میں کھل کر — مر کے مُرجھا کے نہ آخر کو گرا مٹی پر
عاقبت حُسن کی ظاہر ہے جو کچھ ہوتی ہے
ہر سحر دیکھ لو شبنم کو ہی روتی ہے

حُسن اک شمع ہے شب بھر کے لئے جس کا ہی نور — ایک شیشہ ہے ذرا ٹھیس سے ہو چکنا چور
خواہ انساں ہو حسیں رشک پری غیرت حور — حسن کی لکھا ہے پیشانی میں ہونا کافور
بدر کب چرخ پہ گھٹ کر نہ ہُوا شکل ہلال
آئینہ کون سا تھا جس میں نہیں آیا بال

چشم و ابرو کی ادا اور وہ نک سک کی پھبن — گل عارض کی دمک، سنبل مُو کی الجھن
دُر دنداں کی وہ آب اور کشش چاہِ ذقن — لب جاں بخش کا اعجاز۔ قیامت کا چلن
حُسن کا کس پہ صدا رہتا ہے کہئے تو سہاگ
مرثیہ پر نہ ہُوا ختم یہ کب دلکش راگ

یہ صباحت یہ ملاحت یہ نزاکت کیا ہے — یہ تناسب کہ جو اعضا کا قیامت زا ہے
اچھی صورت کا بھی جادو تو غضب چلتا ہے — حُسن اک فتنہ ہے۔ یا ناز و ادا۔ غمزا ہے
یہ تو سب کچھ ہے مگر آہ نہیں اسکو قیام
چاندنی چار ہی دن کی ہے پھر اللہ کا نام

جو صنم آج ہزاروں کا خدا ہوتا ہے — عندلیب آج نہ جس گُل سے جُدا ہوتا ہے
آج جس شمع پہ پروانہ فدا ہوتا ہے — آج جس پھُول پہ بھوروں کا جتھا ہوتا ہے

کل ہی دیکھو گے کہ خلقت کو وہ ہونگے دوبھر
غلط انداز نظر بھی نہ پڑے گی ان پر

کتنے موتی تھے کہ بے آب ہُوئے اِک دم میں — کتنے گُل تھے کہ خزاں خوردہ ہوئے عالم میں
کتنے چہرے تھے کہ مُرجھا گئے درد و غم میں — حسرت انگیز تغیّر ہیں جو دیکھو ہم میں

اس لئے چاہیئے نازاں نہ ہو انساں اس پر
لے سبق دیکھ کے قدرت کا نظارہ یکسر

(شیکسپیئر تصرف کے ساتھ)

تعلیم کی برکتیں

۱۸۹۱ء

تعلیم ہے اے دوستو۔ دنیا میں عجب چیز — کم اس سے بزرگی و فضیلت میں ہے سب چیز
تعلیم سے ہی اشرف مخلوق ہے انساں — تعلیم سے ہی جلوہ فگن دل میں ہے ایماں
تعلیم سے شائستگی ہے آدمیوں میں — کیا اور کمی ورنہ ہے اِن جانوروں میں

تعلیم نے لوگوں کو اٹھایا ہے زمیں سے
پایہ ہے بلند ان کا کیا عرش بریں سے

تعلیم سے انسانیت انسانوں میں آئی — تعلیم سے بہت ہوئے اِک لمحہ میں رائی
وحشی جو تھے انسان بنے اس کی بدولت — دنیا کے وہ سلطاں بنے اس کی بدولت
تھا جہل و حماقت کا عَلم جن کے سروں پر — استاد جہاں اب ہیں وہ با علم و ہنرور

کیا آئینہ دِل کو جلا دیتی ہے تعلیم
اللہ کی قدرت کو دکھا دیتی ہے تعلیم

اُستاد پہ شاگرد کو ہے اس سے فضیلت — چھوٹے کو بڑے سے پڑھے تو اس ہی سے ہے عظمت

خدام کو مخدوم بنایا ہے اسی نے
ادنے کو زمانے میں بڑھایا ہے اسی نے
شودروں کو اسی علم نے رشیوں میں ملایا
کم درجے کے لوگوں کو شریفوں سے بڑھایا

سچ پوچھئے گر۔ سچی شرافت ہے تو یہ ہے۔
انسانوں میں گر وجہ فضیلت ہے تو یہ ہے

سمجھی ہیں جو اس مسئلے کو آج جہاں میں
وہ قومیں ہیں کل قوموں کی سرتاج جہاں میں
ہے دین بھی حاصل انہیں دنیا بھی انہیں کو
یہاں چین تو ہے راحت عقبے بھی انہیں کو
امید خیالوں میں تو ہمت ہے دلوں میں
ہے فتح مہموں میں۔ مسرت ہے دلوں میں

منظور نظر رحمت حق کی ہیں یہ قومیں
ہاں زبدۂ مخلوق الٰہی ہیں یہ قومیں

یہ کہہ گیا کیا خوب کوئی۔ "علم ہے طاقت"
بڑھ کر نہیں اس سے کوئی اللہ کی برکت
جن لوگوں پہ اللہ کی رحمت ہوئی نازل
بس علم و عمل میں وہی ہو جاتے ہیں کامل
عقل ان کی کسی آن نکمّی نہیں رہتی
یوں ہمت عالی کبھی بیٹھی نہیں رہتی

بیٹھے رہیں خالی تو پڑے چین کب انکو
تعمیل میں لانے ہیں سب احکام رب ان کو

انسانوں کی آسائش و آرام کی خاطر
فطرت کے غوامض وہ سدا کرتے ہیں ظاہر
ہو زیست میں انساں کی جو آسانی کی ایزاد
وہ نت نئی کرتے ہیں کلیں کام کی ایجاد
نیچر کے قوانین پہ کرتے ہیں عمل وہ
کرتے ہیں ادق مسئلوں کو چٹکی میں حل وہ

سرمایۂ قومی ہیں وہ یوں اپنا بڑھاتے
مخلوق کی ہیں دقّت و مشکل کو مٹاتے

اس حد پہ ترقی کی اب آ پہونچا زمانا
بے علم کو حیوان بتانے لگے دانا
یہ کہنے میں عاقل کو نہیں آج تامل
گر کل کی جگہ آج ہو تم۔ ہے یہ تنزل
ہے گرم زمانے میں فن و علم کا بازار
کیا خوب پھلا پھولا ہے دانائی کا گلزار

بڑھ سکتے جہاں تک ہو بڑھے جاؤ عزیزو
بڑھ سکتے جہاں تک ہو بڑھے جاؤ عزیزو

اک بات بتاتی ہے تمہیں کام کی یارو
سب نوکریاں پاؤ گے پڑھکر یہ نہ سمجھو

سوچو تو کہاں نوکریاں رکھی ہیں اتنی ۔۔۔ تم سب پڑھے لکھوں کی جہاں ہوسکے بھرتی
اس خام خیالی کو کرو دسر سے بدر تم ۔۔۔ حاصل کرو پڑھ لکھ لیں اچھے سے ہنر تم
نفرت رہی حرفت سے تجارت سے جواب بھی
کرسکتا ہے پھر آپ کی امداد نہ رب بھی

انگریزوں کو دیکھو کہ تجارت کی بدولت ۔۔۔ ان چینیوں کو دیکھو صناعت کی بدولت
یورپ کی یہ قومیں فن و حرفت کی بدولت ۔۔۔ پیشوں کے طفیل اور فلاحت کی بدولت
بیپار کی برکت سے سیاحت کی بدولت ۔۔۔ القصہ ہر اک حرفت و صنعت کی بدولت
ان میں ہیں سبھی مملکت و زر سے نہال آج
ہر وصف میں اور علم میں ہیں اہل کمال آج

تعلیم کی جو برکتیں ہیں سب پہ عیاں ہیں ۔۔۔ تعلیم کے اوصاف تو مشہور جہاں ہیں
ہو علم سے ہی صنعت و حرفت میں ترقی ۔۔۔ کرتا ہے یہی قوم کی دولت میں ترقی
اک بات یہ اے اہل وطن تم کو رہے یاد ۔۔۔ ہے زندگیٔ قوم کی بس اک یہی بنیاد
درکار نہیں طول کلام اس میں ہمارا
عاقل جو ہیں کیفیؔ انہیں کافی ہے اشارا

پٹیالہ کا پانی

(اکتوبر ۱۸۹۱ء)

۱۸۹۱ء میں کیفی صاحب کو چند مہینے پٹیالہ میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں صفائی اور حفظان صحت کے اعتبار سے پٹیالہ پنجاب کا سب سے خراب شہر تھا۔ بدرو اور نالیوں کا کچھ انتظام نہ تھا۔ صفائی کا نام نہیں۔ ساری غلاظت اور میلا پانی زمین میں جذب ہوتا۔ اور ادھر ہوا بگڑتی۔ ادھر کنوؤں کا پانی جس پر لوگوں کا گذارہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا۔ کہ ملیریا اور معدے کی بیماریاں ملک الموت کی سرپرستی کرتیں۔ جن لوگوں نے اس زمانے کا پٹیالہ دیکھا ہے۔ وہ تصدیق کریں گے۔ کہ اس قصیدہ میں محض واقعات نظم کیے

گئے ہیں۔ اب اس شہر کی حالت اس زمانے کے مقابلہ میں بہت اچھی ہے۔ اور اس کے ساتھ باشندوں کی صحت بھی۔ بدرؤں کا بہت عمدہ انتظام ہے۔ نل کا صاف پانی پینے کو ملتا ہے۔ اور صفائی اچھی ہے۔

تھی مقدر میں جو لکھی ہوئی ایذا پانی — کھینچ لایا ہمیں پٹیالہ میں دانا پانی

زہر دینا ہو جسے اسکو پلادو اک گھونٹ — بس یہاں کا اسے کافی ہے ذرا سا پانی

ہو کے مردہ یہ طبیعت نے کہا فرحت سے — ہینوں پٹیالہ دا آنا تو ہویا سیاپا - نی

آب آتش سے یہاں بجھتا ہے دل ہندو کا — کیوں گلابی کو نہ جیل کہیں کالا پانی

سب کو کرتا ہے لگد کوب عوارض یکساں — رومی کشمیری ہوں انگریز - کہ ہوں جاپانی

سستی اور کاہلی بن جاتی ہے۔ ہر اک کا خمیر — بھاری انساں کو ہے اپنا سا یہ کرتا پانی

ٹھیک ہے ہاں اگر اسکو کہو بحر اسکاہل — بڑے چالاک کو کاہل کرے یاں کا پانی

اس کا ہر گھونٹ ہے آب دم صمصام اجل — ہوں جوانمرگ جو پی لیں یہ - مسیحا پانی

آب حیواں کا اثر دھو دیا سب اک دم میں — یہاں آکر تو خضر نے بھی نہ مانگا پانی

پہلے ہی پانی میں بس ہو گئے مٹی گویا — جو پئے بیٹھے تھے - بتیس کنوں کا پانی

معدے پہ گرتا ہے انساں کے شبنم کیطرح — تو درختوں کے لئے بنتا ہے پالا پانی

صاف پانی ہے یہاں جیسے کہ چڑیا کا دودھ — آب حیواں ہے ہنوز گا - یہاں پانا پانی

آکسیجن - ہائیڈروجن ہی پہ موقوف نہیں — اور بھی رکھتا ہے اس شہر کا - اجزا پانی

کچھ ہے کیچڑ کا تو کچھ تیل کا جزو ہمہ ہیں — عطر مجموعہ ہے القصہ یہاں کا پانی

تہ مرے سطح پر اس کی ہیں کہ افشاں یہ چنیں — چشم انجم کی ہے کیا آنکھ کا تارا پانی

گل زمانے کے نظر آتے ہیں عنصر اس میں — جام جم گویا کٹورے کو ہے کرتا پانی

سطح پر اس کی نظر آتے ہیں یوں تارے سے — جس طرح تہ میں کوئیں کی ہے تارا پانی

سوڈیم - کاربونیٹ آف لائم گر ڈالو — نام کو نفع کرے پھر بھی نہ پیدا پانی

ناقص اجزا کی صورت بھی نہ چھوڑیں اس کو — ہے مضر اور دوبالا جو ابالا پانی

قصہ کوتاہ یہ پانی وہ ہے جس کا پینا — اپنے ہی آپ کو گویا کہ ہے دینا پانی

پانی پانی ہو اسے دیکھ کے آب خنجر — نال بندوق کی ہے چاہ تو سیسا پانی

چشم مردم کا ڈھلا نیل تو حیرت کیا ہے
آنکھ میں اس سیپ صدف کی اُتر آیا پانی

یہاں الٹا ہے ثواب اور عذابوں کا حساب
وُہی کوفی ہے یہاں جس نے پلایا پانی

زہر دے کر یوہنی بدنام ہوئے دنیا میں
کیوں نہ سقراط کو پلوا دیا یاں کا پانی

ایسا معلوم ہوا ہے جیسے پیا ہے پارہ
پی لیا نام کو بھی جبکہ ذرا سا پانی

کیا غذا کرتا ہے تحلیل یہ اجزائے بدن
کیا بہاتا ہے غضب الٹی یہ گنگا پانی

کیا تعجب ہے جو اسہال انیمی کو لگیں
بے طرح ہے یہ طبائع کو پلٹتا پانی

نفخ ہے آج۔ گرانی کی شکایت تھی جو کل
کھٹی آتی ہیں ڈکاریں جو ڈکارا پانی

گر ہے امعا میں خرابی تو ہے معدے میں خلل
یہ رطوبت ہے کہ بس منہ سے ہے آتا ہی نہیں

ڈر سے بدہضمی کے پہلے ہی جوارش کا ہے ورد
جیسے بن دیکھے اتارے کوئی موزا پانی

پانی کے مول بھی لیتا نہیں یاں کوئی گلاب
گو عرق ہے پہ ہے دراصل یہیں کا پانی

دستوں کے ہاتھوں ہی جاں خشک تو دم قبض سے بند
آیا دم ناک میں جب حلق سے اترا پانی

ہے جو سوزش سی جگر میں تو جلن معدے میں
تندرستی کو تو کر دیتا ہے ٹھنڈا پانی

ایک چہرے پہ بھی سرخی نہ یہاں پاؤ گے
چھوڑتا تن میں نہیں خون کا قطرا پانی

یوں یہاں ڈھونڈ کے انسان کو لگتا ہے مرض
سطح جس طرح خود اپنی ہے بناتا پانی

جس کو سنیئے یہاں اسکی ہی لگی ہے آواز
حلق کو جیسے کھلا دیتا ہے سرمہ پانی

اسکے پینے سے بس اڑ جاتے ہیں صحت کے دھوئیں
گویا بندوق عوارض کا ہے توڑا پانی

جو مرض سارے جہاں میں ہیں یہاں یکجا ہیں
اصل میں تو یہ ہے بیماری کی پڑیا پانی

پیچش و تپ سے ہوا ایک زمانہ عاری
کبھی برسات میں کچھ کھل کے جو برسا پانی

وہ یہاں کا ہے بخار آفت جاں جسکو چڑھاؤ
وہ گرا ایسا کہ پھر اس نے نہ مانگا پانی

بچے تخمے سے تو اب سر پہ چڑھا تپ کا بھوت
جس کی مٹی ہو یہاں کی وہ ہے پیتا پانی

گھن سا کھا جاتا ہے یہ جسم کو اندر اندر
سمجھو صحت کے دوشالے کا ہے کیڑا پانی

آب و تاب آئینہ روئے بتاں کی نہ رہی
جن کے دُکھتا[1] تھا گلے میں سے اترتا پانی

---

[1] کیفی صاحب سے عرض کیا گیا کہ اسکو بدل دیجئے۔ "دکھنا" اس وقت بھی متروک تھا۔ اور اس کی جگہ دکھائی دینا مستعمل۔ فرمایا کہ یہ میں قصیدہ کی تصنیف کے وقت جانتا تھا۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ چار حرف کے لفظ کو چھوڑ کر نو حرف کے لفظ کو اختیار کیا جائے۔ اگر اس کے ترک کی کوئی معقول وجہ ہو۔ تو بتائی جائے۔ قدما کے متروکات معقولیت پر مبنی تھے۔ متاخرین نے محض دھینگا دھانگی سے کام لیا۔

جانستانی وہ حسینوں کی ادائیں نہ رہی
تیغ ابرو کا بھی اس پانی سے ڈھلکا پانی

ڈر سے شرکنت کے ہے تیزاب سے چڑھ عاشق کو
زخم دل بھولے یہاں آکے چھڑانا پانی

یہ اثر اس کا ہے چہرہ سے اترنے لگتا
اور گلے سے ابھی نیچے نہیں اترا پانی

لاکھ دم کرکے پیو ہے وہی تاثیر اس کی
ان دموں میں نہیں آنے کا ہے پکا پانی

کھانا پینا یہاں کچھ انگ نہیں لگتا ہے
سو میں اک کو بھی موافق نہیں آتا پانی

کیسی صحت! اجی وہ پانی تو ملتان گئے
بندھنے دے کس کی ہوا ہے یہ غضب کا پانی

کتنے پانی میں ہیں یہ خضر ذرا دیکھیں تو
کیونکہ رہتے ہیں امرلی کے یہاں کا پانی

یاں پڑا نیل ہے ایک ایک کنوئیں کے اندر
ہے اثر ایک سا کھاری ہو۔ کہ میٹھا پانی

موتی کھانا یہاں ہے کر کی کنی کھانا ہو
گر یہ ہے ٹھیک کہ ہے آب کا معنیٰ پانی

وہ اثر اس میں ہے جس سے کہ مسیحا چکرائیں
سامنے ہوتا ہے اس کے دم عیسےٰ پانی

قید ہستی سے یہی چھٹنے کی پائی صورت
خضر کے منہ میں اسے دیکھ بھر آیا پانی

پیاسا انسان کے ہے خون کا اس کے آگے
آب شمشیر بھلا کیونکہ نہ بھرتا پانی

اس سے دھوکر جو گلاس آپ پئیں گنگا جل
عرق شرم و خجالت سے ہو گنگا پانی

کنواں اچھا بھی ہوا اک آدھ تو پھر اس سے کیا
گندا اک مچھلی سے ہو جاتا ہے سارا پانی

موریوں کا نہ بدر رو کا ہے کچھ ڈھنگ یہاں
گویا محفوظ ہے رکھا ہوا گندا پانی

چونکہ بدبختی سے نیچان میں بستا ہے یہ شہر
باہر اچھی طرح جاتا نہیں۔ میلا پانی

شہر کی جو ہے نواح اور ہر اک قرب و جوار
ٹھہرا رہتا ہے مہینوں وہاں ہر جا پانی

اس سے ہو جاتے ہیں سو نقص ہوا میں پیدا
اور پھر روز ہی کا ٹھہرا یہ بگڑا پانی

گر تمرے پہ رہیں پھر بھی نہ صحت ہو درست
کہ پئے بیٹھا ہے ان تو لا ملیریا پانی

کیسے رہ سکتی ہے پھر شہر کی صحت قائم
جب نہ اچھی ہو ہوا اور نہ اچھا پانی

چین پانی کے تلے اور نہ اوپر ہے کہیں
بن ہے کیونکہ رہیں روگ ہے مانا پانی

کیفی یہ ہستی ناچیز ہے اک نقش بر آب
پھر یہ کیا شکوہ برا ہے کہ ہے اچھا پانی

شاخِ نبات

دہلی - جولائی سنہ ۱۸۹۰ء

لکھنؤ سے ایک صاحب دہلی میں حکیم واصل خاں صاحب کے پاس اپنے علاج کے لئے آئے۔ حکیم صاحب سے کیفی صاحب کے مخلصانہ تعلقات تھے ان لکھنوی صاحب سے انہیں کے ہاں ملاقات ہوئی۔ اور بے تکلفی کی صورت پکڑ گئی۔ ان کے پاس حضرت شوق قدوائی مرحوم کی تازہ تصنیف "مثنوی ترانہ شوق" تھی۔ وہ انہوں نے کیفی صاحب اور دوسرے دہلوی احباب کو دکھائی اور فخریہ کہا کہ حضرات یہ بلا شرکت غیرے لکھنؤ کا رنگ ہے۔ جسے شوق صاحب نے کمال کو پہنچا دیا ہے۔ دیکھئے کوئی شعر محاورے یا تلازمہ سے خالی نہیں۔ رعایت تشبیہ یا استعارہ ہر شعر میں پائیے گا۔ کوئی دو شعر اس رنگ میں لکھے تو خون تھوکنے لگے۔ محلدار خان کے باغ کا یہ واقعہ ہے۔ جہاں سب دوست آموں کی دعوت منانے گئے ہوئے تھے۔ سب نے کیفی صاحب کی طرف دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ طرز اپنے کلام کا نہیں۔ نہ دہلی نے اس رنگ کو کبھی پسند کیا۔ مگر بہ پاس خاطر معزز مہمان کے ممکن ہے۔ صحبت نے لکھنوی مہمان کو بھڑکایا۔ یار لوگوں نے ابھارا۔ قرار پایا کہ آم سامنے کا موضوع ہے۔ اسی پر ایک مثنوی ہو جائے۔ مگر وہی شوق کے رنگ میں۔ چنانچہ پچاس ساٹھ شعر اسی وقت ہو گئے۔ اور دوسرے روز شام کو یہ دوسو کئی اشعار کی مثنوی احباب کے جلسہ میں لکھنوی دوست کے پیش کی گئی۔ یہ واقعہ جولائی سنہ ۱۸۹۰ء کا ہے واقع میں مثنوی کیا ہے مراعات النظیر اور تلازمہ بندی کا کمال ہے۔ ہر شعر میں کوئی نہ کوئی صنعت ملیگی۔ اور محاورے پر تو معلوم ہوتا ہے۔ علامہ کیفی کو ابتدا ہی سے قطعی قبضہ تھا۔ خاتمہ کتنا بانکا اور بصیرت افروز ہے۔

بلبلِ خامہ لب کشا ہو ذرا — آج کوئی مزے کی بات سنا
بات جو سب کے جی میں کھُب جائے — نکتہ سنجوں کے دل میں چُبھ جائے
صفحے پہ باغ نو کھلا دے آج — سروں ہاتھوں پہ ہاں جما دے آج
سطریں ہوں جوئے شیر کی لہریں — جدول آبِ حیات کی نہریں
آب ہو یہ زبان میں تیری — جانفزائی بیاں میں تیری
پانی پھر جائے جس سے کوثر پہ — جو لکھوں ہو اثر سے شیر و شکر
ہاں دکھا وہ عذوبت تحریر — نکتہ چینی ہو جس کی ٹیڑھی لکیر

نکتہ رس جان لیں گے نیک و بد — مشک آنست کہ بہ بوید خود
طوطیٔ شکریں سخن لب کھول — بیٹھی باتوں سے اپنی قند اب گھول
ہاں ذرا لیٹی بیٹھی نیند سے جاگ — اور سنا کوئی مجھ کو میٹھا راگ
کر شکر خند سے شکر ریزی — نرخ عذب البیاں کی کر تیزی
باش رطب اللساں بہ وصف آم — باش عذب البیاں بہ وصف آم
ذکر خاص آم کا تو ہاں کچھ کر — تیرے منہ میں سدا ہو گھی شکر
آم کا ذکر چھیڑ دے تیرا — تر کلیجا ہو تیرا منہ میٹھا

کھا کے جس کو خدا ہے یاد آتا — جس کے رس میں ہے رام رس کا مزا
کھانڈے کی دھار پر جو چلتا ہے — منہ شکر لب کے منہ سے ملتا ہے
بانکپن بھولے اس کی دیکھ کے قاش — رشک سے ہو ہلال بھی صد پاش
ایسی ہے دلفریب اس کی اٹھان — اٹھیں میٹھے برس کے جوں ارمان
شہد سے تو کہیں یہ بڑھ کر ہے — نوش کے ساتھ نیش کا ڈر ہے
ہے گلو سوز حلوۂ شیریں — حلوہ بے دود ہے یہ آم نہیں
چیز کیا اس کے آگے بورا ہے — پکی احمق ہے خام پارہ ہے
تار شربت کا کیوں نہ یاں بگڑے — پختہ کار اس سے ہو گئے کچے
کیوں نہ قند اس سے روبراہ ہوا — بس بتاسے کی طرح بیٹھ گیا
آم سے بھر کے منہ کی ہے کھائی — ہو شکر کو نہ کیوں شکر پائی
اس کے آگے عسل کی کیا دراصل — برگزیدہ یہ میوہ ہے دراصل
تلخ کام اس سے قند و مصری ہیں — شہد پر مکھیاں بھنکتی ہیں
کر کے گڑ اس سے ہمسری کی ہوس — پڑ گیا ریوڑی کے پھیر میں بس
انگبیں کیسے رنگ لگتا تو — اک زمانا ہے اس کا انگ لگو
چاشنی شربت وصال کی بھی — پڑ گئی اس کے سامنے ڈھیلی
جب سے اس کے کھلے ہیں یہ جوہر — جال سے تنگ آ گیا ہے تنگ شکر
بات اس سے نہ کچھ بھی بن آئی — مصری شرما نبات نے کھائی

بُور کے لڈو پہلے ہی سے تھے مگر
پڑ گئے اس سے آدے اولوں پر

کیا مثال اس کی نیشکر سے ہو
کندۂ ناتراش ہے وہ تو

میٹھے منہ پر سدا ہے تیغ اس کی
اس کے آگے ہو تاب یہ کس کی

تاک کا اس سے بھڑ کے ہے جی سرد
میٹھا میٹھا ہے دل میں رشک کا درد

زخم یہ خارِ رشک سے کھایا
کہ نہ انگور حشر تک آیا

پائی گستاخی کی سزا ہے خوب
کھینچ کر آپ کو رکھا ہے خوب

بانس پر ہے یوں ہی چڑھا رکھا
نیشکر میں بھلا ہے کیا رکھا

ہو مزا کچھ رطب میں یا کہ نہ ہو
رطب و یابس ہے کام کیا ہم کو

کیوں نہ برتر ہو خلد میں طوبےٰ
خرس در کوہ بوعلی سینا

اس کے آگے بنا تھا البیلا
اجڑ اجڑ پیڑ سے جبھی کیلا

سیب کرتا تو اس کے آگے چوں
منہ میں گڑ لے کے رہ گیا وہ کیوں

اس پہ ہر حال ہے ٹپکتی رال
پیڑ کا پکّا ہو۔ کہ ہو وہ پال

ٹپکے پر رال ٹپکے گنّے کی
منہ میں بھر آئے تاک کے پانی

پال سے سیب پر پڑا پالا
اس کو ایسے سے کب پڑا پالا

اس کی خوش رنگیاں اگر دیکھے
گوئے خورشید پھیکی پڑ جائے

کیوں نہ قلمی کا سکّہ جائے جم
جب ہوں وصّاف اس کے لوح و قلم

تار پر اس کو دیکھ گر پائے نم
حسنِ شیریں کبھی نہ گدرائے

مثلِ کمسن جبیں جفا پیشہ ہو
شاہد آم بھی ہے بے ریشہ

ریشہ ہے بھی اگر تو یوں جیسے ہو
خربزوں کی آنکھ میں ڈورے

گٹھلی ہے بھی تو اس قدر اس میں
جیسے ڈھیلا ہو چشمِ نرگس میں

اس کے چھلکے کا یہ نہ رنگ کہو
اس کے شبرہ کی ہے جھلک دیکھو

ہاں جبھی تو کھلا یہ جب سے ڈھنگ
ہے گلوئے بتاں کا پھیکا رنگ

اس سے سیبِ ذقن نے کھایا داغ
آگے کا اس کے کب جلا ہے چراغ

دہنِ نشتر زن کی تیغ زباں
کتنی ہی بیٹھی دھار پر ہو رواں

اس کی میٹھی چھری کا وہ بھی تو | لوہا مانے ہوئے ہے کڑوی ہو
اس کی شیریں اگر ذرا بولے | میٹھی نظروں سے دیکھنا بھولے
شکّریں لب جو اس کا رس پا لیں | شہد لب کو لگا کے وہ چاٹیں
پیار کوئل سے جی رہا ہے سلگ | ہو گئی یہ لگا کے شہ سہاگ
شوق امبہ میں کر دیا بیتاب | کالے کوّوں سے ہو گئی خراب
کچا شیر آپ نے پیا ہے ابھی | نیشکر میں ہے کب یہ شیرینی
نہ تشبیہ کا اگر ہے خیال | چشمہ جوئے شیر کی ہے مثال

شوق رکھتے ہیں اس کا خاص و عام | آم ہے حظّ زندگئے انام
تھا سکندر کے سر میں بسکہ خلل | یا خضر کا گیا تھا چکمہ چل
چھوڑ کر وہ جو ایسا امرت پھل | آب حیواں کے پیچھے تھا بیکل
اس کی پا لیتا بو جو اسکندر | چھوڑ دیتا ہے وہ پیروئے خضر
ڈالتا خاک آب حیواں پر | رکھتا جاں سے عزیز تر یہ ثمر
یاد ہیئت کی دھن تھی نیوٹن کو | سیب سا ہے اس نے جوڑا جو من کو
اس کے ٹپکے پہ دھیان رکھتا اگر | کھلتے اسرار دو جہاں اس پر
جانفزا اور مسیح دم ہے یہ | شجر زیست کی قلم ہے یہ
آب حیواں و بادہ کوثر | ہو سکے آکے اس میں شیر و شکر
پایہ ہو گا کہ باغ جنت میں | نمبر اول تھا یہ حلاوت میں
گنبد برج حسن حور تھا یہ | سر گیاسوں کے دل کا نور تھا یہ
چشمۂ فیض جو اسے پایا | سینہ سے حوریوں نے لپٹایا
مثل اک شیر خوار بچے کی | نہ ہٹاتی تھیں چھاتی سے اپنی
کہ یکایک جو کوک اٹھی کوئل | دل گیا ان کا ایک بار دہل
چھٹ پڑا یوں وہ ہول کے مارے | ٹوٹیں جیسے کہ چرخ سے تارے
پایہ ہے کئے کہ طوبےٰ اور سدرہ | کر کے پیوند آم حق نے دیا
شربت وصل سے اسے سینچا | ہوس دید کی کھلائی ہوا

گرمیٔ شوق نے پکایا ہے ۔ — اور پہ واں یوں چڑھایا ہے
جب ہی لذت یہ اس نے پائی ہے — جبکی وارفتہ اِک خدائی ہے

آم کا دم تو سارے بھرتے ہیں — سب آمنا صدقنا کرتے ہیں
کیا ہی خوش رنگ و خوشگوار ہے آم — چمن زیست کی بہار ہے آم
اس کا ہر گھونٹ ہے ممدّ حیات — ہر ڈکار اس کی ہے مفرح ذات
اس کی لذت کی جو خبر پائی — لعل لب سے چھپی شکر خائی
وصف انبہ ہو اس سے بڑھ کر کیا — جگدامبہ ہے نام دیوی کا
من نہ صرف آدمی کا للچایا — کھٹا میٹھا ہے دل فرشتوں کا
سرکشوں کے یہ سر جھکاتا ہے — منہ کی اچھوں کو یہ کھلاتا ہے
مجھ کو بھاتی ہے امیا ننھی سی — پیلا رس۔ چھوٹی گٹھلی۔ کھٹ میٹھی
آب حیواں میں کیا رکھا ہے ہاں — ہو امر۔ کھا ہوائے امریاں
شان تشبیہ سے ہو اس کی حقیر — ملح اس کی ٹبری ہے ٹیڑھی کھیر
بھر دے پیٹ ایک مالدے کا آم — ہے پلک دریا اس کا راسی نام
اس کے ہر گھونٹ کا اثر دل تک — کرتا ہے راج اُٹھا اُٹھا کے پلک
اس کے آگے جو شیر کی تو لیں — شیر کی تولی ۔ بس وہیں بولیں
اس کو یکساں ہے ادنےٰ اور اعلیٰ — کرتا ہے منہ سبھوں کا یہ میٹھا
رحمت حق کا آئینہ ہے یہ — سب کو اک آنکھ دیکھتا ہے یہ
سب کے دم بند اس کے آگے ہیں — دُردِ ندوں کے دانت کھٹے ہیں
حلوا بے دود نام تھا جس کا — اس کے آگے ہے کاغذ حلوا
در بہشت اس سے آتش غم ہیں — شیر گیر اسکو دیکھکر حرریں

شیر سا گر اس آم کو کہنا — بند کرتا ہے کوزے میں دریا
سامنے ہو اگر کوئی ہے جری — ہٹی اوجھل تنکار کیا معنی
ورنہ دیکھو گے ناک کی تمثال — کھینچی جائے گی اِک پل میں کھال

کیوں نہ ہو اس کا اک جہاں بیتا — میٹھی جھبیا سے اس کے جگ جیتا
کیوں بہی پر گریں کہا ہے سچ — جھوٹا کھاتے ہیں میٹھے کی لالچ
شیریں گفتار تھا بہت یہ انار — موتی برساتا تھا دم گفتار
دم بخود اس سے پر رہا ہی ہے وہ — گھونٹ شربت کے سے گیا پی وہ
چشم جاناں جو شہد کی ہے چھری — تو یہ ہے اک غضب کی میٹھی چھری
اسم تلخی مے مٹانا ہے۔ — نام میخانہ شہد خانہ ہے۔
اس کا رس چوس لے اگر مےنوش — کالے پانی سے پھر چڑھے میکش
زند چکھ جائے چاشنی جو ذری — سمجھے شیشے میں ہے اناری پری
چاٹ میکش کو گر لگے اس کی — پھر چھوٹے وہ نہ شیری اور وسکی
اس کو ساقی اگر زباں پہ دھرے — کالا پانی شراب کو سمجھے
گر افیمی اسے ذرا چکھے — بند ڈبیا میں بس وہ کر رکھے
اس کے چسکے کی ہیں بری ماریں — سیکڑوں کو چٹائیں دیواریں
نہیں چھٹتا جو منہ سے جائے لگ — سچ تو یہ ہے کہ ہے یہ میٹھا ٹھگ

قطعہ

ابھرا ابھرا جو اس کے منہ پر ہے — دل ہے حیران کہ اسکو کیا کہئے
نطق کے منہ پر مہر سی ہے لگی — کہئے آخر تو کیا بھلا کہئے
عقل کے ہے دہن پہ قفل پڑا — اس ادق مسئلے کو کیا کہئے
نقص تشبیہ ہے گر اس کو خال — روئے رنگین یار کا کہئے
ہے یہ اندھیر دن دہاڑے جو — چشم خورشید پر سہا کہئے
یہ بھی بھدی سی اک مثال ہے گر — مردم چشم دلربا کہئے
کاٹئے کیوں جنوں میں آ کے پہاڑ — بلبلہ جوئے شیر کا کہئے
کیوں تجسس میں جھانکئے بغلیں — دل عاشق کا آبلہ کہئے
نگ سلیمانی کی انگوٹھی کا — روئے بلقیس کا مسا کہئے
اس سے آتا ہے شان میں کیا فرق — تاج شیریں کے فرق کا ہے۔

کہیئے بندوق چشم فتاں کی — اس کو مکھی تو کیا بُرا کہیئے ہو
نافِ جسم سمنبراں لکھیئے — تکمۂ خوشنما قبا کہیئے
کچھ نہیں سوجھتا اگر در اصل — نقطۂ رنج جانفزا کہیئے
نئی تشبیہ ہے گر اسکو پھول — مہ جبینوں کی کیل کا کہیئے
کہیے کم سخن حسین کی نتھنی کا — اس کو موتی تو کیا بُرا کہیئے ہا
مہر لب کم سخن حسینوں کی — مے کی بوتل کا کاگ بجا کہیئے
تشقۂ چہرۂ بتاں لکھیئے — عقدہ اس سرنوشت کا کہیئے
جہاں شیریں لبوں پر آئی ہے — جی میں آتا ہے بر ملا کہیئے
چھوڑ کر اب یہ عقدۂ لا حل — آم کا پہلے ماجرا کہیئے

ام الذات اس کا ہے القاب — بو الحلاوت ہے اس کا ایک خطاب
دافع بلغم اور سودا ہے — قوت دل کا خوب نسخہ ہے
ہے مقوی معدہ اور جگر — ہے مصفی خون بہت یہ ثمر
اس سے تسکین رُوح پاتی ہے — اس سے روحانی منہ پر آتی ہے
رُوح مسیح اور دم کی ہے تحسین — پانی ہے اس کے آگے فاسفوڈین
ہول دل کو یہ دیتا ہے ڈھارس — نوشدارو سے بڑھ کے اسکا رس
جوہر خون اسی کا جوہر ہے — لاکھ یاقوتیوں سے بڑھ کر ہے
خالی وہمی صفات یہ کب ہیں — فائدے اس کے سب مجرب ہیں
وصف ہیں اس کے تر زبان طبیب — ہے یہ میوہ بھی کیا عجیب و غریب

اور سنیئے کہ پختہ ہو یا خام — سینکڑوں اس سے ہیں نکلتے کام
بور جب اس میں اول آتا ہے — شاخ امید میں پھل لاتا ہے
اور پھر درجک گھر کی مثال — کیری کرتی ہے اسکو مالا مال
کرتا ہے یہ ابھی سے مہمانی — ہے سخاوت میں حاتم ثانی
چٹنیاں اس کی سب بناتے ہیں — اور چٹخارے لے کے کھاتے ہیں

چٹنی وہ جو ہے ہاضمہ کی جان ۔ ترکھا جس پہ جان سے قربان
سب کہیں گر نہ ہو یہ زینت خوان ۔ پھیکا پکوان اور اونچی دکان
چٹنی ہے بس سہاگ لاون کا ۔ مادہ اس پر ہے دال سالن کا
خضر رہ اس کو کہئے تو ہے بجا ۔ بدرقہ ہے یہ سارے کھانوں کا
اس سے بے مقدرت کی اڑ گئی چلے ۔ اس کے چکھنے سے دانت آئیں نئے
اس کے آگے پڑے کوئی کیا منہ ۔ ترشرویوں کا اس نے پھیرا منہ

پھر بناتے ہیں اس سے لوگ امچور ۔ دل ہے کھٹے کا جس سے چکنا چور
دیکھ پائے اگر ہلال اسے ۔ پانی بھر لائے منہ میں شبنم سے
بند سب شکریں لب اس سے ہیں ۔ شیریں دہنوں کے دانت کھٹے ہیں
ترشرویوں پہ اس سے ہی یہ جفا ۔ کاغذی پیرہن ہے لیمو کا
ایک دن اس کا آ گیا تھا خیال ۔ سوکھ امچور ہو گیا ہے ہلال
جوگی روزی جو پنیوں پہ رکھے ۔ ایک بار اس کا گر مزا چکھے
ترشرویوں کا بندہ ہونے لاگ ۔ سمجھے کھٹ شاستر کو پھر کھٹراگ
پوچھئے مجھ سے اسکے وصف کے گنج ۔ ہیں یہ لیمو نچوڑے سارے ترنج
جو بھڑا اس سے بس وہ چوکا ہے ۔ خوب کھٹے نے کھٹا کھایا ہے
کرتا اس سے کھٹا پٹ کھٹا ۔ نہ یوں جینے سے ہوتا جی کھٹا
توڑنے اس سے توڑ خاک لیا ۔ اب تو یہ کھٹی چھاچ سے بھی گیا
باتیں سنتی ہوں کھٹی میٹھی جسے ۔ آگے آئے وہ منہ لگے اس کے
ہے یہ لذات دو جہاں کا نچوڑ ۔ منہ دیا اس نے ذائقوں کا موڑ
اس سے منہ پھر گیا ہے لیمو کا ۔ ترش رو اس سے ہو گیا چوکا
بند اس سے نشیلی آنکھ کا دم ۔ سرمہ کھائے ہوئے ہے چشم صنم
چشم فتاں نہ اس سے کیوں جھیپے ۔ اس نے اچھوں کے ہیں اتارے نشے
ہضم کرتا ہے اور لگاتا بھوک ۔ توڑ اس کا کرے کوئی ہے چوک
اس معمے سے عقل حیراں ہے ۔ باعث زیب جسم خوباں ہے

ہے غلط اعتراضِ نیم حکیم — ہے سدا اعتدال شرط عظیم
کیوں الہنا وہ دے کھٹائی کو — جو جنم کا کھٹائی کھانا ہو

اس میں پڑنے لگی ہے جب جالی — لونجی لے کر ہر ایک نے ڈالی
کیا مسالہ لگا کے وصف کروں — مدح اس کی ہے۔ مدحت بیچوں
پھر اچار اس کا ڈالتے ہیں سب — حوصلہ یوں نکالتے ہیں سب
ہیں بناتے مربّے بھی اکثر — وصف جس کا بیاں سے ہے باہر
اس کی توصیف ایک امر محال — اس کی تعریف سخت ہے اشکال
ملئے جوئے شیرا سے کہنا — ایک ملاحی گالی ہے دینا
شیرہ میں قاش یوں ہے جلوہ کناں — شیریں دہنوں کے منہ میں جیسے زباں
اس کی آب حیات امان میں ہے — اثر امرت کا مرتبان میں ہے
گر ابھی سے زبان نہ خامہ بند — ہاں ذرہ رہ تو چاق اور چوبند
ہو گیا کیا زبان میں چمرس — ہڑ بڑا اگر ذرا تو کہہ امرس
ایک اس مرس ہی پہ ہے کیا موقوف — ہے ہزاروں صفت سے یہ موصوف

واہ وا آم تیری ہے کیا بات — تیری اک ذات میں ہزار صفات
الغرض اس کا چھلکا گٹھلی تک — کام آتے ہیں خلق کے بے شک
ایک پیسے کے آم لاؤ تم — اور رس گودا آپ کھاؤ تم
پھر جو رہ جائیں گٹھلیاں چھلکے — گائے کے آگے ڈال دو سارے
گٹھلیاں اس سے بچ جو جائینگی — کونے کھدروں میں پھوٹ آئیں گے
پھر پپیہے بنائیں گے اس کے — اور خوشی سے بجائیں گے بچے
کہو پیسے میں نکلے کتنے کام — آم کے آم گٹھلیوں کے دام

اے قلم بس کر اب ٹھہر تو ذرا — واہ وا میرے شیر کیا کہنا
کیا شگفتہ کیا ہے گلشن نظم — بھر دیا موتیوں سے دامن نظم

بے نتیجہ مگر جو ہو گا سخن — کیسے مانیں گے اس کو ماہر فن
اے عزیزو اگر ذرا سوچو — ہیں نتیجہ نکال دوں تم کو
وہ نتیجہ کہ جی میں کھب جائے — دل میں کوئی اگر نہ شک لائے
فائدہ قیل و قال کرنے سے — آم کھائے کہ پیڑ ہیں گنئے
غور سے اب ذرا سنو اسکو — کہتی ہے داستان آم کی جو
ترش رو ہو کہ ہو شکر گفتار — منہ سے بچنا ہے حلق کے دشوار

اس سے لازم ہے بس یہی کیفی
اچھی ہر بات سے ہے خاموشی

دُنیا کی بے ثباتی سے سبق

(دسمبر ۱۸۹۰ء)

گلہ کرتا ہے کیا اے دوست دور آسمانی کا — ہے شکوہ سربسر بیجا ستم ہائے زمانی کا
غنیمت ہے جو دم شکر اور اطمینان میں گزرے — بھروسا کیا ہے ہمدم اس دو روزہ زندگانی کا
دغا اس زیست نے دی ہے زمانے میں نہ کس کس کو — ہے ذرہ ذرہ شاہد اس کے جوہر جانستانی کا
وہ کیوان بارگاہوں کے مکیں کیا ہو گئے یارب — لقب جن کے لئے لکھتے ہیں اب جنت مکانی کا
کہاں وہ نائب ذات خدا ہیں صاحب کشور — کہ تھا گردوں سے بالا پایہ جن کی راجدھانی کا
تھے چاروں کھونٹ میں جھنڈے گڑے جنکی حکومت کے — پڑا ڈنکا شش جہت میں تو جن کی حکمرانی کا
نشاں شاہوں کی شاہی کا ہوا مفقود عالم سے — ہے باقی نام ہی جشن جم و نوشیروانی کا
کہاں ہے وہ ظفر اختر سکندر فاتح دوراں — پڑا غل قاف سے تا قاف جس کی کامرانی کا
ہیں ساسانی کہاں اور ہیں کہاں کلدانی و شامی — پتا بتلائے کوئی پیشدادی اور کیانی کا
نشاں رومائیوں اور مصریوں کا کوئی بتلاؤ — بتاؤ غزنوی کا کچھ پتا اور سیستانی کا
نہ غوری ہیں نہ چغتائی نہ غلجی اور تغلق ہیں — نشاں ملتا ہے تو بس مقبروں میں گورگانی کا
کہاں ہیں چندربنسی اور سورج بنسی مہاراجا — کہ مہر و ماہ پر سکہ تھا جن کی حکمرانی کا

تھا جن کا جیسکر ورتی راج وہ ڈھونڈے نہیں ملتے — نہیں ملتا ہے اک پتھر بھی اب انکی نشانی کا
اگر باقی ہے تو اک ذکر ہی بس رہ گیا باقی — فلاں بیکنٹھ باسی اور فلاں عرش آشیانی کا

نہ وہ عالم نہ وہ فاضل نہ وہ شاعر ہی باقی ہیں — کہ دعویٰ تھا جنہیں اسرار حق کی راز دانی کا
کہاں علم و حقایق کے وہ ماہر اور کامل ہیں — کہ اک اک جن میں تھا غواص دریائے معانی کا
زباں تھی جن کی یا گنگا رواں تھی ایک جنت سے — سخن تھا جن کا اک چشمہ حیات جاودانی کا
نہ اب تک جن کے علم و فضل کی کچھ تھاہ ملتی ہے — کہ تھا ہر ایک ان میں اک سمندر نکتہ دانی کا
اثر جن کی زباں میں اور قلم میں جنکے جادو تھا — ثنا گر کل زمانہ جن کی ہے شیوا بیانی کا

کہاں ہیں وہ حسیں جو نونہال باغ خوبی تھے — گماں بھی تھا نہ جن تک صدمہ باد خزانی کا
صفا تھی جن کے عارض کی صفائے دل کا آئینہ — ہر اک انداز جن کا تھا کرشمہ دلستانی کا
دہن ایسے کہ جب انکی نہ پوری کچھ سکی صورت — ذرا سا رہ گیا خفت سے منہ بہزاد و مانی کا
ہلال و بدر کی کچھ حیثیت گر تھی تو بس یہ تھی — کہ وہ چربہ لڑکپن کا یہ خاکا تھا جوانی کا
عنادل جن کے منہ ہاں لبوں سے تاچہچہہ سیکھیں — سبق لے طوطئے باغ ارم شکر فشانی کا
کلام روح پرور تھا کہ امرت رس کی جھالیں تھیں — ثبوت اعجاز عیسیٰ کا کرشمہ خوش بیانی کا
وہ دلداری کی جاں تھے بوالہوس گو انکو کہتے تھے — گلی میں انکی ہے چھڑکاؤ تلواروں کے پانی کا
نہ تھا نفسانیت کا دخل کچھ بھی عشق میں جن کے — تھا نور حسن جن کا لمعہ شمع لامکانی کا
شہود پاک کا منظر وجود خوب تھا جن کا — لقب شایاں ہے جن کے واسطے جان جہانی کا
عزیزو دہاں بتاؤ تو کہاں وہ پیاری شکلیں ہیں — مگر وہ بلبلہ تھیں ایک اس دریائے فانی کا

کہیں مرگ طبیعی ہے کہیں ہے مرگ اسبابی — کہیں فتویٰ اطبا سے ہے مرگ ناگہانی کا
غرض پاؤ گے اک طاقت محیط وحاوئے عالم — نہیں جو عذر سنتی بیمثالی نوجوانی کا
جو بنتی ہے وہ اک دن مٹنے والی ہے کوئی شے ہو — یہ سچ ہے قول حادث ہے مرادف لفظ فانی کا
خموشی ہے ابھی محزوں نہ پانی ڈال جوشوں پر — مقام پند ہے یہ بات ہے موقع نوحہ خوانی کا
مگر کہتے ہیں آدھی بات کو ذی فہم لایعنی — نتیجہ چاہئیے کچھ تو اس آشفتہ بیانی کا

ہنیں معقول اس تمہید سے یہ اخذ کر لینا — کہ بس ہے اک یہی سادہ نتیجہ اس کہانی کا
کریں کس کے لئے ہم کام اور کس واسطے کوشش — بھروسا ہی نہیں جب کچھ ہماری زندگانی کا
نہیں اے دوستو یہ اک غلط فہمی غضب کی ہے — مناسب دور کرنا دل سے ہے اس بدگمانی کا
تمہارا جب یقیں ہے زندگی کو ہے فنا آخر — نکوکاری نہ کیوں مقصود ہو اس زندگانی کا
کرو وہ کام فیض عام کے ہو نام دنیا میں — اگر ارماں ہے تم کو حیات جاودانی کا
زمیں کی طرح دو ہر دل شکن کو گنج بدلے میں — کلوخ انداز کو پھل دو شجر ساں خوں فشانی کا
دکھاؤ کیوں کسی کا دل کرو کیوں بات تم ایسی — اثر پیدا کرے سامع پہ جو اک سرگرانی کا
جراحت تیغ براں کی تو اکثر بھر بھی جاتی ہے — نہیں بھرتا ہے لیکن گھاؤ ہرگز بدزبانی کا
نہیں موقوف ہے نیکی اکیلی اس زباں پر ہی — زباں ہو ساتھ دل کے تب مزا ہے نیک بانی کا
ہے جینا چار دن تو پھر یہ کیوں بغض و حسد رنجش — ہے کے دن کے لئے یہ حوصلہ ایذا رسانی کا
تعصب کس سے ؟ نفرت کیسی ؟ جب کہ حشر ہونا ہے — ہر اک فرد خلائق کا ہر اک قاضی و دانی کا

خوشی اور صاف دل سے آؤ ہم اسکو بسر کردیں
بقیہ ہے جو کچھ اس چند روزہ زندگانی کا

نالۂ عندلیب

سنہ ۱۸۸۱ء

ہوا کیسی چلی یہ یا الٰہی ! — کہ باغ ہند پر آئی تباہی
تنزل کی گھٹا چھائی ہوئی ہے — جہالت کی ہوا لہرا رہی ہے
خزاں کا ہے سماں ہر اک چمن میں — گل و بلبل ہیں سب رنج و محن میں
ہے رنگت باغ میں پھولوں کی پھیکی — شگفتہ یاں نہیں صورت کسی کی
سروں پر چھائے ہیں غفلت کے بادل — گھٹا ٹوپ آئے ہیں غفلت کے بادل
مصیبت کی گھٹا چھائی ہے گھنگھور — فلاکت کی گرج کا ہے یہاں شور
شگفتہ گل جو کوئی فی المثل ہے — تو داغ گلشن دل کا بدل ہے

عوض خوشبو کے خاک اُڑتی ہے یاں پر | نسیموں کی جگہ چلتی ہے صرصر
ہوا بادِ بہاری کی ہے اُکھڑی | ہوئی بن سے بتر حالت چمن کی
پتا مالی کا ہے نہ باغباں کا | بس اب اللہ بیلی ہے یہاں کا
نہال باغ بے برگ و نوا ہیں | جوانانِ چمن بے دست و پا ہیں
نہ سمجھو برگ گل پر شبنم افسوس | پڑی ہے حسن پر گلشن کے یہ اوس
ہوا اب ہو گئی رد نق وہ ساری | خزاں کی جب سے آئی ہے سواری
کھڑا ہے بس اسی حیرت میں شمشاد | کہ کیوں یہ ہو گیا گلزار برباد
یہی سکتہ ہے سرو بوستاں کو | کہ لو کا لگ گیا کیا گلستاں کو
بجا ہے شکوۂ قمری کی فغاں ہے | بہار باغ پہلی سی کہاں ہے
اسی غم میں ہوا داماں گل چاک | اڑاتی ہیں اسی سے بلبلیں خاک
اسی سے لالہ کو داغ الم ہے | اسی سے آنکھ فوارے کی نم ہے
اسی سے غنچہ دلبستہ سدا ہے | اسی سے چاک دامن گل ہوا ہے
ہوا سنبل کو پیچ و تاب اسی سے | ہوا بلبل کا دل بیتاب اسی سے
ہے نرگس دیکھ کر یہ حال حیراں | ہے پیچ و تاب کھاتا عشق پیچاں
ہے سوسن دم بخود یہ دیکھ کر حال | ہے گم صم تبادہ والوں کی تمثال
رواں ہے نہر مثل چشم پُر نم | اٹھی ہے لہر جیسے آہ ماتم
بتاتے سبزہ کو بیگانہ ہیں گو | مگر گلشن کا ہے کچھ درد اسی کو
کہ جب یہ گت چمن کی دیکھتا ہے | زمیں پر فرط غم سے لوٹتا ہے
نہ کیونکر جوش سیل چھاتی پہ دھرتا | مثل سچ ہے کہ مرتا کیا نہ کرتا
نہ سمجھو شبنم اس کو اے عزیزو | یہ رونا تم پہ آتا ہے فلک کو
ہوئی اب آہ یہ حالت تمہاری! | بس اب یہ ہو گئی ہے گت تمہاری

ہر اک سو جہل کا طوفاں بپا ہے
جو ہے وہ اپنی دھن میں مبتلا ہے

تہنیت کامیابی

۱۸۸۷ء

بابو مدن گوپال ایم۔ اے وکیل ہائیکورٹ۔ دہلی سے بیرسٹری کے لئے ولایت تشریف لیگئے (آنریبل رائے بہادر بیرسٹر ایٹ لاء فیلو پنجاب یونیورسٹی وغیرہ)

ان دنوں اس قانونی تعلیم کے سلسلہ میں ایک امتحان مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ جسے "رومن لا" کی سٹوڈنٹشپ کہتے تھے۔ جو اس میں اول رہتا۔ اسے کئی سو پونڈ کا انعام ملتا تھا۔ بابو مدن گوپال اس امتحان میں سب سے اول آئے۔ اور انعام وامتیاز پایا۔ آپ اول ہندوستانی تھے۔ جسے یہ اعزاز حاصل ہوا۔ آپ لالہ سری رام ایم۔ اے مرحوم مشہور مولف تذکرہ "خمخانۂ جاوید" کے والد تھے یہ نظم جو دہلی کے ایک تہنیتی جلسے میں پڑھی گئی۔ کیفی صاحب اور لالہ سری رام کی ملاقات کی ابتدا کا باعث ہوئی۔

نوٹ:۔ اس نظم میں مصرعوں کی ترتیب انگریزی طرز پہ رکھی گئی ہے یعنی چار چار مصرعوں کا ایک ایک بند ہے جس میں صرف دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہے۔ ایسی نظموں میں کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ پہلا اور تیسرا مصرعہ ہم قافیہ ہو۔ اور دوسرا اور چوتھا مصرع جداگانہ ہم قافیہ ہو۔ جیسے کہ اسی مجموعے میں اگلی نظم ہے۔ آج کل اس قسم کی نظمیں قطعہ کے طور پر لکھی جاتی ہیں۔ یہ اولین نظم ہے جو اس انگریزی طرز پر کہی گئی ہے

مبارک تجھے ہند یہ روز فرخ
کہ تیرے خرابات ویراں کے اندر
ہوئے ہیں وہ شہوار گنجینے ثابت
ہیں محروم جن سے شہ ہفت کشور

ترے گلستاں کی خزاں میں بھی اے ہند
نہفتہ ہیں لاکھوں ربیع و بہاراں
جوانی کی ہے آن پیری میں تیری
گدائی میں تیری امارت کی ہے شان

الجھنے میں ہیں تیرے سلجھاؤ لاکھوں
بناؤ اک بگڑنے میں تیرے غضب ہے
جوانی کے انداز پیری میں تیری
ادا دلربائی کی تیری عجب ہے

تری سادگی میں بھی اک بانکپن ہے
ترے بھولے پن میں بھی تو اک ادا ہے
الوکھی ہے خو نا زیبا نہ تجھ میں
بگڑنے میں بننے سے بڑھ کر مزا ہے

تو گویا ہے اس چھوٹے گلبن کی صورت
کہ مرجھا چکی ہو جسے بادِ صرصر
مگر ان پھٹے حالوں بھی ہو وہ نکہت
کہ کر دے دماغ اک جہاں کا معطّر

وہ تلوار ہے تو جسے مورچے نے
کیا عارضِ شاہدانِ جواں سا
مگر اب بھی وہ آبداری ہے تجھ میں
کہ ہو تیغ ابرو کا رنگ اس سے پھیکا

وہ عنبر ہے تو جو کہ جل بھن کے سارا
زمانے کو خوشبو سے کر دے معطّر
اسی طرح سوز دروں سے بھڑک کے
کیا تو نے اے ہند عالم منوّر

مگر تیری خاکستر اب بھی جو چھانیں
ملیں لاکھوں دُرِّ یتیم اس میں پنہاں
جو ہو چشم بینا تو مٹی میں تیری
ملیں سینکڑوں اب بھی لعل درخشاں

ذرا سُوئے غرب آنکھ اٹھا کر تو دیکھو
کہ کیسا چمکتا ہے مشرق کا سُورج
یہ وہ مہر ہے جس سے عالم ہے روشن
نہیں دیکھا ہوگا کبھی ایسا سُورج

یہ ہے وہ ہی ذرہ جو چمکا ہے آ ہند
اسی ٹھنڈی دھونی سے تیری نکل کر
یہ ہے وہ شرار نہفتہ کہ جس نے
کیا نُور سے اپنے عالم منوّر

وہ فخر وطن ایم۔ گوپال صاحب
جو تحصیل علمی کو لندن گئے تھے
رہے امتحاں سٹوڈنٹ شپ میں
کُل امیدواروں سے اول وہاں کے

رہا دیکھ کر دنگ کُل یورپ اسکو
ملی سیکڑوں سے اسے عزّ سبقت
مُبارک! مبارک ہو یہ کامیابی
جزاک اللہ یہ قابلیت۔ ذہانت

تری کامیابی نے ثابت کیا ہے
کہ جیسا کُل اہل خرد پر عیاں ہے
ابھی تک ہیں اس راکھ میں بھی شرر کچھ
ہنوز آتش کشتہ میں کچھ دھواں ہے

رکھا تو نے نام انڈیا کا جہاں میں
خدا تجھ کو باکام و دلشاد رکھے
کئے ایسے ایسے مہا پرش پیدا
خدا ہند کو شاد و آباد رکھے

ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی پر

سنہ ۱۸۸۷ء

جُگ گزرے ہیں مینہ کو برستے
لاکھوں بار آئی ہیں گھٹائیں
فن ہوئے کلیوں کو بکستے
اور چلتے جاں بخش ہوائیں

کب اودی نہ گھٹائیں آئیں
کب نہ چلی ہے بادِ بہاری
کب نہ دلوں پر خوشیاں چھائیں
کھل گئی کب نہ دلوں کی کیاری

شبنم نے کس دن نہ کیا ہے
کاسۂ گل کو سیپ سے برتر
عشق نے کس دن نہیں دیا ہے
چہرۂ عاشق کو رنگ زر

نرگس نے آنکھیں چمکا کر
کب نہ کیا تسخیر دلوں کو
بلبل نے راگ اپنا سنا کر
کب نہ کیا آشفتہ گلوں کو

سرو لب جو صحن چمن میں
جیسے ہو کوئی ہد مست مے
دھیان کسی کا باندھے من میں
کب نہ پے تعظیم کھڑا ہے

کیف ہے پر زور مے نے کس دن
رندوں کو کیفی نہ بنایا
نے مطرب کے شور نے کس دن
نغمۂ روح افزا نہ سنایا

یہ سب کچھ تو ہم نے مانا
اب سے پہلے کیا نہ ہوا ہے
وہی نیچر ہے وہی زمانا
وہی گلستاں وہی ہوا ہے

آج مگر ہر شے میں نئی جاں
آن انوکھی۔ نئی ادا ہے
ہے ہر بات میں ایک نئی شاں
ہر شے میں اک تازہ مزا ہے

پھول وہی۔ پر بو ہے نئی کچھ
مے ہے وہی پر اور نشا ہے
چرخ وہی پر خو ہے نئی کچھ
اب وہ ستم ہے اور نہ جفا ہے

جو چیز آج نظر آتی ہے
بخشتی ہے صد گونہ مسرت
سب کے دلوں میں کھب جاتی ہے
جس سے نہ تھی پہلے کچھ رغبت

کیوں نہ ہر انساں کو ہو فرحت
جشن مبارک جوبلی کا ہے
جس کی ہے آج آفاق میں شہرت
چرخ پہ غل جس کا پہنچا ہے

اور دنوں سے ہے یہ بڑا دن
نوروز اور عید اس پہ فدا ہے
سنتے تو سب آئے تھے بڑا دن
پر یہ خوشی میں سب سے بڑا ہے

یاد ہیں تم کو جشن جہانگیر
بھولے نہ ہو گے بھوج کے جلسے
جشن جم و دربار سکندر
جشن ہیں سب اس جشن سے پھیکے

جشن فریدوں رو برو اس کے
بھرتا ہے ایک مجلس ماتم
اکبری و مہتابی جلسے
اس کے آگے پڑ گئے مدہم

یہ ہے وہ دن جس نے سنایا
ہند کو اک نغمۂ جاں افزا
دل سے رنج و غم کو بھلایا
اور دیا آنند سندیسا

یعنی ہماری رائل مادر
فخر شہاں ملکہ مہارانی
آدھی صدی سے باکرّ و فر
کرتی ہے عدل و حکومت رانی

جبن سے ہے یہ مدّت گزری
اس لئے ہیں یہ ساری خوشیاں
دیکھ کے ان برسوں کی ترقی
چشم حقیقت رہ گئی حیراں

عہد میں اُس کے ہندستاں نے
آرام اور چین ایسے پائے
دیکھے نہ ہوں جو سارے جہاں نے
خواب ملایک میں بھی نہ آئے

نہریں کردیں ملک میں جاری
تاکہ نہ مینہہ جب وقت پہ برسے
سیچیں ان سے کھیت کی کیاری
خلق خدا دانہ کو نہ ترسے

علم نہ کیا کیا ہم کو سکھائے
ترغیب اور وظیفے دے کر
اسکول اور کالج بنوائے
سکھّر تک بنگال سے لے کر

ڈاک میں کی کیسی آسانی
اور اخباروں کی آزادی
فرمائی ہم پر ارزانی
جس پہ فدا ہے کل آبادی

تار نے عِلم میں غلغلِ شاہی
سارے جہاں کے کان میں ڈالا
تھی جانوں کی جن میں تباہی
ریل نے ان رستوں سے نکالا

جتنے ہیں احسان ذات خدا کے
دُنیا میں انسان کے اوپر
ہیں احسان اور لطف تمہارے
اتنے ہی ہندستان کے اوپر

کوشش لاطائل ہے گننا
ہم پہ جو ہیں احسان تمہارے
بس اب ہے یہی عوض ان کا
ہند وفاداری سے نہ ہارے

آؤ ہم سب یار اور ہمدم
خیر منائیں اس ماتا کی
اور دعا مانگیں یہی ہر دم
جے ہو مہارانی ملکہ کی!

مثنوی خیر مقدم بابو روشن لعل

لالہ روشن لال بی۔ اے بیرسٹر ایٹ لا۔ لاہور شمالی مغربی ہند کے اولین کایستھ تھے۔ جو ولایت سے تحصیل علم کر کے واپس آئے۔ برادری کی طرف سے مخالفت کا اندیشہ تھا۔ اس لئے بجائے الہ آباد کے جو ان کا گھر تھا۔ وہ دہلی میں بلائے گئے۔ جہاں انکے خیر مقدم میں بعض اہل ہنود کا ایک جلسہ ۱۰ جولائی ۱۸۸۶ء کو منعقد ہوا۔ بعد میں کھانا ہوا۔ حضرت کیفی اس تقریب میں شریک تھے۔ وہیں یہ نظم پڑھی گئی۔ لالہ صاحب نے لنڈن میں ایک آریہ سماج قایم کیا تھا جس کے آپ صدر تھے۔ اس کا ذکر بھی اس نظم میں کیا ہے۔ افسوس کہ ۲۴ ستمبر ۱۹۳۲ء کو روشن لال صاحب جنت کو سدھارے ۔

کب اڑائے گئی دل کو نہ ہوا ساون کی
غم بہا لے گئی کس دن نہ گھٹا ساون کی

کب سماں عیش و مسرت کا نہ چھایا دل میں
کب خیال مے و مطرب نہ سمایا دل میں

کب نہ گلشن میں طرب خیز ہوائیں آئیں
جھومتی کب نہ گلستاں میں گھٹائیں آئیں

کب دھواں دھار فلک پہ نہیں چھائے بادل
کب نہ اڈے دل خلقت پہ مسرت کے دل

چنچھ گئیں کب نہ پپیہے کی پکاریں دل میں
کھب گئیں کب نہ گلستاں کی بہاریں دل میں

آج لیکن وہ مسرت کا سماں چھایا ہے
شجر عیش و طرب میں وہ ثمر آیا ہے۔

دیدۂ چرخ نے جسکو نہ کبھی دیکھا ہو
فلک پیر نے جسکو نہ کبھی چکھا ہو

جو صبا غنچوں کو ہر روز کھلا دیتی تھی
جو گھٹا مردہ نہالوں کو جلا دیتی تھی

آج پژمردہ کلی دل کی کھلا دیتی ہے
مردہ ارمانوں کو انساں کے جلا دیتی ہے

بندھ گئی بادِ بہاری کی ہوا گلشن میں
کیوں نہ گھوڑوں پہ ہوا کے ہو صبا گلشن میں

اور ہی رنگ پہ ہے آج یہ باغ عالم
بلبلیں نغموں کی جا گاتی ہیں "ولکم۔ ولکم"

آج اس بزم میں چمکیگا وہ لعل روشن
تاب سے جسکی ہوئے ماند بدخشان و یمن

علم کی کان کا ہم از رجہاں روشن لعل
ہمہ تن فضل و کمالات کی جاں روشن لعل

تیری خوش گوئی کا شہرہ تو ہے دنیا بھر میں
کیوں نہ ہو دھوم لیاقت کی تری گھر گھر میں

آپ اس فرقۂ معروف کے ہیں اک ممبر
آپ اس معدنِ پُرنور کے ہیں اک جوہر

ملک میں آج مسلّم ہے شرافت جس کی
اور مشہور خداداد ہے لیاقت جس کی

اولیں ہیں یہ اسی قوم کے فردِ کامل
علم و فضل آئے ہیں یورپ سے جو کرکے حاصل

جا کے انگلینڈ میں تحصیل کیا علم و کمال
تاکہ ہو فیض سے اس کے وطنِ پاک نہال

کاٹ کر تین برس محنت و جانکاہی سے
پائی بیرسٹری اب بارگہ شاہی سے

کام مشکل جو تھا آسان بنایا اس لئے
قوم کو شارعِ تہذیب دکھایا اس لئے

آسکے پیر و جواں پہ یہ کیا اس نے عیاں
اس طرح رکھتے ہیں پردیس میں قائم ایماں

دھرم رکشا کے لئے جتنی اٹھائی دقت
سب سے بڑھکر ہے یہی قابلِ قدر و وقعت

آج ہم ہندوؤں کو جتنی خوشی ہو کم ہے
آریہ مت کے محل کا یہ بڑا اک تھم ہے

پہلا ہی شخص یہ پیدا ہوا بھارت بھر میں
جس نے چمکایا ہے دھرم اپنا پرائے گھر میں

کام جو اس نے کیا ہے وہ کسی سے نہ ہوا
کسی ست جگ کے رشی اور منی سے نہ ہوا

شمع دیں گھر کے ہی گھر میں جو جلا کرتی تھی
اس نے اب اس کی چمک غرب تلک پہنچا دی

ملحد اس نے کئے کتنے ہی خدا کے پابند
وید کے دھرم کا جھنڈا کیا لندن میں بلند

جتنی ہم قدر کریں اسکی وہ کم ہے بے شک
شکر محسن کا سدا فرض اہم ہے بے شک

جو سلوک اس سے عزیزوں نے کیا لازم تھا
تھا یہی وید میں اور شاستروں میں لکھا

تم پہ افسوس ہے اے آریہ ورتی لوگو!
اگر ان پاک اصولوں کو دلوں سے دھو دو

کہو ممنوع ہے کس دین میں تحقیل علوم
ناروا کون سے مذہب میں ہے تکمیل علوم

علم وہ شے ہے کہ شدروں کو برہمن کر دے
ناروا اور بیاس کے کیا بھول گئے تم قصے

فضل سے اس کے ہی چنڈال رشی ہوتے ہیں
فیض سے اس کے ملیچھ لوگ منی ہوتے ہیں

اس میں جو عذر کرے ہے وہی کافر بیشک
حد سے ہی شاستر اور وید کی باہر بیشک

آریہ قوم کے۔ لازم ہے جو ہیں پیر و جواں
ان کو سر آنکھوں پہ بٹھلائیں جو آئے ہیں یہاں

قوم کا اپنی انہیں عاشق شیدا سمجھیں
اپنے بھارت کی انہیں آنکھ کا تارا سمجھیں

ملک کا اپنے انہیں مایۂ اعزاز کہیں
مفخر قومی و سرمایۂ صد ناز کہیں

خیر البیوں کی تہ دل سے سدا مانگو تم
اور ایشر سے ہمیشہ یہ دعا مانگو تم

نکلیں اس قوم کے معدن سے جواہر ایسے
اور ستارے ہوں شب تار میں ظاہر ایسے

پھر وطن میں کئی بیاس اور کپل ہوں تو سہی
عمل اور علم میں اسپنسر و مل ہوں تو سہی

مثنوی آئینہ ہند

سنہ ۱۸۹۰ء

سنہ ۱۸۸۹ء ۱۸۹۰ء میں حضرت کیفی ایک ہفتہ وار اخبار خیر اندیش کے اڈیٹر تھے۔ یہ اخبار لالہ مرلی دھر مرحوم نے انبالہ سے نکالا تھا۔ لالہ صاحب پنجاب میں حریت کے اوّل علمبردار اور سیاسی جد و جہد کے باوا آدم سمجھے جاتے ہیں۔ اسی زمانے میں یہ مثنوی جو کچھ برس پہلے کی تصنیف تھی شائع ہوئی۔ چونکہ یہ مثنوی اب قریباً نایاب ہے۔ اس لئے یہاں اس کی مکمل نقل فایدے سے خالی نہ ہوگی۔ اس کے مندرجات ہمارے قومی ارتقا کے تسلسل میں ایک اہم کڑی کو پیش کرتے ہیں۔ اس زمانے کے ماحول اور عوارض کو سامنے رکھ کر نوجوان مصلح اور بہی خواہ قوم کے حسن تخیل اور حب وطن کی داد دیجئے۔

دیباچہ :- اس وقت ہمارا کام ملک میں وہ خیالات پیدا کرنا - اور ان طریقوں کا بتانا ہے جن کی بدولت قومیں ترقی اور تہذیب کے معراج پر پہونچی ہیں اور اس کام کے لئے ہمارے ملک کے واسطے نظم کی کل قدرتی طور پر نہایت درجہ کارآمد اور مفید ہے اسی وجہ سے اس مختصر سی نظم کی اشاعت کا ارادہ کیا گیا - وہ بزرگوار جنہوں نے قوم کو کم و بیش غفلت کی ایسی بھاری نیند سے جگایا ہے ممکن ہے کہ بعض کے خیال میں اپنے کیریکٹر (پبلک زندگی) کے خاص خاص نظارہ دل کے اثر سے اس خطاب کے مستحق نہ ٹھہر سکیں جو راقم نے تجویز کیا ہے لیکن ذرا سی غور کے بعد ثابت ہو جائیگا - کہ جہاں تک ہمارے نفس مطلب کا تعلق ہے انکی خدمات خواہ اور امور کے لحاظ سے کسی کی رائے میں کیسا ہی منافی اثر پھیلانے والی اور آپس میں ایک دوسرے سے تمیز پیدا کرنیوالی کیوں نہ ہوں بہر حال قدر کے قابل ہیں -

امبالہ دفتر اخبار خیر اندیش قومی تریبیہ

اے بگڑی کے بنانے والے — مشکل میں کام آنے والے
تو ہے خالق جن و بشر کا — مالک پاتال اور امبر کا
جل اور تھل میں تو ہی تو ہے — پھول اور پھل میں تو ہی تو ہے
عرش پہ ہیں گو تجھ کو بتاتے — ڈھونڈنے والے ہیں پاتے
نور ترا ہر جا پر گھٹ ہے — چمکارا تیرا گھٹ گھٹ ہے
تو ہے ہمیں میں ہم نے یہ مانا — اسکو ملا - پر - جس نے جانا
دل سے جو ڈھونڈیں تیرا ڈیرا — تو پھر کیا گھر دور ہے تیرا
جس پہ نگاہ مہر نہ ہوئے — رحمت میں اس کی ناؤ ڈبوئے
جس دم کرپا کی ٹھہرائے — تو چکی پر گھاس اگائے
شکر ہو کیا نعمت کا تیری — کس نے ہوا مٹھی میں پکڑی
قہر کا تیرے شکوہ کرنا — پاؤں ہے حد سے آگے دھرنا
جب دنیا کاٹے کھاتی ہے — اور بس موت پسند آتی ہے
نام ترا یاد آتا ہے اکثر — اور تسکین دے جاتا ہے اکثر
نام ہے تیرا دل کا اجالا — دل کی ہے آگ بجھانے والا
گو آنی جانی دنیا میں ہو — اس جھوٹی فانی دنیا میں
اپنے بہت جینے ہیں بچارے — جن سے ہیں اچھے حال ہمارے
شب کو بہت ہیں بھوکے سوتے — صبح بہت اٹھتے ہیں روتے

بن ماں کے بچوں کا بلکنا — اور کھانے پانی کو سسکنا
ہجر میں وہ عاشق کا رونا — غم میں کسی کے جان کو کھونا
چاہِ ذقن کا یاد آجانا — اور وحشت کا کنویں جھکانا
یاد آنی کوئی زلف معنبر — سانپ سا لہرانا چھاتی پر
فیل شدہ طلبا کی حالت — اور وہ مایوسی کی صورت
بے تاثیری وہ لکچر کی — اور نومیدی اسپیکر کی
ناداں بچی معصوموں کا — جن کو نہ تھا کچھ ہوش ذرا سا
جن کو نہ شادی کی تھی ضرورت — جن کو نہ منگنی کی تھی چاہت
چاؤ اور چونپ الگ تھے جن سے — جن کے لئے حالی ہیں بلکتے
ماؤں سے جو منہ دھلواتی ہیں — رو رو مانگ کے جو کھاتی تھیں
ہوش جنہیں تھا رات نہ دن کا — گڑیوں کا سا بیاہ تھا جن کا
دو دو دن جو رہ کے سہاگن — جنم جنم کو ہوئیں برہگن
اس غم سے جب واقف ہونا — اور وہ آٹھ آٹھ آنسو رونا
ایسے جہاں میں اور بھی غم ہیں — جن سے بہت جانوں پہ ستم ہیں
ایسے بہت سے شعلے بھڑکے — ہو گئے جن سے لاکھوں ٹھنڈے
جو ہے پر آفت قوم پہ اپنی — کھوئی ہے جس نے آدر اپنی
جس سے ہوئی ہے ملک کی درگت — چھپتی ہے جس سے خود غیرت
بڑھ کر اس سے مصیبت کیا ہے — نام قیامت کا تو سنا ہے

ملک پہ کیا یہ بپتا آئی — قوم نے کیوں پت اپنی گنوائی
ملک اور دولت سب کھو بیٹھے — آبرو کو بھی تو رو بیٹھے
باپ کی کشتی کہتے ہیں اکثر — ڈوبا کرتی ہے بالکل بھر کر
آج وہی حالت ہوئی ان کی — ویسی اب صورت ہوئی ان کی
ہیں وہی یہ اللہ کے بندے — جن کے گڑے تھے کل یاں جھنڈے
علم شجاعت اور تقیا — کان بندھا بندھا تھا ان کا

شور تھا ان کا ہندستاں میں | شہرہ تھا ان کا سارے جہاں میں
دھوم تھی ان کی انگلستاں تک | دھاک تھی ان کی یاں سے واں تک
جب تلوار اٹھاتے تھے یہ | تو لاکھوں کو گراتے تھے یہ
حال تھا یہ ہی علم و فن کا | یعنی کوئی نہیں تھا ایسا
جس میں نہ ہو انہیں قدرت حاصل | تھے ہر فن کے پورے کامل
دنیا میں یہ علم ہیں جتنے | سب ایجاد کئے تھے انکے
علم دیا یونان کو انہوں نے | فلسفہ انگلستاں کو انہوں نے
چین بھی ان کا خوشہ چیں تھا | مصر ایران شاگرد تھا ان کا
اب بھی وہی تم ہو شرماؤ | نام کو بھی مت لاج لگاؤ
اپنے پچھلے حال کو دیکھو | پھر اس اضمحلال کو دیکھو
کایا پلٹ آخر یہ ہوئی کیا | تم پہ ہوا کیا قہر خدا کا
اپنی اور پرکھوں کی کمائی | سب اک پل میں تم نے گنوائی
ملک دیا اور دولت کھوئی | سوکھے میں لٹیا تم نے ڈبوئی
تم کو نہ اتنی بھی شرم آئی | نام دھرے گی ساری خدائی
تم کو نہ اتنا بھی دھیان آیا | کیا کھوئیگا اپنا پرایا
"توکل" بنے کہلائے کالے | جانوں کے بھی پڑ گئے لالے
ہندو ہیں کہ مسلماں ہیں ہم | ہر حالت میں پریشاں ہیں ہم
مال نہ دولت جاہ نہ حشمت | زور نہ طاقت۔ علم نہ ہمت
بارہ مہینے عشرہ ہے یاں | یاں سے کبھی جاتا نہیں رمضاں
دیکھتا ہے جو اپنی حالت | کہہ اٹھتا ہے وائے مصیبت
ہے ہے کیونکہ یقین آجائے | کیونکہ سماں وہ یاد نہ آئے
وہ گلشن جو رشک جناں تھا | مالی جس کا خود رضواں تھا
صرصر کا تھا نہ دھڑکا جسمیں | اور خزاں کا کھٹکا جس میں
پھولی پھلی تھی جس کی کیاری | جس پہ تھی قرباں باد بہاری
پھول تھے سب بے خارہ جہاں کے | لاتے تھے ہیکل جس بستاں کے

پھل جس کے سب امرت پھل تھے / طوبیٰ اسے تھے پودے جس کے
حوض تھے جس کے امرت ساگر / اور نہریں تھیں غیرت کوثر
اب ویراں ہے وُہ ہی گلشن / وقف خزاں ہے وہ ہی گلشن
ہے وہی باغ اب بن سے بدتر / بن تو کیا مدفن سے بد تر
ہو گئی وہ ساری رونق اُف / ہائے تاسف! ہائے تاسف
اب باقی ہیں جو کچھ گلشن میں / تو وہ ہیں دو ایک پھوٹ کی بیلیں
بس اس پھوٹ نے تم کو کھویا / وہم تعصب جھوٹ نے کھویا
اب بھی یقیں ہے پیشانی میں / ڈوب مرو چلو پانی میں
علم سے ہے اب نفرت تم کو / جہل سے ہے اب الفت تم کو
کچیاتے ہو تم سختی سے / کتراتے ہو تم تنگی سے
محنت سے جی اکتاتا ہے / کام سے اب دل گھبراتا ہے
ان میں ہے حاصل جنکو ثروت / ان کی نکھد ہے سب سے حالت
علم سے بے بہرہ ہیں بالکل / ہیں بے رنگ اور بے بو کے گل
عیاشی ہے شان امیری / اوباشی ہے شان امیری
گانجے کی عادت ہے کسی کو / اور چنڈو کی دھن ہے کسی کو
دیں سے نہ مطلب ہے دنیا سے / گویا الگ ہیں مُلک خدا کے
جھنڈے تلے کے شہدے ہیں جتنے / وہ سارے دمساز ہیں ان کے
کٹتی ہے یوں ہی اوقات انکی / ننگ خلائق ہے ذات ان کی
ہندو ہیں تو ملیچھ سے بڑھکر / مسلم ہیں تو مرتد کافر
اور مذکور ہے کیا غربا کا / ہے افلاس ایک ان کا بہانا
لوگ ہیں جو اوسط درجہ کے / کیا کی جائے امید ان سے
نفس کے وہ مزدور ہیں اپنے / بندے ہیں وہ اپنے شکم کے
پبلک کی کیخدمت وہ کرینگے / یا کنبہ کا پیٹ بھریں گے
جن کو ہے ہمت بے طاقت ہیں / جن کو ہے طاقت بے ہمت ہیں
پھر جو ترقی ہو تو کیونکر / حالت اچھی ہو۔ تو کیونکر

کیا گھنگھور گھٹائیں آئیں — کیسی مست ہوائیں آئیں
دھواں دھار چھائے ہیں بادل — امنڈ گھمنڈ آئے کیا بادل
رعد نے عالم کو چونکایا — برق نے دنیا کو چمکایا
مرغ سحر سارے چہکارے — ککڑ بیگ الصبح پکارے
قبروں تک کے سوتے جاگے — پر نہ اٹھے ہندی متوالے
جڑتی ہیں پٹپیں کیا کیا ہوائیں — ان کو قسم جو سر بھی ہلائیں
چھائی ہے جب سے جہل کی بدلی — تم نے تو کروٹ بھی نہیں بدلی
ایسے بنے کیا نیند کے ماتے — سو گئی قسمت تم کو جگاتے
سبح سے اٹھو آنکھیں کھولو — آب علم سے منہ کو دھولو
دیکھو رنگ زمانہ کیا ہے۔ — کس رخ کی اب چلتی ہوا ہے
کیا ہے سما اور رنگ ہے کیسا — یعنی جہاں کا ڈھنگ ہے کیسا
بہتری اب اپنی ہے اسی میں — اور ترقی اب ہے اسی میں
جس میں جو بات اچھی دیکھو — جس فرقہ میں ترقی دیکھو
عقل کی جو باتیں ہوں موافق — علم سے جو چیزیں ہوں مطابق
اس پہ کرو بے کھٹکے عمل تم — پھل اس کا پالو گے کل تم
دل میں تعصب کا نہ گزر ہو — بس نفس مطلب پہ نظر ہو
علم ادب۔ سائنس لٹریچر — منطق فلسفہ۔ ایگری کلچر
صنعت حرفت اور پالیٹیکس — فن تجارت۔ اور میتھمیٹکس
عقلی مسائل اسپنسر کے — علمی مقولے وہ کیپلر کے
مل کی وہ معقول دلائل — ریڈ کے فلسفیانہ مسائل
کینٹ کی نادر عقلی باتیں — ہکسلی کی وہ علمی باتیں
شیکسپیئر کی سحر بیانی — اور ملٹن کی دُر افشانی
اعلےٰ خیالی وہ بیکن کی — اور فکر عالی نیوٹن کی
ان سب کو دل سے سیکھو تم — دسترس کامل کر لو تم
تعلیم اعلےٰ وہ یہی ہے — ملک میں جسکی بڑی کمی ہے

درِ امید کی کنجی ہے یہ
اُجڑے گھر کی بستی ہے یہ

ہے یہ اندھیرے گھر کا اُجالا
جینا ہے تم کو بھی پالا

ریل - جہاز اور تار برقی
ہے سب کچھ برکت سے اسکی

حکمت علم اور فن یہ سارے
گو فرزند اک دن تھے تمہارے

تم نے ہی خلق کیا تھا ان کو
تم نے پالا پوسا ان کو

پر نہ بڑے ہونے پائے تھے
گھٹنوں کچھ کچھ چلنے لگے تھے

تم نے کی غفلت انکی طرف سے
تم نے نہ تاڑے تیور ان کے

قہر خدا نازل ہوا تم پر
کوپ ہوا ایشر کا تم پر

لے گئے غیر انہیں آنکھ بچا کر
رہ گئے تم بس خاک اڑا کر

القصہ دورِ زماں نے
ان کو بھلایا دل سے تمہارے

اب جو ہوا باکام زمانہ
ان کا تمہارے گھر ہوا آنا

پرہے یہ دور کئی زمانا
تم نے نہیں ان کو پہچانا

غیر سمجھ کے رکھائی سی کی
ان سے بے پروائی سی کی

تم نے نہ کی کچھ ان کی عزت
بلکہ سدا کی ان سے نفرت

ہے ہے کیا ہو گئے تم اندھے
آنکھوں پہ یہ کیا پڑ گئے پردے

یہ سب خفت سہتے رہے وہ
حال ہر اک سے کہتے رہے وہ

سارے نشاں لوگوں کو بتائے
قصر و مکاں لوگوں کو بتائے

اتے پتے ان کو دئے سارے
تب کہیں سمجھے بھائی ہمارے

پر تعداد وہ تھوڑی سی ہے
جس نے قدر انکی جانی ہے

قوم کی جب یہ دُرگت دیکھی
مُلک کی جب یہ حالت دیکھی

جب یاروں کو سسکتا پایا
جب لوگوں کو بلکتا پایا

ملک سے اُٹھے دو عیسیٰ دم
عالم باہمت مستحکم

دونو سورج چاند تھے بیشک
دونو سے دونو ماند تھے بیشک

دونو دو پُتلے صدق و صفا کے
دونو دو نمونے نفسِ وفا کے

دونوں دو لب سحر بیانی　　دونوں دو دُرِ بحر معانی
دونوں دو گوشش صدق نیوشی　　دونوں دو دست ایماں کوشی
دونوں دو بحر علم و فضیلت　　دونوں دو کان صدق و شرافت
دونوں دو چرخ فکر معالی　　دونوں دو کوہ استقلالی
دونوں دو ساحل بحر حکم کے　　دونوں دو سر سنگت کی سم کے
قول تھا اس کا امرت بانی　　اس کی زباں میں سحر بیانی
یہ تھا اگر ہمت کا نمونہ　　وہ انسانیت کا نمونہ
تھا یہ جگر تو وہ دلِ ہمت　　رُوح تھا یہ وہ جانِ ہمت
چشمۂ حیواں کہئیے اسے گر　　تو اُسے کہئیے امرت ساگر
یعنے اک تو مہرشی سوامی　　دوسرے حضرت سید نامی
اسکی دیا سے آنند آیا　　آرام اس کے کرم سے پایا
اس نے رکھی انگلی نبضوں پر　　اس نے نظر ڈالی آنکھوں پر
دی آس اس نے بے آسوں کو　　اس نے دیا پانی پیاسوں کو
اس نے رکھا مرہم زخموں پر　　اس نے دئے چھینٹے منہوں پر
یوں ایک ایک کو ہوش میں لاکر　　اور سارا دُکھ درد ہٹا کر
سب کو سیدھی راہ پہ لائے　　ملک اور قوم کے آڑے آئے
جو بھی ضرورت ان کو سجھائی　　جو بھی مصیبت ان کو جتائی
جو تھا وقت کے لائق کرنا　　چاہیئے تھا جس رہ سے گزرنا
دانو بتائے ان کو سارے　　پیچ سکھائے ان کو سارے
وقت کی طرز و روش بتائی　　پبلک کی حاجت سمجھائی
ان میں جو تھے عاقل اور دانا　　ان سب نے حکم ان کا مانا
قول کو ان کے سچا سمجھا　　فعل کو ان کے اچھا سمجھا
قول تھا اس کا وید کی بانی　　اس کا بیاں آیتِ قرآنی
صدق و صفا پر انکی نظر تھی　　صلح کل انکی راہگذر تھی
دونوں کے ہاں جو جو اُترا ہے　　یعنے جو کچھ حکم خدا ہے۔

وہی ان میں ہر اک کا یقین تھا　　وہی درس ان کا اور تلقین تھا
القصہ عاقل لوگوں نے　　دانا اور کامل لوگوں نے
دونو کو سر آنکھوں پہ بٹھایا　　دونو کے قول کو سچا پایا
تقلید ان کی لازم جانی　　تعلیم ان کی دل سے مانی
سمجھے انکے کہے پہ چلنا　　ہے سیدھے رستے پر چلنا

پر ہر جا ہے خلاف طبیعت　　جدا جدا ہے اپنی طبیعت
جب نہیں سب اللہ کے قائل　　کیونکر پھر ان کے ہوتے قائل
ہے یہ سدا سے ہوتی آئی　　نیکی کا بدلہ ہے برائی
بیشک دونو فرقوں میں سے　　اکثر نافہم آدمیوں نے
اپنی غلط فہمی سے بے شک　　اپنی نادانی سے بے شک
راہبروں کو رہزن جانا　　دوست تھے جو انہیں دشمن جانا
خار یہ سمجھے گل کو ہے ہے　　زہر یہ سمجھے مل کو ہے ہے
کرتے تھے جو ان کی غمخواری　　سمجھے یہ انکو دشمن بھاری
سمجھے ملیچھ یہ اپنے رشی کو　　سمجھے وہ مرتد اپنے ولی کو
طعن الحاد کا ان پر مارا　　"نیچری" کہکر ان کو پکارا
بہت کئے تحریر رسالے　　دل کے بخار اس طرح نکالے
دل میں بھرا تھا جوش جہالت　　آنکھیں ڈھک گئی تھی جو حماقت
سچ کو ان کے جھوٹا سمجھا　　کھرے کو انکے کھوٹا سمجھا
سارا غبار دلوں کا چھانٹا　　ایک ایک بات کو انکی کاٹا
ترغیب تعلیم پہ ان کی　　دہریہ پن کی تہمت باندھی
بیواؤں کے حق میں کہا جو　　کہنے لگے بے دھرمی اسکو
اصلاح مذہب پر ان کی　　ناستکی کی شاخ نکالی
تعلیم نسواں پر اُٹھے　　جاہل مطلق خاک نہ سمجھے
ماں پر پوت پتا پہ گھوڑا　　بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا

الغرض ہر طرح انہوں نے — حوصلے اپنے دل کے نکالے
کوئی نہ چھوڑی گھات انہوں نے — کوئی نہ رکھی بات انہوں نے
جھوٹ پہ لیکن سچ کا ہمیشہ — رہتا ہے اور رہے گا غلبہ
سورج چاند پہ جو تھوکے گا — الٹا اسی کے منہ پہ پڑے گا
دونو بزرگوں کے تھے جو پیرو — کرنے لگے بے کھٹکے تگ و دو
اپنی اپنی راہ قدم بھی — ان میں سے ہر ایک نے پکڑی
خوب دکھائی انہوں نے ہمت — سخت اٹھائی انہوں نے محنت
کر دیا اک خون اور پسینہ — سختی سے ہو کر سینہ بسینہ
محنت کی اور کڑی اٹھائی — بات پر اپنی جان کھپائی
جوش تھا قربان نیک قدم پر — کہتے تھے ایک ایک قدم پر
سر جائے پہ بات نہ جائے — جب تک اپنی پار بسائے
بڑھتی تھی ہمت ساتھ قدم کے — چلتی تھی جرات ساتھ قدم کے
گھٹتی تھی جوں جوں منزل انکی — بڑھتی تھی امید دل ان کی
پھولتا تھا جتنا دم ان کا — پھولتی تھی امید بھی اتنا
الغرض ہر طور وہ آلئے — عہد کو پورا اپنے کر لئے
بند ہوئے منہ معترضوں کے — کھل گئے دیدے کوردلوں کے
مانی سب نے صداقت انکی — بھائی سب نے فضیلت انکی
سمجھے کہ نیکوں کو بد کہنا — ہے پانی کو مفرد کہنا
ان کے مخالف دشمن تھے جو — ہو گئی زیست اجیرن ان کو

اے سچے دل اور ہمت والو! — اے مے الفت کے متوالو!
اے پیغامبران قومی — ہادی و راہبران قومی
قوم کی امید اور ارمانو — ملک کے با تہذیب جوانو
دیس کی بھی کچھ اپنے خبر ہے — آپ کی ہمدردی وہ کدھر ہے
بال رہے وہ اک آنے والی — آگ ہے جو بھڑکانے والی

ہوش کو جو پرّاں کر دیگی ... انسان سے حیواں کر دے گی

پٹی جو باندھے گی آنکھوں پر ... جان کو جو کر دیگی دو بھر

دل سے جو الفت کو دھو دیگی ... سر سے فضیلت کو کھو دیگی

خون سفید کرے گی سارے ... منہ میں جو بھر دے گی انگارے

سر کو جو سودا سے بھر دیگی ... گوشت اور پوست الگ کر دیگی

اپنے ہی ہاتھ اور پانو سارے ... آپس میں سب کھچ جائیں گے

خلط اور عنصر سب آپس میں ... لہو پینے کی کھائینگی قسمیں

درد اگر ایک عضو کو ہوگا ... اوروں کو موقع ہوگا خوشی کا

بگڑیں گے ایسے مزاج الحاصل ... جس کا مداوا ہوگا مشکل

اس جان لینے والی بلا کا ... نام "تعصب" رکھتے ہیں دانا

مذہبی قومی کیسا ہی ہو ... بچنا ہئے لازم اس سے عزیزو

آفت جان تاثیر ہے اسکی ... ناممکن تدبیر ہے اسکی

اس کا گھائل میرے بلک کے ... جاندے بسمل اسکا سسک کے

پانی نہ مانگے اس کا مارا ... موت سے ہو جس کا چھٹکارا

اس نے ہی خوں عالم میں بہائے ... اس نے ہی لاکھوں سر کٹوائے

کئے بے سر لاکھوں تن اس نے ... گلشن کر دئے مدفن اس نے

سایہ سے بھی اس کے تم ڈرنا ... پاس سے بھی اس کے نہ گزرنا

اس کی ہوا میں سم کا اثر ہے ... سایہ بھی اس کا ایک اژدر ہے

کاٹے کا اس کے نہیں ہے منتر ... اس دکھ کا نہیں کوئی جنتر

چاہیئے تم کو گر ہو دانا ... آثار اس کے ہوئے جو پیدا

ان کو تدارک سے کھو دو اب ... آئندہ کا خوف مٹے سب

گو تم غور کرو نہ کچھ اسپر ... اور سوچو ممکن ہے یہ کیونکر

لاکھ ہوں گر آپس میں دشمن ... اور کبھی ہو باہم ان بن

کیونکہ بھلا کٹ جائے یہ رشتہ ... ساتھ ہے چولی اور دامن کا

ایسے تعلق ہوں مستحکم ... تو مشکل ہے رنجش باہم

ہاں ابتک بالکل آپس میں
ہیں وہی پیار اور میل کی رسمیں

ایسا ہی رکھیں بلکہ زیادہ
چاہیئے آپس میں برتاوا

پر کہیں کہیں بنجر دھرتی میں
جمنے لگیں جو پھوٹ کی بیلیں

ان کو ابھی سے جڑ سے اکھاڑو
فصل آئیندہ کی نہ بگاڑو

عمل اسباب پہ گر رکھو گے
سرخرو اور بامراد رہو گے

ہوگا جہاں میں نام تمہارا
اور بنے گا کام تمہارا

اے علم اور فضیلت والو!
اے اخلاقی جرأت والو!

اے تم طاقت کے اوتارو!
اے باغ ہمت کی بہارو!

قوم کے اے آزاد جوانو!
ایک نصیحت دل سے مانو

بیڑا تم نے اٹھایا جس کا
بس اس کام کو کرنا پورا

کوئی مرتد تمہیں لاکھ بتائے
کافر مشرک اگر ٹھہرائے

گر کوئی بیدیں کہہ کے پکارے
طعن کا گر کوئی پتھر مارے

لوگ کہیں جو ادھرمی تم کو
خلق کہے جو نیچری تم کو

دھیان اک بات پہ مت دھرنا تم
کام سے کام اپنے کرنا تم

خوف نہ کھانا ان کی بدھی سے
ڈرنا مت گیدڑ بھبکی سے

ان کے ڈراؤں پر مت جانا
ان کے دم دلاسوں میں نہ آنا

دہریہ تم کو خلق کہے گی
اور الحاد کی تہمت دیگی

لوگ پتت ٹھہرائیں گے تم کو
بے ایماں بتلائیں گے تم کو

نکلیں گے اخراجوں کے بوستفا
زندیقی کے دیں گے فتاوا

لوگ قرابت کو توڑیں گے
رشتہ الفت کو چھوڑیں گے

شور اور غل یہ خوب کرینگے
قبضوں پہ گھٹنوں ہاتھ ملیں گے

ہیجائیں گے دو پا یا کرکے
رک جائیں گے ارادہ کرکے

ڈاڑھی چبائیں گے یہ بہت ہی
موچھیں چڑھائیں گے یہ بہت ہی

اکثر خفگی سودا سے
خوں کے تمہارے ہونگے پیاسے

ہارنا تم ہمت ہمت ہرگز — مانا مت یہ دباغت ہرگز
استقلال و جوانمردی سے — روکنا تم سب حملے ان کے
ان باتوں سے کیا ہوتا ہے — سچ کو فوق سدا ہوتا ہے
لاکھ ہوں یہ گر جانی دشمن — لاکھ رہے کوئی تم سے ان بن
تم کو آبھڑ پھر کوئی کوسے — پانی پی پی کر کوئی کوسے
کام تمہارا بگڑے مقرر — کوؤں کے کوسے ڈھور مریں گر
بال تمہارا ہوگا نہ بیکا — تم پہ ہے ہاتھ اللہ کی اماں کا
تم کو ہے حاجت کس کی ولا کی — ہمت مرداں مدد خدا کی
ایک ذرا تاریخ تو دیکھو — انگلستان کے حال کو دیکھو
فتح ہوئی واں صدق کی کیونکر — بس تھی نظر اک اپنی مدد پر
اونچے اونچے سب تھے مخالف — لوگ تھے سارے انکے مخالف
اور سنواں سب سے بڑھکر — سلطاں بھی تھے مخالف اکثر
دقت جو ان کو پیش آئی — آئی نہ تم تک اسکی تباہی
خوش تھے وہ آفات پہ اپنی — جان دیتے تھے بات پر اپنی
زور حکومت - مال اور دولت — ان کی دبی نہ کسی سے طاقت
آخر سب پر غالب آئے وہ — چرخ پہ نام اپنے چمکائے
ملک جو تھا اول میں مخالف — جب ہوا ان کے جوش سے واقف
پیرو بن گیا آکر ان کا — تمام ہوا ریفارمر ان کا
بج گیا ان کا جہاں میں ڈنکا — ایشیا تک جس کا غل پہنچا
دوسری ہے یہ تمہاری حالت — تم کو نہیں ہے دبنی دقت
کاٹتا تھا گر ان کو ہمالہ — تم کو اڑانا ہے اک ٹیلہ
پاٹتا تھا گر ان کو سمند — باندھنا ہے پل تم کو اک پر
فرض تمہارا ہے یہ عزیزو — بات پہ اپنی جان تک کھودو
تن من دھن الغرض کسی کا — اس رہ میں نہ کرو کچھ صرفا
سختی اٹھاؤ کڑیاں جھیلو — جوش سے اپنی جاں پہ کھیلو

تو منزل مقصود پہ اک دن — ہے تم سب کا پہنچنا ممکن
ورنہ بہت ہے راہ میں دقت — تم کو یہی دقت ہے قیامت
اپنی مدد گر آپ کرو گے — لاکھوں میں تم میدان لو گے
پہنچے رستے پر ہو جب تم — پہنچا دیکھ سکو گے کب تم
لیکن یاد رکھو تم اسکو — دل پر لکھ چھوڑو تم اسکو
ہوگا نہ کچھ خالی باتوں سے — لکچروں۔ نظموں۔ اسپیچوں سے
گا کے بہت پرکھونکی بڑائی — بن جاؤ گے خاصے پر ہائی
کرکے بہت آپ اپنی بُرائی — کھو دو گے شرم رسوائی
کام تو ہوگا کرنے ہی سے — وقت نہ کھوؤ نادانی سے
خالی باتوں سے کیا ہوگا — ہر خرفاتوں سے کیا ہوگا
کام کرو تو کام بنے کچھ — پانو اُٹھے تو راہ کٹے کچھ
قافلہ لے نہ جبتک منزل — کیونکہ ہو خوش یہ پژمردہ دل
کیونکہ بھلا دل تسکیں پاوے — بامن جیسے ہی پہنچا دے

اے بگڑی کے بنانے والے — بپتا میں کام آنے والے
تو ہے جگ کا تارن ہارا — تیرا ہی ہے سب کو سہارا
بندوں پہ جب ہے وقت بد آتا — تو کرتا ہے ان کی سہائتا
جب لوگوں پر مشکل آئی — تو نے مدد ان کی فرمائی
رحم کر اب ہندستاں پر تو — ہندو اور مسلماں پر تو
ڈوبتا ہے تاران کا بیڑا — پہنچا دے پار ان کا بیڑا
طوفان کے آثار ہیں پیدا — اور منجدھار میں ہے یہ بیڑا
چار طرف پانی ہیں نیلے — اُٹھتے ہیں اونچی لہروں کے ٹیلے
دھجیاں اڑ گئی ہیں پانو کی — اور ہے بُری گت مستولوں کی
موت نے کمپا آکے لگایا — کچھ کمپاس نہیں کام آیا
ٹیلوں سے کشتی ٹکراتی ہے — بپتا تی ہے جپ کراتی ہے

ناخدا بنکر اس کشتی کا — پار لنگھا دے بار خدایا
عام ہے بخشش تیری سب پر — رحم اور رحمت ہے تیری گھر گھر
وقت کڑا جب ہم پر آیا — بس تو نے ہی کرم فرمایا
جب تیری رحمت جوش پہ آئی — آگ میں بھی کچھ آنچ نہ آئی
یونہی بچا جان اب بندو نکی — پار لنگھا یہ ڈوبتی کشتی
ہم کو دے ہمت اور طاقت — ہمدردی توفیق خدمت
جوش جوانمردی دے ہم کو — ایکا۔ ہمدردی دے ہمکو
دل پر جوش عطا کر ہم کو — مردہ رکھ نہ جلا کر ہم کو
دل میں بھری ہوں سب کے امنگیں — جیسے جوانی کی ہوں ترنگیں
سب کو ترقی کی ہو چیٹک — اور ہمدردی کی ہو چیٹک
یہ دکھ سنکٹ سب کٹ جائیں — سکھ سمپت کے دن پھر آئیں

ملک میں جس سے رونق آئے
اور کیفی تیرے گن گائے

لوریاں

۱۸۹۸ء

(۱)

سو جا میرے پیارے سو جا
مری آنکھوں کے تارے سو جا

میرے پیارے بچے سو رہ — سو رہ بھولے بھالے سو رہ
تو ہی اِن آنکھوں کا ہے اُجالا — ہے اس پھلواری کا لالہ
میٹھی بات سنانے والا — ہنسنے اور ہنسانے والا

سو جا میرے پیارے سو جا
مری آنکھوں کے تارے سو جا

نت چھاتی سے لگاؤں تجھکو — دیکھ تجھے سُکھ آوے مجھ کو
پیارا پیارا تیرا مکھڑا — جیسے پورن چاند کا ٹکڑا
وہ آئی نِندہ آنکھوں میں آئی — سُکھ کی داتا نِندا مائی

سو جا میرے پیارے سو جا
مری آنکھوں کے تارے سو جا

کیا سُکھ کی سانسیں بھرتا ہے — نیند میں یہ باتیں کرتا ہے
کیا اچھی ہے میری ماتا — سیوا بل مجھ کو دے داتا
بڑا ہوا اُپکار کروں گا — بھارت کا اُدھار کروں گا

سو جا میرے پیارے سو جا
مری آنکھوں کے تارے سو جا

(۲)

آجاری نندیا تو سُکھ کی نشانی   سبھی کو تو لگتی ہے پیاری سہانی

مری ننّھی جو آج شالا سے آئی
پڑھ لکھ کے اور سی پرو کر بھی لائی
مری دونوں آنکھیں ہیں یہ۔ اس کا بھائی
مرے من کا سُکھ چین ہے اسکی بانی

آجاری نندیا تو سکھ کی نشانی   سبھی کو تو لگتی ہے پیاری سہانی

کوئی دن میں جب ہوگی داتا کی کرپا
بڑی ہوگی سُندر۔ چتُر میری بالا
جواب سکتا لیتی ہے تب دیکھی سکتا
کرے گی کُبُدّھی سُگرہنی کی ہانی

آجاری نندیا تو سُکھ کی نشانی   سبھی کو تو لگتی ہے پیاری سہانی

یہ پُتری مجھے پُتر سے بھی سوا ہے
کہ ہر گُن اسے ایشور نے دیا ہے
گھڑی وہ کب آنے کو پرماتما ہے
بنیگی یہ جب گیان اور گُن کی رانی

آجاری نندیا تو سُکھ کی نشانی   سبھی کو تو لگتی ہے پیاری سہانی

تمام شُد

رباعیات۔ غزلیں
اور
متفرق

غزلیں

کشمیر - ۲۶ر اگست ۱۹۳۸ء

دیکھ لینا تم کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
اور ہی کچھ باغ عالم کی ہَوا ہو جائے گی

کفر و دیں کے کُل جھمیلے جلد مٹ جانیکو ہیں
نیت شیخ و برہمن با صفا ہو جائے گی

ہے دلوں کا مجھکو رونا اور زبانوں کا نہیں
دل جو مل جائیں زباں رفتہ آشنا ہو جائیگی

نیتوں میں بل ہو تو کیونکر ہوں یکدل یک زباں
گنبد بابل کی گونج انکی صدا ہو جائے گی

ہو اصولوں کی اگر تشکیل بھی کردار میں
تو جفا جس کی شکایت ہے وفا ہو جائے گی

فطرت حُسن و محبّت میں وہ ہوگا انقلاب
دلبری دلداریوں کی اِک ادا ہو جائے گی

برہمن اور شیخ ہو جائیں گے یکجان و دو تن
بانگ ناقوس و اذاں کی ہمنوا ہو جائے گی

ختم ہو جائے گی محنت اور سرمایہ کی جنگ
بے غرض خدمت ہی مذہب قوم کا ہو جائے گی

حاکم و محکوم میں وہ ہوگی ہمرنگی کہ پھر
آج کل کی کشمکش ایک خواب سا ہو جائے گی

قضئے سب دیر و حرم کے جلد مٹجانیکو ہیں
یہ تمیز دین و ملت ہی فنا ہو جائے گی

نیشنیت جمہوریت اور اشترا کی مسئلے
ہو کے طے اِک طینت جلوہ نما ہو جائے گی

قومیت تہذیب اور کلچر سے ہوگی ہمردیف
پاک و صاف اکناف عالم کی فضا ہو جائے گی

امن جنگ اور عزم خونریزی پہ غالب آیگا
وجہ حبّ خلق حُبّ کبریا ہو جائے گی

تنگ نظری اور تعصب کا عمل اُٹھ جائیگا
قومیت انسانیت کا آئینہ ہو جائے گی

یہ جو ہے بیت الحزن ہو جائیگا دارالسرور
یہ تم فنا جس کو سمجھتے ہو بقا ہو جائیگی

حال اہل دہر جو ہے آج کیفی اسکو دیکھ
کیا کہے جاتا ہے یہ ہو جائیگا ہو جائیگی

دیگر

دور جب دل سے شبہہ ماسوا ہو جائے گی
جلوہ گر سینہ میں سینا کی ضیا ہو جائیگی

جب تری نیت غرض نا آشنا ہو جائیگی
تیری بے غرضی حصُولِ مدعا ہو جائے گی۔

دیکھنا ہر شے میں خود کو ہے خودی کا ارتقا
اس سے نغمۂ جذبہ ما و شما ہو جائے گی

حکم اجر المحسنیں جب دلنشیں ہو جائیگا
خدمت خلق خدا عشق خدا ہو جائے گی

خودستائی اور خود بینی تو خودداری نہیں
یہ وہ بیماری ہے بڑھکر لا دوا ہو جائیگی

ہو خودی کے ساتھ حائل جذبۂ ایثار بھی
ورنہ وہ اک خود نمائی کی ادا ہو جائیگی

انقلاب اب پختہ ہونے کو ہے دنیا دیکھنا
ہے جو فانی ایک دن دار البقا ہو جائیگی

دیکھ اس دن کو نہ بھولے آئندہ نزجب یہی
سلک گوہر خندۂ دنداں نما ہو جائیگی

ہفت خوان سے عشق کی منزل زیادہ ہے کڑی
انتہا سمجھے ہو جسکو ابتدا ہو جائیگی

پردہ داری اس کی اچھی ہے جو پردہ اٹھ گیا
تو حجاب چشم جلوہ کی فضا ہو جائے گی

ہے یہ وصل اور فصل کیا تو اس میں ہوگا جلوہ گر
شکل تیری آئینہ سے جب جدا ہو جائے گی

ہو قوی مایوسیوں سے اور بھی ذوق عمل
ہے جو ناکامی دلیل ارتقا ہو جائیگی

کل کو کل پہ چھوڑ جو کرتا ہے کرلے آج تو
کیوں یہ حیرت ہے کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

کیا وطن کے واسطے قربانیاں کیفی نے کیں
جو اجابت آشنا اس کی دعا ہو جائیگی

ایک دن آئیگا ہونگے بے نشاں پست و بلند
اور ہی کچھ باغ عالم کی ہوا ہو جائے گی

شکر کر اب تو غنیمت جان لیں گے وہ اسے
جھوٹ تیری مہر کی انکی غذا ہو جائے گی

یاد رکھ اس سے بھی گر تو نے دیا انکو جواب
انکے صبر و ضبط کی پھر انتہا ہو جائیگی

ہو مساوات تخیل سے مساوات عمل
نیت اہل وطن جب با صفا ہو جائیگی

ہو محرک حوصلہ تو کیا ہے جبر و اختیار
بات جو ہو گی تری حکم قضا ہو جائے گی

ممتنع اور غیر ممکن کو جگہ دل میں نہ دو
تو ہر اک مشکل تمہیں اک کھیل سا ہو جائیگی

طبع ہمت آزما ہو - جب رواداری کیساتھ
دیکھ لینا پھر کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

اجتماعی رنگ کیفی جب طبائع پر جما
حریت ہی دین و مذہب قوم کا ہو جائیگی

لائل پور - ۲۸ جون ۱۹۳۸ء

خدمت قوم کو دل اور جگر پیدا کر | جس میں سودا یہ سما جائے وہ سر پیدا کر

ہے جو ہمت تو بُرے دن یہ وطن پر سے ہٹا | تو نئے روز و شب اور شام و سحر پیدا کر

اپنے تو اپنے پرایوں پہ بھی چھا جائے تو | قول اور فعل میں وہ جذب و اثر پیدا کر

پھول پتی پہ تو کیا باغ جہاں کی غش ہے | وہ شجر جسکو خزاں کا نہ ہو ڈر پیدا کر

خانہ باغوں سے وطن رشک فردوس نہ ہو | جس کے امرت ہوں ثمر میں وہ شجر پیدا کر

خدمت ملک میں خوں اور پسینہ کر ایک | تو وطن کے لئے یہ لعل و گہر پیدا کر

عزم پختہ ہو تو منزل نہیں کچھ دور اے دوست | آپ بن راہبر اور راہگذر پیدا کر

آن خودداری سے گھر کر لے دلوں میں سب کے | بغض و نفرت سے طبیعت میں حذر پیدا کر

تاکہ ہو باطل و حق اور فرائض میں تمیز | دیدۂ دل میں حقیقت کی نظر پیدا کر

آتش عشق اگر دل میں بھری ہے تیرے | سنگدل دوست کے سینے میں شرر پیدا کر

ملک گیری کی نہیں جنگ ہے آزادی کی | تیغ ایثار کی سینہ کی سپر پیدا کر

کر تو گھنشام کی تعلیم فرائض پہ عمل | چرخ کہنہ میں نئے شمس و قمر پیدا کر

کوچ سر پر ہے وطن کیلئے کچھ کر کیفی
اب تو سرمایہ پئے زاد سفر پیدا کر

نظم مشاعرہ علی گڑھ

۱۲ر فروری ۱۹۳۸ء کو دھرم سماج انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ کے سالانہ مشاعرہ کی صدارت کیلئے گئے تھے اور طرح میں یہ نظم پڑھی۔

مجھے کہنا یہی ہے دوستو ہندو مسلماں سے | یہی تم نے سبق سیکھا ہے کیا وید اور قرآں سے؟

جسے دیکھو تُلا بیٹھا ہے نفرت اور عداوت پر | تاسف ہے جو یہ برتاؤ ہو انساں کا انساں سے

رسولوں اور رشیوں نے یہی تم کو سکھایا ہے | کہ کوسوں دور رہنا تم محبت اور احساں سے

کسی کا دل دکھانا بھی اگر ہنسنا ہے تو کیوں پھر | رواداری و دلداری ہو باہر حدّ امکاں سے

جو اجر المحسنین کا قول ہے تعمیل کے قابل | تو کیوں محروم ابنائے وطن ہوں لطف و احساں سے

وہ کوئی ہوں چلن اہل وطن کے نامناسب ہیں
نظر آتے ہیں مجھ کو تو وہ کچھ آشفتہ اوساں سے

کہا کس نے کہ تم مسلم بنو یا شُدھ ہو جاؤ
تمدن اور کلچر کو غرض کیا دھرم و ایماں سے

مبارک پریم کاشی کا مبارک عشق کعبہ کا
نہ توڑو حُب کا رشتہ مگر اپنے ہندستاں سے

تعلق جن میں صدیوں سے رہا ہے چولی دامن کا
پھرے ہیں انکے دل اب کیوں دلا کے عہد و پیماں سے

یہ نشان حریت ہے کیا یہی تمہید آزادی
سبق تم نے یہی سیکھا ہے دنیا کے دبستاں سے

پڑے ہیں پیچ پر پیچ آکے ایسے اپنی ہر شے میں
جو ہیں پیچیدہ تر پیچ و خم گیسوئے پیچاں سے

پھنسیں دنیا کے دھندوں میں جو نکلیں بن کے مذہب کی
انہیں اہل غرض غدار کہتے تم سمجھو دم جھانسے

کبھی محفل میں پیار- ایکے کی گر کچھ بات کر بیٹھو
تو سمجھے جاؤ تم اک اجنبی ناخواندہ مہماں سے

پھٹے ہیں بادباں پتوار ٹوٹا دور ہے ساحل
خدا ہی ہے جو یہ کشتی سلامت نکلے طوفاں سے

مگر مایوس ہو کر ہارنا ہمت نہیں اچھا
مدد اپنی کرو گر تم مدد ہو ذات سبحاں سے

ہو توفیق عمل تم میں ارادے کی ہو مضبوطی
تو قسمت سے گلہ ہو اور نہ شکوہ چرخ گرداں سے

مطلع ثانی

بھلا کیا فائدہ ہے قوم کو ایسے سخنداں سے
جو رہتا ہے کشاکش میں ہمیشہ زلف پیچاں سے

عوارض کا اسے اندازہ کیا ہو مشغلہ جس کا
مساحت روز محشر کی ہو طول شام ہجراں سے

قفس میں اپنے اپنے آشیاں کا سب کو رونا ہو
کسے غم ہو کہ کیا گلشن پہ گزری برق سوزاں سے

جو غربت میں بھی ہو حُبّ وطن کا ولولہ دل میں
فضا صبح وطن کی ہو عیاں شام غریباں سے

کلید فتح ہے ذوق عمل اور عزم کی چستی
کبھی کیا بن پڑا ہے کام کوئی یاس و حرماں سے

یہ دنیا ہے ۔ وہ عقبیٰ ۔ واقعہ یہ مسئلہ وہ ہے
عیاں جو ہے نہاں کرتے ہو کیوں تم اسکو پنہاں سے

نہ سمجھو کارگاہ دہر کو دو روزہ اور فانی
کہ پیدائش ہے اس کی ذات لافانی یزداں سے

نہ ہو لی بیل میں انگور کی لگتی کبھی دیکھی؟
بقا سے ہو فنا پیدا ۔ ہے خارج حدّ امکاں سے

کوئی مرتا ہے تو کیا ۔ موت آجاتی ہے دنیا کو
بھرا گھر چھوڑ کر جاتا ہے بس اک فرد ہی جاں سے

نہیں وہ ۔ لیکن اس کے بیٹے پوتے بیٹیاں تو ہیں
یہ عین زندگی یا موت ہے ؟ کہئے تو ایماں سے

عوض اک فرد کے ہے اک قبیلہ پھر فنا کیسی ؟
ذرا منہ تو نکالیں حضرت والا گریباں سے

زمانہ میں نہیں جس کو تغیّر ۔ وہ تغیّر ہے
نہیں موقوف اک تغیّر ہے تمہیں جس کے ہیں پیمانے

نہیں ہوگا یہاں کیفی تو کیفی کا سخن ہوگا
صدا گونجا کرے گی اس کی صحرا اور گلستاں سے

کہو گے تو غزل ہے یا قصیدہ ہے؟ مگر حضرت!
کروں کیا میں بھی ہوں مجبور جذبِ دل کے طوفاں سے

لائل پور - ۱۵ ار دسمبر ۱۹۳۷ء

فراہم ہو کے خونِ آرزو پھر دل نہ بن جائے
یہ اجڑی پُر سکوں بستی بھری محفل نہ بن جائے

نہ ہو ہر ہوتے تن میں جب تک احساس اک رگِ جاں کا
تو جانبازی و جذبِ عشق میں کامل نہ بن جائے

وہ جلوہ ہو عیاں دیر و حرم کیا ذرّے ذرّے میں
جو تیری ذات ہی اک پردہ حایل نہ بن جائے

طلسمِ رنگ و بو ہے کیا فضائے گلشنِ ہستی!
یہ صنعت ہی کہیں صانع کی متقابل نہ بن جائے

جماعت کی مسلّم قابلیت ہو تو کیونکر ہو۔
ہر اک فرد اس کا جب تک جوہرِ قابل نہ بن جائے

وطن کی ساکھ ہو تم نوجوانو کب یہ ممکن ہے۔
کہ مخبر حال و ماضی شانِ مستقبل نہ بن جائے

ہجومِ یاس و ناکامی میں گر ہمت رہے قائم
تو پھر کوشش تمہاری سے بے حاصل نہ بن جائے

فرشتے تک بھی حظِ نفس سے ہارے ہیں بچ اس سے
کہیں چاہِ زنخداں ہی چہِ بابل نہ بن جائے

زباں کے مسئلے پر یہ خدنگ اندازیاں کیسی
کہیں یہ خاک تودہ گنبدِ بابل نہ بن جائے

کبھی بحرِ محبت سے نہ بیڑا پار ہو اس کا
فرازِ موجِ طوفاں ہی جسے ساحل نہ بن جائے

جو از خود رفتۂ راہِ عشق ہیں۔ ہو نہیں سکتا
کہ منزل۔ ان کے حق میں ہو کے دورِ منزل نہ بن جائے

پریشانی سے تنگ آیا ہوں پھر بھی وہم بخود ہوں میں
کہ ہم آہنگ سوزِ دل کا سازِ دل نہ بن جائے

مریضِ غم کے جینے کی دعا احباب کرتے ہیں
جسے آساں سمجھا ہوں وہی مشکل نہ بن جائے

قیامت ہو نکیرین آ کے حالِ دل اگر پوچھیں
کہیں شہرِ خموشاں ماتمی محفل نہ بن جائے

تمہیں ہو رازدارِ عشق ہیں اب چپ رہو کیفی
فسانہ اک جہاں کا واردات دل نہ بن جائے

لائل پور - ۱۰ ار نومبر ۱۹۳۷ء

جب تک دل و جگر کو کھپایا نہ جائے گا
آفات سے وطن کو بچایا نہ جائے گا۔

گفت و شنود ہو چکی اب ہے عمل کا وقت
یہ وقت ٹل گیا تو بلایا نہ جائے گا۔

جب تک یہ نفسی نفسی ہے اور انفرادیت
رنگ اجتماعیت کا جمایا نہ جائے گا۔

راگ اپنا اپنا اور ہے ڈفلی الگ الگ
یوں نغمۂ دلپسند کا گایا نہ جائے گا۔

یہ فرقہ بندیاں وطنیت کی ہیں عدو — مقراض سے تو چاک سلایا نہ جائے گا
درکار ہے کہ ایک پسینہ لہو کرو — پتھر یہ چومنے سے اٹھایا نہ جائے گا
میداں میں آؤ تیغ عمل کی سنبھال کر — باتوں سے تو یہ کام بنایا نہ جائے گا
دم ہے تو خدمت وطن انجام دے چلو — پھر وقت کو گھسیٹ کے لایا نہ جائے گا
ہو دل میں سوز تو ہو نفس بھی شرر فشاں — پھونکوں سے تو چراغ جلایا نہ جائیگا
کھیلو گے جان پر تو وطن میں پڑیگی جان — چھو منتروں سے کام چلایا نہ جائے گا

کیفی ترانہ قوم کا ہر وقت گائے جا
یہ راگ تیرے بعد سنایا نہ جائے گا

ماڈل ٹاؤن —— ۳ مئی ۱۹۳۷ء

راحت کہاں نصیب کہتی جواب کہیں نہیں — وہ آسماں نہیں ہے کہ اب وہ زمیں نہیں
ہو جوش صدق دل میں تو راحت بغل میں ہے — قائم پھر آسماں رہے یا زمیں نہیں
حب وطن کو ہمت مردانہ چاہیے — درکار آہ سینۂ اندوہگیں نہیں
خون دل و جگر سے اسے سینچ اے عزیز — کشت وطن ہے یہ کوئی کشت جویں نہیں
حق گوئی کی صدا کبھی نہ رکی نہ رک سکی — کب دار کی سنانیں گلوں میں چبھیں نہیں
داغ غم وطن ہے نشان عزیز خلق — دل پہ نہ جس کا نقش ہو یہ وہ نگیں نہیں
جنگ وطن میں صدق کے ہتھیار کا ہی کام — درکار اس میں اسلحۂ آہنیں نہیں
گھربار تیرا۔ پر تو کسی چیز کو نہ چھیڑ — یہ بات تو حریفوں کی کچھ دلنشیں نہیں
جس بات پر عزیز اڑے ہیں اڑے رہیں — کہنے دیں انکو اونچے گلے سے نہیں نہیں
کیا جانے دل جگر کو صبر جو یہ کہہ گیا — دامن بھی تار تار نہیں آستیں نہیں
معبود ہے وطن۔ ہوں پرستار اسی کا میں — دیر و حرم میں جو جھکے یہ وہ جبیں نہیں

کیفی اسی سے حریت ہند میں ہے دیر
حب وطن کا جوش کہیں ہے کہیں نہیں

۱۵ اپریل ۱۹۳۷ء

جذب یا ایثار سے کچھ بات پیدا کیجئے — اس کے خود ہو جائیے یا اسکو اپنا کیجئے
حسن کے نظارہ کو حسن نظر درکار ہے — دیکھنا ہے تو ان آنکھوں سے نہ دیکھا کیجئے

جلوہ بے پردہ ہے دید اس کی اگر منظور ہو — تو یہ لازم ہے کہ آپ اپنے سے پروا کیجئے
ہے ابھی تک عاشق و معشوق کی باقی تمیز — خامشی سے ہجر کا صدمہ گوارا کیجئے
یا مجسم سوز بنیئے یا شہید سوز و ساز — محفل آرائی کا ساماں تو مہیا کیجئے
کم نگاہی نے کسی کی کر دیا ہے بے نیاز — اب جفائے ناز کا کس منہ سے دعویٰ کیجئے
خواہشیں پوری ہوئیں بڑھتی گئیں حرماں نہیں — دیدۂ عبرت سے دنیا کا نظارا کیجئے
فکر عقبیٰ ہے یہاں آنکھوں پر۔ مگر اے مہرباں — پہلے اس دنیا میں جو ہے فرض پورا کیجئے
ہمت و تدبیر والے بن گئے ہیں کیا سے کیا! — آپ بیٹھے اپنی قسمت ہی کو پیٹا کیجئے
کیجئے جو کام کرنا ہے بلا خوف و خطر — کیا کہیگا کوئی؟ اس کی کچھ نہ پروا کیجئے
جن کے دل میں ہے عمل کا ولولہ۔ کہتے نہیں — زندگی ہے چند روزہ۔ اسمیں کیا کیا کیجئے۔
ہستئ جاوید کی تمہید ہے جوش عمل — جلوۂ نور بقا فانی میں پیدا کیجئے

بن پڑے کیا ہم سے کیفیؔ خدمت علم و ادب
خود نکمے ہیں ہمیں۔ کس کس کا شکوا کیجئے

مشاعرہ جوبلی بزم سخن دہلی کیلئے

ماڈل ٹاؤن۔ ۱۵ر دسمبر ۱۹۳۶ء

جس حال خصوصی کو سمجھتے ہو فنا ہے — دراصل تغیر کا وہ اک حسن ادا ہے۔
کب حسن پہ اور عشق پہ عائد ہوئیں قیدیں — جنگ اور محبت میں ہر اک بات روا ہے۔
اے ناصحو یہ دل ہے کہ آیا جہاں آیا۔ — الفت میں بڑے چھوٹے کی تمیز ہی کیا ہے
کیا تاج شہی بھینٹ چڑھے برہنہ سر بھی — یکساں نگہ عشق میں سلطان و گدا ہے۔[۱]
کیوں رنگ زمیں دیکھ کے تم چیں بہ جبیں ہو — بدعت نہ کہو اسکو یہ پہلے بھی ہوا ہے۔
ہاں جبّہ و دستار سنبھال اپنی تو اے شیخ — بدلی ہوئی بے طرح زمانے کی ہوا ہے
ہر چیز پہ دنیا کی مسلط ہے تغیّر — عالم میں کسی کو ہے تو بس اسکو بقا ہے
ہاں ہاں۔ مگر اے دوست تو تدبیر کئے جا — یہ بھی تری تقدیر کے دفتر میں لکھا ہے
تیرا نہیں کوئی بھی تو بن یار تو اپنا — تو ہو ممد اپنا تو معیں تیرا خدا ہے۔

۱؎ یہ تین شعر شاہ انگلستان ایڈورڈ ہشتم کے قضیئے سے متعلق ہیں

ذرہ بھی نہیں کارگہ دہر میں بیکار — پیغام عمل ہم کو یہ فطرت سے ملا ہے۔
میں چھوڑ کے میدان عمل گوشہ نشیں ہوں — ایسا تو مری جان نہ ہوگا نہ ہوا ہے۔
ناکامیوں سے سرد ہو کیوں جوش محبت — بے ہمتی و عاشقی اک سخت بلا ہے۔
سر ہاتھ پہ۔ ایثار ہو دل میں۔ یہ ہے درکار — میدان وغا ہے وہ کہ پیمان وفا ہے
ہنگام عمل ہے یہ اُٹھ اے محو تخیل! — اب سوچنا سونے سے بھی غفلت میں سوا ہے
دانہ جو سلامت رہے تو کیونکہ شجر ہو — دیکھو کہ فنا تکملۂ نقش بقا ہے
زنداں میں بھی وارستہ ہیں آزاد کہ دریا — ساحل کا ہے پابند۔ مگر چل ہی رہا ہے
بلبل تو قفس ہی میں ہوئی ختم پھڑک کر — پر طوف نشیمن میں ابھی برق بلا ہے
مغرب زدگی اس کو نہ کر دے کہیں برباد — جنسی وہ شخص کہ لقب جس کا حیا ہے
کر خلق کی خدمت تو ملے رحمت خالق — سمجھا ہے جسے قبلہ وہ اک قبلہ نما ہے

کہتا ہے جو کیفی اسے تم دل میں جگہ دو
اس بحث کو چھوڑو وہ بُرا ہے کہ بھلا ہے

دہلی۔ ۱۰ فروری سنہ ۱۹۳۶ء

یوم غالب

حسن کی رنگینیاں کیا جلوہ ساماں ہو گئیں — دل کی آنکھیں سر بسر آئینہ بداماں ہو گئیں۔
جب تعلق اور تعین سے ہوا آزاد دل — بدعتیں کہتے تھے جن کو روح ایماں ہو گئیں
مختلف آغاز سے نکلا بہت انجام عشق — سب وہ دور اندیشیاں خواب پریشاں ہو گئیں
رفتہ رفتہ اُٹھ گئی معشوق و عاشق کی تمیز — عشق کی سب مشکلیں اس طرح آساں ہو گئیں
شعلہ وہ ہے جل مرے پروانہ جس پر یوں تو پھر — سنگ سے چنگاریاں اکثر نمایاں ہو گئیں
جلوہ بے پردہ تھا فرط شوق نے ڈالی نقاب — یہ نگاہیں مضطرب ہو کر پریشاں ہو گئیں
حریت کیسی عمل کی جب محرک ہو غرض — نیتیں آوارگی سے پابجولاں ہو گئیں
دو لہو کی بوندیں رکھ چھوڑی تھیں ختم شوق میں — وہ بھی آویزۂ تار گریباں ہو گئیں
جن امیدوں سے بنا تھا خانۂ دل رشک خلد — اب وہی اس گھر کی بربادی کو طوفاں ہو گئیں
تھیں جو چیزیں ساری دنیا کے لیے سہل الحصول — ہائے کیا قسمت ہے وہ بھی میرا ارماں ہو گئیں
ناز والوں کے سلوکوں نے کیا صبر آشنا — بے نیازی کی ادائیں مجھ پہ احساں ہو گئیں
اس دل بے مدعا نے کر دیا مجھ کو غنی — راحتیں اور آفتیں سب مجھ کو یکساں ہو گئیں

یاس ہے قطعِ عمل۔ اُمیدِ تجدیدِ عمل
پھر بسیں گی بستیاں جو آج ویراں ہو گئیں

تھیں وہ اگلی صورتیں محوِ بنت آرائیں قدر
دیکھ مِٹ مِٹ کر بھی زیبِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

انفعالِ معصیت پر شانِ رحمت دیکھنا
چند بوندیں چہرۂ عصمت پر افشاں ہو گئیں

حشر تک اہلِ جہاں وہم و گماں ہی میں رہے
دہر کی نیرنگیاں کیا فتنہ ساماں ہو گئیں

طور سا باقی عیاں فطرت کے ہر ذرّے میں ہے
تیری آنکھیں دیکھ کر اِک گُل کو حیراں ہو گئیں

کیا دِکھاتیں حُسنِ فطرت کی تجھے رعنائیاں
وہ تو میری آنکھ کے پردے میں پنہاں ہو گئیں

آفتاب اِک ذرّے میں قطرے میں بحر آیا نظر
کُنہ کی باتیں مجھے کارِ نمایاں ہو گئیں

کس قدر رَم شیوہ ہیں کیفی ادائیں حُسن کی
چھائیں عالم پر کبھی سینہ میں پنہاں ہو گئیں

استقامت عزم کی جذبہ عمل کا پھر کہاں
سیرتیں جب پائمالِ یاس و حرماں ہو گئیں

دین و دُنیا اس کی بعدِ مرگ جنت اس کی ہے
خدمتیں اہلِ وطن کی جس کا ایماں ہو گئیں

توڑ سکتیں اہلِ ہمت کی کمر ناکامیاں
بلکہ وہ تو موجبِ سعیٔ فراواں ہو گئیں

میں نے مانا کچھ نہیں صاحب میں کچھ بھی تو نہیں
کیوں پھر اس ناچیز پر وہ نظریں پیکاں ہو گئیں

جب حسینوں کو ہوئی یک گونہ عریانی پسند
فِکر و تخئیل سخن سنجاں بھی عُریاں ہو گئیں

سالانہ مشاعرہ بزمِ سخن دہلی
۳۰ر دسمبر ۱۹۳۵ء

صدر نواب سجاد علی خاں رئیس کرنال

زمانہ دیکھتے ہو شعبدے کیا کیا دکھاتا ہے
پھریں نظریں، کھنچی ہیں تیوریاں گردونِ گرداں کی

غنیمت سمجھو یہ مل بیٹھنا کچھ دن جو رہ جائے
جھپٹ میں تم نہ آ جانا کہیں رفتارِ دوراں کی

ہویدا اتحادِ اضداد کا کلچر سے دُنیا میں
بنی پرتو گیر اسی سے ذہنیت ہندو مسلماں کی

رواداری سکھائی تھی ادب اور شعر نے ہم کو
اسی سے ہو گی پھر ترتیب ان اجزائے پریشاں کی

بناتی ہے یہ صحبت معترف اس نیک جذبہ کا
مرتب جس سے ہے یہ بزم یارانِ سخنداں کی

یہ دو بہنوں کا سنگم کیا مبارک سین ہے کیفی
ادب نے اور رواداری نے جس پہ جان قرباں کی

ے صدر مشاعرہ کا نام اور بانی مشاعرہ کا تخلص (ساحر) دونوں "س" سے شروع ہوتے ہیں۔

غزل

سوال اٹھتا ہے حالت دیکھ کر ہندو مسلماں کی
یہ ہے تعلیم ویدوں کی؟ یہ ہے تلقین قرآں کی؟

تجلّی منعکس ہو دل میں کیونکر شمع عرفاں کی
کبھی پروانہ کی مانند تم نے قدر کی جاں کی

تناقض سے بھری ہے سربسر ذہنیت انساں کی
اطاعت اہرمن کی ہے کبھی طاعت ہے یزداں کی

ترا ہر موئے تن جاں بن کے ہو قربان جاناں پر
حقیقت کیا ہے دراصل اس تری ہستی اک جاں کی

فروغ جلوۂ عریاں تحیّر خیز پردہ تھا
بنا خلد نظر جب بند میں نے چشم حیراں کی

حرم میں اس کا گھر ہے۔ دیر میں وہ جلوہ گستر ہے
یہ تم نے ایک ہی شیخ و برہمن بے تکی ہانکی

ملے جب خاک میں دانہ تو نخل بار آور ہو
خودی کو کھو کے قطرہ شکل پائے دُرِّ غلطاں کی

جو اپنی ذات کو یوں محو کر دے ذات قدسی میں
تو پائے صورت تکمیل یہ تصویر یزداں کی

اسی صورت ہوا وہ فرد الحاق سے جماعت کے
کہ جس نے شخصیت جمہور کے قدموں پہ قرباں کی

مجھے تم دار پر کھینچو۔ کہ جلتی آگ میں ڈالو
کہ افشا راز کی یہ بات کی ہے میں نے ہاں۔ ہاں کی

وہ جلوہ وجد گستر ہو وہ منظر طور ساماں ہو
خبر کس کو رہے اس حال میں پھر جسم اور جاں کی

مری آنکھوں سے میرے دل کی حالت کو اگر دیکھو
ابھی یہ آئینہ ہو تم پہ حقیقت سوز پنہاں کی

نہ آنچ آئے وفور سوز غم سے جان عاشق پر
بڑھائے آتش گل گرم بازاری گلستاں کی

نقاب الٹو بھڑکنے کو ہے دیکھو دیکھو پھینکو بھی
نہیں یہ شمع کی جھلکی جھبک ہے حسن رخشاں کی

کھبی جاتی ہے دل میں تو جگر میں بیٹھی جاتی ہے
تری ہر بات میں واعظ ہی گویا نوک پیکاں کی

چمن ہوگا۔ صنم ہوگا۔ تو مست جام مے ہوگا
یہی تعبیر ہے زاہد ترے خواب پریشاں کی

سوا نظم عناصر کے ہی چیز ایک اور عالم میں
ہے ترتیب اس سے ہی کامل ان اجزائے پریشاں کی

غم ماضی و مستقبل نے حال اپنا بگاڑا ہے
خدا جانے کہاں چرنے گئی ہے عقل انساں کی

وہ تیرے فعل ہیں اچھے برے دن جو دکھاتے ہیں
نہ دخل اس میں ہے مقدر کا نہ ہے چرخ گرداں کی

پڑی ہے اپنے اپنے آشیاں کی دام والوں کو
کسی کو غم نہیں بجلی نے کیا گت کی گلستاں کی

تصور کی ہے گمراہی کہ آشفتہ مزاجی ہے
فضا گلزار میں کرتے ہیں پیدا جو بیاباں کی

کرو وہ بات جس سے دل بڑھیں اور ولولے ابھریں
سنانے بیٹھے کیا تم یہ کہانی یاس و حرماں کی

خدا کی ہے دولت زندگی قدر اس کی کر ناداں
اڑائی تو نے پھبتی اس پہ کیوں خواب پریشاں کی

بنا تعمیر نو کی ہے تری تخریب میں پنہاں
ہو جیسے برق خرمن وجہ سرگرمی دہقاں کی

سناتا ہے یہ باتیں کس کو اپنا کام کر کیفی
ذرا تو دیکھ تو حالت ہی کیا گبر و مسلماں کی

مشاعرہ جے پور کے لئے

ماڈل ٹاؤن ——— ۱۶ اپریل سنہ ۱۹۳۵ء

جلوے مچل رہے ہیں حجاب جلال میں
کھل کھیلے خوب آ کے فضائے جمال میں

اے شیخ فائدہ نہیں کچھ قیل و قال میں
رہنے دے رند مست کو تو اس کے حال میں

مفقود دیر اور حرم اس فضا میں ہیں
وسعت ہی دو جہاں کی ہمارے خیال میں

جلوے وہاں ہیں نور فگن اور کیف پاش
ہیں بیخودی سے رند جہاں مست حال میں

جمشید سے زیادہ ہے رندوں کا مرتبہ
کونین کا نظارہ ہے جام سفال میں

افراط کا ثبوت ہے تفریط سے عیاں
مضمر کمال بدر ہے نقص ہلال میں

نیرنگئ مجاز حقیقت پہ ہے نثار
کون و مکاں ہیں غرق فروغ جمال میں

کافر ہوں میں نہ ہوں جو پرستار حسن کا
دیکھو تو رمز کیا ہے یحب الجمال میں

رحمت سے اسکی کم نہ رہی معصیت مری
کامل ہے نقص آئے جو حد کمال میں

ہو کس زباں سے لطف کریمی کا حق ادا
اعجانہ بھر دیا عرق انفعال میں

جس کے لئے تو دیر و حرم میں خراب ہے
وہ نور پات پات میں ہے ڈال ڈال میں

مختار ہونے پر ہی نہیں حریت کا حصر
ہم پر کھلا یہ راز حیات بلال میں

بزم سخن میں جب ہمیں مائل[1] نہیں ملے
دل کی خوشی بدل گئی رنج و ملال میں

کامل ہیں اہل بزم تو ہے فرد صدر بھی
یہ بزم یادگار ہے علم و کمال میں

اے شیخ کہنہ شرب ہے وہ اس سے ہاتھ دھو
کیفی تو آ سکے نہ کبھی تیری چال میں

---

[1] مرزا محمد تقی بیگ مرحوم جن کی عمر کا بہت بڑا زمانہ جے پور میں گزرا۔

ساحر صاحب کی بزم سخن کے سالانہ مشاعرہ میں پڑھی گئی

جو ۱۲-۱۴ جنوری سنہ ۱۹۳۵ء کو آنریبل راجہ نریندر ناتھ بہادر کی صدارت میں ہوا۔

سراسر جائے عبرت گلشن ہستی کی محفل ہے / چٹک غنچہ کی آواز شکست شیشۂ دل ہے

جو چھوٹے دامِ دنیا سے پھنسے عقبیٰ کے پھندے میں / ہر آزادی کی کوشش منجر طوق و سلاسل ہے

وہ اب جرم وفا و عشق کا الزام دیتے ہیں / رہوں چپ تو بھی مشکل ہے کہوں کچھ تو بھی مشکل ہے

تڑپ کر خاک و خوں میں مل رہے ہیں بخت دل میرے / نہیں یہ آہ جوش اشک حسرت رقص بسمل ہے

گل پژمردہ کی بکھری ہوئی کچھ پتیاں دیکھیں / تو اک بیدل یہ چیخ اٹھا مرا دل ہے مرا دل ہے!

نہیں سود و زیاں کا دخل سودائے محبت میں / جسے انجام سمجھا نفع وہ تحصیل حاصل ہے

جو ہے دشوار سے وحشت تو سہل انگاری آساں سے / یہی ہر کام میں دقت یہی تو سخت مشکل ہے

درِ شہوار قعر بحر میں غوطے سے ہاتھ آئے / ترا اللہ نظر اے پست ہمت ریگ ساحل ہے

ہمارا دل بڑھاتی ہے درازی راہ الفت کی / سمند شوق کو اک تازیانہ بُعد منزل ہے

سویدا ہے کہ مرکز ہے محیط ہر دو عالم کا / ہمارا دل ہے یا ہنگامۂ تکوین کی محفل ہے

بھرا ہے صدق اور اخلاص قول و فعل میں جس کے / اسی کی بات ہر اک دل میں گھر کرنے کے قابل ہے

بہت دیکھے ہیں کہنے سننے والے یوں تو دنیا میں / ہم اسکو مانتے ہیں قول پر جو اپنے عامل ہے

ہوا ایثار اور دلسوزی سے نام انساں کا روشن / جو پروانہ ہے خلق اللہ پر وہ شمع محفل ہے

جو عشق آوارہ ہیں وہ راہ و رہبر سے ہیں مستغنی / وہ از خود رفتہ ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے منزل ہے

نہیں کشتی کی پروا آشنائے بحر الفت کو / جو موج اٹھتی ہے طوفاں کی وہ اسکے حق میں ساحل ہے

جہاں میں اک سے اک بہتر بنایا دست قدرت نے / ہمیں اچھے ہیں سب سے یہ سمجھنا زعم باطل ہے

خودی سے تیری ہے محجوب وہ حسن جہاں آرا / تو ہی پردہ ہے جو نظارے اور جلوے میں حائل ہے

نہ ہوگا تو تو وہ ہوگا جہاں تو ہے وہاں سب کچھ / ترا پندار ہے جو تجھ میں اسمیں حد فاصل ہے

نظارہ ذات کا اپنی ہے اس سے دور ہو جانا / جدا ہے جیسے آئینہ سے تو اور اس میں شامل ہے

یہ بزم اور یہ پرانی صورتیں کیفی غنیمت ہیں
کہ دلّی دلّی ہے جبتک یہاں ساحر ہے سائل ہے

یہ لازم ہے کہ خلقت کی معیشت پر تڑپ اُٹھے — اگر سینہ ترا صد چاک اور اس میں پھیکا دل ہے
یہ اصل ہوشیاری ہے نہ کہہ دیوانہ پن اسکو — جہاں کا دُکھ مٹاتا ہے جو اپنے سکھ سے غافل ہے
تو اپنا امتحاں کر ایسی تنقید دل سے کیا حاصل — وہ ہے زشت اور یہ ہے خوب وہ ناقص یہ کامل ہے
تنوّع شاعروں کے رنگ میں ہو اس سے ہی بڑھ کر — جسے مدِّ مقابل کہہ رہے ہو مدِّ فاضل ہے
جو شاعر ہیں سبھی اچھے ہیں میری رائے ناقص میں — جو اپنے طرز میں پختہ ہو بس وہ فرد کامل ہے
جو خواہش وصل کی ہے کل جہاں کے دل میں گم کر لے — کہ عرصہ شش جہت کا اس کا رستا اور منزل ہے

قطعہ

خبر اُڑتی سی پائی شاعروں کی نغمہ سنجی کی — گلستانِ سخن میں آج انبوہ عنادل ہے
نہ کیوں پھر کھنچ کھنچ کر آئیں اہلِ ذوق اس بزم میں کیفی — جو ہے زیبِ صدارت دلّی اور پنجاب کا دل ہے
نہ منصب ہی کے۔ یہ ہیں ملکِ علم و فضل کے راجہ — اسی سے بڑھ کے درباروں سے رونق میں یہ محفل ہے
مرے گذرے برس یا رب بڑھا دے عمر ساٹھہ میں — اسی کے دم سے یہ بزمِ سخن زندوں میں شامل ہے

ماڈل ٹاؤن - ۱۶ر نومبر ۱۹۳۴ء

شہرۂ عالمگیر مر مٹ کر مری قسمت میں تھا۔ — مشترک مقسوم عنقا کا مری شہرت میں تھا۔
نقش کو جس طرح چمکا دے سیاہی مُہر کے — نام بھی روشن مرا تاریکیٔ قسمت میں تھا
عشق کی فریاد سنتا کون؟ ملتی کس سے داد؟ — داورِ محشر آپ اپنی صنع پر حیرت میں تھا
وصل کی کاوش رہی باقی نہ فرقت کی خلش — اب ہے دل کچھ اور پہلے دوسری حالت میں تھا
اب کہاں وہ شوقِ دید اور اضطرابِ انتظار — اب نہیں اس لطف کا احساس جو حسرت میں تھا
بن کے سودائی میں چھوٹا مخمصوں سے دہر کے — جوہرِ فرزانگی دیوانہ کی وحشت میں تھا

چشمِ دل جب وا ہوئی ہر شے میں پایا ایک نور
کھل گیا جو رازِ کیفی وحدت و کثرت میں تھا

مشاعرہ الٰہ آباد - ۱۱ر فروری ۱۹۳۸ء

فرطِ نیرنگی میں یکرنگی کا ساماں دیکھئے — چشمِ وحدت بیں سے رنگِ کفر و ایماں دیکھئے
کیجئے دیر و حرم کا ختم قصہ بھی کہیں — دل میں اپنے انعکاسِ نورِ سبحاں دیکھئے
رازِ ہستی ہی کے حل میں ہے نہاں رازِ عدم — دیدۂ بینا ہے تو پیدا میں پنہاں دیکھئے
حشر پیما عزم پر کہتے ہیں فانی ہے جہاں — جل گئے ہیں شوق سے خوابِ پریشاں دیکھئے
موج اک مٹتی ہے اٹھتی ہے وہیں تہ دوسری — نائے سیلِ عدم ہستی کا طوفاں دیکھئے
وہ تو دیکھا جو کبھی سننے میں بھی آیا نہ تھا — کیا دکھانے کو ہے اب رفتارِ دوراں دیکھئے
کر دیا ہے کیا سے کیا دنیا کو اس انسان نے — ایک قطرے نے کیا برپا یہ طوفاں دیکھئے
کھیل ہے تھگلی لگانا آسمانوں میں اسے — اور کیا کچھ کر دکھانے کو ہے انساں دیکھئے
اہلِ ہمت کے لغت میں لفظ نا ممکن نہیں — یہ یقیں ہو جائے تو ہر مشکل آساں دیکھئے
ہمتِ مرداں مدد سے ہے خدا کی مستفید — ممتنع اور غیر ممکن کا بھی امکاں دیکھئے
حسن کی ہنگامہ آرائی ازل سے ہے یہی — پھر یہ خواہش کیوں حسینوں کو پشیماں دیکھئے
آئینہ ہو جائیں گے معنی نیانہ و نانہ کے — تھام کر دل عالمِ گنجِ شہیداں دیکھئے
ہے ضیا پاشی وہاں صبحِ وطن کے عشق کی — سوزِ دل سے منظرِ شامِ غریباں دیکھئے
دیکھئے دل میں جگہ ہیں اسکے کتنے چاک ہیں — کیوں کسی کا چاک داماں و گریباں دیکھئے

پھنک رہا ہے تن بدن کیفی کا سوزِ عشق سے
دستِ شفقت دور رکھئے اس سے! ہاں ہاں دیکھئے

فانی دنیا؟

لاہور - ۲۰ر نومبر ۱۹۳۳ء

حیّ اور قیوم کی ذات اس کی جب بانی ہوئی — پھر یہ دنیا کس طرح باقی نہیں۔ فانی ہوئی
مصلحت اور خوف سے سچا کبھی بولیگا جھوٹ — کیونکہ عائد حق پہ یہ تمثیل انسانی ہوئی
اس کو اک خوابِ پریشاں جو سمجھ بیٹھا ہے تو — یاد رکھ تجھ کو اسی باعث پریشانی ہوئی
تو نہیں تھا میں نہیں ہونگا۔ مگر یہ کارگاہ — تھی یونہی۔ یوں ہی رہے۔ یہ بات ہے مانی ہوئی

تو اسے چاہے کہے دوں۔ چاہے نیرنگ فسوں
اصل اس کی ہے ازل سے جانی پہچانی ہوئی

اپنی مرضی پر چلانا چاہتا ہے دہر کو
میں سمجھتا ہوں جو تو نے دل میں ہے ٹھانی ہوئی

ہے جو تیرے ذہن کی افتاد وہ اچھی نہیں
نفس کا بندہ جو تھا اس کو پشیمانی ہوئی

چاہتا ہے کیا؟ تجھے کس چیز کی ہے جستجو؟
بات وہ کیا ہے کہ جس سے مجھکو حیرانی ہوئی

عشق لافانی کو تیرے حشو نے فانی کیا
قاطع صلۂ رحم تو غیر انسانی ہوئی

رونق دکاں نہ تھی حلوائے بے دود آ غبی!
ظرف ناکافی تھا۔ رو نکلی ہوئی گھانی ہوئی

جو زیادت تھی وہی باعث ہوئی تخفیف کا
حذف کا تیرے سبب تیری فراوانی ہوئی

تو خزاں کی نذر ہے پھل پھول تازہ ہیں ترے
حالت اپنی اب بتا فانی کہ لافانی ہوئی

اس کے جو برعکس ہے نادر ہے یا خود کردہ ہے
گر گیا ہے اس سے استدلال نادانی ہوئی

ایک کے دو چار۔ دس ہو جائیں تو منفی کہاں
تیری کثرت احدیت کی دشمن جانی ہوئی

دہر کو اپنے کو تو فانی کیے جا شوق سے
اس فنا خوانی سے ہی یہ فتنہ سامانی ہوئی

ہائیں تہیّے تو ترے اتنے بلند ایسے وسیع
نام پر تیرے رقم گویا جہانبانی ہوئی

تو نقیضوں سے بھرا ضدّین کا ہے اجتماع
بات جو ہے تیرے دل کی اپنی ہے جانی ہوئی

تو نہ دنیا کی ادا اور رمز کو سمجھا کبھی
تجھ کو دیوانہ بنا کر وہ نہ دیوانی ہوئی

جاوداں جو تجھ میں شے تھی اس کی پروا نہ کی
مادّی پر مطلقاً حادی نہ روحانی ہوئی

تجھ کو وہ دہ قوتیں دیں جو کسی کو بھی نہ دیں
کب نہ تجھ پر بارش الطاف ربّانی ہوئی

کب کہا تھا تجھ سے دنیا دائمی گھر ہے ترا
آپ بن بیٹھا تو مالک خوب مہمانی ہوئی

ملکیت کے تیرے دعوے ہی تو ہیں یاس آفریں
تیرے دشمن یہ ترا دل۔ یہ تری بانی ہوئی

تو نہ سمجھا عندیہ کل من علیہا فان کا
تو نہیں تیری خودی کی حس ہے جو فانی ہوئی

تھے ترے کچھ فرض ادا کرنے انہیں آیا نہ تو
بھول بیٹھا ان کو جب تحریص نفسانی ہوئی

یہ سنا ہوگا کبھی۔ اللہ بس باقی ہوس
یہ ہوسناکی تری تخریب کی بانی ہوئی

خاک میں تجھ سے ملا وہ جوہر قدس اعزیز
آبرو اس کی ترے کرتوت سے پانی ہوئی

تو نہ تھا تو مادہ تھا تو نہ تھا تو روح تھی
پھر فنا کی کس لئے یہ مرثیہ خوانی ہوئی

صورتیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں ہر آن میں
تیری خوش فہمی کہ جو تغیر ہے فانی ہوئی

(۷ / مارچ ۱۹۳۳ء - طرح مشاعرہ دہلی)

حُسنِ ازل کا جلوہ ہماری نظر میں ہے
دَیر و حرم میں کس لئے آوارہ گرد یاں
جو دیکھنے کی آنکھ ہے تجھکو نہیں ملی
خاموشیوں میں محفلِ انجم کی اسکو دیکھ
دیکھا ہے اور پھر نہیں آیا نظر تجھے
اسکو نتیجے۔ علّتِ غائی کی اِس کو ڈھن
ڈھونڈا ہے جس نے اسنے ہی پایا سنا نہیں
ہاں ہاں خدا خدا ہی ہے اور ہے بشر بشر
وہ بھی تو ہیں نظارۂ کُل جزو میں ہے جنھیں
ہے عشق جز دلا بیخبری۔ یقین جان
کیا شوقِ دید تجھ پہ تو غالب ہے لطفِ دید
نکلے نہ پھنس کے گیسوئے پُرپیچ و خم سے دل
اُلفت ہے کس کی کیسی محبّت۔ کہاں کا عشق؟
ناقص تھی ابتدا تو ہے انجام عشق بھی

جو طور پر ہُوا تھا۔ دل دیدہ ور میں ہے
جس کی تجھے تلاش ہے وہ دل کے گھر میں ہے
وہ نور قدر میں ورنہ شجر میں حجر میں ہے
ہنگامہ مست کیوں تو نمودِ سحر میں ہے
وہ حُسن وہ جلال جو شمس و قمر میں ہے
فرق اس قدر ہی بیخبر و باخبر میں ہے
لکھا ہوا یہ حکمِ قضاء و قدر میں ہے
اس عُقدے کا جو حل ہے وہ قلبِ بشر میں ہے
پوشیدہ رازِ دید تو حُسنِ نظر میں ہے
یہ قسمت مجاز و حقیقت خطر میں ہے
جو بات تیرے دل میں ہے اپنی نظر میں ہے
ساحل پہ خاک پہنچے جو کشتی بھنور میں ہے
معدوم تو تو فکرِ دہان و کمر میں ہے
بے ربطی ابتدا میں جو تھی وہ خبر میں ہے

کیفیؔ مسیحِ شعر ہیں احباب اور بھی
اِک تجھ سے جان تازہ نہیں اس ڈھچر میں ہے

خلجان کیوں یہ مسئلہ خیر و شر میں ہے
کیا جبر و اختیار کو بیٹھا ہے لے کے تو
انسانیت کا جوہرِ اصلی ہے حُسنِ خُلق
ہے بحرِ نیلگوں میں بھی آب اس کی برقرار
سارے جہاں کے درد کا احساس کیونکہ ہو
گر ترکِ کفر و دیں پہ ہو قادر تو مان لیں
پہنچا ہوا جو ہو وہ کہاں ہم میں آپ میں
کرنا جو ہے سو کر لو۔ یہ ہے قال و قیل کیا؟

بیم و رجا کا سحر ابھی تیری نظر میں ہے
جو ہو چکا ارم میں وہی ہر بشر میں ہے
کیا فرق ورنہ آدمی اور جانور میں ہے
خود داری اس قدر تو ہو۔ جتنی گہر میں ہے
ہے لب پہ آہ کچھ بھی کسک گر جگر میں ہے
سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہے
منزل پہ جس کو سمجھے ہو وہ رہگزر میں ہے
معذور ہو تو حیلۂ "اگر" اور "مگر" میں ہے

چلتا ہے فصلِ گل میں جو دل سیرِ باغ پر
بلبل قفس میں رہ کے بھی گویا سفر میں ہے

سر پہ چمن اٹھائے ہے نالوں سے عندلیب
اللہ رے جوشِ عشق جو اس مشت بھر میں ہے

منہ پھیر دیگی بسملِ مظلوم کی اک آہ
دم دیکھنے کو خنجرِ بیداد گر میں ہے

خالی کبھی نہ جائے گی عاشق کے دل کی آہ
ظالم تو یاد رکھ کہ وہ ڈوبی اثر میں ہے

بیٹھا جو پاؤں توڑ کے پھر بھی نہیں سکوں
چکر جو پاؤں میں نہیں وہ میرے سر میں ہے

جوں توں بھرے ہی جاتے ہیں یہ زندگی کے دن
کیا گھر میں ہم کو چین تھا۔ جو دکھ سفر میں ہے

آ بیٹھے چار یار دل میں سب غم ہوئے غلط
من مانتی یہ ایک گھڑی عمر بھر میں ہے

کیفی کو یار صادق و یکرنگ پاؤ گے
ہے بات ایک سی وہ سفر یا حضر میں ہے

(۲۰ جنوری ۱۹۳۳ء۔ طرح مشاعرہ دہلی)

بات حیرت کی کوئی عالمِ امکاں میں نہیں
دیکھنے کی ہیں جو آنکھیں وہ ہر انساں میں نہیں

دو جہاں ایک ہے جو ہوں شیخ و برہمن عاملِ
کیا ہدایت نہیں ویدوں میں کہ قرآں میں نہیں

عمل۔ عزم ہیں محروم جسارت ورنہ
غیر ممکن کا محل عالمِ امکاں میں نہیں

کُن کے اک معنی وہ بنتے ایک یہ ہیں۔ کر کچھ کام
کیا عرب اور عجم متفق اللساں میں نہیں

اب وہ آیا ہے زمانہ کہ بس اللہ کی پناہ
گبر ہیں گبر مسلمان مسلماں میں نہیں

قول تیرا تھا "بلا"۔ فعل ہے "لا" ثابت ہے
تیرے اقرار میں انکار تری ہاں میں نہیں

یوں اگر دیکھئے کیا کچھ نہیں یہ مشتِ غبار
اور اگر سوچئے تو خاک بھی انساں میں نہیں

نکتہ چیں کون ہے نقص اور معایب سے بری
گل بے خار تو کوئی بھی گلستاں میں نہیں

طعن و تشنیع کا ہوتا ہے دلوں پر جو اثر
کاٹ وہ تیغ میں توڑ ایسا تو پیکاں میں نہیں

ہو کسی کی جو بدی مجھ سے تو چاہو سو کرو
نہ کہیں بد مجھے۔ یہ تو مرے امکاں میں نہیں

مدعی تو جو کہے وہ مرے سر آنکھوں پر
بات اتنی ہے کہ منہ تیرا گریباں میں نہیں

رحمت و عفو الٰہی کا ہوا جب سے یقیں
دلفریبی کا اثر لذتِ عصیاں میں نہیں

جادۂ عشق نہ کب رشکِ گلزار ہوا
نوک کی بات کوئی خارِ بیاباں میں نہیں

خاک میں ملتے نہ دل اور جگر کے ٹکڑے
ہائے اتنی بھی تو حالت مرے داماں میں نہیں

عصمت عشق پر اے ضبط یہ نازک ہے گھڑی
بے نیازی کی ادا عشوۂ جاناں میں نہیں

چاہیں جو بات رہے یاد۔ نہ چاہیں نہ رہے
یاد و بے یاد میں نسیاں بھی یہ نسیاں میں نہیں

مجھ کو سودائی کہا جس لیے وہ ظاہر ہی تھا
دل میں وہ چاک پڑے ہیں۔ جو گریباں میں نہیں

پھر کہ سینہ دکھا دوں تو ملک چیخ اٹھیں
یہ تلف آتش گل روضۂ رضواں میں نہیں

کیا عجب سمجھے نہ کیفی کو اگر اہلِ جہاں
کفر میں اس نے وہ پایا ہے جو ایماں میں نہیں

---

۱۵ فروری ۱۹۳۳ء

غازی آباد کے سالانہ مشاعرے کی طرح میں پڑھی گئی۔

جگر کٹ کر رہے پلکوں پہ نہ دل خوں ہو کے دامن پر
ہے سوز عشق کو کیا کیا تبسّم تیرے شیون پر

نظر پڑتی ہے کب اپنی گل و ریحان و سوسن پر
کہ دل کے داغ سوزاں مارتے ہیں آنکھ گلشن پر

یہ قدغن آجکل منطق کا ہے شیخ و برہمن پر
کہ مشتق بحث کر خونِ اخوت میری گردن پر

خلیفہ سے ہے بغداد اور بیضا سے عجم خالی
ہے پھر دار و رسن کا بوجھ کیوں حق گو کی گردن پر

مدد اے ضبط وہ جور و ستم کی مشق کرتے ہیں
نہ آنے پائے دھبا نام کو الفت کے دامن پر

قفس کو داغ عشق گل جواب خلد کر دیں گے
نہ ہو صیاد ہرگز خندہ زن بلبل کے شیون پر

خموشی ہے تصیرِ راز داری دیکھ لو ان کو
نہ دل پہ میل آیا ہو۔ تو بل آتا ہے چتون پر

یہ لازم تھا سبھی ہوں دوست کوئی بھی نہ ہو دشمن
نہ کہ ناز اس پہ ہو اک آنکھ تیری دوست دشمن پر

ازل میں بھر دیا سوز محبت قلب عاشق میں
گری جو کل گری ہوگی وہ بجلی طورِ ایمن پر

بیگانہ حسن صورت میں نہ ہو پایا ہو دل اسکو دو
نماز اگر پڑھیں جنت سے حوریں جھکے دامن پر

ہے دل میں خون۔ خوں ہے گرم۔ پھر کھیتی ہری ہوگی
نہ ہو مایوس اے دہقاں گری جو برق خرمن پر

کہاں کی زیب و زینت جب ہو محتاج سے عاری
مسی پھبتی نہیں ہونٹوں پہ جب چیتھڑا نہ ہو تن پر

یہ ہمت کی ہے پستی حوصلے کی تنگدستی ہے۔
طبیعت تیری گرویدہ ہوئی کیوں آہ و شیون پر

بڑھاپے میں تجھے سوجھا ہے کیا رونا جوانی کا
تسلط کیوں نہیں رہ سکا جوانی کا لڑکپن پر

پس طفلی شباب آتا ہے تو آتی ہے پیری بھی
ہنسی آتی ہے ان پیرانِ نابالغ کے بچپن پر

سمجھ بیٹھا ہے تو کیوں دار فانی بستی دنیا کو
یہاں سے جائیگا تو جب تو ہوگی بھیڑ مدفن پر

نتیجہ کیا کہ وہ نفس و ہوس کوشی کے بندے ہیں
جو الزام خزاں رکھتے ہیں اس اللہ کے گلشن پر

تو مر کر زندہ - ہاں ہاں - زندہ جاوید رہ سکتا
جو مٹ جاتا ادائے فرض پر - اعمال حسن پر

جو کچھ کہتا ہے کیفی گوش دل سے اسکو سن رکھنا
نظر رکھنا نہ اس کے نقص علم و خامیٔ فن پر

دہلی کی بزم سخن کے سالانہ مشاعرے کی طرح میں

(دسمبر سنہ ۱۹۲۳ء)

قیس کا تجھ میں جنوں جذبۂ منصور نہیں
ورنہ منزل گہ دلدار تو کچھ دور نہیں

کوہ و وادی ہی سہی تجلی وہی پھونکتی بھی
جلوہ لیکن وہ دل افروز سر طور نہیں

ڈھونڈنے جاؤں کسے جاؤں تو میں جاؤں کہاں؟
دل کے جو پاس ہے وہ آنکھ سے بھی دور نہیں

پھیر میں ذات و صفت کے نہ سر اسیمہ ہو
نہیں معلوم کہ جوہر سے عرض دور نہیں

نظر آتا نہیں تجھ کو تو ہے آنکھوں کا قصور
عکس سے شخص حقیقت میں ذرا دور نہیں

جلوہ ساماں ہے رہ عشق میں ذرہ ذرہ
صاحب ذوق نظر منتظر طور نہیں

نور وحدت نظر آجائے اگر تو نہ رہے
یہ وہ منظر ہے جہاں ناظر و منظور نہیں

امر حق حرف ازل ہے تو یہ فتوے کیسے؟
وہ نئی بات نہیں - میں کوئی منصور نہیں

جھوٹ سچ اسکو ہے یکساں وہ ہی اپنی دھن کا
حق شناسی مرے نقاد کا دستور نہیں

کبر ہی سے تو عزازیل ہے شیطان رجیم
آدمی ہے وہی انسان جو مغرور نہیں

کیا تماشا ہے لئے جاتے ہیں تقدیر کا نام
اور نہ تدبیر سے اک لحظہ بھی معذور نہیں

نہیں تقدیر کی تحریر سے انکار مگر
اس میں تدبیر مقدر ہے جو مذکور نہیں

آپ تقدیر سدھر جائے گی تدبیر تو کر!
کون کہتا ہے کہ انسان کو مقدور نہیں

تو عوارض سے عوارض کی ہے تجھ سے پرواز
تو جو مطلق نہیں مختار تو مجبور نہیں

ذرے ذرے کو ہے اک فرض ودیعت حق سے
یہ سمجھ تو کوئی قیصر نہیں فغفور نہیں

کارگاہ عمل اس دہر کو وہ سمجھے ہیں
گل و بلبل کے کرشموں سے جو ماتور نہیں

کل میں مل جل کے رہے جز کا ابھی ہے وقار
فرد ناچیز ہے گر شامل جمہور نہیں

کیوں الجھے رہتے ہیں یہ شیخ و برہمن باہم
دیر کعبہ سے جو حق پہ ہو نظر - دور نہیں -

ادب و شعر کا عالم ہے وہ وحدت آئیں
کہ جہاں کافر و دیں دار کا مذکور نہیں

حدِّ جغرافیہ سے شعر کی دنیا ہی جدا
دور کھیلا اس سے دو گز بھی یہاں طور نہیں

کیف باقی ہے وہ اس میں کہ نہیں جس کو خمار
بادۂ شعر کوئی بادۂ انگور نہیں

ساقیٔ مست نظر ہی یہ فسوں یا اعجاز
سب کو مدہوش کیا۔ آپ تو مخمور نہیں

ساغرِ اک اور بھی دے پیرِ مغاں کیفی کو
نشۂ بیخودیٔ عشق میں وہ چور نہیں

(دہلی - ۱۹ ر نومبر ۱۹۳۲ء)

صورتِ حال اب تو وہ نقشِ خیالی ہو گیا
جو مقامِ ماسوا تھا۔ دل میں خالی ہو گیا

ممتنع جو تھا وہ ہے زیبِ بداہت قلب کو
جو یقینی امر تھا وہ احتمالی ہو گیا

چھوڑی خود بینی تو اب ہر شے میں حسن آیا نظر
دیدۂ حق بیں جلالی سے جمالی ہو گیا

ذوقِ نظارہ یہ ہے آنکھوں پہ اب رکھتا ہوں میں
ذرّے ذرّے کو جو نذرِ پائمالی ہو گیا

زعم اور پندار کا حق الیقیں سے ہے بدل
وہ گھروندا اب تو فانوسِ خیالی ہو گیا

آنکھ اٹھ کر حسنِ قدرت ہی جو اپنے پر گئی
سب خودی کا رنگ رنگِ انفعالی ہو گیا

پہلے اس میں سر تھا اے صمصامِ عشق او جان تھی
کیونکہ ملتا تجھ سی آ - اب ہاتھ خالی ہو گیا

غیریتِ دلدادہ و دلدار کی جاتی رہی
اب تو جو ہونا تھا اے آقائے عالی ہو گیا

وجہ علمِ ذات ہو کیونکر نہ عرفانِ صفت
کیا عرض کی شان جب جوہر سے خالی ہو گیا

جو رہا خود دار ہونے پر خودی سے دور دور
وہ دیارِ عشق و دلسوزی کا والی ہو گیا

ہے خطا اس کو اگر عاشق کہو تم۔ جس کا عشق
ختم جب اس نے مراد اک اپنی پا لی ہو گیا

جذبۂ ایثار کیا۔ قوتِ عمل کی پھر کہاں
جب شعورِ انساں کا صرف لاابالی ہو گیا

اے قدامت کیش سن! یہ عالمِ ایجاد ہے
نام جدت کا ازل میں لایزالی ہو گیا

چھوڑ کر لطفِ سخن مغزِ سخن سے کام لو
کیا ہوا کیفی جو گرمِ خوش مقالی ہو گیا

دہلی کی بزم سخن کے سالانہ مشاعرے کی طرح میں
(دسمبر ۱۹۳۱ء)

صفت کی جلوہ پردازی سے کیوں اس پر حیراں ہے
یہ ذات بحت کا جوہر ہے نور شمع عرفاں ہے

عرض کو کس طرح جوہر سے کر دیگا جدا کوئی
ترا دعوے امہل وجہ استہزائے امکاں ہے

حریم عشق صادق سے ہے خارج گریہ و زاری
وہاں ہیں دم بخود آہیں۔ تو نالہ پا بجولاں ہے

جو سمجھے بیٹھے تھے راز دو عالم ہیں زخود رفتہ
نگاہ مست ساقی کا یہ جذب دل پر احساں ہے

نظر کو حسن ہر شے میں۔ جگر میں درد ہر دل کا
یہی ہے عشق کا مذہب یہی عاشق کا ایماں ہے

خدا جانے کہاں کی سرد مہری آ گئی ہم میں
جلے جو دوسروں کی آگ میں وہ بھی تو انساں ہے

یہ دقت ہے کہ سہل ممتنع ہر سہل کو سمجھے
اگر دشوار کو دشوار سمجھیں مشکل آساں ہے

ہوا پانی جو سوز عشق میں دل اس نے بھر پایا۔
یہ ہے وہ ابر جس کی تہ میں برق طور پنہاں ہے

مبرا ہو نہ ہو سکتے ہو تم تعبیر سے اس کی
نہ سمجھو زندگانی کو کہ اک خواب پریشاں ہے

جہاں اک موج مٹتی ہے وہیں پیدا دوسری اٹھتی
عدم سمجھا جسے اے آشنا ہستی کا طوفاں ہے

ادھر آ مدعیٔ عشق تیرا دل تو دیکھوں میں
مری نظروں میں۔ ہاں ہاں یہ ترا چاک گریباں ہے

ترا دنیا میں دل ہے اور میرے دل میں کل دنیا
جو تجھ میں اور مجھ میں فرق ہے زاہد نمایاں ہے

نہ مارے انجمن پر آنکھ کیوں یہ میری تنہائی
تصور کا ہجوم بیکسی میں مجھ پر احساں ہے

بیاں دل تنگیٔ وحشت کی ہو کیا وسعت آرائی
جو دم نکلا تو سمجھا اس کو میں یہ اپنا ارماں ہے

دل ویراں کو میں لیکر جو آیا دشت وحشت میں
تو ذرہ ذرہ چیخ اٹھا بیاباں میں بیاباں ہے

جو آ جاتا۔ یہاں قیس اپنی لیلے کو بھلا دیتا
کہ ذرہ ذرہ اس دشت جنوں کا جلوہ ساماں ہے

یہ کیوں کیفی پہ صادر ہو رہے ہیں کفر کے فتوے
سنا تھا ہم نے وہ تو مرجع گبر و مسلماں ہے

---

۲۵ نومبر ۱۹۳۱ء۔ مشاعرہ رام پور۔ بتقریب سالگرہ مبارک ہز ہائنیس۔

نشاں اس شخص کے سجدوں کے مٹ جاتے ہو تم در سے
جبیں کے مس کو جس کی آج تک دیر و حرم ترسے

جناب محتسب ہم اور توبہ آپ کے ڈر سے
یہاں تو پینے والے ہیں کف ساقیٔ کوثر سے

جو ہے معبود اپنا ہر کہیں ہے حاضر و ناظر
نہ ہم کو کام مسجد سے نہ مطلب ہم کو مندر سے

تعلق ہے جو حُسن و عشق میں یوں آ کو جانو تم
جدا آئینہ سے جوہر نہ آئینہ ہے جوہر سے

ہوئے جو عشق میں بیخود انہیں کیا رنج فرقت کا
بس اتنا جانتے ہیں کھُب گئے ہیں دل اُن نشتر سے

یہاں کیا ہو گیا الطاف عاشق جو وہاں ہوگا
تہیدستانِ الفت کیا امیدیں باندھیں محشر سے

کسی کا پاس ہے اسکو تو بس ناموسِ الفت کا
جو اک حرفِ تسلّی کیلئے بھی عمر بھر ترسے

نیازِ عشق و نازِ حسن میں ہے احدیت کامل
غرض کو کہہ نہیں سکتا جدا کوئی بھی جوہر سے

کسی کے وعدہ و اقرار پر ڈھارس ہو کیا دل کو
جو اس کا حشر ہونا ہے عیاں ہے اس کے تیور سے

وہ سمجھے عرضِ حالِ دل کو افسانہ غنیمت ہے
مجھے تو تھا یہی دھڑکا وہ اب برسے کہ اب برسے

شمارِ داغہائے دل کو عمرِ خضر ناکافی
کسے فرصت کہ جی بہلائے اس بزمِ اختر سے

تجھے چُپ لگ گئی اے چارہ گر کیوں حالِ دل سُنکر
ذرا تو بول تو منہ سے ذرا تو کھیل تو سر سے

غزل پھر اس روش کی یہ ظریفانہ ستم کیسا
قرابہ نوش و عبادت کی ہو کیا تسکین ساغر سے

اسی کی خاک کا اِک ذرّۂ ناچیز ہوں میں بھی
سندِ علم و ادب اور شاعری نے پائی جس گھر سے

سخن سنجی کا چرچا ہو نہ کیوں اس دور میں کیفی
جو دو دن پہلے حکم آئے کہ چلئے اٹھئے بستر سے

(دہلی - ۱۰ر دسمبر ۱۹۳۳ء)

فدا اللہ کی خلقت پہ جس کا جسم و جاں ہوگا
وہی افسانۂ ہستی کا میرِ داستاں ہوگا

یقیں جس کا کلامِ قدس اجر المحسنین پر ہو
نکوکاری کا اس کی قایل اک دن کل جہاں ہوگا

حیاتِ جاودانی پائیگا وہ عشق صادق میں
جو عنقا کی طرح معدوم ہوگا بے نشاں ہوگا

سفر راہِ محبت کا سہل قدمی سمجھتے ہو
ابھی دیکھو گے تم اک اک قدم پر ہفتخواں ہوگا

ہمیں گلزارِ جنت سے عزیز و باغِ دل اپنا
سمجھتے ہو کہ جاں پرور ہے صحنِ گلستاں ہوگا

جو ایثار اور ہمدردی شعار اپنا بنالوگے
تو کانٹا بھی تمہیں رشکِ گلِ باغِ جناں ہوگا

یہ قصّہ شمع و پروانہ کا بس ما و شما تک ہے
وہ ہو جائیگا بزم آرا تو پھر کوئی کہاں ہوگا

ادائے فرض بر حق پر کھپا دو دوستو جاں تک
یہ وہ سودا ہے آخر کو نہیں جس میں زیاں ہوگا

ازل سے واعظوں کے قول دنیا سنتی آئی ہے
عمل کا وقت بھی کوئی کبھی اے مہرباں ہوگا

تغافل اور ستم کے بعد ہے انداز دلداری
سنبھل اے شوقِ بے پایاں ترا اب امتحاں ہوگا

ہندوستان قسمت کو تو دم لینا قیامت ہے۔ یہاں کچھ ہو گیا انصاف عاشق جو وہاں ہو گا۔
نہ سمجھو کھیل اسکو بزم کیفی میں وہ جادو ہے
یہاں گر زاہد خشک آئے گا پیر مغاں ہو گا

مَیں کچھ نہیں کہتا

(لاہور۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۲۲ء)

باعث کوئی ایسا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
الزام یہ جھوٹا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا
جھوٹا ترا کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
تو دیکھ رہا ہے جو مرا حال ہے قاصد!
کہنا جو نہ تھا کہہ گیا دیکھو تو ڈھٹائی
وہ ضد پہ تُلے بیٹھے ہیں کیا بحث سے حاصل
تھی شمع خراشی کی شکایت کبھی ان کو
بد گوئی سی بد گوئی ہے بہتان سا بہتان
میں کچھ کہوں تو ہاتھ وہ کانوں پہ ہیں دھرتے
آتا ہے جو منہ پر وہ کہے جاتے ہیں بے رنگ
میں دیکھ چکا ہوں انہیں کہہ کہہ کے۔ مگر کیا
میں کس سے کہوں کیا کہوں سنتا ہی وہاں کون
یہ ترک محبت نہیں ان سے۔ مگر اے دوست
قینچی سی چلی چلتی ہے۔ دیکھو تو زباں۔ اور
راز اُن کے کھلے جاتے ہیں ایک ایک بھول پہ
سچ بات کے سننے کی انہیں تاب کہاں ہے
باتیں ہیں کہ چھریاں سی چبھی جاتی ہیں دل میں
میں کہنے پہ آ دوں۔ تو رُلا کر انہیں چھوڑوں

ورنہ مجھے سودا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کیا وہ مری سنتا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا
دعویٰ مرا سچا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا
مجھ کو یہی کہنا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا
اور پھر کہے جاتا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا
موقع ہی یہ ایسا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اب سنتا ہوں شکوا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اور اس پہ وہ کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اور الٹا یہ جھگڑا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا
اور اس پہ یہ فقرا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اس کا ہی نتیجہ ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا
اس کا ہی یہ منشا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا
رنج ایسا ہی پہنچا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا
اس پر بھی یہ دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اور اس پہ تماشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اس سے ہی اچھا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا
میرا ہی کلیجا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا
مت پوچھ سبب کیا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا

چپ چاپ سنی ان سنی کر دیتا ہوں ہر بات
غیروں میں بھی چرچا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

نازک ہے مزاج ان کا یہاں سچ کی ہے عادت
اب سمجھے سبب کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

بگڑا ہے مزاج اور کہیں تیز نہ ہو جائیں
مجھکو یہی سانسا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کیوں اپنی زباں سے کہوں پوچھو تم انھیں سے
راز اس میں نہیں یا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

جو رنج عزیزوں نے دئے کیا کہوں کیفی
غیرت کا تقاضا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

یاد نہیں

(لاہور - ۱۱؍اگست ۱۹۳۲ء)

داستاں عمر گزشتہ کی ہمیں یاد نہیں
یاد بھی ہے تو بس اتنا کہ ذرا یاد نہیں

کیونکہ گزرا تھا؟ کب آیا؟ ہوا کب ختم شباب؟
شیخ ہے یاد تمھیں؟ ہم کو تو کچھ یاد نہیں

باتیں وہ عہد جوانی کی کچھ ایسی ہی تھیں
قابل ذکر ہوں تو ہم نہ کہیں یاد نہیں

خاک بھی ہوش نہیں کیونکہ کٹا عہد شباب
سچ جو پوچھو تو یہی خوب ہے کچھ یاد نہیں

صحبتیں اگلی جو یاد آتی ہیں جی کڑھتا ہے
کوئی پوچھے بھی تو کہہ دیتے ہیں ہم یاد نہیں

جب عدم میں تھے تو معلوم تھیں ساری باتیں
اب یہاں آئے تو واللہ کہ کچھ یاد نہیں

شیخ کل رات کہاں تھے بخدا سچ کہنا
کیا کہا یاد نہیں۔ پھر تو کہو یاد نہیں

رہرو ڈھونڈتے کیا پھرتے ہو منزل کا پتا
کب ہوا کوچ؟ کہاں سے؟ یہ تمھیں یاد نہیں

جب وہ آئے تو ہمیں بیخود سا پڑا پھرنا تھا
اس قدر ہوش تھا اور اس کے سوا یاد نہیں

شبھ گھڑی عمر میں ایک آئی تھی اتنا ہی خیال
کیفیت ان سے ملاقات کی تو یاد نہیں

یاد رہتا تو یہ تحقیر تھی مے کی ساقی!
دور سابق میں بھی پی تھی یہ ہمیں یاد نہیں

بیخودوں سے گلہ احسان فراموشی کا!
سر تھا گردن پہ کبھی یہ بھی یہاں یاد نہیں

یاد جب ان کو دلاتا ہوں وفا کے وعدے
کہتے ہیں یاد نہیں۔ کہا تو دیا یاد نہیں

کب فراموشی کی عادت ہے یہ ہے ضد کی بات
یاد کی بھول ہے یہ بھول کی یہ یاد نہیں

بھول کر بھی جو نہ یاد آئے وہ ہے میرا نام
یہ اگر بھول ہے تو یاد کوئی یاد نہیں

چاہیں جو بات رہے یاد نہ چاہیں نہ رہے — بھول یہ بھول نہیں یاد بھی یہ یاد نہیں
تنگ آکر جو سنادیں وہ پتے کی باتیں — کہا منہ پھیر کے۔ ہاں یاد نہیں۔ یاد نہیں
ہاں وہ کیا بات تھی فرماتے ہیں کس ناز سے وہ — مجھ سے کیوں پوچھنے بیٹھے ہیں اگر یاد نہیں
بات کل ہی کی تو ہے جس سے تجاہل ہے تمہیں — فائدہ یاد دلانے سے اگر یاد نہیں
نقش ہے دل پہ کسی نے اگر احسان کیا — جو سلوک اور ہوئے ہیں وہ ہمیں یاد نہیں

سازشیں غیبتیں کیا کیا نہ ہوئیں۔ وہ لیکن
یہی کہتے رہے کیفیؔ۔ تو ہمیں یاد نہیں۔

(دہلی۔ ۲۸؍ جنوری سنہ ۱۹۳۲ء چند شعر پہلے کے تھے)

لطف ہو حشر میں کچھ بات بنائے نہ بنے — آنکھ بھی شوخ ستمگر سے چرائے نہ بنے
مجھ کو اٹھوا تو دیا اس نے بھری محفل سے — کون تھا یہ؟ کوئی پوچھے تو بتائے نہ بنے
بات ساری یہ ہے وہ ضد پہ اڑے بیٹھے ہیں — یاد کی بھول ہو تو لاکھ جتائے نہ بنے
تم سے اب کیا کہیں۔ وہ چیز ہے۔ داغ غم عشق — کہ چھپائے نہ چھپے۔ اور دکھائے نہ بنے
سیدھی باتوں پہ ہے مطلوب سند اور ثبوت — ہیں وہ کج بحث زباں ان سے لڑائے نہ بنے
فتح کا راز ہے۔ ثابت قدمی اور ہمت — کام بھی ہے کوئی ایسا کہ بنائے نہ بنے
بات وہ کہہ گئے آئے بھی تو کس طرح یقیں — اور سحر اس میں کچھ ایسا ہے بھلائے نہ بنے
بیکسی کی ہے مصیبت میں شکایت بے سود — کب پڑا وقت کہ اپنے بھی پرائے نہ بنے
غم جو پیارے سے ملے کیوں نہ ہو وہ بھی پیارا — بھولنا بھی اسے چاہیں تو بھلائے نہ بنے
ہے نظر میں وہ سماں نقش ہے جس کا دل پر — ورد وہ نام ہے لب تک جسے لائے نہ بنے
بیخودی کا ہے جہاں پہ اثر ناز و نیاز — سرکشی بھی نہ چلے سر بھی جھکائے نہ بنے
آہ سرد اور بھی بھڑکاتی ہے شعلہ دل میں — یہ دیا وہ ہے جو پھونکوں سے بجھائے نہ بنے
سرو آزاد ہے دل رشک نمائش ہے عبث — خار کھائے نہ بنے۔ گل بھی کھلائے نہ بنے
عین بیرنگی ہے نیرنگ تماشا ہر چند — یہ وہ عریانی کا پردہ ہے اٹھائے نہ بنے

بیخودی میں بھی تو کیفیؔ کی یہ خودداری ہے
حال دل پوچھ بھی لیں وہ تو سنائے نہ بنے

(دہلی۔ ۲۵ اگست سنہ ۱۹۳۱ء)

لب ساغر سے سُن لو زاہد و تقریرِ میخانہ
شکست توبہ ہی ہے بلنئے تعمیرِ میخانہ

ازل سے اس پہ رحمت ہے ابد تک اسپہ رحمت ہو
رقم ہے خطِ جام بادہ میں تقدیرِ میخانہ

تو کیا اے زاہد خشک اس کی عظمت جان سکتا ہے
قلم ہے موج کوثر کے کھچی تصویرِ میخانہ

"بمے سجّادہ رنگیں کُن گرت پیر مغاں گوید"
کہ دانائے رموز دو جہاں ہے پیرِ میخانہ

بلا پاؤگے اسکا سلسلہ تسنیم و کوثر سے
بہت طول و طویل اے شیخ ہے زنجیرِ میخانہ

بنا ہے شیشۂ مے سر بسر آئینہ محشر
بھری زور و ریا سے ہے جوان و پیرِ میخانہ

تو ساری عمر اب ہاتھا رگڑتا رہ۔ گڑگڑا کے کر۔
نہ ٹالے سے ٹلے اے شیخ یہ تعزیرِ میخانہ

دہائی سلسبیل و کوثر کی یہ ہیں نفس کے بندے
جو وصلِ حور کی خاطر کریں تحقیرِ میخانہ

حباب خطِ جام و قلقلِ مینا سے ثابت ہے
وہ ہے تسبیحِ میخانہ یہ ہے تکبیرِ میخانہ

گرا جو خشت خم پر سر لب کوثر نے چوما ہے
کہ ہے تقصیرِ میخانہ ہی میں توقیرِ میخانہ

نہ کیوں ہر قطرۂ مے مہر کی آنکھوں کا تارا ہو
کہ برقِ طور کی ہے اک چمک تخمیرِ میخانہ

پڑی ہے اک نظر جس پر وہ بیخود ہو گیا کیفی
نگاہِ مستِ ساقی میں ہے کیا تاثیرِ میخانہ

جسکو خبر نہیں اسے جوش و خروش ہے
ہے ایک شورِ بلبل و صوتِ شگفتِ گل

آئی نہ تھی شکل دل کے جو آئینہ میں نظر
یہ حال ہو کہ آپ میں عالم کو دیکھ لے

کب ہے کمالِ عشق پہ حاوی غمِ فراق
دارفتۂ ہوائے طرب یاد رکھ اسے

برقِ جمال نافۂ ما دشتہا ہوئی
کیا ہے ترا حدوث و قدم۔ ہم تو ہیں وہاں

عشاق جامہ پہنے ہیں تسلیمِ عشق کا
تیرے جہاں سے محفلِ رنداں جدا ہے شیخ!

جو پا گیا وہ راز وہ گم ہے۔ خموش ہے
یہ صورِ عافیت ہے۔ وہ بے ہوش ہے

بند آنکھ اس سے اور زباں بھی خموش ہے
گر دل میں تیرے عشق کی کثرت کا جوش ہے

ایک ایک ذرہ قیس کو محمل بدوش ہے
جو ورد کی کھٹک ہے نوید سروش ہے

کیا ذکر شمعِ طور کہ وہ بھی خموش ہے
ہستی جہاں عدم کے لئے خواب نوش ہے

دستار و جبۂ شیخ کا ہاں پردہ پوش ہے
ہر ایک مغبچہ یہاں کوثر فروش ہے

ساقی کی ایک نظر ہی ہمیں مست کر گئی — کس کو صراحی و خم و ساغر کا ہوش ہے
امرت کے چھانٹے مرکیاں لا تقنطوا کی ہیں — اس بزم میں یہ شغلۂ نا و نوش ہے
کیفی یہ اہلِ دہر سے کہدو پکار کر
اس بزم میں وہ آئے کہ جو سرفروش ہے

عہد وفا سے یہ نہیں اقرار ہی نہیں — کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں۔ انکار ہی نہیں
ان کو تو ضد یہ ہے کہ نہ ہوگا جو میں کہوں — بھولے نہیں وہ قول سے انکار ہی نہیں
کیا بھولے بن کے کہتے ہیں پھر کوئی کیا کرے — اسکو تو اک جنون ہے وہ بیمار ہی نہیں
اس کا علاج ایک ہے۔ اب تم سے کیا کہیں — اچھا دوا سے ہو یہ وہ آزار ہی نہیں
نظروں میں تیر۔ اداؤں میں خنجر کبھی نہ تھے — پھر کیا ہوا کمر میں جو تلوار ہی نہیں
کچھ وہ بھی ہیں جو پیٹھ میں سینہ میں چار گرہ — پیکاں جن کے اور کہیں سوفار ہی نہیں ہا
اے عکس ریزہ والے تجھے کیا دکھائی دیں — دل کی تو چوٹ ممکن الاظہار ہی نہیں

گل کیا ہے پتے پتے ہیں اک شان دلبری — آنکھیں تمہاری طالب دیدار ہی نہیں
اب آپ ہی بتائیں کہیں کس سے کیا کریں — جب امر حق کا کوئی روادار ہی نہیں
وہ جوہری رہے نہ مبصر ہی وہ رہے — جنس ہنر کا کوئی خریدار ہی نہیں
کایا بدل ہوا ہے۔ زمانہ کچھ اس قدر — وہ خلق وہ سلیقۂ گفتار ہی نہیں
دنیا کی بات کیفی بیخود سے کیا کریں
مست الست وہ تو ہے سرشار ہی نہیں

مشاعرہ حیدر آباد۔ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء

اک خواب کا خیال ہے دنیا کہیں جسے — ہے اس میں اک طلسم تمنا کہیں جسے
اک شکل ہے تفنن طبع جمال کی — اس سے زیادہ کچھ نہیں دنیا کہیں جسے
خمیازہ ہے کرشمہ پرستئ دہر کا — اہل زمانہ عالم عقبیٰ کہیں جسے
اک اشک وارمیدۂ ضبط غم فراق — موج ہوائے شوق ہے دریا کہیں جسے

باوصف ضبط راز محبت ہے آشکارا — عقدہ ہے دل کا عقدہ ثریا کہیں جسے
برہمزن حجاب ہے۔ خود رفتگی حسن — اک شان بیخودی ہے زلیخا کہیں جسے
عکس صفائے قلب کا جوہر ہے آئینہ — وارفتۂ جمال خود آرا کہیں جسے
رم شیوہ ہے صنم تو ہے رم آشنا یہ دل — حاصل ہے مجھ کو عیش مہیا کہیں جسے
خونی کفن یہ سینت کے رکھا ہے کس لئے — قاتل وہ ہے کہ رشک مسیحا کہیں جسے

سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں دہر کا وجود
کیفی یہ بات وہ ہے معمّا کہیں جسے

چینئی - ۲۷ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء

زندگی کا کس لئے ماتم رہے — ملک بنتا ہے مٹے یا ہم رہے
دل رہے پیری میں بھی تیرا جواں — آخری دم تک یہی دم خم رہے۔
چاہئے انساں کا دل ہو غنی۔ — پاس مال و زر بہت یا کم رہے
کیا اسی جنت کی یہ تحریص ہے — جس میں کچھ دن حضرت آدم رہے
وصل سے مطلب نہ رکھ تو عشق کا — دم بھرے جا دم میں جب تک دم رہے
لاگ اک دن بن کے رہتی ہے لگاؤ۔ — ہاں لگاوٹ کچھ نہ کچھ باہم رہے
عشق نے جس دل پہ قبضہ کر لیا — پھر کہاں اس میں نشاط و غم رہے
شرق سے جب نور چمکا تو کہاں — برگ گل پر قطرۂ شبنم رہے
حسن کی دنیا کا ہے۔ دائم شباب — حشر تک اس کا یہی عالم رہے

ہے سرور حسن کیفی لازوال ہے۔
درخور ظرف اس میں بیش و کم رہے۔

چینئی - ۷ر مئی سنہ ۱۹۲۹ء

نسیم باغ ارم ہے صبا جہاں کے لئے — نہیں وہ روح رواں صرف گلستاں کیلئے
ہے مہر و ماہ کا فیض ایک سا ہر اک شے پہ — یہ راہ بانٹ کے دیوے ہیں کل جہاں کیلئے
زباں بنی ہے بشاشت کا راگ گانے کو — نہ داستان غم و حسرت و فغاں کے لئے

کھلیں گے دیدۂ دل چھوڑ گریہ زہ آنند — ہے سرمہ خاکِ الم چشمِ خوں فشاں کے لئے

تو مست کھا کے ہے پھل اور سونگھ کر یہ پھول — نہ کھتے مزے یہ مشام اور فقط دہاں کے لئے

ہو نورِ حُسن جو دِل میں تو ہر نفس تیرا — شمیمِ باغِ جناں ہو مشامِ جاں کے لئے

سمجھ کے زیست کو دو روزہ کیوں ہوا مایوس — جہاں ہے تیرے لئے اور تو جہاں کے لئے

اجل جو آنی ہے آ کر رہے گی اپنے آپ — تو پالتا ہے یہ کیوں روگ اپنی جاں کے لئے

شباب جیسے لڑکپن کے بعد لابُد ہے — اسی طرح ہے بڑھاپا بھی ہر جواں کے لئے

بنی ہے تیری ہی خاطر تو ساری موجودات — زمیں کا لقمہ نہ تو جورِ آسماں کے لئے

جو کائنات کا خلّاق ہے خدا تیرا — تو دِل میں آگ نہیں کیوں ہر انس و جاں کے لئے

ہے دقت حل ہو معمائے حال و استقبال — زمانہ یہ نہیں ماضی کی داستاں کے لئے

عیاں جو ہے اُسے پنہاں پہ چھوڑتا کیوں ہے — کیا یہاں کا ہی توشہ بنے وہاں کے لئے

نہیں ہے تجھ میں جو ایثار اور جانبازی — تو منہ اٹھائے چلا کیوں ہے امتحاں کے لئے

اٹل ہے عزم ہی تیرا نہ حوصلہ ہی بلند — مزّے کس لئے پھر تو نے آسماں کے لئے

قوی دلوں کو ہے میدانِ امتحاں دُنیا — تماشے کی ہے جگہ قلبِ ناتواں کے لئے

وہ آئیں بزمِ عمل میں جو کام کے ہیں لوگ — جگہ نہیں یہ تماشائی۔ نوحہ خواں کے لئے

تسلّی رکھ ابھی ترکش سے آیا چٹکی میں — جو تیر چاہیئے اس سینۂ تپاں کے لئے

رہین بخت کا اختر بھی اوج پہ ہو گا کہ — بنیں گے اور ستارے جبینِ آسماں کے لئے

جو حوصلہ ہو پیو ڈگڈگا کے یہ ساغر — ہے ظرف کی بھی ضرورت مئے مغاں کے لئے

جو حوصلوں کو ابھارے وہ جذبِ پنہاں قلم — اُجالے قلب کو یہ شرط ہے بیاں کے لئے

تو کیا غرابت و تعقید سے لے کے بیٹھا ہے — دلوں پہ قبضہ ہی معراج ہے زباں کے لئے

غزل سے پائی ہے کیفی نئی نرالی شان
یہ ظرف تنگ نہیں ہے مرے بیاں کے لئے

(چنیئی - ۲ر اپریل ۱۹۲۹ء)

حُسن جلبابِ عدم سے جو درخشاں نکلا — مصحفِ عالمِ ایجاد کا عنواں نکلا

ہے جہانگیر ضیا پاشیٔ حسنِ تکوین — اب تو ارمان ترا عالمِ امکاں نکلا

ہے خطوطِ دل و رُوح بشریت اس میں | حُسن کی بزم سے کوئی نہ پریشاں نکلا
کیسی حیرت کہ ہو جب خلد نظر نظّارہ | کام تجھ سے نہ کوئی دیدۂ حیراں نکلا
ہے عدو ذہنیتِ خلق کا رنج اور ملال | قید اندوہ میں پڑ کر کوئی انساں نکلا؟
جو سمجھتا ہے کہ انساں ہے ضعیف البنیاں | ذہن سے اس کے نہ اندیشۂ شیطاں نکلا
حُسن کو جس نے دو روزہ کہا کوتہ بیں تھا | اس کے سینہ سے نہ خارِ غمِ عصیاں نکلا
گوش و گردن نے جو پھیلائے ترے دستِ سوال | لعل و الماس سے پُر کوہ کا داماں نکلا
عارضی زیب گلے کا جو ترے ہار ہوئی | بحر سے سلسلۂ گوہرِ غلطاں نکلا
حُسن قدرت سے ہے انساں کی حُسن آرائی | غازہ و عطر کا گل بوٹے سے ساماں نکلا
ہے شرر آلودۂ حُسن سے عالم کی فضا | اس کا گلشن ہی نہ اک بندۂ احساں نکلا
برق کا ہے وہ تبسّم کہ وہ ہے خندۂ گل | حُسن ہر رنگ میں ہر شان میں رخشاں نکلا
حُسن کا ہے یہ وفور اس کو نہ کہہ دل تنگی | رنگ بھی سینے سے غنچے کے پرافشاں نکلا
دُرّۃ التاج سعادت ہے پرستارئ حُسن | نفس کا لوث ہی برہم زنِ ایمان نکلا
پردہ کاہ کہ ہے وہ گل و برگِ گلبُن | حُسن ہر رنگ معیّن سر و ساماں نکلا

ہے گلِ حُسن سے لبریز یہ دنیا کیفی
نظرِ قلب کا بھی تنگ ہی داماں نکلا

جموں - ۲۴؍ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء

جس کو ظاہر نہ کیا شعلۂ سینائی نے | راز وہ فاش کیا حُسن کی رعنائی نے
چشمِ دل وا ہوئی اے حسن! محبت بیدار | طرفہ جادو یہ جگایا تری انگڑائی نے
خود کو رکھا نہ کہیں بُت ہرجائی نے | کیا ہی نیرنگ کیا حسن کی یکتائی نے
گل پہ بُلبل ہے فدا سرو پہ قمری ہے نثار | گل کھلائے ہیں یہ کس کی چمن آرائی نے
کر دیا کثرتِ جلوہ نے نظر کو خیرہ | دیکھنا تھا جو نہ دیکھا وہ تماشائی نے
دلِ صافی میں نہیں جوہرِ ذاتی کے سوا | دیکھ لو رکھ کے ہزار آئینوں پر آئینے
ایک دم بھی نہ تصوّر نے اکیلا چھوڑا | انجمن میں مجھے رکھا مری تنہائی نے
پیکرِ خاک ہے تو چرخ پہ چھا مثلِ غبار | تجھ کو مٹی میں ملایا ہے جبیں سائی نے

روحِ تازہ دلِ مردہ میں سرایت کرتی — مُردہ تن ہی تو کیے زندہ مسیحائی نے
کاش ہر چیز میں تو اپنا ہی جلوہ دیکھے — محو کر رکھا ہے تجھ کو جو خود آرائی نے
سوچ تو کن کو سناتا ہے یہ باتیں کیفی
تجھ کو دیوانہ بنایا تری دانائی نے

۱۱ر جنوری سنہ ۱۹۲۶ء

پردہ دار ہستی تھی ذات کے سمندر میں — حُسن خوب کھل کھیلا اس صفت کے منظر میں
حُسن عشق میں ہے یا عشق حُسن میں مضمر — جوہر آئینہ میں یا آئینہ ہے جوہر میں
عشق محشر آرا کی طور پر گری بجلی — حُسن لنترانی کی رہ سکا نہ چادر میں
دیکھے تماشائی گل ہے رنگ و بو یا گل — امتیاز ناممکن ہے عرق سے جوہر میں
گل ہیں اور بلبل ہیں کون جانے کیا گزری — چشم پوش مستی تھی اس برہنہ منظر میں
اوچھی بناتے ہیں حسن کو سخن گو کیوں — کاٹ ان اداؤں کا کب ہے تیغ و خنجر میں
فرطِ سوزِ الفت میں دیکھا سکوں دل کا — بجلیاں مچلتی ہیں یا دلوں کے محشر میں
چارہ گر کو حیرت ہے ارتقائے وحشت سے — پانو میں جو چکر تھا۔ آرہا ہے وہ سر میں
حسرت و ارمان کی ہو کہاں سے گنجائش — ہے وہی مرے دل میں ہے وہی مرے سر میں
ہو وہ رند یا صوفی مست اسکی دھن میں ہیں — جانے کتنے مینخانے بھر دیے ہیں کوثر میں
چرخ کیا اتر آیا۔ آج فرشِ گیتی پر — رند بھی ہیں چکر میں میکدہ بھی چکر میں
مے وہ ہوش پرافگن اور نظر وہ صہبا پاش
مست کیوں نہ ہو کیفی ایک دو ہی ساغر میں

لاہور۔ فروری سنہ ۱۹۲۸ء

ایسی بھی زیرِ چرخ کوئی گلزمیں نہ ہو — عاقل جہاں سوائے غم و بغض و کیں نہ ہو۔
بغض اور کیں نہ ہو تو کشاکش کا ذکر کیا؟ — جابر نہ ہو کوئی۔ کوئی اندوہگیں نہ ہو
اندوہگیں نہ ہو۔ جو دل عافیت پسند — وہ شکوہ سنج گردشِ چرخِ بریں نہ ہو
چرخِ بریں نہ ہو تو نہ ہو عرش کا وجود — ربُّ العلا کی ذات بھی کرسی نشیں نہ ہو

کرسی نشیں نہ ہو جو سرِ عرش نورِ پاک
اس ساری کائنات کی ہستی کہیں نہ ہو

ہستی کہیں نہ ہو تو عدم ہی عدم ہو پھر
ساقی و رند بادہ - خم و مینا کہیں نہ ہو

یہ کیفیت نہیں تھی کبھی سارے جہان کی
منظور ہے جو اس کا اعادہ کہیں نہ ہو

آپس میں صلح اور مدارات سے رہو
ناحق کے مدعی نہ ہو - اور نکتہ چیں نہ ہو

اصلاح کی سعی ہو - خطا پوشیوں کی رسم
حق بیں تمہاری آنکھ ہو اور خوردہ بیں نہ ہو

یہ عذر لنگ ہے کہ ہے بدلے میں بد سلوک
تکرار سے بدی کی کوئی بہتریں نہ ہو

نیکی کبھی بدی سے نہ پیدا ہوئی نہ ہو
پھن میں تو اژدھا کے کبھی انگبیں نہ ہو

اخلاق کی کتاب میں دیکھا تھا ایک بار
تم کو بھی وہ سناؤں جو چیں بر جبیں نہ ہو

تھا اک سوال کون ہے اپنا ہی گھر کن
اہل وطن یہ ڈر ہے مجھے وہ تمہیں نہ ہو

کیفی غزل کا طرز نکالا یہ تم نے خوب
اس میں جو رنگِ عشق مجازی نہیں نہ ہو

جموں - ۳ر مارچ ۱۹۲۵ء

وہ بھی ہوں گے عمر بھر دنیا میں جو بھٹکا کئے
ہم تو دل ہی دل میں خلوت کے مزے لوٹا کئے

بوالہوس جو ہیں وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے کبھی
تم عبث رازِ محبت ان کو سمجھایا کئے

سب دکھاوا تھا بلا آئندان کو اور نہ ورد
مدتوں ہنستے رہے اور مدتوں رویا کئے

ایک بلبل تھی قفس میں جو پھڑک کر مر گئی
ہم تو زنداں میں بہارِ گلستاں دیکھا کئے

ہے وہ بت خانہ میں اچھا - بلکہ کعبہ میں بہت!
بس جی بس ہم سمجھے - اد تم ہم کو سمجھایا کئے

ہم معاذ اللہ بنے خالق کے والی اور امین -
تم نے ہنگامے نہ کیا کیا دہر میں برپا کئے

شمع ہے لے نور اور پروانہ ہے بے بال و پر
کام دیکھو اک شعاعِ مہر نے کیا کیا کئے

ہے سمجھ تو موت کا بیما کرو اعمال سے
ہو نہ بے پروا کہ ہو تم زندگی بیما کئے

ایک بد کو نیک کر دیتے تو جیوں تھا سپھل
کیا کسی کو تم نے کام اچھے کئے - اچھا کئے

کام ہاتھوں کا بھی ہو سکتا ہے باتوں سے کوئی
کیا ہوا زورِ زباں سے مسئلے چھانٹا کئے

اختلاف اضداد کا تم فرق سمجھے ہی نہیں
تفرقے بیٹھے اٹھانے - تفرقے پیدا کئے

ہوش کی لیں کس ہوا میں حضرت زاہد ہیں آپ
ہم کوئی ہوتے ہیں رسوا آپ کے رسوا کئے

یہ کہیں گے پڑھ کے وہ اس عہد کے اخبار حیف | وہ سبق مہر و اخوت کے سلف نے کیا گئے
موڑ کر منہ ان سے راہِ حق پہ سیدھا ہو لیا | کیا نہ شیخ و برہمن کیفی کو بہکا یا گئے

بات مطلب کی ہو سنانی تھی سنا دی آپ کو
بیٹھے رہیئے ورد روف و زاہد و ایطک گئے

دیگر

کس نے داغِ دل بجھائے کس نے چاک دل سیئے | حشر تک رہ باٹ کے جلتے رہیں گے یہ دیے
کام کر اپنا۔ خدا کو تو خدا پر چھوڑ دے | مفت کے یہ مخمصے کیوں تو نے اپنے سر لیے
جاہ و حشمت اور خزانے ساتھ جانے کے نہیں | ساتھ جائیں گے جو کام اچھے برے تو نے کیے
نفس مطلب کو جو جانچیں جھوٹ سچ سے دیں نکال | ہیں وہ پکے جوہری اور ہیں وہی تو نیاریے
زندگی فانی ہے تو کام آج کا کل پر نہ چھوڑ | اپنے کیلے پھرتے ہیں دنیا میں انساں کس لیے
کیوں ہے انجام فرائض میں یوں سہل انگاریاں | جانتے ہو جبکہ مرنا ہے جو صدیوں بھی جیے
ایشیا کا نام تک تو قائم التقلیب ہے | اس کے ہو کایا پلٹ ہونے کے پیچھے کس لیے
مے بھی ہے اس میں تو ہے اس کے لیے شرب حلال | ہاتھ سے پیرِ مغاں کے یہ پیالہ جو پیے

راز کیفی کا کھلیگا زاہد و ناصح پہ کیا
مست وہ مردِ خدا رہتا ہے دائم بے پیے

لوگ کہتے ہیں جہاں میں نہیں اپنا کوئی | نظر آتا نہیں ہم کو تو پرایا کوئی
بندۂ نفس ہیں جو۔ اور غرض کے لاگو | وہی کہتے ہیں یہاں کب ہے کسی کا کوئی
حال تو یہ ہے کہ جینے سے بھی بیزار ہوئے | جب نکلتی نظر آتی نہ تمنا کوئی
غم زدہ ہوں غمِ عالم سے یہ ہمدردی ہو | اس سے بڑھ کر نہیں دنیا میں اپنا کوئی
کام ہو جاتا ہے کل بند اکلوتے گھر کا | جب بگڑ جاتا ہے چھوٹا سا بھی پرزہ کوئی
آپ کو خلق میں اور آپ میں اسکو نہ سمجھے | ہم کو اتنا بھی دکھائی نہیں دیتا کوئی
تو مجسم ہے صلیب اور تو ہی قلۂ طور | یہاں عیسیٰ ہی کوئی اور نہ موسیٰ کوئی
جام کیا ایک نظر میں تجھے کرتا سرشار | تجھ کو اے شیخ ملا ہی نہیں ایسا کوئی

زر سے اور زور سے اٹھا ہے نہ اٹھے وہ نقاب — بوالہوس دیدِ صنم بھی ہے تماشا کوئی

تنِ بیجاں میں تو پڑ جاتی ہے جان آپ سے آپ — دلِ مُردہ کو جلا دیتا مسیحا کوئی

بیڑیاں کٹتی ہیں بیڑی سے کہیں آ نا داں — کیوں تمنا ہی نہ ہو دل میں تمنا کوئی

پھر کہاں دیر و حرم اور کہاں تو کیفی
پڑ گیا تجھ پہ جب اس جام کا چھینٹا کوئی

جموں کے مشاعرے کی طرح پر۔ ۲۲ر مارچ سنہ ۱۹۲۴ء

بتائیں کیا عملِ عشقِ حقیقی کا کہاں تک ہے — زمیں کیا آسماں تک ہی مکاں کیا لامکاں تک ہے

تعیّن سے بری ہو کر ہے لامحدود کا طالب — کہ حدِ ملکِ دنیا تو وہیں تک ہی جہاں تک ہے

نہ ہو آزاد دورِ چرخ کی حلقہ بگوشی سے — ترا سر گو زدِ ما و شما اور این و آں تک ہے

تو بسم اللہ کے گنبد میں کیا ہے معتکف زاہد — سکونِ خاطرِ مضطر حواسوں سے اماں تک ہے

پہنچ سکتا ہے کب سچی خوشی کو عیشِ نفسانی — کہ وہ تو آبِ رکنا باد و جوئے مولیاں تک ہے

ہے شیخ و برہمن کے دین کی حد دیر و کعبہ تک — سوادِ دینِ عشقِ بے غرض کون و مکاں تک ہے

یقیں سے اور عمل سے پختگی پائی عقیدت نے — پہنچ تیری تو اے ناداں بس وہم و گماں تک ہے

حقیقت حسن کی آئینہ تجھ پر کیونکہ ہو جاتی — نظر تیری تو زلف و خال و ابروئے بتاں تک ہے

جو ہیں مستِ الست انکو خمار و سکر کا ڈر کیا؟ — نگاہِ تشنہ کامِ عشق ہی دستِ مغاں تک ہے

حسیرِ عشق کو کب دخل اس محفل میں ہے کیفی
بساط اس کی فقط بین و بکا۔ آہ و فغاں تک ہے

کشمیر۔ سنہ ۱۹۲۳ء

کمال جو دوش پہ ڈالے وہی تو رام نہیں — جو رکھ لے ہونٹ پہ مرلی وہی تو شام نہیں

وہ خود پرست نہ خالق سے سروری پائے — جو اس کی خلق کا خادم نہیں۔ غلام نہیں

وہ جن سے خوش ہے انہیں رنج دیکے کیا لیگا — تو خامِ عشق میں ہے۔ گر رقیب کام نہیں

ہے تیغ تیز سے بڑھکر کہیں زبان کی ضرب — یہ زخم وہ ہے کبھی جسکو التیام نہیں

یہ باتیں عام مجالس میں کہہ نہیں اٹھنے — تری زبان کو بیموقع گو! لگام نہیں

اسی کلام کو کہتا ہے تو غزل کیفیؔ
کہ گفتگوئے حسیناں کا جس میں نام نہیں

یہ دل وہ ہے کہ جفا و کرم سے رام نہیں — اسے زمانے کے بخشش اور کم سے کام نہیں
تو اپنے رنج و مصائب کا آپ موجب ہے — بچھا ترے لئے کب ترے دم کسے دام نہیں
تو کیا نسور رہا ہے اٹھ اور جہاں پہ پھیل — کبھی جہاں میں رہا چشم نم سے نام نہیں
ہے شان و زینت منسوب فیض نسبت سے — کہ جام سے ہی جم اے دوست جم سے جام نہیں
نہ آہ و نالہ سے تیرے ہلا کسی کا دل — ہلے گا چرخ کا اس زیر و بم سے بام نہیں
کٹا کے سر ہے دوبارہ امید خالی ہاتھ — جدا ہوا کبھی قلب الم سے لام نہیں

فراست اور خرد و عمر سے نہیں کیفیؔ
کہ پختہ عقل تری پشت خم سے خام نہیں

غم امام میں رو آج کل جو ہنستا ہے — کہا یہ کس نے کہ خیر الامم امام نہیں
ہر ایک ذرہ ہے آئینہ دار حسن ازل — ہمیں زیارت بیت الحرام حرام نہیں
ثواب و نام کی خواہش دلوں میں ہے جاگیر — کریں کسی پہ جو لطف و کرم کرام نہیں

۱۹۲۲ء

مشکل ہے وصل دل جو غرض سے رہا نہ ہو — یہ بھی تو مدعا ہے کوئی مدعا نہ ہو
تو کس پہ ہو رہا ہے دل و جاں سے نثار — ایسا نہ ہو وہ ایک صنم ہو خدا نہ ہو
مانیں بھی گر مجاز حقیقت کا رہنما — تو دل لگی سے کہیں سمجھا ہوا نہ ہو
جو ڈھونڈ لے صنم میں صنم ساز کا خیال — ایسا صنم پرست وحید زمانہ ہو
ذرے میں شمس۔ قطرے میں دریا کو دیکھنا — تو اس کو ایک کھیل کہیں جانتا نہ ہو
ارکان دین عشق یہ ہیں ان کو یاد رکھ — دل میں کسی سے رنج۔ زباں پہ گلہ نہ ہو
آزاد قید وقت و مکاں چاہیئے خیال — محو نظارہ دل ہو۔ وہ ہو پاس یا نہ ہو
خلوت کا انجمن میں ہو چھپایا ہوا سماں — ہے لطف درمیاں میں کوئی دوسرا نہ ہو

باتوں ہی باتوں میں ہو وصال صنم نصیب — اے مدعئ عشق کبھی یہ ہوا نہ ہو
پیر مغاں کو چھوڑ کے تیرے ہوں ہم مرید — زاہد ترے چلن میں جو لوٹے ریا نہ ہو
اے سوزِ عشق! ایک دل و جاں پہ کیا ہو فخر — تیرا تو فرض ہم سے ہوا ہے۔ ادا نہ ہو
آج اک مریض عشق کا ہونے کو ہے وصال
کیفی کہیں وہ تو ہی شہید وفا نہ ہو

بولے یہ سچ ہے۔ وصل کا اقرار۔ وہ بھی ٹھیک — پر کیا کروں یہ ضد ہے۔ کہ تیرا کہا نہ ہو۔

کشمیر۔ ۲ر جولائی سنہ ۱۹۲۲ء

طلسم اٹھ جائے تیرے دل سے امید و بیم اور ما و من کا
تو خاص بندہ بنے خدا کا اثر نہ ہو تجھ پہ اہرمن کا
کھلے ہوں گر دیدۂ بصیرت خلوص سے ہو بھری طبیعت
تو رہبر مسلک حقیقت فسانہ بن جائے ملد من کا
دوئی سے اس کا جو صاف دل ہے تو برگ سبز آشنائے گل ہے
خودی سے جو خود جدا ہوا ہے وہ سبزہ بیگانہ ہے چمن کا
تو اور شیدائی باغ و گل کا! تجھے تو ہے رنگ و بو کا چسکا
ہے خواہش نفس کا تو بندہ نہیں فدائی گل و سمن کا
بنی ہے جب شمع زیب محفل کہ سوز غم سے جلی سراپا
تو روغن ناز مل کے رخ پر بنے گا شاہد نہ انجمن کا
ہے استقامت نشان وقعت فشار خاطر ہے وجہ خفت
رہا جو ثابت قدم جگہ پر وہی تو پتھر ہے لاکھ من کا
نہیں وہاں دخل وہم جہاں ہاں تمیز ذات و صفات کا بھی
تو کیا فسانہ یہ لے کے بیٹھا ہے نا سمجھ! اے شیخ و برہمن کا
وہ دہر میں دہر سے الگ بھی وہ عین وحدت وہ زیب کثرت
اسے وہ سمجھیں گے جن کو حاصل ہے رتبہ خلوت در انجمن کا

یہ ایک ننھی سی جان کیا ہے۔ شہید ہونے کا عجب مزا ہے
کہ ہر بُن مو ہے رگ جاں فدائے الفت ہے کے تن بدن کا
کبھی بٹھائے نہ اپنی آنکھوں پہ کوئی کج خُلق آدمی کو
تجھے یہ ابرو کی دیکھا دیکھی ہوا ہے کیا چاؤ بانکپن کا
سدا بہار اپنا باغ دل ہے۔ اسی کی کرتے ہیں سیر کیفی
کریں گے ہم جا کے کیا نظارا نشاط باغ اور ہارون کا

جموں - ۳۱ دسمبر ۱۹۲۱ء

پھر اس سے دیر و حرم دیکھتے ہیں — ہر آئینہ شکل صنم دیکھتے ہیں
ان آنکھوں سے کب دیکھ سکتا ہے کوئی — جو آئینۂ دل میں ہم دیکھتے ہیں
یہاں دیکھنے کی جو ہے بات اسکو — بہت دیکھنے والے کم دیکھتے ہیں
یہ کیا دیکھنا ہے جو تم دیکھتے ہو — وہی دیکھنا ہے جو ہم دیکھتے ہیں
ترازو ہے تیر نظر جن کے دل میں — بہت دیکھتے ہیں نہ کم دیکھتے ہیں
بری ہیں جو بندھن سے بیم و رجا کے — وہ ہستی میں سیر عدم دیکھتے ہیں
کھلا جن پہ ہے راز عالم انہیں کو — جنوں سے یہاں منتظم دیکھتے ہیں
تا حد کی ہے اس میں ریشہ دوانی — جو اضداد کو ہم بہم دیکھتے ہیں
ستم جانے کیا دل پہ عاشق کے ٹوٹے — وہ دیکھو بہ چشم کرم دیکھتے ہیں

جو خوش ہو دل اپنا تو کس طرح کیفی
زمانے کو صید الم دیکھتے ہیں

۱۹۲۲ء

راز عالم کو نہ علامۂ دوراں سمجھا — ہاں اسے کچھ دل خود رفتہ و حیراں سمجھا
دیر و کعبہ کی حقیقت ہے مجھے سب معلوم — تو بتا کیا اسے اے زاہد ناداں سمجھا
عدم و ہست میں ہے نسبت بحر و امواج — میں تو یہ اصلیت عالم امکاں سمجھا
شیخ نے کفر کہا جسکو برہمن نے ادھرم — دل دیوانہ مرا اسکو ہی ایماں سمجھا

اک جہاں زیر کیا پر دلِ مضطر نہ دیا — کام دشوار وہی تھا جسے آساں سمجھا
کر دیا تنگ پریشانئ خاطر نے مجھے — دشت کا حلقۂ زنجیر کو داماں سمجھا
سوزِ غم اور تپش قلب کا کیا حال کہوں — ٹھنڈی سانسوں کو بھی ہیں سرِ چراغاں سمجھا
وسعت آرائیے دلتنگئے۔ حسرت مت پوچھ — دم جو نکلا تو میں اپنا اسے ارماں سمجھا
لذت افزائے جگر تلخئے ایام ہوئی — منہ کو بدگویوں کے ہر زخم نمکداں سمجھا
پڑ گیا دست درازی کا جنوں کو لپکا — دامن کوہ کو عشاق کا داماں سمجھا
دردِ فرقت میں ہوا جان سے اتنا بیزار — تیغ کے گھاٹ کو ہیں چشمۂ حیواں سمجھا
خانہ بربادئے وحشت کا بیاں کیا کیجے — دیکھا ویرانہ تو میں اسکو شبستاں سمجھا

حال یہ بیخودئے عشق میں کیفی کا ہوا
شیخ کافر اسے اور گبر مسلماں سمجھا

سنہ ۱۹۱۵ء

ہم سے بھی جو فروش زمانے میں کم ہوئے — جب پینٹھ اُٹھ چکی تو دکاندار ہم ہوئے
بزم اُٹھ گئی جب اور ہوئی سرد شمع بزم — تو مدعئے الفت پروانہ ہم ہوئے
میدان شعر میں نہ رہا کوئی شہسوار — چمکا کے اسپ طبع کو ہم سر قدم ہوئے
فکر سخن نے دور کئے دو جہاں کے غم — جتنے نکمے رہ گئے۔ اہل قلم ہوئے
ٹکسال باہر آپ تھے اسکا تھا جب چلن — نوٹ اور گنی کے وقت کھنکتے درم ہوئے
ہاں بزم میر و میرزا پھر تازہ کیوں نہ ہو — دو اک جو آپ جیسے سخنگو بہم ہوئے
نقش سلف بگاڑ کے موجد بنے ہو تم — تم شاعری کے حق میں تو بخت دژم ہوئے
کہتے ہیں انکو صاحب طرز جدید آج — جن سے نہ حل رموز کلام قدم ہوئے
کل جانتا تھا جن کو نہ کوئی جہان میں — وہ آج آکے صاحب سیف و قلم ہوئے

کیفی سمجھ یہ اپنی زمانہ نہ کیوں ہنسے
بازار بڑھ گیا۔ تو خریدار ہم ہوئے

۲ر جولائی سنہ ۱۹۱۵ء

یا الٰہی مجھ کو یہ کیا ہو گیا — دوستی کا تیری سودا ہو گیا
دوستی کیا ہمسری کا دھیان ہے — قید سے آزاد اتنا ہو گیا۔
کیسی آزادی؟ اسیری چیز کیا؟ — جب فنا رنگ تمنا ہو گیا
جب تمنّا اور ڈر جاتا رہا — تو ہر اک شے سے مبرّا ہو گیا
یوں مبرّا ہو گئی جب کوئی ذات — بند پھر نغمہ صفت کا ہو گیا
جب ہوا اوصاف سے کوئی بری — عیب کیونکر اس میں پیدا ہو گیا
خود پرستی اسکو یا جو کچھ کہو — اب تو یہ عالم ہمارا ہو گیا
بیخودی نے محو حیرت کر دیا — آپ میں اپنا تماشا ہو گیا

جس کو دیکھا آپ ہی آیا نظر
رنگ اب کیفیؔ یہ اپنا ہو گیا

۱۰ جنوری سنہ ۱۹۱۹ء

تُو ہے کون اہلِ ہنر کے وقار کا
یارب بُرا ہو کشمکشِ روزگار کا

جنگل ہیں وادیوں میں بہت پھول کھل گئے
جن تک کماں نہیں ہے کسی کو بہار کا

چٹکے ہیں ایسے غنچۂ گل دشت میں بہت
شرمائے جن سے رنگ رُخِ گلعذار کا

سر در ایسے بیسیوں لبِ جو جلوہ گر ہوئے
جن سے بھرم کھُلے قدِ زیبائے یار کا

صحرا میں ایسے مرغ بہت چہچہا گئے
منہ پھیر دیں جو نغمہ کشی میں ہزار کا

سجدے میں حق کے کوہ سے پانی گرا بہت
بھر دے جو دل غبار سے ہر آبشار کا

برسا ہے گھاٹیوں پہ وہ بادل کہ بھول جائے
منظر سے جس نے جھرنے پہ گرنا پھوار کا

لعل ایسے رحمِ مادرِ قدرت میں ہیں بہت
لب کا لے جس سے حُسن دلِ آرا نگار کا

دُرِّ یتیم رُلتے ہیں دریا میں ایسے لاکھ
شایاں لقب ہے جن کے لئے شاہوار کا

کیا جانے کتنے ہو گئے اس دہر میں گُشن
نام ایک کا ہی جپتے ہیں بِرج اور دوار کا

کیفی خدا کی دین سمجھ عزّ و نام کو
کیا شکوہ اس میں گردشِ لیل و نہار کا

---

۱۴ فروری سنہ ۱۹۱۹ء

دل اگر لب پہ جگر نوک مژہ پر ہو گا
آہ و گریہ میں اثر تیرے برابر ہو گا

مانع گردشِ تقدیر سلاسل ہے نہ طوق
گر نہیں پانو میں تو سر میں یہ چکر ہو گا

آہِ سوزاں کی ہے اشکوں سے اگر لاگ تو ہو
قطرہ گر بحر نہ ہو گا - تو سمندر ہو گا

ہوں تصنع سے بری - ایک ہے ظاہر باطن
دل میں جو ہو گا وہی اپنی زباں پر ہو گا

منہ سے جو کہدیا سمجھو اسے پتھر کی لکیر
فرق اس میں نہ کبھی بال برابر ہو گا

صاف و شفاف ہے آئینہ صفت دل اپنا
میل لائیگا جو ہم سے وہ مکدر ہو گا

نورِ الفت کے سوا کچھ دل صافی میں نہیں
نالہ جو نکلیگا - آئینہ کا جوہر ہو گا

ہو چکا وقت ہر اک شے کا مقرر کب کا
وصلِ جاناں کا مگر وقت مقرر ہو گا

نخت دل سے نہ ہو زنار اگر تا سر تنگ
رشتۂ سبحۂ زہاد سراسر ہو گا

زاہد آئینہ ہے مرکوز دل اس حلقہ میں
شیشۂ مے تجھے آئینہ مظہر ہو گا

کل کے خطبہ کی تو شب رندوں نے دیکھی تفسیر — آج کیا حضرت واعظ سر ممبر ہوگا۔

اس کی ہاں میں جو نہیں ہے وہ بتاتی ہے یہی — کہ عدم کلمۂ ہستی میں مقدر ہوگا

کیوں نہیں مانتے ہیں شیخ! اجی جاؤ بھی! — خلد اور کوچۂ جاناں کے برابر ہوگا

ہوش کر تو یہ کہیگا - یہ سنے گا جب سے — تو کہاں ہوگا - وہ جس وقت ترے گھر ہوگا

یہ کہا سن کے مرا حال وہ عاشق ہے جو خوش — ہم تو سمجھے تھے کہ اک رند سخنور ہوگا۔

دیکھنا ایسا تماشا ہو - جو ناصح آجائے — کہدوں وہ بات کہ بس جامہ سے باہر ہوگا

پھونک دی مردہ مضامین میں جان تازہ
تجھ سے بڑھ کر کوئی کیفی نہ سخنور ہوگا

(۹ جولائی سنہ ۱۹۱۹ء)

کہاں تم رہ سکو گے مجھ سے پردہ میں نہاں ہوکر — یہ چھپنا آنکھ سے کس واسطے دل میں عیاں ہوکر

خم گیسو سے تیر نگہ ہے بوسہ زن رخ پر — ختن سے کعبہ پہنچا دل مرا ہندوستاں ہوکر

ہوا دم ناک میں اس داستاں کلکل سے زمانے کی — رہے کب تک کوئی بتیس دانتوں میں زباں ہوکر

تڑپ جاتی ہیں جاں جب بزم ساقی یاد آتی ہے — ستاتا ہے مجھے دور قدح دور زماں ہوکر

لپٹ کر بیٹھ جانا اور کبھی دیوار در ہونا — دم رخصت ہی آنکھوں میں قیامت کا سماں ہوکر

شہیدستان الفت گر تمنا جذب کی کرتے — اتر آہوں سے اڑتا پیرہن کی دھجیاں ہوکر

نہ آتا تھا نہ آیا چین بیمار محبت کو — کسی صورت کسی پہلو - یہاں رہ کر وہاں ہوکر

نئے روپ اور رنگت سے مرے ارماں نکلتے ہیں — شرار آہ ہوکر اشک ہوکر اور فغاں ہوکر

پتہ پوچھو نہ تم گم گشتگان راہ الفت کا — ہیں عنقا کی طرح مشہور بے نام و نشاں ہوکر

جو ایثار اور نیکی کے ہوئے عامل زمانہ میں — ہے باقی نام نیک انکا حیات جاوداں ہوکر

جو قطرہ جا گزیں ہوکر رہا وہ بن گیا موتی — ہوا برباد جو دریا بنا آب رواں ہوکر

خیال یار ہم سے دور ہو تو پھر کہاں ہوں ہم — سمایا ہے رگوں میں خون ہوکر تن میں جاں ہوکر

جو دیکھا بیکسی گور غریباں پر برستی ہے۔ — تو حسرت چھا گئی ہے شمع کشتہ کا دھواں ہوکر

تم اب خود دیکھ لو اعجاز ہے کیا بزم ساقی میں — جو ناصح بن کے آئے تھے گئے پیر مغاں ہوکر

دل ناداں اثر ہوتا تو اس ترکیب سے ہوتا۔
نکلتی آہ دل سے شعر کیفی کی زباں ہوکر

۱۱ر نومبر سنہ ۱۹۱۴ء

میں نے ان سے جو کہا دھیان مرا کچھ بھی نہیں
ہائے کس ناز سے ہنس ہنس کے کہا کچھ بھی نہیں

عرض کی کچھ دلِ عاشق کی خبر ہے تو کہا
ہاں نہیں کچھ نہیں بس کہہ تو دیا کچھ بھی نہیں

تو نہ آیا نتب وعدہ تو گیا کیا تیرا
مر مٹے ہم ترے نزدیک ہوا کچھ بھی نہیں

کیا ہے انجام محبت کوئی پوچھے ہم سے
جیتے جی خاک میں ملنے کے سوا کچھ بھی نہیں

کس کی مہر اور وفا - اب ہے جفا سے بھی گریز
کیوں نہ جل کر کہیں الفت میں مزا کچھ بھی نہیں

آنکھوں ہی آنکھوں میں دل لیگیا سینے سے نکال
ہاتھ سے ہم نے دیا - اس نے لیا - کچھ بھی نہیں

مرے اللہ یہ پتھر کہ بتوں کا دل ہے
رحم - رسوائی کا ڈر - خوف خدا کچھ بھی نہیں

کونسا درد ہے جس کا نہیں دنیا میں علاج
لیکن اس دردِ محبت کی دوا کچھ بھی نہیں

دیکھا کیفیؔ کو تو بیساختہ یوں بول اُٹھے
اب تو بیمارِ محبت میں رہا کچھ بھی نہیں

(۳۰ر جولائی سنہ ۱۹۱۴ء)

لطف ایّام جوانی اور ہے
دن کٹی کی زندگانی اور ہے

الفت دل کی نشانی اور ہے
ظاہری شیریں زبانی اور ہے۔

سب لگاوٹ کی ہیں یہ باتیں حضور
دل سے ہو جو مہربانی اور ہے۔

داستان عشق تم مجھ سے سنو
قیس و لیلےٰ کی کہانی اور ہے

برق میں شعلہ میں یہ گرمی کہاں
سوزشِ دردِ نہانی اور ہے۔

ذرّے ذرّے میں ہے نورِ حسن یار
اب کی طرز لنترانی اور ہے۔

آدمی بت اور بت تصویر ہو
گفتگوئے بے زبانی اور ہے۔

کیا ہوا دنیا پہ جو قبضہ کیا
ملکِ دل کی حکمرانی اور ہے

اب تو جاتے ہیں ملیں گے پھر کبھی
گر یہاں کا دانہ پانی اور ہے

بندشِ الفاظ ہے کچھ اور شئے
لطف اسلوب معانی اور ہے

اس کو کیفیؔ کب پہنچ سکتا کوئی۔
میر کی شیوا بیانی اور ہے۔

دہلی - ۲۰ر مارچ ۱۹۱۴ء

اس غزل کے نیچے حضرت کیفی کے قلم کا یہ نوٹ بیاض میں درج ہے - جو بجنسہ نقل کیا جاتا ہے -

۱۹۱۴ء کی سردی امپیریل کونسل کے جلسوں کے سلسلے میں دہلی میں گزری - کچھ دن کی غیر حاضری کے بعد ۱۷ر مارچ کو دہلی پہنچا - اور رکھی ہوئی ڈاک میں پنڈت امرناتھ صاحب مدان ساحر دہلوی تحصیلدار ضلع گورگانوہ کا ایک وارنٹ ملا - لکھا تھا - کہ ۱۸ر کو طرحی مشاعرہ ہے باہر کے شاعر بھی آئیں گے - اور میں ضرور شریک ہوں - وہ معہ احباب کے تشریف بھی لائے اور سخت تقاضا کر گئے - مجھے اپنے آقا کی بجٹ کی سپیچ تیار کرنی تھی یہ منٹو - مارلی کے ضابطہ کا زمانہ تھا - اور بجٹ پر غیر سرکاری ممبر صرف تقریریں (جو تحریری بھی ہوتی تھیں) کر سکتے تھے - ووٹ دینے کا انہیں حق نہ تھا - ۲۴ر کو بجٹ کا آخری جلسہ تھا - منہ پر ہو کر جائے بغیر بنتی نہیں - جاکر غیر طرح پڑھ آنے میں لطف نہیں - مصرع طرح تھا "ع آپ میں کٹ گیا تلوار کا احساں نہ ہوا" برسوں سے غزل کہنے کا اتفاق بہت کم ہوتا تھا اور جو غزل ہوتی بھی - تو اس میں مضامیں کچھ اور ہی ہوتے تھے - اس سے کئی پہلے صحبتیں جو بلا قید طرح و صنف ہوئیں - ان میں شریک ہو چکا تھا - اب جو طرح کی بات آئی - تو طرح دینا ظاہر ہے کیا معنی رکھیگا - آخر ۲۰ر کو یہ غزل ہوئی - میں بجٹ کی تقریر ختم کر کے معتکاف ہوس کے نیچے جمنا کے کنارے کرسی پر کاغذ پنسل لئے سوچ رہا تھا کہ یہ مصرع ذہن سے زباں پر آیا - "میرے خوش ہونے کا جنت میں بھی ساماں نہ ہوا" - اس مصرع کا ذہن میں آنا تھا - کہ غزل ہو گئی -

لکھنؤ سے حضرت صفی اور حضرت ظریف - آگرہ سے حضرت بزم اور کئی اصحاب باہر سے تشریف لائے تھے - نواب سعید الدین احمد خاں طالب - نواب شجاع الدین صاحب تاباں حکیم اجمل خاں صاحب شیدا - نواب سراج الدین احمد خاں سائل حضرت بیخود - پنڈت جواہر ناتھ ساقی - حضرات برق و شیدا و رونق وغیرہم دہلی کے سب نامی شعراء شریک مشاعرہ تھے -

---

غزل

کیا ہوا مرکزِ ہستی اگر انساں نہ ہوا
آبرو خاک ہے قطرے کی جو طوفاں نہ ہوا

سخت مشکل ہے کہ ہمت یہ ہوئی سہل پسند
کام ٹھہرا وہی دشوار جو آساں نہ ہوا

خاک بھی حضرتِ موسےٰ کی نہ پھر ہاتھ آئی
شعلۂ طور پہ بھی پردے سے عریاں نہ ہوا

خیرہ آنکھیں ہوئیں اس کثرتِ نظارہ سے
کس لئے نورِ ہدیٰ پردے میں پنہاں نہ ہوا

پھر عجب کیا ہے عدم سے جو ہوئی دلچسپی
درخورِ وسعتِ دل عالمِ امکاں نہ ہوا

کھیل سمجھا کئے عالم کے کرشموں کو ہم
دلِ خود رفتہ کبھی بات سے حیراں نہ ہوا

جامہ پہنے رہا پروانوں کی جانبازی کا
شعلہ فانوس کے پردے میں بھی عریاں نہ ہوا

ہیں مرے دل میں وہ آہیں نہ بنیں جو بجلی
میری آنکھوں میں وہ قطرہ ہی جو طوفاں نہ ہوا

حوصلہ کس کو ہے دل چیر کے دکھلاؤں کسے؟
وہ شرر اس میں ہے جو سنگ میں پنہاں نہ ہوا

قید میں سبحہ و زنار کی پھنستا کیونکر
حلقہ در گوش رہا مرکزِ ایماں نہ ہوا

غم رہا ان کا جو دوزخ میں پڑے جلتے ہیں
میرے خوش ہونے کا جنت میں بھی ساماں نہ ہوا

اب تو یہ حضرتِ ساحر کو شکایت نہ رہی
کیفیؔ سحر نوا آج غزل خواں نہ ہوا

۳۰ر اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء

غمِ دنیا نہیں پھر کونسا غم ہے ہم کو
فکرِ اندیشۂ عقبیٰ سے بھی کم ہی ہم کو

دہنِ غنچہ سے پیغامِ وفا سنتے ہیں
غازۂ عارضِ حدِ ہستی عدم ہے ہم کو

قول یہ سچ ہے کہ خود کردہ کا درماں کیا ہے
داورِ حشر یہ ناحق کا بھرم ہے ہم کو

اگلے لقموں میں نہیں قندِ مکرر کا مزا
سخت بے لطف حیاتِ پیہم ہے ہم کو

زیست کی کشمکش اور مرگ کی فرصت کا الم
آمد و رفتِ نفس تیغِ دودم ہے ہم کو

بیٹھے بیٹھے جو کٹے پھر تگ و دو سے حاصل
ہر نفس جادۂ ہستی میں قدم ہی ہم کو

ذرہ ذرہ میں نظر آتی ہے تصویرِ صنم
سر بسر روکشِ صد دیر و حرم ہی ہم کو

بارِ غم بار سے احساں کے بدل جاتا ہے
طوقِ گردن کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

حالِ دل لکھتے نہ لوگوں کی زباں میں پڑتے
وجہِ انگشت نمائی یہ قلم ہے ہم کو

آنکھ کیا ڈال لئے اس گل پہ جو کمھلا جائے
کیفی اپنا ہی یہ دل باغِ ارم ہے ہم کو

---

۲۰ اگست سنہ ۱۹۱۲ ع

کوئی نہ دیکھا نہ واپس آیا خدا کے گھر ایک بار جا کر
وہ دیر و کعبہ میں ہے مقید، خدا کرے خدا خدا کر

سمجھ نہ تو اسکو بینوائی۔ یہ دو جہاں کی ہے بادشاہی
کہ دولتِ عشق ہاتھ آئی متاعِ دنیا و دیں لٹا کر

جہان کی کائنات کیا ہے امیدِ عقبیٰ میں کیا دھرا ہے
بری ہیں جو اس سے وہ نہ دیکھیں ادھر ذرا آنکھ بھی اٹھا کر

کرم ترا طمع پر ہے مبنی ہے تیری خیرات اس نفس پر
کہ سود میں اشرفی ملیگی جو دیگا اک دام ہاتھ اٹھا کر

یہ حسن ہی کیا ہے باد و باراں ہنسی ہے یہ باستم ظریفی
گلوں کو مٹی میں کیوں ملایا کھلا کھلا کر ہنسا ہنسا کر

نہ رہ سکے پیشِ مہرِ تاباں گل اور شبنم میں ربطِ باہمی
میں کٹ گیا کل جہاں سے کیفی دل ایک دلدار سے لگا کر

---

۱۲ اگست سنہ ۱۹۱۲ ع

ہم نے اس عالمِ فانی کو تماشا جانا
ایک نیرنگیٔ آشوبِ تمنا جانا

دیر میں جا کے ہوا ہمکو جو دیدارِ صنم
اپنی تصویر کا ہم نے اسے چربا جانا

کس مپرسی کی حرم میں جو یہ حالت دیکھی
خانہ برباد سے دل کا اسے خاکا جانا

دل کے آئینے میں عکسِ رخِ زیبا اترا
جو خیال آیا اسے خوابِ زلیخا جانا

نظر آیا یہاں چھوٹا نہ بڑا کوئی ہمیں
ذرۂ خاک کو ہمپایۂ ثریا جانا

دل کے ہوتے جسے آئینے کی حاجت ہوا سے
محوِ دلبستگیٔ لطفِ تماشا جانا

اصل وحدت کی بنا ہے عدمِ غیریت
اس کا جب رنگ جما غیر کو اپنا جانا

طور پر حضرت موسیٰ نے جو کچھ دیکھا تھا
وہ بھی اک پتلیوں کا ہم نے تماشا جانا

ہو گئے جذب وہ عالم میں کہ عالم ان میں
تم نے خود رفتوں کو کیا سمجھا۔ انہیں کیا جانا

جسکو تم کہتے ہو موت اسکو میں سمجھا ہوں وصال
دمِ شمشیر کو میں نے دمِ عیسیٰ جانا

تیری جو بات ہے دنیا سے نرالی کیفی
سب برا کہتے ہیں جسکو اسے اچھا جانا

۱۳ر جولائی سنہ ۱۹۱۲ع

جو محوِ محویتِ نظارہ وہ حسنِ ہنگامہ کار ہوگا
جو گل عروسِ چمن بنا ہے گلے کا بلبل کے ہار ہوگا

بت اٹھ کے بھاگیں گے بت کدے سے پناہ لینگے حرم میں جا کر
نقاب اٹھا کہ جمال آرا۔ اگر وہ رعنا نگار ہوگا

وہ نور جب ہوگا محفل آرا تو شمع و پروانہ جل بجھیں گے
رہینگے ہم تم ہی جب نہ باقی تو کون کسی پر نثار ہوگا

دوئی کی حد سے جو عشق گزرا تو کچھ نہ برقِ نظر نے چھوڑا
شہیدِ الفت کا سینۂ اہلِ دل کے اندر مزار ہوگا

جو برق بنکر تڑپ رہی ہے جو ابر بن بن کے رو رہا ہے
وہ میری بیچین آرزو ہے یہ میرے دل کا بخار ہوگا

ہے نہ تم شمع ساں پگھلکر پھنکے نہ پروانہ وار جل کر
تو پھر محبت کی انجمن میں کہاں تمہارا شمار ہوگا۔

حریمِ راحت ہی باغِ الفت یہاں ہی کب دخل آہ و زاری
یہاں جو ہوگا ملول و محزوں وہی فنا کا شکار ہوگا

جو نہ وہ نکلیگی قید ہوگی یہ رنگ و بو غنچے کے جگر میں
جو نالہ اٹھیگا سرد آسا وہ قید ہے جو بیار ہوگا۔

وہ داغ لالہ کے دل کا ہوگا پڑیگا بنخالہ جو جگر میں
بنیگی پتھر اگے آنکھ جھرنا اگر کوئی اشکبار ہوگا

ہے شرط پھنک جائے جسم و جاں تک مگر نہ اٹھے ذرا دھواں تک
نہیں سر ضبطِ راز جسکو وہی سزاوارِ دار ہوگا۔

پئے جو پیرِ مغاں کا پیالہ وہ شورِ محشر سے بھی نہ جاگے
ہے نشۂ دردِ عشق ایسا کبھی نہ جس کا خمار ہوگا

لگی ہے دھن جب سے اس صنم کی نہ سدھ رہی ہمکو تن بدن کی
وہ ہم نہ پھر ہم رہیں گے کیفی یہی جو لیل و نہار ہوگا

(۱۰ر جولائی سنہ ۱۹۱۲ع)

کرشمہ ریز ہے حسن سے کیوں بھٹک رہا ہی تو دنگ ہوکر
شکستہ پا ہو کے کاش گرتا اک آستانے پر سنگ ہوکر

شکست رنگِ امید کی ہی صدا وہ ضبط آزما کے نکلی
گلوئے مینا سے ہو کے قلقل جگر سے پیہم ترنگ ہوکر

ہے دعویٔ عشق خام کاری یہ ظالم ایسا ہی ستم قاتل
چڑھا جو سر کو بخار بنکر تو دل بیٹھا ہی زنگ ہوکر

تعطل حسن ظاہری بھی نہیں سکون دلی کا ہو جب
کہ صبر سے ایک لحظہ بیٹھا کہیں نہ تیمور لنگ ہوکر

یہ باغ عالم ہے جائے عبرت وہ ذرہ ذرہ وہ دولت ہی حسن صورت
وہ پھول کانٹوں میں رل رہا ہی جو سر چڑھا شوخ و شنگ ہوکر

نقاب میں بھی عجب فسوں تھا بہار ہستی تھی یا جنوں تھا
جو سیر میں آیا سہر ہوکر تو دل پہ چھایا امنگ ہوکر

ہے انکی گمنامی عین شہرت یہی انکی وارفتگی تشخص
کہ رو شناس شاہ و گدا ہیں فقیر بے نام و ننگ ہوکر

وہ حسن نے پائی رسم شعاری ہے جس سے چشم سراغ عالی
ہوا میں گو ہو کے جا سمایا کھلا رخِ گل پہ رنگ ہوکر

کرشمہ حسن جانستاں کی ستم ظریفی کا کیا بیاں ہو
کہ دل میں یہ تیش بنکے بیٹھا جگر سے نکلا خدنگ ہوکر

نہ کوہ و صحرا میں نکلی حسرت کہیں بھی پائی نہ جب فراغت
میں نقطۂ دل میں آ سمایا جہاں کی وسعت سے تنگ ہو کر
یہ مجھ کو بیحس کیا ہے کیفی مئے محبت کی بیخودی نے
کہ خواہشیں دل کی اڑ رہی ہیں گلوں کے چہرے کا رنگ ہو کر

(۹ر جولائی سنہ ۱۹۱۲ء)

بتاؤں کیا تجھ کو چشم پرنم ہوا ہے کیا خون آرزو کا
بنا گل داغ یاس حسرت جو دل میں قطرہ بچا لہو کا
دبے جو گھٹ گھٹ کے دل میں ارمان وہ برق بنکر فلک پہ تڑپے
جو ولولہ جی میں رُک گیا تھا وہ بلبلہ اب ہے آب جو کا
محبت ہی تو چارہ گر پریشاں نہ تجھ سے کچھ بن پڑیگا درماں
کہ ہو تو تار نفس سے سامان جراحت دل کے ہو رفو کا
کھلا لب گور سے یہ عقدہ کہ خواب تھی سب نمود ہستی
وقوف نا محرم مئے منزل کمال ہے میری جستجو کا
نہ تجھ کو مست ہوائے گلشن خزاں میں اے عندلیب دیکھا
نہیں تو شیدائی باغ و گل کا مگر فدائی ہے رنگ و بو کا
اُسے نہ پھر کچھ دیا دکھائی نظر پڑا وہ جمال جسکو
کھلا حقیقت کا راز جب پر نہ اسکو یارا تھا گفتگو کا
ہے نفی ذات اور نسخ ہستی وصال جاناں کی شرط اول
بھرا مناظر سے ہی جہاں سب جو صرف ورزش کا تو ہے بھوکا
طلسم دیر و حرم ہے تجھ پر ہنوز دل ہی ہے دور ناداں
وہاں ترا خاک دل لگیگا وہ ہی سراسر مکاں ہو کا
خبر کسے صبح و شام کی ہے تعینات اور قیود کیسے
نماز کس کی وہاں کسی کو خیال تک بھی نہیں وضو کا
نہیں محیط رسوم و ملت ہے بے نشاں منزل حقیقت
وہاں نہ سمرن کی ہتکڑی ہے نہ طوق زنار ہے گلو کا
ہیں غرق بحر مئے محبت وہاں ہے کیفی یہ سب کی حالت
ہے دخل ساقی کی بزم میں کیا صراحی و ساغر و سبو کا

(۱۰ر جون سنہ ۱۹۱۲ء)

تیری حالت پہ آنسو ڈبڈبائیں چشم سوزن میں
اگر دل میں بھی ہوں وہ چاک جو ڈالے ہیں دامن میں
نہ کیوں پہنچے نوائے بلبل کی گوش نازک گل تک
سراپا ہو گداز دل بھرا گر اس کے شیون میں
سراپا درد ہوں کیونکر نہ روتے پھوٹ کر چھالے
جو ٹوٹا کوئی کانٹا زیر پا صحرا کے دامن میں
جو ہوگا عشق صادق جذب کامل جلوہ گر ہوگا
ضرورت کیا نکل کر گھر سے جائیں دشت ایمن میں
سمایا ہو جو دل میں یار پھر بعد مکانی کیا؟
منو ہر دوار کا میں جا براجیں یا مہابن میں
نہ اس میں دل کے ٹکڑے ہیں نہ ملتی لخت جگر ہیں
یہ آئے آسماں طلب تیرا کوئی دامن ہے دامن میں

گلستاں میں جو گل ہے اسکو سنکر چاک داماں ہے
بھری ہے غنچے کی دلبستگی بلبل کے شیون میں

ہے خالقِ عشق کی یکتائیے حسن جہاں آرا
ہے بیڑی سرو کی جو طوق ہے قمری کی گردن میں

نمبر صدر و پائیں بزم فطرت میں نہیں رہتی
تمہیں دیکھو کہ سبزی کس طرح رہتی ہے گلشن میں

محبت نے نہ جس کے دل میں چھوڑی ہو جگہ باقی
تمیز اس کے لئے ممکن نہیں ہے دوست دشمن میں

سکون قلب حاصل خاک ہو دنیا کے لوگوں کو
تلوّن ہے بڑھاپے میں وہی جو تھا لڑکپن میں

لگی باغ جہاں میں آگ کیا جنس محبت کو
جلے گل شاخ پر بلبل تڑپنے سے ہو نشیمن میں

گلے کا بن گیا ہے ہار یہ تار نفس میرا
الٰہی ڈال اثر تھوڑا سا آہ شعلہ افگن میں

نہ تھی منظور شاید ابتری تکوین عالم کی
اثر پاتے نہیں کیا ہم اسی سے برق خرمن میں

تماشے ہیں حرم اور دیر کے دیکھے ہوئے اپنے
کریں گے جا کے ہم کیا مجلس شیخ و برہمن میں

جو اس جا تک ہے مرگ مسلسل کی خبر ہوتی
دعائیں طول عمری کی نہ دیتے مجھ کو بچپن میں

یہی طرز غزل خوانی رہا کیفی اگر تیرا
عجب کیا شعر لے جائیں ترے دلی سے لندن میں

(۲۴ اپریل سنہ ۱۹۱۲ء)

تو بتوں کی حق سے ناحق ہے بکھانتا برائی
ترے دل میں بت کی صورت کب اتر کے سمائی

جو ہوا تجھا بت کا شیدا تو یہ حال تیرا ہوتا
تری آنکھ جس پہ پڑتی وہی دیتا بت دکھائی

جو خدا کا عشق ہوتا تو نہ کفر و دیں میں پڑتا
کہ خدا کی شکل تجھ کو نظر آتی کل خدائی

جو ہے خواہشوں کا بندہ تجھے کہتے پاک شہدا
تجھے زاہد ریائی نہ بناتی جگ ہنسائی

جو تو ہوتا دھن کا پکا تو جو چاہتا سو کرتا
تھی جہاں کی تجھ کو یکساں یہ برائی اور بھلائی

جو لگن خودی کی ہوتی نہ خلش دوئی کی ہوتی
ترے سر میں غیریت کی نہ یہ ہوتی بو سمائی

جو کسی حسین کا اثر اترے دل میں ہوتا نقشا
تو نہ شوق وصل ہوتا نہ یہ کاوش جدائی

نہ گلہ ستم کا ہوتا نہ شکایت تغافل
کہ غریق شکر ہوتا ہے طریق آشنائی

تو پلٹ کے جا سماتا دل و دیدۂ صنم میں
ترے دل پہ قبضہ کرتی جو کسی کی خوش ادائی

ترا کام سب ادھورا نہیں کوئی رنگ پورا
تو پھر اس جہاں میں تو نے یونہی دھوم کیوں مچائی

نہ لے نام عشق کیفی نہ فریب دے جہاں کو
ابھی عشق کی ہوا تک نہیں تیرے پاس آئی

(۱۰ مئی سنہ ۱۹۱۲ء)

چھوڑ کر دنیا کو بھی یہ بوالہوس پائیں گے کیا ۔ سبحہ و زنار کے پھندے یہ کھل جائیں گے کیا

پختہ کار عشق ان فقروں میں آتے ہیں کہیں ۔ لن ترانی واقف دیریں سے فرمائیں گے کیا

محفل رنداں میں جاکر کیا کرینگے شیخ جی ۔ ان پڑھے جنوں کو آپ سمجھائیں گے کیا

دل میں ان کا گھر ہے آنکھوں میں سمائی ہے نظر ۔ لاکھ پردے دیں چھپیں وہ ہم سے چھپ جائیں گے کیا

انکی ہر شکل اور صورت اس کے دل میں ہے عیاں ۔ عاشق خود رفتہ سے وہ سوانگ اب لائیں گے کیا

سنتے ہیں کیفی چلے ہیں دیر سے سوئے حرم
تھی یہاں تو ایک صورت بھی وہاں پائینگے کیا

(یکم اپریل سنہ ۱۹۱۲ء)

ڈھونڈھنے سے یوں تو اس دنیا میں کیا ملتا نہیں ۔ سچ اگر پوچھو تو سچا آشنا ملتا نہیں ہے

آپ کے جو یار بنتے ہیں وہ ہیں مطلب کے یار ۔ اس زمانے میں محب باصفا ملتا نہیں ہے

سیرتوں میں بھی ہے انسانوں کی باہم اختلاف ۔ ایک سے صورت میں جیسے دوسرا ملتا نہیں ہے

دیر و کعبہ میں بھٹکتے پھر رہے ہیں رات دن ۔ ڈھونڈھنے سے بھی تو بندوں کو خدا ملتا نہیں

ہیں پریشاں اور حیراں جائیں تو جائیں کدھر ۔ راہ گم گشتوں کو منزل کا پتا ملتا نہیں

بوالہوس دل کی طرح ہر رنگ میں ہے صرف نکہت ۔ لالہ و گل میں بھی رنگ دیرپا ملتا نہیں

ہے یہاں تو سیر گلزار خیال نو بہ نو ۔ ہاں اسیر وہم کو مضموں نیا ملتا نہیں

روئیے رونا زمانے کا تو کیفی کس کے پاس
کوئی اس دل کے سوا درد آشنا ملتا نہیں

(۲۲ جون سنہ ۱۹۱۲ء)

کیا ہی بگڑے ہیں جو کچھ بات بنائی نہ گئی ۔ حشر میں آنکھ بھی ظالم سے چرائی نہ گئی

تیری الفت کی نہ ہرگز بھی گئی دل سے لگن ۔ آگ جو دل میں لگائی تھی بجھائی نہ گئی

عشق کا نقش وہ بیٹھا کہ نہ دل سے اٹھا ۔ موت کے آگے بھی وہ شکل بھلائی نہ گئی

آنکھیں گرمائیں بھویں تن گئیں تیور بدلے ۔ بات آدھی ابھی مطلب کی سنائی نہ گئی

ہم نے مانا ہیں بُرا۔ اور زمانے کا بُرا
جو بھلے ہیں کبھی ان سے بھلائی نہ گئی

ایک تم ہو کہ رہا میل ہمیشہ دل پر
ایک ہم ہیں کہ کبھی دل سے صفائی نہ گئی

شکوہ لب تک اگر آیا۔ تو غضب کیا آیا
بات بھی کیا کوئی پتھر تھی اٹھائی نہ گئی

کان تک ان کے پہنچتی تو اترتی دل میں
ہم سے ہی اپنی بپتا ان کو سنائی نہ گئی

نام سے میرے وہ شرمانے لجھکا لیں آنکھیں
دل میں جو بات تھی ان سے وہ چھپائی نہ گئی

حوصلہ عشق میں گھٹ جاتا ہی کیوں انساں کا
آنکھ بھی ان سے سر بزم لڑائی نہ گئی

پانو میں مہندی لگی تھی جو نہ آئے نہ سہی
مرنے والے کی خبر تک بھی منگائی نہ گئی

خاک دامن سے مری جھاڑ کے فرماتے ہیں
دل کے مٹی میں بھی وہ تری ڈھٹائی نہ گئی

عشق کے جرم میں کیفی کو کیا قتل آخر
جھوٹی تہمت کوئی قاتل سے لگائی نہ گئی

(سنہ ۱۹۱۲ء)

قدرت نے جب یہ عالم امکاں بنا دیا
تو اس میں اک طلسم یہ ارماں بنا دیا

حرص و ہوا نے کلبۂ احزاں بنا دیا
گھر ہی میں ہم کو قیدئ زنداں بنا دیا

ارمان اور اُمید کی ہے ہم ردیف یاس
دنیا کو جس نے کشتۂ حرماں بنا دیا

جو تار تار ہونے پہ بھی ہی گلے کا ہار
عشاق کا اسی کو گریباں بنا دیا

دست جنوں سی بڑھ کے رہا سوز عشق بھی
تار نفس کو تار گریباں بنا دیا

اس آنکھ سی نہیں تو اسے چشم دل سی دیکھ
جلوے نے کس لئے تجھے حیراں بنا دیا

مرکوز ہو گئی نہ دل میں جو شکل یار
اک نقطہ ہی کو مرکز ایماں بنا دیا

تو قوت عمل کا ذرا معجزہ تو دیکھ
ہر ممتنع کو زینت امکاں بنا دیا

کیا جبر و اختیار کا ہے ذکر اے عزیز
سب کچھ دیا ہے تجھ کو جو انساں بنا دیا

سوز وطن سے داغ جو سینوں میں پڑ گئے
اس اجڑے گھر کو روضۂ رضواں بنا دیا

جذبہ جو حریت کا ہوا ہادئ عمل
دشوار تھا جو کام اسے آساں بنا دیا

کیفی غم وطن ہے عروج وطن کا راز
ظلمات ہی میں چشمۂ حیواں بنا دیا

چند پرانی غزلیں جو بعد میں ملیں

ہجوم آور یہ کیوں سینہ میں ارماں ہوتے جاتے ہیں
یہ کیوں راحت کے مٹ جانے کے ساماں ہوتے جاتے ہیں

نہیں کچھ غیر حسن و عشق چوری کیا نظر کس کی
یہ زلف و خال کیوں رخ کے نگہباں ہوتے جاتے ہیں

سمائی ہے ہر اک کے سر میں کیا دھن لنترانی کی
یہ کیوں سب بوالہوس ہو سے عمراں ہوتے جاتے ہیں

تو ہی اے سوز دل دست جنوں کی دستگیری کر
گلے کا ہار یہ تار گریباں ہوتے جاتے ہیں

سپر سینہ تھا کب اور تیر تھے کب نیمکش اس کے
جو مہماں ٹوٹ کر دل میں یہ پیکاں ہوتے جاتے ہیں

نہ ہے تلوار ان کے ہاتھ میں خنجر۔ نہ نیزہ ہے
تعجب ہے کہ کیوں عشاق ہیجاں ہوتے جاتے ہیں

ہے شکل آنکھوں میں دل میں یاد۔ لب پر نام ہے انکا
وہ پھر عاشق سے کیوں پردے میں پنہاں ہوتے جاتے ہیں

سنبھل اے ضبط ناموس وفا پر وقت آیا ہے
جگر کے داغ اب خورشید رخشاں ہوتے جاتے ہیں

جو گزرا عشق میں دل پر وہ تھا سب اپنے ہاتھوں سے
وہ کیوں سن سن کے حال دل پشیماں ہوتے جاتے ہیں

بتوں کی سرد مہری سے یہاں تک جی کڑھا میرا
کہ داغ دل چراغ زیر داماں ہوتے جاتے ہیں

سبق ضبط جنوں کا کیا حجاب حسن سکھلاتا
ہتھیلی کا پھپھولا داغ پنہاں ہوتے جاتے ہیں

جنوں کو دے سکیگا کون اب الزام رسوائی
شباب و ناز ہی دست و گریباں ہوتے جاتے ہیں

بھلے کو حال دل ان سے نہ کہہ بیٹھا کہیں کیفی
وہ اسکی شکل ہی کو دیکھ حیراں ہوتے جاتے ہیں

جب میکدے سے کیفی میخوار چل پڑا
بھٹی وہیں بھڑک اٹھی اور خم ابل پڑا

اے ناصح شفیق یہ دل وہ نہیں کہ جو
اک چکنی چپڑی بات سنی اور پھسل پڑا

وہ آنکھ کیا پھری کہ زمانہ الٹ گیا
قسمت کا پیچ یا تری تیوری پہ بل پڑا

کیفی حرم میں شیخ کو جب چھوڑ کر مڑا
شیشہ میں بادہ ہاتھ میں ساغر اچھل پڑا

دل کو جب حاصل صفائی ہو گئی — جلوہ گر بت میں خدائی ہو گئی
ذکرِ وصل آ کے لب پر رہ گیا — یہ بھی کیا عاشق کی آئی ہو گئی
دار کیا شیطان کا اب چل سکے — وہ بھی اک گندم نمائی ہو گئی
نور ہر پتھر میں پایا طور کا — چشمِ دل کو روشنائی ہو گئی
بیچ سے پردہ دوئی کا اٹھ گیا — تو خود ہی خود پھر خدائی ہو گئی

قسمت برے کسی کے نہ اسطرح لائے دن — آفت نئی ہے روز مصیبت ہی آئے دن
دن سن یہ اور دن دیے اللہ کی پناہ! — اس ماہ نے تو خوب ہی ہم سے گنائے دن
ہے دم شماری دن کو تو اختر شماری شب — اس طرح تو خدا نہ کسی کے کٹائے دن
انکی نظر پھری ہو تو کیا اپنے دن پھریں — ابرِ سیہ گھرا ہو تو کیا منہ دکھائے دن
جی جانتا ہے کیونکہ یہ کٹتے ہیں روز و شب — دشمن کو بھی خدا نہ کبھی یہ دکھائے دن

کیا لطف زیست بھرتے ہیں دن زندگی کے ہم
کیفی برے کسی کے نہ تقدیر لائے دن

نتیجہ کیونکہ اچھا ہو نہ ہو جبتک عمل اچھا — نہیں بویا ہے بیج اچھا تو کب پاؤ گے پھل اچھا
کر دست آجکل حضرت برائی کو ابھی چھوڑو — نہیں جو کام اچھا تو نہ آج اچھا نہ کل اچھا
برے کو تک بھی کرنے اور توقع نیک نامی کی — دماغ اپنا سنوارو تم نہیں ہے یہ خلل اچھا
جو ہو جائے خطا کوئی کہ آخر آدمی ہو تم — تو جتنا جلد ممکن ہو کرو اس کا بدل اچھا

معذرت کی ہے کہیں جانا ہی پھر آئینگے — عقل حیران ہے اب کیا کریں اور کیا نہ کریں
پر کبھی ان سے ملی ہے نہ ملے گی اچھی — طاعت و زہد کو جنت کا جو بیعانہ کریں
شمع رویوں کی صحبت کا جو دم بھرتے ہیں — ایک مدت وہ ابھی بیعت پروانہ کریں
نام پر انکے مریں ہم تو کوئی بات بھی ہو — اور ہماری وہ ذرا نام کو پروانہ کریں

ملک دل کی بادشاہی دیکھ لی
ہم نے اے بندہ خدائی دیکھ لی
حور و غلماں کا ہے نقش اس پر جما
قلب زاہد کی صفائی دیکھ لی
جانے کیا دیکھا ہے تم کو دیکھکر
اے بتو ہم نے خدائی دیکھ لی

ذرا چین لینے دے اے جذب دل تو
نہ کر طبع دلدار کو مضمحل تو
رہا دل میں اب کچھ نہ جز یاد جاناں
زیادہ بھڑک اب نہ اے سوز دل تو
دیا ہے جو دل جاں سے بھی ہاتھ دھولے
امیدوں کا خوں کردے اس پر بہل تو
پڑھا کلمہ عشق بتاں کا جو کیفی تو
تو چھاتی پہ اب رکھ لے ہجراں کی سل تو

مانا کہ چلے تم ہو مرے بر سے نکل کر
جاؤ گے کہاں پر دل مضطر سے نکل کر
یوں آ ئے مرے پہلو میں تم گھر سے نکل کر
بو آتی ہے جسطرح گل تر سے نکل کر
دم عاشق بیجاں کے بھلا سینے میں کیا
آتا ہے مگر آپ کے خنجر سے نکل کر

ضرورت اسکو پردے کی کہاں ہے
مری آنکھوں کے پردوں میں نہاں ہے
کہاں جاؤں میں بخت بد سے بچکر
زمیں ہے سخت اور دور آسماں ہے
زمیں والو جسے کہتے ہو افلاک
وہ میری آہ سوزاں کا دھواں ہے
جسے تم ڈھونڈتے پھرتے ہو گھر گھر
تمہارے خانہ دل میں نہاں ہے

ہو کے عاشق جان مرنے سے چرائے کس لئے
مرد میداں جو نہ ہو میداں میں آئے کس لئے
جو دل و ایماں نہ دیں نذران بتوں کو دیکھکر
یا خدا وہ لوگ اس دنیا میں آئے کس لئے
ہے یہ انداز حیا اور طرز تمکیں! کیوں نہیں!
جو نہ ہووے چور وہ آنکھیں چرائے کس لئے
دیکھئے کس حق کے آج کھلتے ہیں نصیب
تیغ کیوں تولے ہیں یہ چلّے چڑھائے کس لئے
انگلیاں اپنے پہ اٹھوائی نہ ہوں منظور تو
وہ کسی کو عام محفل سے اٹھائے کس لئے

اس کے پیچ و خم سے جیتے جی نکلنا ہے محال
حضرت کیفی تم اس کوچے میں آئے کس لئے

مشکل انساں کو نہیں وصل خدا ہو جانا — سخت دشوار خودی سے ہے جدا ہو جانا
ایک چٹکی ہی میں اکسیر ملے دور نہیں — پاس تم خاک نشینوں کے ذرا ہو جانا
غیر سے آنکھ اٹھائے تو پڑے یار نہ آنکھ — بند ہونا ہی ہے اس چشم کا وا ہو جانا
ہمہ تن سوز تو بن شمع صفت طالب نور — کھیل پروانوں کا سمجھا ہے فدا ہو جانا
خار غم کی دل صد چاک پہ تو چوٹ تو کھا — گل سے پھر سیکھنا بلبل کا خدا ہو جانا
محو یکرنگ ہے تو ذات کو دے اپنی مٹا — دیکھ برسات میں پانی کا ہرا ہو جانا

اہل دل کے نہ طریقوں پہ تو منہ آ کیفیؔ
ہے منا ہی کا یہاں عین روا ہو جانا

کوئی دل لگی دل لگانا نہیں ہے — قیامت ہے یہ دل کا آنا نہیں ہے
منائیں انہیں وصل میں کسطرح ہم — یہ روٹھے کا کوئی منانا نہیں ہے
ہے منظور انہیں امتحاں شوق دل کا — نزاکت کا خالی بہانہ نہیں ہے
دغا پر دغا صلح میں دشمنی ہے — بھلائی کا ہرگز زمانہ نہیں ہے
شب غم بھی ہو جائیگی اک دن آخر — کبھی اک روش پر زمانا نہیں ہے

ہے کوئے بتاں بس گھر اس کا ہی کیفیؔ
زمانے میں جسکو ٹھکانا نہیں ہے۔

خدا بھی طرفدار نکلا تمہارا — یہ جھگڑا چکا اب ہمارا تمہارا
بتو شوق دیدار سے سر نہ چڑھنا — نظارہ کسی کا تماشا تمہارا
بڑے باحیا اور پردہ نشیں ہو — ہے ہر کوئے و برزن میں چرچا تمہارا
لو میں ہی جھوٹا ہوں پیماں شکن ہوں — نہیں اب تو کچھ مجھ سے شکوہ تمہارا
دل آئے نہ کیوں۔ کیوں نہ ایماں جائے — یہ صورت تمہاری۔ یہ غمزہ تمہارا

دل و جاں کیفیؔ ہے قربان تم پر
نہیں اس سے انکار زیبا تمہارا

رُباعیاں

فلسفۂ حیات

۱۹۴۳ء

کیوں سہم گیا جا کے تو گورستاں میں
گورستاں بھی ہے عالم امکاں میں
مرنا نہیں۔ رہنا ہے ہمیشہ زندہ
ایثار ہو۔ نیکی ہو اگر انساں میں

’’الحادثُ فانی‘‘ کو سمجھا بھی ہے
سادہ بھی ہے یہ قول معمّا بھی ہے
لابُد ہے عدم تو زندگی ہے لابُد
مرنا ہے ہر ایک کو تو جینا بھی ہے

دل پہ نہ قنوطیت کو کرنے دے ہجوم
تو موت سے پیشتر نہ ہو جا معدوم
ہے گور جو لابد تو ہے گہوارہ بھی
ہیں جیسے ہلال و بدر لازم ملزوم

تاریکیٔ یاس میں تو ناحق نہ بھٹک
کھا سکتی ہے تجھ کو نہ زمیں اور نہ فلک
اللہ سے جو فرض ودیعت ہے تجھے
تعمیل میں اس کی تو کھپا دے جاں تک

رکھ یاد یہ کارخانہ ہے قدرت کا
یہ دار فنا نہیں۔ یہ ہے دار البقا
ملتے دیکھا ہے تخم کو مٹی میں
یہ بھی دیکھ اس سے کیا ہوا ہے پیدا

مانا کہ بلند مائل پستی ہے
مانا کہ اجڑنے کے لئے بستی ہے
کر غور یہ زیست ہی تو ہے جان فنا
ہستی سے عدم کی جان من ہستی ہے

کیوں دل پہ یہ حرماں کی گھٹا چھائی ہے
سونے نہ رہے جاگے ہیں اعمال ترے
ہستی ہے یہ کیوں معرکہ آرائی ہے
ہستی کی عدم در اصل انگڑائی ہے

موت اور لحد سے تو وہی ڈرتے ہیں
اپنے لئے جو زیست بسر کرتے ہیں
جو خلق خدا پہ کرتے ہیں جان فدا
وہ زندۂ جاوید ہیں کب مرتے ہیں

ہستی کو تو نیستی کا طوفاں نہ سمجھ
مٹ جانے کو ہے عالم امکاں نہ سمجھ
تعبیر ہے اس کی وصل حق اے خوش فہم
اس زیست کو تو خواب پریشاں نہ سمجھ

اللہ کو قائم و قدم کہتا ہے
خلاق جہاں تو لاجرم کہتا ہے
پا سکتا ہے سچے سے کہیں جھوٹ وجود
کیوں زیست کو طعمۂ عدم کہتا ہے

بخشا تجھے خالق نے بھی کچھ مقدور
اذن محشر وگرنہ پاتا نہ صدور
رکھ دی جو سزا جزا تو مختار کیا
مجبور نہیں در اصل تو ہے معذور

اس وِردِ فنا نے کر دیا ہم کو فنا
دنیا کا نہ عقبیٰ ہی کا کچھ کام بنا
وہ بھی تو جہاں میں ہیں خدا کے بندے
کر لیتے ہیں بے درنگ جو جی میں ٹھنا

دن رات غم موت میں آہیں بھرنا
ہے رب کی ودیعت کو معطّل کرنا
دیں چھوڑ کے جیتے بندے جاتا ہی ایک
فرمایئے جینا ہے کہ ہے یہ مرنا

حسنِ عالم آرا

سمائی نہ آنکھوں میں تری نہ نشان محبوبی
نہ تیری روح کبھی بحر حسن میں ڈوبی
لگائے رہتا ہی سینے سے کیا تو یہ فوٹو
ہے ذرے ذرے میں اللہ کے آئینہ دار تری خوبی

تعینات کا نکلا نہ تیری آنکھ سے خار — بساط دہر کا دیکھا کبھی نہ تو نے سنگار
سدا بہار ہمیشہ جواں ہے شاہد حُسن — یاں اس کے باب میں مہمل شباب اور بہار

دمن دمن چمن حُسن ہے کوئی دیکھے — چراغ طور کی جگنو میں روشنی دیکھے
وہاں تنگ نہیں قید خانہ جس دِل کا — ہر ایک شے میں وہ انداز دلکشی دیکھے

صبح نور روئے زیبائے بہار — شام عکس زُلف لیلائے بہار
منظر حُسن ازل نظروں میں ہے — اور دِل میں کیف صہبائے بہار

آغاز کی خبر ہے جو کہیئے شباب حُسن — جب تو نہ تھا بلند تھی بانگ رباب حُسن
ڈوبی ہوئی ہے کیف میں اسکے تمام خلق — کیفی ہی ایک کیا ہے غریق شراب حُسن

فلسفۂ توحید

گل میں جس طرح رنگ اور بُو ہیں — اس میں اس طرح جذب ہیں۔ تُو ہیں
تجزیہ حُسن و عشق کا کیا ہو — ایک تصویر کے دو پہلو ہیں

خالق اس خلق کا سمجھتا ہُوں — خلق سے کب جُدا سمجھتا ہُوں
کیا حرم اور دیر کا ہے ذکر — آپ کو میں خدا سمجھتا ہوں

شیخ کعبہ کو تو نے کیا جانا؟ — برہمن کس کو بُت میں پہچانا؟
سب جگہ ہے تو کیوں یہ قید مکاں — چُپ ہیں اس کے جواب میں دانا۔

ہیں تو یہ ہستئ دُنیا سمجھا۔ — ایک نیرنگ تماشا سمجھا
رنگ ہر شے میں اسی کا پایا — تو بتا رازِ جہاں کیا سمجھا

فلسفۂ حیات

دارِ عالم بھی کیا تماشا ہے۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے۔
کبھی خالی ہوا نہ یہ رمنا یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے!

جینے کی خوشی نہ کر نہ مرنے کا الم ہیں اصل میں نیستی و ہستی توام
دیکھا ہے سمندر کے تموّج کو کبھی بس ہے یہی موت و زندگی کا عالم

کہتے ہیں بوالہوس کہ جو جی ہے تو ہے جہاں جب ہم نہیں رہے تو زمانہ رہا کہاں
سرچشمہ حیات کو کہیئے اننت ناگ اس کی نہ ابتدا ہے۔ نہ انجام کا نشاں

شیر خواری کو ابتدا سمجھا اور دم مرگ انتہا سمجھا
کیا یہی زیست کی حقیقت ہے ہائے کمبخت تو بھی کیا سمجھا

شباب اور پیری

دُنیا کو غلط ہے دارِ فانی کہنا ہر چیز کو اس کی آتی جانی کہنا
غم پیر ہوئے تو کیا جواں کوئی نہیں خود غرضی ہے پھر ہائے جوانی کہنا

گر دل ہے جواں تو ہے جوانی جب تک ہے زندہ دلی تو زندگانی جب تک
زندوں میں تجھے کرینگے دانا نہ شمار ہے مُردہ دلی تو نوحہ خوانی جب تک

کب تک غفلت میں تو رہے گا سوتا اور موئے سفید آنسوؤں سے دھوتا
کس واسطے ماتم ہے بڑھاپے کا تجھے بیٹا نہیں تیرا کہ نور سا پوتا ہو

یہ شکوہ یہ شغل نوحہ خوانی کیسا — یہ ذکر فنائے زندگانی کیسا -
تو بطن سے مادر کے جواں نکلا تھا — پیری میں پھر افسوس جوانی کیسا -

حوصلہ اور استقلال

آفات و مصائب سے کبھی منہ مت موڑ — دل ٹوٹ گیا تو اس کا مشکل ہے جوڑ
ہے شکوۂ آسمان و قسمت بیجا — چھوڑے تجھے کل زمانہ تو جی مت چھوڑ

قسمت بھی اگر پھوٹ گئی - جائے پھوٹ — پھر ہاتھ نہ آئیگی جو ہمت گئی - چھوٹ
لے کام جو حوصلہ سے پھر یاس ہو کیوں — سر پر نہ تو خاک ڈال - سینہ مت کوٹ

مجذوب کی آ - تجھے سنائیں اک بڑ — گردوں سے الجھ نہ اپنی قسمت سے جھگڑ
ناکامیوں پر چاہیئے ہمت ہو دوچند — کیا غم ہے جو کام جائیں بن بن کے بگڑ

رحمت حق

ہے اہل دول کو اپنی دولت پہ گھمنڈ — زاہد کو ہے زہد اور طاعت پہ گھمنڈ
دنیا سے الگ ہے اپنا مسلک کیفی — ہم کو تو ہے اللہ کی رحمت پہ گھمنڈ

پاس وضع

افلاس میں بھی فراخدستی نہ گئی — گر کر بھی نظر جانب پستی نہ گئی
اف پیر مغاں نے کیا پلایا تھا جام — اپنی تو خمار میں بھی مستی نہ گئی

ہوش اور مدہوشی

الزام ہے کیفی پہ کہ وہ ہے ذی ہوش — اور دین میں اپنے ہے بہت عصمت کوش
ہاں ہاں نہ ہو دین تو ہو کیونکر بے دیں — ہاں ہاں نہ ہو گر ہوش تو کب ہو مدہوش

عشق کی عظمت

اُلفت زدہ دِل کو شیخ تو کیا سمجھا — وحشت کا جنوں کا اِک کھلونا سمجھا
جو داغ ہے اس کا عرش کی ہی قندیل — تو زعم میں اپنے جوشِ سودا سمجھا

جاہل کا ہے قول عشق ہے اک کھٹراگ — آنند سے اور خوشی سے ہے اسکو لاگ
ہے عشق جو شمع تو ہے دِل اس کا لگن — دل ہے جو دلھن تو عشق اس کا ہی سہاگ

ہو جسکو مسرّت اور شادی کی تلاش — سمجھو کہ وہ بوالہوس اور ہے اوباش
جس دِل میں ہو عشق غم بھٹکتا ہی وہاں؟ — عشاق ہیں ہر حال میں مست اور بشاش

جذبۂ شعر

جب آئی خزاں تو نغمہ خوانی چھوڑی — مضموں نہ ملا تو شعر خوانی چھوڑی
ہم بلبل و شاعر سے الگ ہیں کیفی — دِل کی نہ کبھی رام کہانی چھوڑی

رند باصفا

کہتے رہے ان سے مل کے رہنا ناصح — رندوں کو کبھی بُرا نہ کہنا ناصح
جنت پائیگا لگ چلا جواں سے — اور تم۔ ہے بس اپنا اپنا لہنا ناصح

زاہد تجھے وحشت ہے ہو جائیگا دیوانہ — آ ساتھ ہمارے چل پیوا دیں گے پیمانہ
ہے خواب کی بیداری دُنیا جسے کہتا ہے — عقبےٰ جسے سمجھا ہے وہ بھی ہے اک افسانہ

ساقی سے

ہاں بادۂ تُند و تیز لادے ساقی — جو کچھ ہے ترے پاس پلا دے ساقی
مطلب ہے سرور سے نہ مستی سے غرض — جیسے بھی ہو مدہوش بنا دے ساقی

کیا ہے اگر آنکھوں سُرور آجائے
وہ جام دے جس سے دل میں نُور آجائے
ہاتھوں میں کلید در گلزار خلیل
اور سینے میں جذب ہو کے طُور آجائے

مجمع یہ نہیں ہے۔ اتفاقی ساقی
ہر دل ہے یہاں دل سے ملاقی ساقی
دیکھ ایک ہی رٹ لگی ہوئی ہے سب کو
ایک ایک زبان پر ہے۔ ساقی ساقی

نعرۂ مستانہ

محشر کے دھڑکوں سے ناصح ہمیں مت ہو لا
ہے اپنی دُعا تجھ پہ بھی ہو کرم مولے
رکھ دھیان نہ عقبیٰ کا کر فکر نہ دنیا کی
ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولے

اس بادہ سے واسطہ خردمندوں کو
یا لالہ عذاروں کے شکر خندوں کو
کیا ورد ہے۔ کیسا وزن رکیں کی چوری
اللہ سے ملاتا ہی یہی بندوں کو

وفات خواجہ الطاف حسین حالی

آزاد نہ مجروح نہ باقی ہیں ظہیر
اور دے گئے داغ ہجر داغ اور امیر
حالی کا فقط دم تھا سو وہ بھی نہ رہا
ہیہات ہُوا سخن کا قصہ ہی اخیر

قسمت اُردو زباں کی روتی ہے آج
شیریں سخنی وداع ہوتی ہے آج
جس ذات نے سوتوں کو کیا تھا بیدار
پردے میں لحد کے آہ سوتی ہے آج

آزاد نے تو طرح سخن جو ڈالی
تکمیل تھی اسکی تجھ سے ہونیوالی
اُردو کا بجا ہے۔ تجھ کو سعدی کہنا
احسان ہے شاعری پہ تیرا حالی

رکھتے ہیں تعرض سے جو یہ تجھ کو نام
پا لغز سے خالی نہیں حالی کا کلام
وہ عشر عشیر اس کا کرکے تو دکھائیں
تو نے جو لیا زباں سے اور شعر سے کام

کوئی یہ مسیحائی دکھائے تو سہی
ان مردہ دلوں کو یوں جلائے تو سہی
کرتا ہے جو اعتراض شعروں پہ ترے
دو شعر وہ ایسے کہہ کے لائے تو سہی

وہ سرور ملک خوش مقالی نہ رہا
سجّادۂ میرزا کا والی نہ رہا
ماتم ہو نہ کیوں ملک سخن میں کیفی
افسوس کہ آج خواجہ حالی نہ رہا

مشاعرہ اور موسم[1]

شملہ کو چلا تھا۔ کہ پکڑ لائے خضر
گرمی کی وہ شدت تھی کہ بھنتے تھے جگر
جب گرمئے صحبت سے دبی حدت فصل
قدموں پہ گرا فلک بھی پانی ہو کر

نیرنگ کا رنگ آشنائی ہی یہاں
اعجاز کی اعجاز نمائی ہے یہاں
امبالہ سے بالا جانا تھا محال
دُھن مرلی کی مجھ کو کھینچ لائی ہی یہاں

کیفیت خاص دل پر جو طاری ہے
اظہار میں اس کے یہ زباں عاری ہے
دو آتشہ ہے مئے وصال احباب
گرمی کی۔ سخن کی گرم بازاری ہے

کیوں کہتے ہیں سب لوگ بُرا گرمی کو
جل بھن کے ہیں دیتے بددعا گرمی کو
حیران ہوں میں تو۔ کس کو بڑھکر سمجھوں
احباب کی گرمجوشی یا گرمی کو

---

[1] سنہ ۱۹۱۳ء کی جلتی بلتی گرمیاں تھیں۔ علامہ کیفی شملہ جا رہے تھے۔ امبالہ کے سٹیشن پر شیخ محمد خضر جو آپ کے نہایت پیارے دوست تھے۔ ملنے آئے۔ انکے ساتھ اور احباب بھی تھے۔ اسی شب کو رائے مُرلی دھر صاحب کے ہاں مشاعرہ تھا۔ کیفی صاحب کو مشاعرے کی شرکت کیلئے اُتار لیا گیا۔ گرمی نہایت سخت تھی۔ مگر مشاعرے کے وقت سے کچھ پہلے ترشح ہو گیا۔ میر غلام بھیک نیرنگ سید اعجاز حسین اور رائے مرلی دھر کی طرف بعض رباعیوں میں اشارہ ہی۔ وقتی چیز ہے مگر لطف سے خالی نہیں۔ اس سے حضرت کیفی کی حضور گوئی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

گرمی سے کف پا میں حنا باندھی ہے — زینت جس نفس کی یا باندھی ہے
یہ سب غلط اعجاز سخن سنجاں نے — پتا نہیں ہلتا وہ ہوا باندھی ہے

گرمی نے کیا قہر ستم کیا ڈھائے — اوس اس پہ پڑی بزم میں دل گرمائے
وہ ہو گئی سرد مہری اب اسکی ہوا — موتی ہنس ہنس کے چرخ نے برسائے

تعلّی

۹۰/۱۸/۶

کیونکر نہ جلیں عدو کہ شبدیز قلم — گھوڑے سے تفنگ کے نہیں ہرگز کم
ہر نقطہ ہے دشمن کو زحل کی مکھی — بندوق کی نال ہے مرا نال قلم

کلام سادگی

جھومر سر مہتاب پہ جھمکا ہے کبھی — گہنا سورج کا وصف ٹھہرا ہے کبھی
زیور سے یونہیں غنی ہے کیس حسن کلام — ہاں دیدۂ بینا سے بھی دیکھا ہے کبھی

قدرت نے کہا ماہ کا زیور ہے فضول — حکمت نے کہا ماہ رخوں کا ہے بھول
پھر حسنِ کلام اور زیور لاحول — ہے ہمکو نہ قدرت سے نہ حکمت ہی عدول

چشم آہو میں سرمہ ڈالا کس نے — سوسن کو مسی لگاتے دیکھا کس نے
آرائش چہرۂ سخن ہے بیکار — روئے مہ پر ملا ہے غازہ کس نے

دی کس نے ہلال کو ادا یہ بانکی — اور چندوے پہ سورج کے کرن ہی ٹانکی
کیوں شاہد مضموں کی سجاوٹ کی ہی فکر — حاجت ہوئی کہکشاں کو کب افشاں کی

کیفی کے کلام پر ہے تعریض اکثر — ہے نظم کا حسن جانفزا بے زیور
سوچو تو کہ خلقت کو جب اس سے روکے — پھر شاہد مضموں کو سجائے کیونکر

رنگینیٔ طبع میں کہاں سے لاؤں — یاروں کے جو دل کو خوش کروں بہلاؤں
رنگینی سے ہے مُراد اگر ہو نا رنگ — یکرنگی کا رنگ آؤ تمہیں دکھلاؤں

زندہ دِلی

جانداروں میں ہے گرچہ ملی جا ہم کو — موٹی غلطی ہے زندہ کہنا ہم کو
تن زندہ ہے دِل مگر ہے مردہ اپنا — کیا خاک جلا سکیں مسیحا ہم کو

ہستیٔ بے بنیاد

نقش بر آب یہ جہاں ہے گویا — جوں مَوج ہر اک شے گذراں ہی گویا
ہستی ہے حباب کی طرح بے بنیاد — پانی پہ ہَوا کا اک مکاں ہی گویا

افکار

دُنیا میں جو ایک بار پیدا ہوگا — ہر حال میں وہ فکر کا پتلا ہوگا
انساں کبھی اس سے بچ سکا ہے کیفی — دُنیا کا نہیں تو فکرِ عقبےٰ ہوگا

اہلِ خطّہ کی ہجرت

لَوٹے نہ مثال بو چمن کی جانب — جوں دُودۂ شمع انجمن کی جانب
شاید کہ جلا وطن ہوئے تھے ہم سب — بھولے بھی نہ رُخ کیا وطن کی جانب

ہم مثلِ شمیم گل چمن سے نکلے — یا صورتِ مشک ہم ختن سے نکلے
پھر جیتے جی رُخ کیا وطن کا نہ کبھی — آدم کی طرح باغ عدن سے نکلے

قوم کی حالت

کیا اخترِ نحس اپنے تابندہ ہوئے — جاگے نہ کبھی یہ بخت خوابندہ ہوئے
ثابت ہوا مسئلہ تناسخ کا غلط — برسوں ہوئے مر کے ہم نہ پھر زندہ ہوئے

اے قوم غم و غصہ میں تو دانت نہ پیس — کر تو بھی ذرا اپنے سے اچھوں کی ریس
یہ کاہلی اور اس پہ فلاکت کا گلہ — اک لائے کما کے اور کھائیں دس بیس

تقدیر کے شکوہ ہائے بیجا کب تک — ناسازیٔ بخت کا یہ رونا کب تک
ہو اپنی ہی ذات سے شکایت ہو اگر — بیمہریٔ تقدیر کا شکوا کب تک

کالا ہوا منہ پہ سر سے سودا نہ گیا — جلنے پہ بھی رسی کا جو بل تھا نہ گیا
ہیں اب بھی وہی قوم کے تیور کیفی — اپنا تو خمار میں بھی نشا نہ گیا

اسراف

بوجھ اپنا نہ اٹھ سکا ہی طاقت ہے — کنبے کا پلا نہ پیٹ یہ ہمت ہے
با اینہمہ خرچ شادیوں کا۔ توبہ! — کوڑی نہ رکھیں کفن کو یہ نیت ہے

سستی

سستی نے بنائی ہے یہ حالت اپنی — بے علمی سے یہ ہوئی درگت اپنی
کیا اور کسی سے ہم کو شکوا کیفی — ہے اپنی ہی ذات سے شکایت اپنی

پدرم سلطاں بود

اوصاف سلف کی ہے عبث گفت و شنود — جس وقت کہ تم میں ہے تنزل موجود
جوہر ہیں جو کچھ تم میں تو ہاں دکھلاؤ — بے سود ہے کہنا پدرم سلطاں بود

تاریخ گذشتہ پہ اکڑنا ہے فضول — نو روشنی یافتوں سے لڑنا ہی فضول
ممکن نہیں یک شنبہ کو شنبہ کرنا — مٹھی میں ہوا کو بس پکڑنا ہی فضول

سب پہلے تعصبات دھو دو دل سے — دیرینہ توہمات دھو دو دل سے
ہے اگلے زمانے کی ترقی کا زعم — بیفائدہ۔ واہیات۔ دھو دو دل سے

علم حاصل کرو

کام آئے گی دولت ہی نہ حشمت ہرگز — پُرکھوں کی کمائی اور نہ عزت ہرگز
اک دولت علم ہے وہ حاصل کرو — آسکتی ہے جس پہ کچھ نہ آفت ہرگز

ہیں جو کہ نکمے اور گھر سے فاضل — لکھے نہ پڑھے نام محمدؐ فاضل
ہے ان کے یہ اعتقاد مذہب کا حال — ہیں سیکڑوں بندہ درخت فاضل

بے شک یہ ہے ٹھیک وہ بھی اک عالم تھا — پڑھنے لکھنے کا جب نہ کوئی مُعلم تھا
وہ دن اب لد گئے کبھی کے حضرت — ماں باپ کا قول جب "متوئی استم" تھا[۱]

ماں باپ کے لاڈلے دُلارے ہیں جو — محلوں کے چراغ آنکھوں کے تارے ہیں جو
رہ جاتے ہیں اکثر وہی بے علم و غبی — پڑھ جاتے ہیں۔ افلاس کے مارے ہیں جو

پھیلاکے ہو باہمن کو کھلتے کیوں ہاتھ — ریکھا کا تو ہم بتاویں پھل ہاتھوں ہاتھ
حاصل تم اگر کرو گے اونچی تعلیم — اونچا رہے گا ہمیشہ بے جونکھوں ہاتھ

ہم کیا کہیں زائچہ میں لکھا کیا ہے — ہاں ہاں اس سر میں کرم کی ریکھا ہے
عالی ہے دماغ فیض تعلیم سے گر — تو اوچ کا گرہ دوسرے گھر بیٹھا ہے

عورت کی ذات

جس قوم میں عورتوں کی تکریم نہیں — جس قوم میں لڑکیوں کی تعلیم نہیں
جس قوم میں عورت نہیں محترمہ مرد — وہ قوم کبھی قابل تعظیم نہیں

---

[۱] کشمیری زبان کی ایک ضرب المثل ہے: لستم تو متوئی استم۔ بچہ دیوانہ ہے۔ مگر جیتا رہے۔!

در بارۂ زن بدظنی کے لاکھوں اقوال
بک بک گئے ہر زمانہ میں جہّال
بھارت میں کہا ہے برہم مورت اس کو
بدگوئی ہے معترض کی بدنفسی پہ دال

لفظوں کی رعایت سے جو زن کہتے ہیں
انجام کو بد یہ طعنہ زن کہتے ہیں
پنجاب کی دیکھئے بلند اخلاقی
عورت کو وہاں زن نہیں رن کہتے ہیں

ہے قابل قدر یہ منو جی کا کلام
عورت نہیں جس گھر میں یہ عزّو آرام
اس گھر پہ سدا چھائی رہیگی نکبت
ہو جائیں گے گھر کے لوگ مردود تمام

اک قول ہے مہمل اور دانش سے بعید
"اسپ و زن و شمشیر وفادار کہ دید"
جوہر کے لئے ہے قابلیت درکار
پاکیزگی کیا کرے کہ جب دل ہو پلید

اردھنگی سمجھ کے جس نے مانا اس کو
اپنے سے سوا پوتر پایا اس کو
ہیں اس کی بڑائی کی ہزاروں سندیں
دیکھو علماء نے کیا سراہا اس کو

ہے عقل میں مدعی کی بے شبہ فتور
عورت میں جو کہتا ہے جبلّی ہے فتور
اس میں جو بدی ہے جانب مرد سے ہے
اصلی نہیں کوئی ذات نسواں میں قصور

خلقی ہے برائی تو ہے پوتھی جھوٹی
مکسوبہ ہے تو نہیں ہے وہ یک طرفی
مانا ہے کہ بری ہے مے پس میکش بدتر
جو ہر کو جو کھو کے شے میں لاتے ہیں بدی

بچپن کی شادی

بچپن میں خراب بیاہ کرنا ہے عزیز
اللہ کا اک گناہ کرنا ہے عزیز
خطّی کی طرح ہے معنوی بھی تجنیس
یہ بیاہ نہیں تباہ کرنا ہے عزیز

تعلیم نسواں

عورات کو گو دن اور جاہل رکھنا
اللہ کے حکم کو ہے عاطل رکھنا
جاہل ہیں جو عورتیں تو جاہل ہے قوم
اس بات کو یاد اہل محفل رکھنا

یہ اوّلین درسگہ پسر دختر کی
بتلاؤ کہاں ہے گر خبر ہے گھر کی
اسکول ہے۔ مکتب ہے نہ ودّیالہ ہے
جہان کیفی ہے! وہ گود ہے مادر کی

بچوں کے پڑھانے کی اُٹھا دی تمہید
سمجھے ہو کہ پانچویں برس میں ہے سعید
چھ اور برس سات کہیگا کوئی
ہم کہتے ہیں بیس سال پیش از تولید

گر عورتیں ودّیا دنی ہوں ہم ہیں
بچے بھی عقیل اور ذکی ہوں ہم ہیں
عذر آپ کا ہو درست پہلے جو کبھی
عورات نہ با علم ہوئی ہوں ہم ہیں

ہے علم جو خلّاق صفات حسنات
اور رہبر راہ راست ہے اس کی ذات
کیا وجہ کہ مردوں کو خدا تک پہنچائے
اور چاہ ضلالت میں گریں مستورات

جب علم ہے دافع عیوب مذموم
اور کرتا ہے جہل اور خودی کو معدوم
عورت کے دماغ میں پہنچکر ہوگا
کیوں قدرتی تاثیر سے اپنی محروم

چشمان بصیرت کو اگر تم کھولو
اور جانچ کے میزان خرد میں تولو
پھر پاؤ جو تعلیم نسا میں کچھ نقص
اس وقت تم آنکھیں اونچی کرکے بولو

بچوں کی تعلیم

بچوں کو جو علم و فن نہ سکھلائینگے
افسوس کریں گے اور پچھتائینگے
بچپن میں نہ دیں گے زور تعلیم پہ جو
وہ کھو کے یہ وقت خاک پھر پائینگے

انقلاب

یکسر الٹا یہ کارخانہ کیسا — اور ردّ و بدل ہُوا ہے کیسا کیسا
پرسوں جو تھا کل نہ تھا۔ جو کل تھا نہیں آج — دیکھو کہ بدل گیا زمانہ کیسا

خواب دُنیا کی جو کہ سمجھے تعبیر — ساتھ اس کے ہی رنگ کے ہُوئے وہ تغیّر
قسمت سے بھی بڑھ کے مغز تھے جن کے کورے — افسوس رہے لکیر ہی کے وہ فقیر

یہ رونا چھوڑ دو کہ ہے یہ زمانہ سفلہ نواز — ذرا سنبھالو شرافت کی اپنی تم پرواز
سنو جو گونج رہی ہے ہر اک طرف آواز — زمانہ با تو نہ سازد۔ تو با زمانہ بساز

خواب غفلت

نہ اُٹھے ایسے بے خبر سوئے — گھوڑے کیا سر ہی بیچ کر سوئے
میرے ہمقومو تم مگر اپنے — بخت سے شرط باندھ کر سوئے

حسد

خوش پایا کسی کو تو کیا ہے افسوس — دیکھ اپنوں کو سرخرو ہُوا ہے افسوس
پہنچی ہے سیہ بختی قومی یاں تک — یہ خون سفید ہو گیا ہے افسوس

دعوت بیداری

اٹھو کہ ہوا نور کا تڑکا دیکھو — سر پر ہے تمہارے شور تڑکا دیکھو
سیلئے زمانہ پر بھی خوابِ خرگوش — ہو جانے کو ہے گھڑی میں تڑکا دیکھو

غفلت کا رہا یہی جو نقشا اے قوم — ہو جائیگا کوئی دم میں تڑکا اے قوم
کھویا ہُوا وہ نہیں جو گھر آئے شام — اُٹھ۔ چیت کہ ہے ابھی سویرا اے قوم

بدمست مئے عیش و طرب کے ہیں امیر — مفلوک ہیں افلاس کے مارے دلگیر
ہیں پیٹ کی فکر میں جو ہیں پیچ کی راہیں — اب خدمت قومی ہو تو کس طرح سفیر[1]

دعوت عمل

خواب غفلت سے قوم والو اُٹھو — رفتار زماں کو دیکھو بھالو اُٹھو
کرنا ہے سو کر لو ورنہ پچھتاؤ گے — یہ وقت ہے کام کا نہ ٹالو اُٹھو

بیہودہ مکالمہ ہے اور بحث فضول — جب قول سے سر بسر ہے فعلوں کو عدول
کہنے ہی پہ حصر ہے تو سب ہیں ملکوت — ہو جن پہ عمل وہی تو پکے ہیں اصول

ہے روز سپید کا اب سویرا اُٹھو — دل دھولے سیاہی نے ہی گھیرا اُٹھو
اب تو غفلت کی نیند سے جاگو تم — چھایا ہے نحوست کا اندھیرا اُٹھو

مانا کہ نہ تم نے کچھ بھی دنیا دیکھی — دیکھی بھی تو بند آنکھوں سے گویا دیکھی
نادان ہو تم مگر ہیں رہبر دانا — انسان بنو تم ان کی دیکھا دیکھی

ہیں یوں تو بہت شور مچانے والے — اصلاح کے غل سے سر پھرانے والے
اے قوم بتا کہ آج تجھ میں کتنے — ہیں بن کے مثال خود دکھانے والے

آزادی کا گر

آزادی کے معنی کیا بتائیں کیا ہے — مضبوط نظام میں جکڑ جانا ہے
عام اس کی حقیقت کو غلط سمجھے ہیں — پابندی و قید کی یہ اک ڈبّا ہے

---

[1] سفیر کشمیر ایک ماہانہ رسالہ مراد آباد سے نکلا کرتا تھا۔ اس میں یہ اور چند اس کے ساتھ کی رباعیاں شائع ہوئی تھیں ۔

آزادی و آوارگی دو لفظ ہیں عام | اُلٹی ہی مراد جن سے لیتے ہیں عوام
ہیں اُن کے تو معنی سخت اصولوں کی قید | اور اس کے نہ کام ہی سے کچھ رکھنا کام

نیکی کر

کچھ فکر تو عاقبت کمانے کی کر | جو بن پڑے خدمت وہ زمانے کی کر
مت یاد رکھ اسکو جو کرے تجھ سے بدی | دشمن سے بھی اے امرِ خدا نیکی کر

دوست کہاں ملتا ہے

الماس و عقیق اور نگیں ملتا ہے | امرت۔ لعل اور در ثمیں ملتا ہے
پارس۔ گوگرد سرخ۔ خاک سیماب | مل سکتے ہیں پر دوست نہیں ملتا ہے

قدیم

جاہ و حشم ہر دو جہاں ملتا ہے | جو کچھ ہے یہاں اور وہاں ملتا ہے
پا سکتا ہے انساں ہر اک شے لیکن | یارِ صادق اجی کہاں ملتا ہے

دورِ اوّل

ابتدا سے ۱۸۸۴ء تک

دورِ اوّل

ابتدا سے ۱۸۸۴ء تک

۱۸۸۴ء میں یہ ابتدائی غزلیں مختلف پرچوں وغیرہ سے ردیف وار مرتب کی گئی تھیں۔ اسی طرح پیش کی جاتی ہیں۔

ہے عکس آئینہ دل میں کسی بلقیس ثانی کا
تصوّر ہے مرا استاد بہزاد اور مانی کا

غنیمت سمجھ یہ مل بیٹھنا یاران جانی کا
بھروسا کیا ہے دُنیا میں دو روزہ زندگانی کا

نزاکت ہوگئی ضرب المثل انکی زمانے میں
بھلا ہو یا الٰہی اس ہماری سخت جانی کا

ہے عکس اس چشم پُرنم میں کسی آبی دوپٹے کا
بنایا ہے مکاں ہم نے عجب پانی میں پانی کا

غضب کا کاٹ کرتی ہیں ادائیں اس پری وش کی
ابھاروں پر ہے جوبن اور عالم ہے جوانی کا

امنگوں کی کسک بے چین کرتی ہے انہیں لیکن
نزاکت روک دیتی ہے ارادہ نوجوانی کا

شب فرقت جو ٹھنڈے ٹھنڈے ہو جائے وصال اپنا
گماں ہو موت پر اپنی حیات جاودانی کا

یہ دل کیوں بجھ گیا سوز فراق شعلہ رویاں میں
تماشا ہے کیا ہے آگ نے یاں کام پانی کا

خیال اک چشم میگوں کا سدا مسرور رکھتا ہے
یہاں کیا کام ہے ساقی شراب ارغوانی کا

یہی ہیں دیکھ لو وہ شاعر معجز بیاں کیفی
زمانے میں ہے چرچا آج جن کی خوش بیانی کا

ہر دم خیال ہے اسے بس کوئے یار کا
لگتا نہیں ہے پاؤں دل بیقرار کا

کیوں کر میں اعتبار کروں زیست پر کہ ہے
اک جال تیرے عہد و رگ جاں کے تار کا

دم بند ناطقے کا ہے ایسے مقام پر
مضمون کیا بندھے دہن تنگ یار کا

بلبل صدائے نغمہ سنا کر نہ دل لبھا
ہم راگ سن چکے ہیں تجھ ایسے ہزار کا

ہے دل میں بعد مرگ بھی گرمئ سوز عشق
کہتا ہے یہ دھواں مری شمع مزار کا

چٹکی سی دل میں لیتا ہے جھونکا نسیم کا
سینے کو گدگداتا ہے موسم بہار کا

دلِ داغدار حسرت و ارماں رہا سدا — لالہ کا تختہ تختہ ہو میرے مزار کا
کیفیؔ یہ طرح گو نہیں اپنے کلام کی
پر حکم ماننا پڑا اک طرح دار کا

در پہ کب تیرے جبہ سا نہ ہوا — خط مگر چین جبہ سا نہ ہوا
یہ بھی تھا کیا کسی کا بند قبا — عقدہ قسمت کا اپنی وا نہ ہوا
خال مشکیں و گیسوئے پُر خم — طائر دل کو دام و دانہ ہوا
نکلا جب کھینچ کر وہ تیغ ادا — سامنے کوئی منچلا نہ ہوا
اک نکمّا سا آدمی ہوں میں — میرا کیا ہے۔ ہوا ہوا نہ ہوا
مجھکو افسوس ہے تو بس یہ ہے — کام مجھ سے کوئی بھلا نہ ہوا
ہر چہ از دوست مے رسد نیکوست — شکر ہے یاں کبھی گلہ نہ ہوا
تو کہاں نازش آزمانے جائے — میں ہی جب جذب آزمانہ ہوا
موت کی بات دوسری ہے۔ مگر — درد تو کوئی لا دوا نہ ہوا
چٹکیاں دل میں گل لگا لینے — لب پہ بلبل کے پھر ترانہ ہوا
آئی کب ٹلتی یوں ہی ہجر صنم
مرگ کیفیؔ کا اک بہانہ ہوا

ہو شوق نہ کیوں نعت رسول دوسرا کا — مضموں ہو عیاں دل میں "جو لولاک لما" کا
تھی نعت محمود خداوند کو منظور — تھا پھل وہ بشارت کا نتیجہ نہ دعا کا
پہنچایا ہے کس اوج سعادت پہ جہاں کو — پھر رتبہ ہو کیوں عرش سے کم غار حرا کا
معراج ہو مومن کو نہ کیوں اسکی زیارت — ہے خلد بریں روضۂ پُر نور کا خاکا
دے علم و یقیں کو مرے رفعت شہ عالم — نام اونچا ہے جس طرح مروہ و صفا کا
یوں روشنی ایمان کی دے دل میں کہ جیسے — بطحا سے ہوا جلوہ فگن نور خدا کا
ہے حامی و ممدوح مرا شافع عالم
کیفیؔ سبب مجھے اب خوف ہے کیا روز جزا کا

جب معینؐ وقتِ معراج پیمبر ہو گیا
عرش بولا میرا طالع آج یاور ہو گیا

پہنچا فرازِ اُڑتا وہاں براقِ احمدی
رعب سے لرزاں جہاں جبریل کا پر ہو گیا

لن ترانی کی صدا موسیٰ نے جس لب سے سُنی
گفتگو سے اس کی پُر گوشِ پیمبر ہو گیا

گرم رفتاری میں بجلی تھا براق برقدم
عرش سے پھر آئے گھر ٹھنڈا نہ بستر ہو گیا

کیا جہالت تھی نہ آیا تب بھی جاہل کو یقیں
ہاتھ میں بوجہل کے گویا جو پتھر ہو گیا

واہ وا قربان اس اعجاز کے اک سنگ سے
دم میں پیدا کیا نہال بار آور ہو گیا

تھی جو منظورِ نظر ترویج دینِ پاک کی
پہلے کل عالم سے پیدا نورِ اطہر ہو گیا

کس نے تسخیر کل ہے ناخدا نام علی
فتح جس کی جرأت و قوت سے خیبر ہو گیا

چرخ پر کیں کی جفاؤں کا نہیں کچھ ڈر اسے
جس کے سر پر سایۂ لطفِ پیمبر ہو گیا

کہہ دیا "لولاک" جس کی شان میں اللہ نے
اب تو کیفیؔ کا وہی محبوب دلبر ہو گیا

مرتے دم بھی تو نہ بالیں پر وہ دلبر ہو گیا
یہ وصال اپنا ہمیں ہجراں سے بدتر ہو گیا

سمجھو اسکو سوزِ دل سے یا وفورِ گریہ سے
الغرض ہر اشک میرا اک سمندر ہو گیا

کوئے جاناں کی ہوا میں کچھ نرالا ہے اثر
نامہ لیکر جو گیا عنقا کبوتر ہو گیا

بیخودی پیری وہی تھی کعبہ و بتخانہ میں
نورِ حق کو دیکھکر آپے سے باہر ہو گیا۔

پوچھتے ہو کیا بہائے جنسِ الفت واہ وا
اشک جو آنکھوں سے ٹپکا گوہرِ تر ہو گیا

وہ نظر کیا پھر گئی۔ گویا کہ دنیا پھر گئی
ہائے اس کا ناز بھی میرا مقدر ہو گیا

وصل میں اسکو خفا کرکے نکالا ہم نے کام
کچھ کہا ایسا کہ وہ جامے سے باہر ہو گیا

حور و غلماں کا فسانہ رہنے بھی دو شیخ جی
بس جی بس تم نے کہا اور مجھ کو باور ہو گیا

ہو گیا سُن سُن کے میرا حالِ دل وہ سنگدل
بُت تو پہلے ہی سے تھے اب اور پتھر ہو گیا

پھیر میں کس کے پھرا کرتا ہے دن بھر آفتاب
یہ بھی کیا سودائے الفت میں سراسر ہو گیا

ٹمٹما کر چھپ گیا پرویں کا جھرمٹ ابر میں
زیب بر جب میرے مہرو کا وہ جھومر ہو گیا

کیا غضب ہے زلف ہو یا خالِ ابرو کوئی ہو
جو ہے اس قرآن کا حافظ وہ کافر ہو گیا

اس میں ہے کیفیؔ کب بڑا ندی ہی سوا ہوگا مزا
سادہ دل زاہد ہے جو مشتاقِ کوثر ہو گیا

غیر اب یار کا معتوب ہوا خوب ہوا
کیوں نہ خوش ہو کے کہیں خوب ہوا خوب ہوا

آنکھ پڑتی ہے حسینانِ جہاں کی مجھ پر
ہیں تری عشق سے منسوب ہوا خوب ہوا

دعوےٰ کرتا تھا رخِ یار کی ہمسری کا
لالہ اس جرم میں منکوب ہوا خوب ہوا

شاید اب سن لے وہ بت رام کہانی میری
قصہ خواں اک اسے مطلوب ہوا خوب ہوا

قتلِ عاشق پہ کسی جاتی یہ ہر روز کمر
اس کا ہونا ہی جو معیوب ہوا خوب ہوا

دعوےٰ یکتائی کا عالم میں کسی کو نہ رہا
جلوہ فرما مرا محبوب ہوا خوب ہوا

کیفی اس طرح مگر آپ کا ڈھب بن جائے
شعر سننا اسے مرغوب ہوا۔ خوب ہوا

پانی پانی ہو گیا جوشِ ابرو ربا یار کا
دیکھ کر طوفاں ہمارے دیدہ ہائے زار کا

چشمِ ہمدردی مریضِ عشق ان آنکھوں سے نہ رکھ
کام کیا نکلے بھلا بیمار سے بیمار کا

دل سے ہمدم لے رہِ الفت میں یہ دھوکا دیا
کیا کرے اب کوئی دنیا میں بھروسا یار کا

دل دیا جس کو اسی نے داغِ مایوسی دیا
راس ہی آیا نہ ہم کو ہائے کرنا پیار کا

یا مٹایا اس کا لکھا یا میں خود ہی مٹ گیا
اے مقدر اب تو یہ سر اور در ہے یار کا

ہم نے کیفی خوب ہی آنکھیں لڑائیں اس سے کل
کر دیا سارا ہرن نشّہ نگاہِ یار کا

مجھ سے صنم میرا خفا ہو گیا
ہائے یہ کیا میرے خدا ہو گیا

ہجر میں ہی وصل میرا ہو گیا
درد ہی خود دکھ کی دوا ہو گیا

مر بھی نہیں جاتا کہ غم سے چھٹوں
تارِ نفس دام بلا ہو گیا

عقدۂ قسمت نہیں کھلتا مرا
یہ بھی ترا بندِ قبا ہو گیا

جی بھر آتا ہے مرا خود بخود
ہائے عزیزو مجھے کیا ہو گیا

جب وہ ہوا کھانے چمن میں گیا
رنگِ رخِ گل سے ہوا ہو گیا

کیا نہیں کیفی شبِ غم کی بسر
نالوں سے اک حشر بپا ہو گیا

چھپ گئے کیوں دیکھ کے صورت مری
آج الٰہی کیا میں نیا ہو گیا

جس پہ لگا خاگ کا تو وہ کیا۔ تیر نظر تیر قضا ہو گیا
کھاتا ہے دل غم سے سدا پیچ و تاب یہ بھی تری زلف دوتا ہو گیا
ذکر ہی کیا گر مٹے تاثیر کا دود بھی آہوں سے ہوا ہو گیا
کل تو یہ کیفی کو نہ تھی بیکلی
آج نہ معلوم اسے کیا ہو گیا

جو پر جفا ہو تو اس آفت جہاں کا سا جو باوفا ہو تو مجھ زار و نیم جاں کا سا
یہ ضعف ہے کہ دم آتا نظر نہیں آتا ہے رنگ تار نفس کا موئے میاں کا سا
کرے گا مرہم کافور خاک نفع کہ ہے وہاں زخم پہ عالم ترے دہاں کا سا
خیال ہے کہیں دیکھا تھا خلد کو رضواں بتاؤں کیا کہ یہ نقشہ ہے کس مکاں کا سا
بھلا کہاں تھا یہ انداز شور بلبل میں اڑا لیا ڈھنگ ہی اس نے مری فغاں کا سا
یہ کوئی بات ہے کیونکر میں مان لوں اے شیخ کہ ہو گا بادہ کوثر مئے مغاں کا سا
ضرور سوز تو کچھ آفتاب حشر میں ہے کہاں ہے سوز پر اس سینۂ تپاں کا سا
سنے یہ شعر تو سب باکمال بول اٹھے
کلام تو ہے یہ کیفی خوش بیاں کا سا

ہجر کا رنج و تعب وصل کا ساماں نکلا درد جانکاہ مرا روکش درماں نکلا
حال مایوسی و بیزاریٔ الفت مت پوچھ جاں نکلی تو میں سمجھا مرا ارماں نکلا
رشک گلزار کیا دل تو نکل کر دامن اشک ہر رنگ مرا رشک بہاراں نکلا
جوش وحشت ہی کہیں بھی مرے آنسو نہ چھپے ہائے صحرا کا بھی نکلا ہوا داماں نکلا
اللہ اللہ مرا عالم ضبط الفت جان کے ساتھ ترے تیر کا پیکاں نکلا
صرصر غم نے کیا گلشن امید خراب دل پر سوز چراغ تہ داماں نکلا
اس قدر جوش جنوں ہے کہ عیاذاً باللہ جیب سے ہاتھ نہ نکلا تھا کہ داماں نکلا
ہو گیا کشتۂ ہجر میں کیفی کا وصال
کام سمجھے تھے یہ مشکل مگر آساں نکلا

دشمنی حق میں ہمارے چارہ گر کیا کر گیا
زخم کے بھرتے ہی پیمانہ ہمارا بھر گیا

قاعدہ ہی ہو گیا جب ہاتھ خالی نقد سے
عشق بازی سے بھی انساں کا کبھی دل بھر گیا

فاتحہ کو غیر کے ساتھ آیا ہے قاتل مرا
ہے وہی ملنے کا لکھا گرچہ میرا سر ہو گیا

وقت کو جانو غنیمت اور جو کرنا ہی کرو
پھر نہیں آنے کا دم سینے سے جو باہر گیا

میرے مرنے کی خبر سنکر وہ کہتے پھرتے ہیں
آج اک بانکا جواں سنتے ہیں ہی مر گیا

دربدر سر پٹکا پر سر کا لکھا وہ ہی رہا
میں یونہی پورب گیا پچھم گیا۔ اُتر گیا

وصل میں ناز و نیاز آپس میں الجھا ہی کئے
دست گستاخانہ آخر کام اپنا کر گیا

غور سے دیکھا تو کیفی دل میں پایا یار کو
میں عبث گرجا گیا۔ مسجد گیا۔ مندر گیا

ردیف ۔ ت

عالی ہے تیری کیا شان نعمت
کب ہو سکے شکر شایان نعمت

بے حد کو محدود کرنا گنہ ہے۔
شکران نعمت کفران نعمت

تخصیص واں کچھ نہیں اس کی اُس کی
سب کے لئے اس کا ہے خوان نعمت

اک چیز ہو تو ہو شکر اس کا
کیا ہو سکے شکر احسان نعمت

ہے عاصیوں کے لئے منّ و سلوا
کیا پا سکے کوئی پایان نعمت

دُو روزہ ہیں لطف سب زندگی کے
کے دن بھلا یہ الوان نعمت

جانو غنیمت دوران نعمت
ہے بڑھنے والا یہ خوان نعمت

دوست ہی کیا کرے جو شکوۂ دوست
ہر چہ از دوست مے رسد نیکوست

جور استاد بہ ز مہر پدر
ہڈیاں اس کی ہیں اور اسکا پوست

فرق کیا دیر و کعبہ میں اس کو
جس کسی کا مقولہ ہو ہمہ اوست

پڑ گئی ہم کو یہ تپ ہجراں
رہ گیا چار دن میں پوست ہی پوست

با وفا دوست کب ملے کیفی
ہیں زمانے میں سب رکابی دوست

نہیں یہ اینٹھنا۔ کہدوں جو ہو معاف درست
جو اپنی حد کی ہوس ہے وہی گزاف درست

ہمارے آگے یہ بڑھ بڑھ کے بولنا کیا خوب
تو پہلے کر تو ذرا اپنا تئیں قاف درست

ہمارے آگے سخن فہمی کی وہ لیں لاحول
نہ سمجھیں جستجو کہ جو ٹھیک اور زحاف درست

زباں سے اور قلم سے نہ نکلے جب دم کا کام
تو ایسے موقع پہ بے شبہ ہے مصاف درست

ردیف ح

کیوں کر چبھے نہ آنکھ میں گل خار کی طرح
بھاتی ہے دل کو ایک طرحدار کی طرح

حالت تلاش یار میں یہ ہو گئی مری
جاتا ہوں بیٹھ بیٹھ دل زار کی طرح

کیا دل میں خار رشک رخ یار کا چبھا
بگڑی ہوئی ہے کیوں گل گلزار کی طرح

ہے کچھ نہ کچھ وہاں بھی اثر درد عشق کا
آنکھ ان کی بھی ہے اس دل بیمار کی طرح

اے کاش میرے تار رگ جاں کو توڑ دے
قاتل کی تیغ یار کے اقرار کی طرح

کیفی بٹھائیں آنکھوں پہ کیوں آپکو نہ لوگ
چبھتی ہوئی ہے۔ آپ کے اشعار کی طرح

ردیف ر

کیا عرش معلیٰ کو مسخر میہماں ہو کر
نہ کیا کچھ بن پڑا انساں سے مشت استخواں ہو کر

بس اے ذوق اثر رونا کہاں تک مجھ کو دھڑکا ہے
نہ بھڑکے دل پر سوز گستے دخاں ہو کر

اجل پھر پھر گئی مژدہ سمجھ کر میرے بالیں سے
بڑھی ہے زندگی اپنی ضعیف ناتواں ہو کر

عزیزوں کا ہے کھٹکا گھر میں بن میں خضر کا ڈر ہے
کہاں اے شوق مر جائیں مرگ ناگہاں ہو کر

کہاں سے لاؤں وہ حسن بیاں تشبیہہ دوں کس سے
بہت شرمندہ ہوں میں اک حسیں کا مدح خواں ہو کر

نہیں کر سکتا خواہش موت کی بھی وائے ناکامی
یہ کھٹکا ہے نہ ہو جائے شفا وہ بدگماں ہو کر

دل مردہ بھی جی اٹھتا ہے سنکر قلقل مینا
مسیحا کو کیا ہے منفعل پنبہ دہاں ہو کر

نکل جائیگی گھٹ گھٹ کر یوں ہی کیفی کی جاں اگر دن
چبھا ہے دل میں وہ خار مژہ نوک سناں ہو کر

بن سنور کر ہو جو وہ جلوہ نما کوٹھے پر — چرخ چہارم کا نظر آئے سما کوٹھے پر

طشت از بام نہ کرنا کہیں راز الفت — نہ اشارے کرو اے شوخ ادا کوٹھے پر

ڈورے ڈالیں نہ کہیں یار اڑانے والے — بے تکلف نہ لڑیں کنکوے اڑا کوٹھے پر

سب کو مہتاب کا دھوکا ہوا مہتابی پر — کل سر شام وہ مہرو جو چڑھا کوٹھے پر

وہ کہا کرتے ہیں کوٹھوں چڑھی ہونٹوں نکلی — دل میں ہی رکھنا جو کل رات ہوا کوٹھے پر

چاندنی ہو بچھی اور چاند نے ہو کھیت کیا — اور پہلو میں تمہارے ہو وہ ماہ لقا کوٹھے پر

آفتاب لب بام اب تو ہوئے ہیں کیفی
آنکھیں پھر اس سے لڑائیں بھلا کیا کوٹھے پر

نہ لگنے پائے ہاں ہائے اشک گلگوں داغ دامن پر — نہ کھلنے پائے لب راز محبت دوست دشمن پر

معاذ اللہ یہ اس دست جنوں میں تیزیاں آئیں — کہ اٹھ جاتا ہے بے خوف و خطر صحرا کے دامن پر

سوال وصل پہ عذر نزاکت کون مانے گا — ہزاروں دل کے ہے خوں کا بوجھ ثابت تیری گردن پر

بیاں کرتا ہوں جب احوال بیتابیٔ دل اپنا — پریشاں ہوتی ہے زلف مسلسل میری الجھن پر

ہے ان روزوں چمن کا چشم بد دور اسکی یہ عالم — کہ حور خلد کی پڑتی ہے آنکھ اس شوخ پر فن پر

سبکدوشی مری قسمت میں لکھی ہی نہ تھی اے دل — گیا سر تو رہا قاتل کا احساں میری گردن پر

یہ دل ہے ناصحا آئے تو اک پتھر پہ آ جائے
نہ یہ پابند صورت کا نہ حصر اس کا ہے جوبن پر

پانی سیانے دیتے ہیں کیا پھونک پھونک کر — دل سوز غم نے خاک کیا پھونک پھونک کر

چھڑکا ہے آب تیغ کا ہے کوئے یار میں — پا تو اس زمیں پہ رکھیے ذرا پھونک پھونک کر

دیکھا نہ آنکھ بھر کے نزاکت کے خیال سے — لیتے ہیں ہم تو نام ترا پھونک پھونک کر

ہوگا نہ صاف جھوٹی ہوا خواہیوں سے دل — یوں دل کا کب غبار اڑا پھونک پھونک کر

باد نفس سے داغ دل سرد جل اٹھے — ہم نے جلا دیا ہے دیا پھونک پھونک کر

الٹا ہے کیا اس آہ شرربار کا اثر — دل ہی بجھا دیا ہے مرا پھونک پھونک کر

پیری میں آئے گی نہ کبھی طاقت شباب — لے پیر لاکھ پارے کو کھا پھونک پھونک کر

شیطاں کا دھوکا زاہد پر فن پہ کیوں نہ ہو — پیتا ہے چھاچھ دودھ جلا پھونک پھونک کر

آتش بیانیٔ لب کیفی نے بزم میں
دشمن کے دل کو خاک کیا پھونک پھونک کر

ردیف نون

وصل کی اِن بتوں سے آس نہیں ! — کہ ٹکے دکشنا کو پاس نہیں
امتحانِ وفا پہ کربِ فراق — پاس ہیں ہائے ! اور پاس نہیں
نفس کو مار کر ملے جنت — یہ سزا قابلِ قیاس نہیں
دم میں یہ آنا اور جانا کیا؟ — آپ انساں ہیں کچھ حواس نہیں
خوب ویراں ہوا ہے خانۂ دل — آس کیسی کہ یاں تو یاس نہیں
کعبہ میں جا کے کیا کریں زاہد — واں کی آب و ہوا ہی راس نہیں
شاعری ہے مری کہ سحرِ حلال — بھلا کہہ دیں تو حق شناس نہیں
پاؤں کس سے مذاقِ شعر کی داد — آج فیضی و کالیداس نہیں
جامِ خورشید میں ہے آبِ حیات — رام رنگی کا یہ گلاس نہیں

کیفی اور جامِ بادہ سے انکار
تم کو کچھ نام کا بھی پاس نہیں

عجب انداز سے ہم اس صنم کی یاد کرتے ہیں — نہیں ہے یاد سے خالی اگر فریاد کرتے ہیں
نہ مانند عنادل شکوۂ بیداد کرتے ہیں — شکستِ رنگِ گل کی طرح ہم فریاد کرتے ہیں
اڑیں کاگ آج تو زاہد کے پراں ہوش کی مانند — کہاں ہے؟ جلد آ ساقی تجھے سب یاد کرتے ہیں
جو چشمِ دلربا کے وصف میں اشعار لکھتا ہوں — تو ہر ہر لفظ پر اہلِ نظر اک صاد کرتے ہیں
جنوں میں ہر رگِ تن ہوگئی زنجیر سے بڑھکر — گوارا کب بھلا ہم منتِ حداد کرتے ہیں
ہوا کچھ تو اثرِ فریادِ عاشق کا غنیمت ہے — وہ دونوں ہاتھوں سے دل تھام کر بیداد کرتے ہیں
پٹ جاتے ہیں ڈر کر غیر سے یہ ہول اٹھتا ہے — اثر الٹا ہمارے نالہ و فریاد کرتے ہیں

کہا اُن سے کہ کیفی تم پہ مرتا ہے تو فرمایا
وہ کیوں اپنی جوانی مفت میں برباد کرتے ہیں

آخر اس دردِ محبت کی دوا ہے کہ نہیں — یا الٰہی مری قسمت میں قضا ہے کہ نہیں
ہاں اڑا دے دھوئیں اس چرخِ کہن کے دم میں — تجھ میں تاثیر کچھ اے آہ رسا ہے کہ نہیں
کون کہتا ہے کہ نہیں ہستیِ خالق پہ گواہ — سرِ گردوں پہ تسلیم جھکا ہے کہ نہیں

میں تو جب جانوں دلِ مردہ جلا دے میرا
ہاں اثر تجھ میں کچھ آبِ بقا ہے کہ نہیں

درد دُکھ میں ہو بھلا کون کسی کا ساتھی
درد کا آپ ہر اک حرف جُدا ہے کہ نہیں

شیشے میں خوب اتارا ہے پری کو ایواہ!
کیوں مری باتوں میں اک سحر بھرا ہے کہ نہیں

تلخ کہتے تھے لو اب پی کے تو بولو زاہد!
ہاتھ آئے ادھر استاد! مزا ہے کہ نہیں

ضد سے کیا فائدہ۔ پوچھو تمہیں اپنے دل سے
چاہنے والے پہ یہ ظلم بُرا ہے کہ نہیں

یہ ستم اے بُتِ سفّاک نہ کر ڈر تو ذرا
ہم غریبوں کا بھی تو کوئی خدا ہے کہ نہیں

شاعری کو جو یہ کہتے ہو کہ تک بندی ہے
شعر کیفی کا کبھی تم نے سنا ہے کہ نہیں

میرے رونے پہ ہنسی اچھی نہیں
بس جی بس یہ دل لگی اچھی نہیں

دل لگی کا بھی نہ رونا ہو کہیں
ہر گھڑی کی یہ ہنسی اچھی نہیں

نازکی کا عُذر رہنے دیجئے
بات اے جاں بس یہی اچھی نہیں

اُٹھ کے بیٹھا اور جانے کی پڑی
بس یہی تو خو تری اچھی نہیں

کونسی کیفی بُری ہے تجھ میں بات
ہاں یہ اک قسمت مری اچھی نہیں

رکھنا تھا میرا دل عزیز تمہیں
دلبری کی نہیں تمیز تمہیں

جانِ من ہو تمہیں تو جاں مری
کیونکہ دیدوں کسی کی چیز تمہیں

خوب گھٹ مٹ بنے میں مسّر جی۔
بس مبارک ہو یہ کریز تمہیں

ہر بُنِ مو تفنگ خوبی ہے۔
ہے رفل کی بہت کمیز تمہیں

آج یکتا ہے وہ زمانے میں
کیونکہ کیفی نہ ہو عزیز تمہیں

ہزاروں دل کو اک ٹھوکر ہی میں پامال کرتے ہیں
یہ اندازِ خرامِ ناز بھی کیا گُل کترتے ہیں

بڑی چالیں شبِ وصلت میں وہ عاشق سے کرتے ہیں
بگڑتے ہیں جھگڑتے ہیں مچلتے ہیں بپھرتے ہیں

بتائیں کیا شبِ فرقت کو کیونکہ صبح کرتے ہیں
عجب ہے زندگی اپنی نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

پھٹا پھرتا ہی جوبن ہے یہ عالم اس پریوش کا
وہ کوٹھے پر چڑھیں تو مہر و مہ کے منہ اترتے ہیں

مقابل ہو کے بن جاتا ہے آئینہ یہ عالم ہے
بگڑ جاتا ہے نقشہ حور کا جب وہ سنورتے ہیں

سما رات اور دن کے اک جگہ ہونیکا بندھتا ہے — رخ پرنور پر جب گیسوئے مشکیں بکھرتے ہیں
کرے کیا اعتبار اب انکے قول و فعل کا کوئی — ڈھٹائی تو یہ دیکھو منہہ پہ کہہ کہہ کر مکرتے ہیں
نہ سمجھے تھے محبت میں کبھی یہ دن بھی آئینگے — ہمارے نام سے اب ہاتھ وہ کانوں پہ دھرتے ہیں

خبر بھی آپ کو ہے حضرت کیفی ذرا اس کی
کسی پر جان دیتے ہیں وہ جن پر آپ مرتے ہیں

پینے کو انہیں ابھارتے ہیں — شیشے میں پری اتارتے ہیں
دنیا میں ہے اتفاق کی جے — جگ لوٹے تو نرد مارتے ہیں
عاشق بھی غضب ہیں آسماں سے — تارے جو کہو اتارتے ہیں
دب جاتا ہے چاؤ نازکی سے — ارماں تو بہت ابھارتے ہیں
ہو جاتا ہے اک جہاں معطر — زلفوں کو وہ جب سنوارتے ہیں
دیکھیں گے ارم میں قدر زاہد — شیخی تو بہت بگھارتے ہیں
کب مانتے ہیں بھلا کسی کی — ہاریں بھی تو کب وہ ہارتے ہیں
مر کر ہے عذاب گور سچ ہے — مرتے کو مدار مارتے ہیں

ہیں اہل کمال رند کیفی
شیشے میں پری اتارتے ہیں

آنسو نہیں رکے ہیں یہ چشم پر آب میں — دریا کو ہم نے بند کیا ہے حباب میں
باغ جہاں میں پھول کی رنگت ہے چار دن — ہم نے پڑھا ہوا ہے گلستاں کے باب میں
چین آیا اب تو اے دل محو رخ امید — قاصد جواب لایا ہے خط کے جواب میں
آنکھیں بدن کے بدلے چرائے ہیں مجھ سے وہ — آنکھیں نئی نکلتی ہیں ان کے حجاب میں
ہم وہ قرابہ کش ہیں نہ کوثر سے سیر ہوں — ساقی یہ چار پانچ ہیں خم کس حساب میں
اے شیخ ایک جام تو خود پی کے دیکھ لے — ہم کیا بتائیں لطف ہے کیا کچھ شراب میں
لگتے ہیں چار چاند سمند حسین کو — رکھتا ہے پاؤں جب مہ و مہر رکاب میں
ہے جوش جنسیت جو ہو انساں کو اس سے میل — شر ایک ہی ہے دیکھو بشر اور شراب میں

کیفی ہے ایک ایک ترا شعر لاجواب ہے
دیواں کے دیواں کیوں نہ چھپیں انتخاب میں

اک طلسم عجب نما ہوں میں — کیا بتاؤں تمہیں کہ کیا ہوں میں

ہے زوال اپنا اک نشاں کمال — بدر کی طرح گھٹ گیا ہوں میں

کیا نشاں پوچھتے ہو تم میرا — رہِ گم گشتہ کا پتا ہوں میں

ہے یہ حیرت کہ ہوں مجسّم درد — اور ہر درد کی دوا ہوں میں

میری شہرت ہے میری گمنامی — قوت بازوئے ہما ہوں میں

رہِ الفت میں نقش پا کی طرح — خاک ہو ہو کے مٹ گیا ہوں میں

ساغرِ عشق کر گیا بے خود — ہوش کس کو نہیں ہوں یا ہوں میں

خاک سمجھو تم آبرو میری — دُرِ اعزاز کی بہا ہوں میں

دم غنیمت ہے سالکو میرا — جرسِ دور کی صدا ہوں میں

ہوں صراحی میں بادۂ احمر — اور مئے سرخ میں نشا ہوں میں

جس طرح سے کنول ہو پانی میں — ہو کے دنیا میں پھر جدا ہوں میں

خاکساری ہے میری جوہر ذات — خاک میں مثل کیمیا ہوں میں

دُرِ دُرجِ وفا کی آب ہوں میں — دل کے آئینہ کی صفا ہوں میں

آج ہے میری دھاک عالم میں — روشناس شہ و گدا ہوں میں

دھوم ہے فن شعر میں میری — قمرِ علم کی ضیا ہوں میں

لکھوں گر داستان رنج و الم — دلِ بشکستہ کی صدا ہوں میں

گر کروں ذکر ساز عیش و طرب — طوطئ خلد کی نوا ہوں میں

گر میں لکھوں بیان عرصۂ رزم — ناوک ترکش قضا ہوں میں

ایک اس نظم پر ہے کیا موقوف — نور شمع علوم کا ہوں میں

قدر ہے میری قدر علم و ہنر — کیا زمانے میں دوسرا ہوں میں

ہوں تو سب کچھ پہ کچھ نہیں کیفی
صورت موجۂ فنا ہوں میں

اس قدر زار ہو گیا ہوں میں — واللہ اعلم نہیں ہوں یا ہوں میں

نالہ کی طرح سے اٹھا ہوں میں — رنگ کی طرح اڑ گیا ہوں میں

گر کے اٹھنا محال ہے مجھ کو — صورت نقش بوریا ہوں میں

اپنے سایہ پہ ہے گماں اپنا — اس قدر زار ہوگیا ہوں میں
درد دل، فکر وصل، رنج عدو — کن بلاؤں میں مبتلا ہوں میں
آئے وہ میرے گھر، کوئی یہ بتلائے — خواب میں ہوں کہ جاگتا ہوں میں
کہہ رہا ہے یہ میرا جام سفال — رشک جام جہاں نما ہوں میں
مجھکو ناصح جو دل سے پیار کرے — کیونکہ اس بت کو پھر نہ چاہوں میں

توبہ توبہ میں اور مے نوشی
اجی کیفی تو نام کا ہوں میں

سارے عشاق سے ہم اچھے ہیں — ہاں ترے سر کی قسم اچھے ہیں
الجھا ہی رہنے دو زلفوں کو صنم — جو نہ کھل جائیں بھرم اچھے ہیں
کوئی پہنچتا نہیں اس بت کے سوا — اور بھی یوں تو صنم اچھے ہیں
حشر تک مجھ کو جلائے رکھا — یہ حسینوں کے بھی دم اچھے ہیں
بحث ہو جائے تو سب پر کھل جائے — ہیں بھلے آپ کہ ہم اچھے ہیں
غیر کی کچھ نہیں شرکت اس میں — ہم کو یہ تیرے ستم اچھے ہیں
جیتے ہیں آرزوئے قتل میں ہم — دم ترے تیغ دو دم اچھے ہیں
نہ ہوا کعبہ کا دیدار نصیب — ہم سے آہوئے حرم اچھے ہیں
خوب ہے وقت جو کٹ جاتا ہے — جو گذر جاتے ہیں دم اچھے ہیں

پوچھتے کیا ہیں مزاج کیفی
آپ کا لطف و کرم اچھے ہیں

شکوہ کیا ہے جو در یار پہ جاتے بھی نہیں — ضعف سے ہم تو کبھی آپ میں آتے بھی نہیں
آفت جاں ہے ترا نام جہاں میں مشہور — خوف سے لوگ قسم تک تری کھاتے بھی نہیں
مل گیا دل کا پتا ان کی نظر سے ہم کو — ساہ جو ہیں وہ کبھی آنکھ چراتے بھی نہیں
ایک وہ ہیں کہ ہمارا ہے گلہ ہر اک سے — اک ہم ہیں کہ زباں پر کبھی لاتے بھی نہیں
بدگمانی انہیں کچھ ہو گئی مجھ سے ایسی — گھر میں کیا خواب تلک میں تو وہ آتے بھی نہیں
ایک اک داغ میں سو سو گل حسرت کا ہے رنگ — حال دل ہم تو کبھی تم کو دکھاتے بھی نہیں
ہے سبب اور کچھ ان بہکی ہوئی باتوں کا — نشہ آنکھوں میں نہیں [illegible] کے پاتے بھی نہیں

لوگ کیفی کو یوں ہی کہتے ہیں رندانہ مزاج
ایسی باتیں تو ہم اس شخص میں پاتے بھی نہیں

بوسہ پر جاں طلب کرتے ہیں — آپ واللہ غضب کرتے ہیں
وصل کا کرتا ہوں جب ذکر ان سے — اک تبسم نہ لب کرتے ہیں
لب پہ رہ جاتی ہے جان آ آ کر — لوگ ذکر آپ کا جب کرتے ہیں
غم بھی کھانے کو نہیں ملتا آہ — ہم جو امید طرب کرتے ہیں
نالے گردوں کے اڑا دیں پرزے — ناز دلبر کا ادب کرتے ہیں
باتوں باتوں میں اڑا لیتے ہیں دل — خوبرو بھی تو غضب کرتے ہیں
نہ شریف ان کو کبھی کہنا تم — جو بیاں اپنا نسب کرتے ہیں
رہتے ہیں دونو جہاں میں باکام — جو بزرگوں کا ادب کرتے ہیں
ہائے واژونئے قسمت کی طفیل — جو نہ کرنا تھا سو اب کرتے ہیں
ستم ان کا بھی غنیمت ہے ہمیں — نظر مہر تو کب کرتے ہیں

خیر آپ اپنے قدح کی مانگیں
کیفی کیا جام طلب کرتے ہیں

شوق میں ہم کو خبر پاں پانو اور سر کی نہیں — چادر شرم و حیا پر سر سے وال سر کی نہیں
لکھتے ہیں کلک کبوتر دم سے ہی دلبر کو خط — آجکل گر رسم نامہ بر کبوتر کی نہیں
نیک دل حسن خلوص اور خلق احسن چاہیے — فتح ملک دل کو حاجت لاؤ لشکر کی نہیں
آخری دم نام حق لینے سے اسکو فایدہ — کوئی نیکی جس شقی نے زندگی بھر کی نہیں
بادبانوں میں بھری ہے اس کے کیا باد نفس — کشتئے عمر رواں کو تاب لنگر کی نہیں
ہم کو اپنی بینوائی پر بھی کیا کیا ناز ہیں — دل وہ بخشا جس میں بو بغض و ریا شر کی نہیں
سب یہ وہمی اور خیالی بات ہے، سچ تو یہ ہے — کچھ کسی کو بھی خبر ہمدم فلک پر کی نہیں

پیچ و تاب بہتری قوم میں جو پڑ گیا — اس کو سدھ پیچ و خم زلف معنبر کی نہیں
دل فدا ملکی ترقی پر ہے جس دلسوز کا — پھر لگن اس کو کسی دلدار و دلبر کی نہیں
خادم قومی وہی ہے در حقیقت دوستو — نام کو پروا جسے زر کی نہیں سر کی نہیں

اس نے پائی ہے صفائے قلب کی دولت ضرور — جس نے خاطر اک بشر کی بھی تکدر کی نہیں

اپنے ایماں اور یقیں کے جو کرے برعکس کام — اور کچھ اس کے سوا تعریف کافر کی نہیں

اس قدر فرصت کہاں کیفی کہ لکھ پائیں غزل
اور کاموں سے ہمیں مہلت تو دم بھر کی نہیں

آزاد نہ ان سے ہم کبھی ہیں — ایسے افکار دنیوی ہیں

گلگشت چمن کو آئے گا کون — کیوں بلبلیں چہچہا رہی ہیں

ڈالا ہے تری ہنسی نے رونا — عشاق پہ بجلیاں گری ہیں

لوٹے صفیں ان کی ایک جنبش — لب ہیں کہ رفل کی لبلبی ہیں

گفتار میں پھول جھڑ رہے ہیں — واللہ یہ ہونٹ پھلجھڑی ہیں

کردیں گی جہاں کا خون دم میں — یہ تیری ادائیں کہہ رہی ہیں

کیفی انکار جام مے سے
واہ آپ بھی کوئی آدمی ہیں

ہے یاد یار سے اک آگ مشتعل دل میں — عجب ہے خلد و جہنم ہیں متصل دل میں

جو چپکے چپکے ہمیں کچھ کہے وہ آپ سنے — پڑے اسی کو جو کوسیگا ہم کو دل دل میں

کرو گے اب بھی برائی مے مغاں کی شیخ — نہ کہیے منہ سے مگر ہوگے تو خجل دل میں

گئے وہ پانی تو ملتان اب گنو موجیں — کہاں وہ جوش آب اشک پا بہ گل دل میں

ایلو یہ خوب ہوا آپ تم چلے آئے — میں کہتا ہی تھا کہ آج ان سے جا کے مل دیکھیں

پکڑ جو کل لیا چسکی لگاتے زاہد کو
بتاؤں کیا کہ ہوا کیسا منفعل دل میں

ردیف واو

بھلا یہ پھاڑ کر رہ جاتے چار انگل گریباں کو — غضب ہے تکتے ہیں دست جنوں داماں میداں کو

یہی دھڑکا ہے فرط بیقراری سے کہ اب ٹوٹا — ترا پیماں بنایا ضعف نے تار رگ جاں کو

بھلا زاہد برابر کوئے جاناں کے ارم ہوگا — ابھی رہنے بھی دو بس بے تکی گپ ایسی مت ہانکو

نکالوں دل سے کیونکر ناصحا یاد ان حسینوں کی — نکالے کس طرح کوئی بھلا گھر آئے مہماں کو

معاذ اللہ نکلتے جاتے ہیں اور بڑھتے جاتے ہیں — بجا ہے کہیے تار جنتری گر میرے ارماں کو

بچایا زخم دامن دار کو احسان ناخن سے — دہاں زخم دیتے ہیں دعائیں سنگ طفلاں کو

نظر آنے لگیں تارے ابھی آنکھوں میں انجم کی
چُنے گر میرا مہر و اپنی پیشانی پُر افشانکو

شکایت ہے تو اپنے نارسا طالع کی ہے اے دل
بھلا کیوں نام رکھوں میں رقیبوں اور دربانکو

ضمیر دل پہ ہی ان زلفوں میں پھنس جانیکا طعنہ تھا
ذرا دیکھو تو ناصح پیچ و تاب عشق پیچاں کو

ہیں وہ بیخود غریق بادۂ الفت ہوں اے زاہد
فرشتے آ چھین لیں گر پکڑ لوں اپنے دامانکو

اجی ہاں کیا یہی اقرار ہم میں اور تم میں تھا۔
اِدھر کو تو ذرا دیکھو۔ خجالت سے نہ منہ ڈھانکو

پڑھو کیفی غزل اب دوسری جیسے سرور آئے
مئے دو آتشہ سے بڑھ کے یاران سخندانکو

جگہ سینہ میں دوں کیونکر نہ میں قاتل کے پیکانکو
بٹھاتے ہیں جہاں میں صدر کی جا سب ہی مہمانکو

خوشی میں عید کی وہ آج مہتابی پہ آتے ہیں
لگیں گے چار چاند اب اس ہلال چرخ گردانکو

بہا کشتے مے میں اور نہ قرباں ہی ہوا بت پہ
قیامت کے لئے رکھا ہی کیا زاہد نے ایمانکو

نہ طشت از بام کرنا راز الفت کو کہیں انکو
خدا کے واسطے پلکوں کی چلمن سے نہ تم جھانکو

جوانی میں تو سب کھل کھیلتے ہیں پر یہ بڑھکر ہے
بڑھاپے میں کیا ہے شیخ نے معشوق غلمانکو

شب فرقت میں تڑکا کر دل آہ آتش افشاں سے
دکھاؤ دل میں ابھی روز سیہ گردوں گردانکو

نمک اک خندہ نمکیں سے زخم دل پہ کب چھڑکا
لگا کر شہد چاٹیں کیا ہم اس حسن ملیحانکو

محبت باولی ہوتی ہے پر سمجھے ہے پوچھتے ہیں ہم
دیا ہے جس نے درد و غم اسی سے جا کے درمانکو

یہ مانا قبر میں ڈر جور گردوں کا نہیں اے دل
بتاؤ کیا کرو گے تم خیال چشم فتاں کو

سیاہی اور درازی نہٹ گئی یوں اسکے کاکل کی
ملی وہ تیر طالع کو تو یہ شب ہائے ہجراں کو

نہیں ہے بے نمود داغ یہ چیچک روئے گلگوں پر
ملا یا تربت عناب میں ہے تخم ریحاں کو

پڑھو اور اک غزل کیفی اسی بحر و قوافی میں
نہ روکو ہاں سمند خامۂ پُر زور جولانکو

عطا کیں کیسی کیسی نعمتیں اللہ نے انسانکو
ادا کب کر سکے کوئی بشر خالق کے احسانکو

بجھا جاتا ہے دل سوز فراق شعلہ رویاں ہیں
دل سوزاں سمجھتا ہوں چراغ زیر دامانکو

حبابوں میں بھلا دریا کو کب تک بند کر رکھوں
کہاں تک روکوں اے ضبط آنکھ میں اشکوں کے طوفانکو

ہیں مد سے آنکھیں نیچی کر کے پھر اک بار فرمانا
تقاضے نے ترے آفت میں ڈالا ہی مری جانکو

ہے حسن گر آئے یہ قرآں کا بھی جامہ تو مت سننا
نہ چھوڑو دو جرم سے دزد دل لگے زلف پیچاں کو

وضو ہوتا ہے یاں تو شیخ اسکی آب گلابی سے
تیمم کیلئے تم خاک جاکر دشت میں پھانکو

جگر کو چھید کر دل میں ترازو ہو گئے جا بیٹھا
دعائیں کیوں نہ دے ذوق تپیدن تیر پیکانکو

کبھی کا ساتھ کب دیتا ہے کوئی دشت غربت میں
سمجھتا ہوں میں اپنا ہم قدم خار مغیلانکو

شب فرقت تو جوں توں تارے گن گن کر کٹی ہے
الٰہی کس طرح کاٹونگا میں اس روز ہجرانکو

لبوں پر نام ہے تیرا تو آنکھوں میں تری صورت
نکلنے کی کہیں سے جا نہیں ملتی مری جانکو

نہ رہنے دینگی راز عشق کو پوشیدہ یہ آہیں
سمجھتا ہوں ہتیلی کا پھپھولا داغ پنہاں کو

پڑھو اب مشعرے میں اور اک چبھتی غزل کیفی
کہ ہو کیف مسرت چوگنا ارباب ذی شانکو

نکالا دل سے دل میں رکھ کے ہم نے جاناں کو
امنگوں کو امیدوں کو خوشی کو اور ارماں کو

شب وصلت میں اس بت پر سے میں قرباں کرتا ہوں
جگر کو دل کو جاں کو روح کو اور دین ایماں کو

ہمارے دیدۂ بیگوں نے حیراں کر دیا یکسر
مری آنکھوں کو چشم آئینہ کو نرگستاں کو

چھپاؤں خانۂ تنگ دل ویراں میں کس کس کو
تمہاری یاد کو پیکاں کو غم کو سوز پنہاں کو

جلا یا دے کے پیچ و تاب زلفوں نے تری کیا کیا
ہمارے دل کو عود و مشک کو اور سنبلستاں کو

سمجھتا ہوں میں اپنا ہمنفس اس دشت وحشت میں
بگولے کو بلا کو غول کو خار مغیلاں کو

چھپاؤں ہائے راز عشق کیس کس کو تری خاطر
الم کو نالہ کو گریہ کو غم کو آہ وافغاں کو

دیئے ہیں پیچ و تاب و قید و حیرت داغ اس گلشن نے
گلوں کو نرگسوں کو سرو کو اور عشق پیچاں کو

بنایا اپنا محسود اختر دل نے گل نے غنچوں نے
دہان تنگ کو روئے صنم کو اور افشاں کو

خدا جانے وہ کیا شے ہے کہ دم میں توڑ دیتی ہے
مری توبہ کو زاہد کے وضو کو تیرے پیماں کو

نہ پوچھو تم کسی کو پر اسے جس نے بنایا ہے
ملک کو حور کو چرخ و زمیں کو جن و انساں کو

نصیحت سے کبھی کچھ فائدہ حاصل نہیں کیفی
عدو کو جاہلوں کو خود پرستوں اور ناداں کو

یوں سسکتا مجھے تم چھوڑ نہ جاؤ آؤ
آخری وقت ہے اے جان من آؤ آؤ

صحبت لطف میں لو نام نہ غیروں کا کبھی
دل میں عاشق کے نہ تم آگ لگاؤ آؤ

بے بنے ہی بہتوں کو ہے بگاڑا اس نے
اپنی کاکل کو بہت اب نہ بناؤ ـ آؤ

پی بھی لو رہنے دو کوثر کی کہانی زاہد
ایسی بے پر کی نہ یاروں سے اڑاؤ آؤ

کیفیؔ چھوڑو بھی کہیں کوئے بتاں کی یہ دُھن
چین آرام دل و دیں نہ گنواؤ آؤ

دُنیا میں بقا نہیں کسی کو — مرنا اک روز ہے سبھی کو
وہ کون ہے جو ہے عیب سے پاک — کیا کوئی بُرا کہے کسی کو
معلوم ہے وعدے کی حقیقت — بہلا لیتے ہیں اپنے جی کو
خود نورِ خدا ہو تم میں پیدا — دل سے کھو دو اگر خودی کو
سو عیبوں کا ایک عیب ہے یہ — افلاس خدا نہ دے کسی کو
مشکل نہیں کوئی کام لیکن — ہمت لازم ہے آدمی کو
سچ کہہ دے کہ ہے قصور کس کا — منصف میں نے کیا تجھی کو

مانا کہ شراب چھوڑ دی کیفیؔ
ایسا تو کہو نہ میکشی کو

حالِ دل کہنے کو کہتے ہو تو کب تم مجھ کو — ہائے جس وقت نہیں تابِ تکلم مجھ کو
خاک ہو کر بھی وہی حسرتِ پابوس رہی — ہو گئی موجِ صبا موجِ تلاطم مجھ کو
ضعف سے حال یہ پتلا ہے رہِ الفت میں — سیلِ گریہ پہ بھی حاصل ہے تقدم مجھ کو
کہتے ہیں ذکرِ شبِ وصل پہ کیا جانیے کیوں — کبھی شرم اور کبھی آتا ہے تبسم مجھ کو
معجزہ حضرتِ عیسےٰ کا بھی ہے بشنو درست — کہیں دنیا سے گیا اُٹھ جو کہا قم مجھ کو
سیلِ گریہ کی بدولت یہ ہوا گھر کا حال — خاک تک بھی نہ ملی بہرِ تیمم مجھ کو
ان کو گن گن کے شبِ ہجر بسر ہوتی ہے — تارے آنکھوں کے نہ کیوں ہو دیں انجم مجھ کو

ہے گزی گاڑھا ہی کیفیؔ کا شعار اور دثار
نہیں درکار ہے یہ اطلس و قاقم مجھ کو

مقصد حاصل نہیں ہو یا ہو — جو ہونا ہے جلد اے خدا ہو
الفت ہے پاسِ وضع کا نام — مرتے مر جاؤ پر نبا ہو
دل میں نہیں خوب میل رکھنا — جو شکوہ گلہ ہو برملا ہو
کیا ہوتا ہے فرشِ بوریا سے — لازم ہے کہ قلب بے ریا ہو
اک جام ہی تو پلا دے للہ — اے پیرِ مغاں تیرا بھلا ہو

در کار اسے مدد ہے کس کی
جس کو اللہ کا آسرا ہو

اس دل کی جلن جو دیکھ پائے
شمع سوزاں چراغ پا ہو

کیا اور بھلا کہوں میں تم کو
تم حضرت عشق بد بلا ہو

کہنے کو تو کہہ گئے ہو سب کچھ
اب کوئی جواب دے تو کیا ہو

دل زیست سے سرد ہو گیا ہے
اے سوز جگر ترا برا ہو

بے عیب کوئی نہیں ہے کیفی
گر ہو تو وہ ذات کبریا ہو

ساقیا کس کو ہوس ہے کہ پیو اور پلاؤ
اب وہ دل ہی نہ رہا اور امنگیں نہ وہ چاؤ

رہنے دے ذکر خم زلف مسلسل کو ندیم
اس کے تو دھیان سے بھی ہوتا ہے دل کو الجھاؤ

کوچۂ عشق میں جانا نہ کبھی بھول کے تم
ہے وہاں آب دم تیغ کا ہر جا چھڑکاؤ

کیا ضرورت کہ حسینوں کے دہن کی خاطر
تم کمر باندھ کے ملک عدمستاں تک جاؤ

کیوں مٹو نقش قدم ساں کسی رفتار پہ تم
بیٹھے بٹھلائے غرض کیا ہے کہ اک حشر اٹھاؤ

کس طرح کوئی انہیں راہ پہ لائے یا رب
اور برگشتہ ہوئے جاتے ہیں جتنا سمجھاؤ

ناخدا ان کے خدا پار کرے اس کا بیڑا
بے طرح پھنس گئی ہے ہند کی منجدھار میں ناؤ

یہ نہیں ہے کہ نہیں قابلیت کچھ ان میں
ہمتیں ہارنے کا ہو گیا کچھ ان کا سبھاؤ

غرب ہے مشرق خورشید علوم و حکمت
اب تو لازم ہے کہ لو اپنی ادھر کو ہی لگاؤ

جو قدامت پہ اڑے بیٹھے ہیں وہ ہیں گمراہ
ان سے بچنا ہے غضب انکے اوتار اور چڑھاؤ

ایشیا کے تو تمہیں نام سے اپنا ہی نہیں
وہی صورت ہے اسے کتنا ہی الٹو پلٹاؤ

رسم و مذہب ہے نہ تم غیر بنو آپس میں
ہو چلت میں کوئی پاٹھا ہیں سم پہ مل جاؤ

بس کرو رہنے بھی دو وعظ و نصیحت کیفی
ناصحوں کو تو یہاں پڑتی ہیں بازار کے بھاؤ

ردیف ہ

دل کھو گیا ہمارا کسی سے ملا کے ہاتھ
ہو دسترس تو کاٹئے وزد حنا کے ہاتھ

اک تسمہ رہ گیا رگ جاں کا لگا ہوا
چھوٹا پڑا ہے آہ کہاں انکا جا کے ہاتھ

ہاتھوں پہ ہم کو ناگ کھلانے کی مشق ہے — چھوتے ہیں ہم جبھی ترے گیسو بڑھا کے ہاتھ

پھیلائے پانو کھول کے دل اے شبِ فراق — بیٹھے ہیں ہم بھی تربیت ہی اپنی اٹھا کے ہاتھ

کیوں ہاتھ پانو میرے خوشی سے نہ پھول جائیں — انگلی چھوئے وہ ہاتھ میں جب وہ ملا کے ہاتھ

وہ اڑ رہے ہاتھوں یوں کہ اکڑ ساری بھول جائے — منہ کی نہ کھا نا شیخ جی ہم سے ملا کے ہاتھ

سرسوں جمائی ہاتھوں پہ یوں سیکھے کوئی — دل سے ملا لیا ہی دل ان سے ملا کے ہاتھ

یہ بیکسی کے ہاتھوں ہوا ہے ہمارا حال — پیغام بھیجتے ہیں ہم انکو صبا کے ہاتھ

کیفیؔ نہ ناز کی یہ قسم اس بت کی بھولنا
دیکھے نہیں ابھی کسی نازک ادا کے ہاتھ

آجاؤں آپ میں جو وہ دل پہ لگائے ہاتھ — جانا ہی اپنے ہاتھ اور آنا پرائے ہاتھ

افسوس الجھ کے تار گریباں میں رہ گئے — ہم نے پڑے پڑے جو دعا کو اٹھائے ہاتھ

چمکا کے ہاتھ کہتے ہیں وہ کس ادا سے ہائے — ہاتھ اس کے ٹوٹیں ہم کو جو یارب لگائے ہاتھ

انگلی پکڑتے پکڑا ہے پونچا یہ تم نے خوب — دل ہی اڑا کے لے گئے ایسے ملائے ہاتھ

توبہ ہے یوں تو شاہدِ وقت سے ہماری شیخ — پر کیا مضائقہ ہے اگر مفت آئے ہاتھ

جی بیٹھنے کا ذکر ہے ہر سانس پر یہ کیا
کیفیؔ ہیں زندگی سے ہی ہم تو اٹھائے ہاتھ

ردیف

نہ ہرگز درد کی آئے چارہ گر اس سے کسک نکلے — جو دل نکلے تو دل سے خارِ مژگاں کی کھٹک نکلے

تراز و کر کے تیرا اپنا وفا کا حوصلہ تو لو — ہمارا ذمہ گر منہ سے ہمارے آہ تک نکلے

نمک ہی ہے جراحت بات ہر اک اس شکر لب کی — تعجب ہی کہ کان قند سے کیونکر نمک نکلے

ہمارے سر سے بھی سودا بتوں کا نکلے اے زاہد — اگر دل سے ترے حورِ بہشتی کی لٹک نکلے

نکلتے تیر تیرے اور کیا چٹ کر کے سینے سے — تمنا اور ارماں اور خوشی کو تو بھسک نکلے

نہیں چمکا ستارا میری قسمت کا کبھی ہمدم — ہزاروں تارے یوں تو چرخ پہ ہر شب چمک نکلے

ضرورت نقل کی اس کیفیؔ میخوار کو کیا ہو
تمہارے بوسہ ہائے لب میں جب لطفِ گزک نکلے

دل نہیں وہ شیشے کہ جو اکثر بنے اور ٹوٹ جائے — بلبلہ جس طرح پانی پر بنے اور ٹوٹ جائے

ٹوٹ کر تار رگ جاں جُڑ نہیں سکتا ہی پھر — جیسے تار رشتہ مسطر بنے اور ٹوٹ جائے

بات غیروں کی تری محفل میں اور عاشق کا دل — ظلم ہے ہر روز آ کے دلبر بنے اور ٹوٹ جائے

جُڑ نہیں سکتا ہی دل ٹوٹا ہوا ہرگز ندیم — یہ نہیں شیشہ کہ جو اکثر بنے اور ٹوٹ جائے

ہو کسی کی بھی نہ یوں خانہ خرابی یا خدا — جیسے اس کے دل میں میرا گھر بنے اور ٹوٹ جائے

ڈھب عدو کا گھر مرا محفل میں اور دل میں ترے — کیا غضب ہے آپ ہی بگر بنے اور ٹوٹ جائے

آدمی کی بحر ہستی میں ہے بس یہ کیفیت — بلبلہ سا جیسے دریا پر بنے اور ٹوٹ جائے

کاسۂ سر توڑ دے گی کیفی اک ضرب اجل
جس طرح سے ظرف کوزہ گر بنے اور ٹوٹ جائے

الفت کے امتحاں میں اغیار فیل نکلے — تھے پاس ایک ہم ہی جو جاں پہ کھیل نکلے

تیغ و سناں کو رکھ دو آنکھیں لڑاؤ ہم سے — اچھی ہے وہ لڑائی جس میں کہ میل نکلے

دیکھا جو نور اس کا تو کھل گئی ہیں آنکھیں — دنیا و دیں کے جھگڑے بچوں کا کھیل نکلے

امید نیکیوں کی رکھو نہ تم بروں سے — ممکن نہیں کھلی سے ہرگز جو تیل نکلے

کب کوہ کن سے اٹھا کوہ گراں سی الفت
ان سختیوں کو کیفی کچھ ہم ہی جھیل نکلے

بادل امڈے ہیں دھواں دھار گھٹا چھائی ہے — دھوئیں توبہ کے اڑانے کو بہار آئی ہے

تاکہ انگور رہے ہوں مرے زخم دل کے — دھانی انگیا مرے دلدار نے رنگوائی ہے

تیرہ بختی سے ہوئی مجھ کو یہ خفت حاصل — دل وحشت میں سویدا کی جگہ پائی ہے

یہ چلن ہیں تو تمہیں حشر سے دیں گے تشبیہ — لوگ سفاک کہیں گے بڑی رسوائی ہے

موت کو زیست سمجھتا ہوں میں بیتابی سے — تری فرقت نے یہ حالت مری پہنچائی ہے

صبر ہجراں میں کرے کیفی محزوں کب تک
آخر اے دوست کوئی حد شکیبائی ہے

حال دل کہہ کے بتوں کو میں رلا دوں تو سہی — دل کو پتھر کے بھی میں موم بنا دوں تو سہی

آہیں وہ کھینچوں کہ ترا کا نظر آجائے تجھے — اے فلک روز سیہ تجھ کو دکھا دوں تو سہی

حسن بھی کہتی ہے اس شوخ کی یہ خودبینی — آئینہ کو بھی میں تصویر بنا دوں تو سہی

دل کو تھامے ہوئے خود کلبۂ احزاں میں وہ آئے　　اثرِ نالۂ شبگیر دکھا دوں تو سہی

بُت خود بیں نہ اکڑ اپنی تو یکتائی پر
میں بھی اک دن تجھے آئینہ دکھا دوں تو سہی

پھر ہوا جوشِ جنوں سلسلہ جنباں ہم سے　　بل کی پھر لینے لگی سُنبلِ پیچاں ہم سے
اللہ اللہ رے یہ طنطنۂ جوشِ جنوں　　منزلوں بھاگتا ہے دامنِ میداں ہم سے
رشتۂ عشق رگِ جاں کی طرح ٹوٹ نہ جائے　　اس قدر آپ کھچے رہیئے نہ اے جاں ہم سے
ڈرنے والے نہیں ہم لاکھ ہیں کہدیں زاہد　　ربط ہے اک بُتِ بے پیر کا ہاں ہاں ہم سے
کیوں جی کیوں کیا یہی ایمانِ وفاداری تھا　　چار آنکھیں تو ذرا کیجیے اے جاں ہم سے
ہو گئی یہ بھی سیاہی میں ہماری قسمت　　ہم نہ کہتے تھے نہ مل اے شبِ ہجراں ہم سے
دھوئیں اڑ جائیں گے اک آہِ رسا سے اس کے　　دون کی لے نہ کہیں گنبدِ گرداں ہم سے
جھومتی پھرتی ہے گلزار میں مستانی سی　　ساقیا چھو گئی کیا بادِ بہاراں ہم سے
بادل اٹھتے ہیں تو میخانے میں شور اٹھتا ہے　　اب جو توبہ کریں لے لے قسم ایماں ہم سے

کیفیؔ ہے کل ہند میں دلّی کا سماں بندھ جاتا
ملک میں ہوتے جو دو چار سخنداں ہم سے

ان کے آنے کی کیا خبر آئی　　بلبلیں پھر رہی ہیں اترائی
سچ ہے ان دونوں کا ہے اک عالم　　میری تنہائی تیری یکتائی
قصۂ دل میں تھا وہ جذب و اثر　　کہ طبیعت بھی ان کی بھر آئی
وقتِ بد کا کوئی نہیں ساتھی　　باپ بیٹا ہو دوست یا بھائی
کون غمخوار بیکسی میں ہو　　اپنی مونس ہے بس شکیبائی

ایسی باتیں کیا نہ کر کیفیؔ
لوگ سمجھیں گے تجھکو سودائی

آہ وہ شعلہ ہے جو جی کو جھلکے اٹھے　　درد وہ فتنہ ہے جو دل کو مسل کے اٹھے
آپ کی یاد میں ہم اے صنمِ غفلت کیش　　ایسے بیٹھے کہ قیامت ہی اٹھا کے اٹھے
ایک دزدیدہ نظر سے مرا دل چھین گئے واہ　　تم کدھر کو مری جاں آنکھ بچا کے اٹھے
عرصۂ حشر تک اک لگ گیا تانتا ان کا　　مردے قبروں سے جو تیرے شہدا کے اٹھے

رمضاں کیونکہ برس بھر کو سمجھ بیٹھیں ہم — آئے دن کے بھی کسی سے یہ گڑا کے اُٹھے

دل نشیں رحمت حق جب سے ہوئی ہے کیفی
دغدغے دل سے مرے روز جزا کے اُٹھے

دُرِ گہر سے سوا تیری آبرو ہوتی — اثر کی تجھ میں گر آئے اشک کچھ بھی بو ہوتی

ہمارے دل کی طرح پانو ٹوٹ ہی جاتے — اگر کسی کی تمنائے جستجو ہوتی

بنی ہے تو شب ہجراں فقط ہمارے لئے — جو ہم جہاں میں نہ ہوتے کبھی نہ تو ہوتی

کریم ہے دل پہ لے مدعا عطا کر دے — یہ ہوتی دل میں اگر کوئی آرزو ہوتی

نہ ایک تار بھی داماں حشر میں ملتا — جگر کے چاک کو گر حاجت رفو ہوتی

دو چار ہوتیں جو آنکھیں تو دل سے دل ملتا — نہ بات بڑھتی جو بات ان سے دو بدو ہوتی

بنے بنائے تھے ہم خاصے متقی کیفی
ہماری توبہ بھی زاہد کا گر وضو ہوتی

کب یہ خال لب نوشیں ہے عسل کی مکھی — ہے مژہ نوک سناں تو یہ رفل کی مکھی

سیم اور زر کے جو بندے ہیں نہ ملنا ان سے — ہیں یہ سب سفرۂ ارباب دول کی مکھی

اس کی پھانسی کو تو ہے تارِ نگہ اک ہی بہت — شور کیا کرتی ہے کیوں لیتی ہے بل کی مکھی

مکھی پر مارنی مکھی کوئی ان سے سیکھے — مگس جام کو کہتے ہیں کنول کی مکھی

آپ کے قاف کے دیو دل سے یہ ہو سکتا ہے — کاٹتی ہے جو پہاڑ آج یہ کل کی مکھی

دم کے دم لذت ناسور ملی زخموں کو — لطف کیا کر گئی یہ اک تری جھلکی مکھی

وہ مزاج ان کا ہے کہ طوا کے اڑا دیں جڑ سے — ناک پر بیٹھے جو ارباب دول کی مکھی

علم و فن سیکھ لے انسان جہاں میں کیفی
بس ہے نایدۂ علم و عمل کی مکھی

ہر طرف اک مسرت کا سماں چھایا ہے — ساقیا اب تو چلے دور کہ ابر آیا ہے

خوں ہوا لعل کا دل دیکھ کے ہونٹوں کو ترے — پان جب تو نے مرے غنچہ دہن کھایا ہے

کیونکہ دل چھین نہ لیں چھوتی چالیں اسکی — تیرے جوبن کی طرح ابر بھی گدرایا ہے

خم تو دو چار مرے سامنے لا تا مے کے — ساقی اک چھوٹا سا کیا جام یہ بھر لایا ہے

اب تو یہ حال تری یاد میں ہے اے غافل — دم بھی ہونٹوں پہ ترے نام کے ساتھ آیا ہے

دہر سے نام اٹھایا ہے وفاداری کا آپ نے بزم سے مجھ کو نہیں اٹھوایا ہے

عشق بازی میں تو کل عمر گنوائی کیفیؔ
کیا خدا کا تمھیں پیری میں خیال آیا ہے

نالے سن لے جو ترے بلبل ناشاد ابھی پر کی مانند زباں کاٹ لے صیاد ابھی
غیر کے ہاتھ مرے خط کا جواب آیا ہے دیکھیں کھلاتا ہے کیا کیا دل ناشاد ابھی
ہمدمو پوچھتے ہو کیا مرے دل کا احوال ابھی خوش ہے جو کوئی دم تو ہے ناشاد ابھی
آنکھ سے اس نے گرایا ہے مجھے آنسو کی طرح دیکھوں کیا کیا مرے سر پڑتی ہے افتاد ابھی

گر ٹھمک کر چلے گلشن میں مرا سرو رواں
شرم کے مارے زمیں میں گڑے شمشاد ابھی

خوب ہی کیفیت گلشن دنیا دیکھی بو وفا کی نہ کسی پھول میں اصلا دیکھی
کون کج خلق کو آنکھوں پہ بٹھاتا ہے بھلا نہ کھنچا کیجئے آپ ابرو کی دیکھا دیکھی
اک کلی بھی نہ کبھی اس کی شگفتہ پائی مدتوں رونق گلزار تمنا دیکھی

ہے یقیں مر کے بھی مرا تن مردہ کیفیؔ
زندہ ہو جائے گا گر صورت مینا دیکھی

آج بن ٹھن کے وہ بت جلوہ نما ہوتا ہے حال عشاق کا اب دیکھئے کیا ہوتا ہے
چارہ گر کیا تجھے آزار محبت کی خبر ہے یہ وہ درد کہ درماں سے سوا ہوتا ہے
کیا کہیں ہوتی ہے کس طرح بسر ہجر کی شب ہر نفس نالوں سے اک حشر بپا ہوتا ہے
چڑھ گئی باڑھ پہ سرمہ سے تری تیغ نظر اب ہرن دیدۂ آہو سے نشانا ہوتا ہے
مان شیریں دہانوں کی نہ بات اے ہمدم یہ وہ مصری ہے کہ زہر اس میں ملا ہوتا ہے

حال اپنا انھیں کیا کوئی سنائے کیفیؔ
شکر کرنے میں بھی میرے تو گلہ ہوتا ہے

جو جھلک آپ کے لچکا ٹنکے آنچل میں ہے کب بھلا ایسی چمک بجلی کی چھل بل میں ہے
تیرے وعدے کی حقیقت ہمیں معلوم ہے خوب روز فردا کی طوالت ترے اس کل میں ہے
کھل گئے کیا کسی مشتاق شہادت کے نصیب شور کیوں آج بپا عرصۂ مقتل میں ہے
بکھری ہیں تیری نہائے ہوئے زلفیں منہ پر یا کہ ساون کا چھپا چاند یہ بادل میں ہے

آج کل آپ کا کس طرح نہ کل پاتے ہیں ۔ بیکلی سخت ہیں آ لگی اس کل میں ہے

کیفی کچھ فکر نہ کر تیری مدد پر ہے خدا

مشکل آساں تری ہر ایک بس اک پل میں ہے

بادل اُمڈے ہیں گھٹا چھائی ہے کالی کالی ۔ بلبلیں پھولی ہوئی پھرتی ہیں ڈالی ڈالی

بس ہرن ہو گیا سب دیدۂ آہو سے نشا ۔ آنکھ جو دیکھ لی اے جان تری متوالی

جان لینے کے عجب ڈھنگ ہیں یاد اُس بت کو ۔ دل مسل دیتا ہے عاشق کا بجا کر تالی

میں جو کہتا ہوں کہ مر جاؤں گا تو کہتے ہیں ۔ ارے بس بیٹھ بھی ضد ہے تری دیکھی بھالی

ایسا کچھ ہو گیا ہے اس بت بدخو کا مزاج ۔ ہاتھا پائی جو کبھی ہے تو کبھی ہے گالی

بول اُٹھتی کبھی چھڑ یا جو تری انگیا کی ۔ خوش نوائی کی نہ یوں جیتتی بلبل پالی

دل لئے جاتے ہیں یہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ۔ مست گر کرتی ہے ساون کی گھٹا متوالی

آج کل سست سے کیوں رہتے ہیں کہئے کیفی

خیر ہے بات ہے کیا۔ خوش ہے مزاج عالی

سخت مشکل ہے آپ میں آنا ۔ حال کیا تیرے مضمحل میں ہے

دل میں رکھنا غبار کا ہے بُرا ۔ صاف کہہ دے جو تیرے دل میں ہے

غور کر خود تجھی میں ہے وہ نور ۔ کیا دھرا سنگ و خشت و گل میں ہے

بات ہے جو ہندوستان ہندی میں ۔ کب بھلا لعبت چگل میں ہے

کب خلل سے کوئی بچا کیفی

سہو انسان کے آب و گل میں ہے

کبھی ہے آج اور کل کبھی ہے بھلا یہ عہد و مآل کیا ہے

ہو وعدہ ایفا کہ ترک الفت یہ روز مرہ کی ٹال کیا ہے

زباں بگڑتی ہے آپ ہی کی ہمارا نقصاں کیا ہے اس میں

ذرا انہیں پوچھوں دل سے اپنے بھلا یہ طرز مقال کیا ہے

جو مانگا اک بوسہ میں نے ان سے تو بولے کیا تو سڑی ہوا ہے

ذرا یہ باتیں سنو تو لوگو جواب کیا ہے سوال کیا ہے

انہیں سرہ اکیلا پاکر یہ بولا چھاتی سے بیں لگا کر

کہ اب تو فرما دیں بندہ پرور وصال میں قبل وقال کیا ہے
ہیں ترک الفت میں ہم بھی راضی یہ کہدو بے کھٹکے اس صنم سے
بتوں کا اس ہند کی زمیں پر خدا کی رحمت سے کال کیا ہے
گرٹا رکھے آدمی جو دل کو تو جھیل لے ہر کڑی کو آسان
بندھی ہوئی ہو جو اپنی ہمت تو کام کوئی محال نہیں ہے۔
یہ کیسی ہیں ٹھنڈی سانسیں کیفی کہیں تو آیا ہے آپکا دل
یہ منہ نکل آیا کیوں ذرا سا بتائیے تو کہ حال کیا ہے

تصویر میرے دل میں اُتر آئی کسی کی
بھاتی نہیں اب مجھ کو دلارائی کسی کی
تنگ آیا ہوں میں جان سے اس عشق کے ہاتھوں
آجائے الٰہی مجھے اب آئی کسی کی
جب کہتے ہیں کچھ واسطہ ہم کو نہیں تم سے
کیوں آپنے پھر جھوٹی قسم کھائی کسی کی
کیا جانے کوئی دیکھتے ہم کیوں ہیں بتوں کو
آنکھ اپنی ہے دربردہ تماشائی کسی کی
در پر جو مرا شور سُنا تو وہ یہ بولے
رسوا مجھے کردے گی یہ رسوائی کسی کی
تقدیر میں جو لکھدیا کون اس کو مٹائے
چل سکتی نہیں اس میں تو دانائی کسی کی
زندہ ہی مجھے مار دیا طرز سخن نے
تھی دشمن جاں اپنی مسیحائی کسی کی
دراصل جو دیکھو تو ہے ان دونوں کی اک شان
تنہائی مری اور وہ یکتائی کسی کی
کیفی نہ بھروسہ کرو دنیا میں کسی کا
سچ جانو نہ یاری و شناسائی کسی کی

غضب سج دھج ہے اس جان جہاں کی
ہے نکیلی چتون اور چھب ترچھی بانکی
ملی لذت حیات جاودان کی
کرے دل کیا صفت تیرے سناں کی
فقیروں کو بھی اک چلو پلا دے
الٰہی خیر ہو پیر مغاں کی
بھلا دیکھیں سنکیں کیتنگ نہ آنکھیں
کٹے جائیں گے ہم بھی تا کا جھانکی
وہ بولے دیکھکر تصویر میری
یہ ہے تشکل ایک تیر آئے بتاں کی
بجھا جاتا ہے دل پھنکتا ہے سینہ
کہوں کیا کیفیت سوز نہاں کی

وہ پہلے جانچ لیں اپنی نزاکت — کریں پھر بات ہم سے امتحاں کی
گرا دی کہکشاں کے دل پہ بجلی — قیامت کی دھنک پلّو میں ٹانکی
کدھر کی سیدھیاں ہیں شیخ صاحب — بتاؤ تو یہ سُدھ باندھی کہاں کی
پلا ساقی مجھے وہ جام وحدت — نہ کچھ سُدھ بُدھ رہے پھر دو جہاں کی
بہت مشکل ہے یاں ایماں بچانا — زمیں بُت خیز ہے ہندوستاں کی

سمائی کب تھی آخر پھوٹ نکلا
تنک ظرفی ہے میرے رازداں کی

ہے مجھ کو جھجک وصل میں تو شرم ادھر بھی — دشمن ہے موذّن بھی مرا مرغ سحر بھی
کھا رکھی ہے جاں پہلے سے اس مرغ سحر نے — لوکا لگے تجھ کو کہیں کمبخت تو مر بھی
بُت خانے کی ہے رہگذر شیخ بلا خیز — رہگیر یہاں جاتے ہیں جاتا ہے گذر بھی
اوروں کو تو مسرور کیا بلکہ شرابور — اے ساقی گلفام کوئی جام ادھر بھی
ہو کون مقابل رخ پر نور سے تیرے — کھائے ہوئے ہے داغ یہ لالہ بھی قمر بھی
لیتے ہیں ہر اک بات پہ سینوں بل کی یہ معشوق — پھر اس پہ کہ غائب ہے دہن اور کمر بھی
آوارۂ وحشت کا پتا خاک بتائیں — ہوتا ہے بگولے کا پتا اور کہیں گھر بھی
اک دم میں اڑا دیتی دھوئیں چرخ کہن کے — آہوں میں جو ہوتا مری کچھ جذب اثر بھی
یہ رات پہاڑ ایسی ہے کاٹے نہیں کٹتی — ہے یا نہیں یارب شب ہجراں کی سحر بھی

اس رندی و میخواری کو اب چھوڑ بھی کیفی
ہے روز جزا کا تجھے کچھ خوف و خطر بھی

بحر خامہ سے مرے طرز روانی مانگے — بلبل اس سے سبق زمزمہ خوانی مانگے
دیکھ پائے جو دہن چشمۂ حیواں اترا — ایسا پانی پڑے اس پر کہ نہ پانی مانگے
زندگی اصل میں ہے زندہ دلی کا ہی نام — میری پیری سے اپج جوش جوانی مانگے
شاہد فصل بہاری نے دیا لالہ کو داغ — نہ کسی سے کوئی یاری کی نشانی مانگے
درد سر صندلیں رنگوں کی ہی الفت یا تک — کوہ سر سے مرے انداز گرانی مانگے
تو وہ بدظن کہ اسے رام کہانی جانے — قصۂ دل وہ کہ وارفتہ بیانی مانگے
کھنچ بیٹھے گر اس بُت کے دہن کی تصویر — خامہ انگشت تحیر ہی سے مانی مانگے

ہائے یہ جوشش وحشت کی بیاباں گردی — خاک سے ریگ رواں میری اڑانی مانگے

سر پہ احسان کسی کا نہیں اچھا کیفی
کیوں کسی سے کوئی شے مرحوم فانی مانگے

کبھی جو پاس بھی بیٹھے تو کسمساتے ہوئے — دبے جھکے ہوئے سمٹے ہوئے لجائے ہوئے
اگر انھوں نے چرایا نہیں ہے دل میرا — تو کیوں وہ بیٹھے ہیں آنکھوں کو یوں چرائے ہوئے
نہیں شہید محبت کو غسل کی حاجت — کہ آب خنجر مژگاں میں ہے نہائے ہوئے
یہ خوف تھا کہیں آواز سن کے جی نہ اٹھوں — وہ آئے قبر پہ میری چھڑے چڑھائے ہوئے
مگر یہ حشر کو نکلیں گے یا الٰہی کیا؟ — ہمارے دل میں جو ارمان ہیں سمائے ہوئے
رقیب روسیہ سے آج ان کی بگڑی ہے — وہ بے سبب نہیں بیٹھے ہیں منہ بنائے ہوئے
گئی نہ شرم شب وصل میں بھی تو ان کی — مری بغل میں وہ بیٹھے بدن چرائے ہوئے
خوشی سے کیوں نہ مرے ہاتھ پاؤں پھولیں آج — نہ کیونکہ آپ سے جاؤں کہ ہیں وہ آئے ہوئے

عجیب روپ سے کیفی چلے ہیں کعبہ کو
بغل میں دل کی جگہ بوتلیں دبائے ہوئے

مہدی ملنے کا ایک بہانہ ہے — ان کو عاشق کا خوں بہانا ہے
میرا ایسی جگہ ٹھکانا ہے۔ — جہاں جانا جہان سے جانا ہے
عشق بازی میں آرزو رکھنا — برق خرمن پہ خود گرانا ہے
اے صبا اس کی زلف کو مت چھیڑ — سوتی ناگن کو یہ جگانا ہے
نیت اس بت کی مجھ کو بتلا دے — تو تو یارب علیم دانا ہے
کہتی ہے یہ نفس کی آمد و شد — جان سے جانا دل کا آنا ہے
ہے جو دنیا میں نیک و پاک سرشت — وہی تشنیع کا نشانا ہے

عشق کا روگ کیوں یہ پال لیا
تو تو کیفی بڑا سیانا ہے۔

کام اپنا بس تمام تب ہجر کر گئی — بیمارئ فراق صنم ہم کو چر گئی۔
زخموں کے منہ کو تیغ کے ڈورے نے سی دیا — تکلیف چارہ سازئ زخم جگر گئی۔
قسمت کھلی پہ عقدۂ قسمت نہ کھل سکا — الٹا نقاب زلف وہ رخ پر بکھر گئی۔

محروم خلد ہی رہے طاعت کے زعم میں — اب شیخ جی وہ شیخی تمہاری کدھر گئی

اس گل کے دل میں خوبسائی ہوئے باغ — متفرق باد باغ بھی کیا گل کتر گئی

چڑھتا نہیں نظر کوئی اس بت کے سامنے — دیکھ اس کو کائنات نظر سے اتر گئی

روز سیہ ہے ہم سیہ بختوں کو رات دن — کہتے ہو کس سے تم کہ شب آئی سحر گئی

دنیا کی سرد مہری سے جی سرد ہو گیا — اے سوز غم تو اپنی طرف سے نہ کر گئی۔

اک راستی ہی جوہر انسانیت ہے بس — جب یہ گئی تو عزت و شان بشر گئی

سچ ہے پرانا ہو گئے ہی انساں کی قدر ہے — اس ہم کو دن لگے جو دلوں سے اتر گئی

کے دن کی چاندنی ہے نہ اس حسن پر اکڑ — دو دن کی ہے بہار ادھر آئی ادھر گئی

کس لئے نہ میرے قتل پہ شوں تیں ہیں سر بکف — ہنہ ہے تو ہاں بتاؤ کہاں وہ کمر گئی

کیا تیر نیمکش کے ہوں تشا کی دہان زخم — تلوار اپنے دورے سے سب گھاؤ بھر گئی

کم ظرف آدمی کے ہے بس جوش کا یہ حال — برسات کی ندی سی چڑھی اور اتر گئی

کہرام ہے ادیبوں میں کیفی کی موت پر

وہ کیا گیا جہاں سے قیامت گزر گئی

عشاق میں نام ہو چکا ہے — کیفی بدنام ہو چکا ہے۔

کیا پوچھتے ہو مریض غم کو — کام اس کا تمام ہو چکا ہے

عاشق کا نہ امتحاں لو — وہ تو بندۂ بے دام ہو چکا ہے

کیوں ہم سے نہ منہ چھپا کے جائیں — ہاں آپ کا کام ہو چکا ہے

کیا کام ہمیں رہا کسی سے — جب اپنا ہی کام ہو چکا ہے

کیفی کب تک یہ خواب غفلت

مہر لب بام ہو چکا ہے

آدمی کا آدمی شیطان ہے — آدمی کے آگے کیا شیطان ہے

جائے بعد مرگ خوئے بد تو جائے — اس سے پہلے جائے کیا امکان ہے

آسماں پہ کیوں نہ ہو اپنا دماغ — آج میرے ہاں وہ بت مہمان ہے

چرخ اکبر اس کے آگے ہیچ ہے۔ — دل میں پھیر کرنا کوئی آسان ہے

غم عدو کا۔ رنج گردوں۔ ہجر یار — اتنے غم سہنے ہیں یہ اک جان ہے

کیوں دو روزہ زیست کو بے حظ کرو
ہے جہاں جب تک کہ کیفی جان ہے

کس سے ٹھنڈک کہ یہ سب ہیں جلانیوالے
نالے آہوں سے سوا آگ لگانیوالے

بعد مردن تو ہوا سوز محبت پیدا
وہ مری قبر پہ ہیں شمع جلانیوالے

کوٹھے پر چڑھ کے اڑایا نہ کریں آپ پتنگ
ڈورے ڈالیں نہ کہیں یار اڑانیوالے

کیونکہ معشوقوں کے وعدوں پہ جیا کرتے تھے
بھولے بھالے تھے بہت اگلے زمانے والے

اڑتی چڑیاں کوئی کیا پکڑیگا انکے آگے
اچھے اچھوں کو ہیں چٹکی میں اڑانیوالے

ہم جو کہتے ہیں کہ مرتے ہیں تو فرماتے ہیں
ایسے دیکھے ہیں بہت جان سے جانیوالے

لے کے دل آنکھ بھی تو ہم سے ملاتے وہ نہیں
تھے مرے دل کی طرح دن کبھی یہ آنیوالے

ہجر میں تیرے تڑپتا ہے سر راہ کوئی
کہدے اس بت سے ذرا جاکے یہ للہ کوئی

جانے والے رہ عشق کے خود رفتہ ہیں
یہ وہ رستہ ہے کہ جس سے نہیں آگاہ کوئی

جی جو جلتا ہے تو آجاتی ہیں آہیں لب تک
بن کے پتھر سہے کب تک یہ ستم آہ کوئی

دوستو سنگ لحد پر مرے لکھوا دینا
کبھی بھولے سے کسی کی نہ کرے چاہ کوئی

بوریا اپنا ہے یہ مسند شاہی سے سوا
کیا ہمیں گر ہے فریدوں فر جمجاہ کوئی

ہے تعصب کی تو بات اور تمہیں کیفی کو
کردو معقول کہے بات جو بے راہ کوئی

ہاں دور جو پے بہ پے نہیں ہے
ساقی کچھ لطف مے نہیں ہے

آئینہ ہستی اول گل
ہر چند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہے

پہلو میں نہیں جو وہ ستمگر
کچھ لذت نا و نے نہیں ہے

چبھ جاتا ہے دل میں سنگدل کے
گو نالے کی کوئی لے نہیں ہے

کیوں جام طہور پر مرا ہے
گر شیخ فدائے مے نہیں ہے

ہے وصف شہان دہر کا عدل
خسرو ہی وہ کیا جو کے نہیں ہے

ہے باغ سدا بہار دل کا
اردی یہاں اور دے نہیں ہے

بے نشہ میں کب جیوں گا کیفی
افیون تو ہے جو مے نہیں ہے۔

بدن چراتے ہیں چشم خوش آب کے بدلے
وہ پردہ کرتے ہیں ہم سے حجاب کے بدلے

الٰہی خیر ہو قاصد کا رنگ فق ہے کہیں
جواب ہی نہ ملا ہو جواب کے بدلے

نہ ڈھنگ اس دلِ خانہ خراب کا بدلا
ہزاروں رنگ جہانِ خراب کے بدلے

کوئی بھی آرزو اس دل کی بر نہیں آتی
ہمیں تو پیری ہی ملتی شباب کے بدلے

کہی ہے شیخ نے کیفی یہ لیس مرِ دل کی
پئیں نہ آب بقا بھی شراب کے بدلے

ہوش میں آ جلد اٹھ اے مست خواب زندگی
آ چکا کب کا لب بام آفتاب زندگی

نقش پانی کا ہے یہ سب آب و تاب زندگی
آب حیواں ہے نظر آتا سراب زندگی

غور سے دیکھو تو کرتا ہے ازل ہی کسب نور
آفتاب ہستی سے ماہتاب زندگی

دیکھکر اوروں کو عبرت اور نصیحت دل میں ہو
پندنامہ ہے اگر سمجھو کتاب زندگی

کیوں نہ غافل اس کی ہستی کو کہیں نقش بر آب
لجۂ بحر عدم میں ہے حباب زندگی

دل سے جس نے حق کہا اور ہاتھ سے پیسا دیا
سمجھو اس نے ہی کمایا کچھ ثواب زندگی

کام اوروں کے مصیبت و آفت میں جو آ گئے
ہے وہی دنیا میں یارو کامیاب زندگی

جھوٹ مت جانو عزیزو اس کو ہرگز بعد مرگ
لائیں گے پھل ارتکاب و اجتناب زندگی

جس نے مارا نفس کو اور کر لیا شیطاں کو زیر
ہے حقیقت میں وہی تو فتحیاب زندگی

ہے وہاں کا توشہ جو یاں بھیج لیا اور تج دیا
کام کیا خاک آئے گی یہ سیم ناب زندگی

عمر دو روزہ پہ کیا بھولا ہے سب ہوگا تباہ
ایک دم میں گنبد گردوں قباب زندگی

کر چکا فکر معاش اب کر لے کچھ فکر معاد
کب تک اتنی غفلت اے مست شراب زندگی

خود کرو انصاف دل میں سوچنے یہ کم یا کہ وہ
گر گنو کار بد و کار صواب زندگی

خواب غفلت سے اٹھو رویا کرو گے ورنہ پھر
ہے عدم اے غافلو تعبیر خواب زندگی

دین و دنیا کے جھمیلوں میں رہا ہوں مبتلا
کب یہاں چھوٹا گہن سے آفتاب زندگی

نفس ناطق نے جبھی چھینکا تھا پر سمجھے نہ خاک
ہم نے جس ساعت کیا تھا پا تراب زندگی

شرم آتی ہے کہ آخر اس کا دیں گے کیا جواب
مانگ بیٹھا گر خدا ہم سے حساب زندگی

ہم یہ اب سمجھے کہ ہے سکرات نزع اسکا خمار
ہم نے اے کیفی جو وہ پی تھی شراب زندگی

یادِ ایّام

خوش تھے ہم جب نہ سمجھتے تھے کہ الفت کیا ہے
ناز کیا شے ہے اور انداز کسے کہتے ہیں
تلخ گوئی کسے کہتے ہیں ترشروئی کسے
بے کہ آدمی رہ سکتا ہے - زندہ کیونکر
گالیاں کھانے میں کیا آتا ہے لوگوں کو مزہ
نفخۂ صور ہے کیا - کیا ہے چھڑ دینی جھنکار
ہم سمجھتے تھے نہ کچھ سبزۂ خط کے معنی
کس طرح آتا ہے دل - جاتا ہے کیونکر آرام
شوق کیا چیز ہے اور کہتے ہیں ارماں کس کو
روزنِ در کے نظارے کا ہے لپکا کیسا
چہ بابل کو سمجھتے تھے عمر کی زنبیل
تھے ریاضی میں ذہیں - اور نہ یہ جان سکے
تھا نہ کچھ ہوش کسے کہتے ہیں عدے کی وفا
غرض اصرار سے کیا - اور ہے انکار سے کیا

کیا بلا ہوتا ہے عشق اور محبت کیا ہے
حُسن کس چیز کا ہے نام نزاکت کیا ہے
کیا ہے شیریں دہنی اور ملاحت کیا ہے
لبِ دہاں اور مسیحائی یہ ندرت کیا ہے
تلخ گوئی میں حسینوں کی حلاوت کیا ہے
ناز کی چال ہے کیا اور قیامت کیا ہے
اور تحریر سے سرمہ کی عبارت کیا ہے
جیتے جی جان کے جانے سے بشارت کیا ہے
کیسی ہوتی ہے امنگ اور یہ چاہت کیا ہے
کسی دلوار کے سایہ میں فضیلت کیا ہے
نہ خبر تھی ہمیں زہرہ کی حکایت کیا ہے
مدت وعدۂ فردا کی لغایت کیا ہے
دل کی بے صبری وہ شام شبِ وصلت کیا ہے
دستِ گستاخ جھٹک دینے میں لذت کیا ہے

عشق کو کھیل صنم کا سا سمجھتے تھے ہم
ناز و انداز کی باتوں میں الجھتے تھے ہم

فارسی کلام

ہاں بیا تا ایں جہاں را عالمِ دیگر کنم — شش جہت را از طلسمِ جذبِ دل ششدر کنم

قطرہ را آبِ گہر بخشم ز نیسانِ سرشک — ذرہ را از سوزِ دل ہم پرتوِ خاور کنم

من خلیلِ عہدِ حاضر ہستم اے اربابِ دیں — کعبۂ تازہ بنا در سینۂ آذر کنم

از شرارِ سنگ گردد جلوہ گر صد نورِ طور — یک نظر از گوشۂ دل گر بریں منظر کنم

تا ریاکاری جدا گردد ز آئینِ صفا — شیشۂ میخانہ را آئینہ محشر کنم

خونِ فاسد تا بریزد از رگِ اہلِ فساد — ہر نفس نقشِ سخن را ہمدمِ نشتر کنم

زخمہ بر تارِ ربابِ خامشِ دلہا زنم — جادۂ شوق ز یاس و حزن لامصدر کنم

ضدِ تسکین و قناعت ہست دورِ انقلاب — قلبِ تسکین و قناعت را بیکے مضطر کنم

در ازل قلبِ مرا شانِ قیادت دادہ اند — اندریں طوفانِ گمراہی گرا رہبر کنم

در دلم حُبِّ جہاں و در چشمِ من ہر شئے حسیں — جنگِ حسن و عشق را بر نوعِ تازہ سر کنم

پردہ دارِ رُوح و جاں گشتہ دلِ صد چاکِ من — زاہدا- ایں خرقۂ صد رنگ چوں در بر کنم

چشمم از جذبِ نگاہِ مستِ ساقی شد فراخ — سر چرا اندر ہوائے چشمۂ کوثر کنم

گم شود یکسر ز عالم امتیازِ کفر و دیں

گر حدیث از وارداتِ قلبِ کیفی سر کنم

ز کیفِ بادہ کہ مستم خُمار کے داند — مقامِ رندئے ما ہوشیار کے داند

کسے کہ جان و دلِ خویش را بہ یار سپرد — تمیزِ جبر و حدِ اختیار کے داند

و راز حسرتِ دیدار سینہ آباد است — الیمِ عشق غمِ روزگار کے داند

کسے کہ روز و شبانش بہ ذکرِ یار گزشت — فریبِ گردشِ لیل و نہار کے داند

خلاف دخل ندارد بہ چشمِ وحدت بین — کہ آں تفاوتِ اغیار و یار کے داند

زبیخودی چو کسے خسروئے دل دریافت
دراں نگاہ بصیرت شعار کے داند

زخون گرم کسے ہست گرم بازارش
حقیقتے ہست کہ سرمایہ دار کے داند

بیا تو رخت بہ ملک دگر ببر کیفی
عیار جوہرت اہل دیار کے داند

شہود شاہد و مشہود بحث دور از کار
کہ جز ولا یتجزّا است عشق صدق شعار

خوش آں زماں کہ بر آید بیک کرشمہ دو کار
کہ دست محو بہ کار است و دل مرا با یار

بہ نور پاک شدہ جذب بسکہ ذرّہ خاک
چہ ارتقا کہ مدارج بر آں شدند نثار

ریاض دل ز نسیم رواں فزا معمور
چہ حاجت است کہ آریم نافہ از تاتار

تمیز ذات و صفت وہم خیرگئے نظر
عرض گسستہ ز جوہر بود شئے بیکار

چو تار جیب ہم آہنگ شد بہ تار نفس
ز نغمہ رگ تو سراید ہزار موسیقار

عیار عشق ترا تا کہ امتحان کنم
دلے کہ فخر براں میکنی بیاؤ بیار

بیا کہ از وطن۔ اہل وطن سخن رانیم
بدر کن از دل خود قصۂ غم اغیار

خوش است خدمت یاراں چو بیغرض باشد
کہ برگزیدۂ اخلاق نیک است ایثار

بہ حبّ خلق نہاں عشق خالق عالم
ہمیں وظیفہ مرا ہست خسروا اذکار

یکے است شیخ و برہمن بہ دیدۂ حق بیں
یکے است رشتہ در آنہا چہ سبحہ چہ زنّار

بہ حق پرست نہ ارزد تمیز ملت و دیں
کہ یابد اہل نظر دید یار در اغیار

مقام عشق خدا بعد عشق خلق خدا است
چو نقص علم معانی است قبل ذکر اضمار

نہ صرف علم۔ عمل دفع جہل را باید
شفا پذیر ز تشخیص کے شود بیمار

ز فکر حال دلت گرم و چشم تر باشد
فسانۂ غم فردا بہ زاہد خشک گزار

بہ کار حال دل و دست خویش را پیوست
ترا چہ حرفہ وہد داستان پار و پرار

تو راز عشق و وفا نشر کن چو دریا جی
نشیں نہ بر لب دریا مثال بوتیمار

ادائے فرض کن از جوش شوق و حسن عمل
چرا تو عربدہ جوئی بہ چرخ ناہنجار

ہلا کہ تا ز حقارت نظر بہ آں نہ کنی
جہاں است کار نمایان حق و جہاں تہکار

مگر دلت بہ جہانیاں رسد ز حبّ جہاں
صنم جمال صنم ساز را است آئینہ دار

چو شیخ مست مئے کوثر است گو خوش باش
ز میگسارئے بہماں فلاں مرا چہ فشار

بطون من ز غریب صُوَر مبرّا شد　　مرا بہ بادۂ و پیمانۂ و سبوست چہ کار
چشیدہ بُود یکے جرعہ در ازل کیفیؔ
چہ بادہ بود۔ سرورش نہ شد ہنوز خمار

یوم غالب

علّامہ کیفی جو انجمن یادگار غالب دہلی کے بانی اور صدر ہیں، یوم غالب کے شروع کرنے والے بھی ہیں سنہ ۱۹۳۶ء میں آپ نے اس کی بنیاد ڈالی۔ سب سے پہلے یہ دن آپ کی تحریک سے سنہ مذکور ۱۵ اور ۱۶ فروری کو دہلی میں منایا گیا پروگرام کی مدات میں مشاعرہ بھی تھا۔ یہ قصیدہ فارسی طرح میں ہے اردو کی طرح تھی۔ خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں۔ اردو کی غزل اپنی جگہ ملے گی۔

ایکہ فرمودی"۔ کہ سرمست سخن خواہد شدن　　ایں مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن"
مے جواں تا تیز شد از کہنگی اے میرزا　　زاہد خشک از تندیش پنبہ دہن خواہد شدن
شکرّ و شیر ایں چنیں از رشحۂ طبعت چکید　　روزے ایں گنگ و جمن رود لبن خواہد شدن
در سرما ایں قدر جوش جنوں انداختی　　تار تار دامن اکنوں پیرہن خواہد شدن
آبیاری کردئی زینساں ز رشحات قلم　　ہر زمین شعر محسود چمن خواہد شدن
دی بہ حرف غیر بود امروز در حرف خود است　　ایں تغیّر تا مگو ختم سخن خواہد شدن
رنگ بیرنگئے اردو بیں چہ نیرنگی نمود　　ایں ہما نا آئۂ نطق وطن خواہد شدن
توم از نقد سخن آقائے من نادار نیست　　ہر کسے البتہ کے جادو سخن خواہد شدن
قرنہا باید کہ ذوق عام با صحت شود　　سالہا باید کہ کسب علم و فن خواہد شدن
نیست دور از فیض طبع روشنت اے مہر علم　　ذرّہ ایں خاک پرویں و پرن خواہد شدن
ہست ظاہر بر تو اے استاد جدت آفریں　　آنچہ اکنوں نو بود فردا کہن خواہد شدن
آں زماں بگزشت کاندر ایں طلسمات مجاز　　دل اسیر گیسوئے پُر از شکن خواہد شدن

جاذب ذہن است ایں دل کشف سرّ کائنات
سعیٔ لاطائل حل راز دہن خواہد شدن

انقلاب ذوق طبع عاشقاں را در گرفت
قلب را محبس نہ آں چاہِ ذقن خواہد شدن

ثمرۂ شیریں محنت مطمح چشم دل است
کان کن پیدا بجائے کوہکن خواہد شدن

در گلستان سخن ہیں غنچہ ہائے نو بہ نو
کز شمیمش رشک گلشن ہر دمن خواہد شدن

ایں زماں آوان تغیر است وحین انقلاب
لاجرم تجدید پرداز کہن خواہد شدن

با خدائی! عرض ما در بارگاہ حق رساں!
کام دل حاصل ز سعیت غالباً خواہد شدن

از سخن بگزشته مے آئیم بہ میدان عمل
گوہر ما از ہمیں بالاثمن خواہد شدن

سابقاً محبوب ما مولود وہم و ذہن بود
قابض دل حالیا حب وطن خواہد شدن

عقل انساں در پئے تحقیق و اصلاح است از آں
صورت بہبود ابنائے زمن خواہد شدن

از لب ناقوس گلبانگ اذاں خواہد دمید
سنگ کعبہ بر برہمن را وثن خواہد شدن

چوں بگوشِ دل رسد آوازۂ امّ الوطن
برہمن از شیخ و شیخ از برہمن خواہد شدن

نغمۂ تکبیر رقصد بر فراز صومعہ
واز منار کعبہ آواز بھجن خواہد شدن

ماتمی شبیر و شبّر را شود زنّار دار
شیخ مدحت گستر رام و کشن خواہد شدن

گل کند از ایں تضاد اخلاص و رنگ اتحاد
گبر و مسلم جملہ یک جان و دو تن خواہد شدن

سورۂ والشمس رخشاں از دل لالہ شود
سبزۂ بیگانہ دلدار چمن خواہد شدن

اے چنہ میرانی سخن از ابعد کیلاس و حجاز
قرب دلہا نفیٔ فرق تو و من خواہد شدن

نذر ملک و قوم جوش و شوق او۔ ہستیٔ او
ہر کہ ہست اکنوں نثار خویشتن۔ خواہد شدن

نعرۂ توحید چوں بردہ فرد شور ملل
ساجد اولاد آدم اہرمن خواہد شدن

سرفرازی حصّۂ حق بین و حق گویاں بود
آں رسے سر پیچ دعلم دار و رسن خواہد شدن

جذبۂ رفق و رواداری اصول دیں شود
منبع راحت ہمیں دار المحن خواہد شدن

خلوت از فکر عزیزان وطن تنہائی سوز
پردہ دار راز الفت انجمن خواہد شدن

طبع انسانی وداع صبر و تسکیں کردہ است
منتہائے ارتقا را گام زن خواہد شدن

ہمت مردانہ خط بر لفظ ناممکن کشد
کار ماہ و سال در یک دم زدن خواہد شدن

چیزہا کو در تصوّر ہم نہ امکاں داشتند
شکل امر واقعی پیدا معاً خواہد شدن

نیست دور از فیض عام او کہ ایں خاک بسیط
مہبط افضال ربّ ذو المنن خواہد شدن

این ہمہ ہنگامہ بد و انقلاب اعظم است — منقلب یک روز اندازِ کہن خواہد شدن
حرف گارہ حال شو کیفی زِ مستقبل گزر
ہاں سرائی تا بکے - خواہد شدن خواہد شدن

عاشق آں نیست کہ صد پارہ گریباں دارد — آہ بر لب بہ زباں نالہ و افغاں دارد
نہ بہ ہر کس کہ غم عشق سپردند بہ او — کہ دم "تازہ بسر خوش- دلِ شاداں دارد
آرزو وصل خودی ہست و خودی بالغ دید — پردہ از ذات خودت جلوۂ جاناں دارد
آنچہ بر حور و ملائک نہ ودیعت کردند — بخدا آں ہمہ این پیکر انساں دارد
قایل حرّیت مسلک منصور استم — قید فرزانگی و عشق نہ امکاں دارد
لنترانی نہ ادائیست کہ ازرد بہ جیب — دل جاں سوختہ صد طور بہ داماں دارد
آنچہ پیداست نظر کن بہ نگاہ دل خویش — راز و ہر این و ہمیں ہیچ نہ پنہاں دارد
جملہ لانست کہ از وہم پرستاں شنوی — نہ کسے درجۂ تحقیق نہ ایقاں دارد
زاہد خشک بہ تر دامنئ رند مخند — ظلمت کفر او صد لمعۂ ایماں دارد
وقف بہبودئے خلق آنکہ دل جاں کردہ است — آں کس از فاصلہ نزدیکئ یزداں دارد
سخن آں ہاست کہ ز لب تا بہ دلاں راہ کند — ورنہ ہیچ است ہم از شیوۂ سحباں دارد
برہمن خانہ فروزی بہ شبے در یک سال — ہر نفس سینۂ عشّاق چراغاں دارد
طرفہ احیائے سخن از دم کیفیؔ پیداست
کہ بہ اشعار رواں چشمۂ حیواں دارد

مکن یقین بہ تحریر و در بیانِ کسے — محکّ صدق عمل ہست نے زبان کسے
بہ بیں ہر آنچہ زِ کردار و فعل او پیداست — مپیچ در غم اسلاف و خاندان کسے
کسے کہ گفت انا الحق ز جوش و جذب دروں — بہ چاہ نیست فتادہ بہ ریسمان کسے
دراں نہ بیم و رجا نے غم فراق و وصال — جہانِ عشق جدا ہست از جہان کسے
منم کہ مست ہوائے بہار باغ دلم — نظر فریب مرا نیست گلستان کسے
بنوش و گوش مکن آنچہ واعظاں گویند — کسے چگونہ مقفّل کند دہان کسے
تلاش کن بہ دلِ خویش آں دِلآرا را — بہ دشت و راغ نیابد کسے نشان کسے
فرا رسید مرا درا کمال رُشد جانی — دلش تپید چو از اضطراب جان کسے

دریں زمانہ کسے نیست غیر ظاہر بیں
کسے چگونہ گزیند غمِ نہان کسے

قیاس کن کہ چساں شب بروز آوردہ
مرنج خواب تو شد تلخ از فغان کسے

تو امتحان خود اے دوست کن عیارت بیں
ترا بدست چہ آید ز امتحان کسے

بہ بیں بہ دیدۂ حق بیں چہ نقش اندازی
مبیں کہ وزن چہ داری تو در گمان کسے

مرا سخن ز دل و در زبان دل باشد
کنم نہ نقل ز شیراز و اصفہان کسے

بیا کہ از وطن و دوستاں سخن رانیم
دہد چہ صرفہ بہ ما ذکر و داستان کسے

ہر آنچہ کیفیؔ ما گفت ہست کلمۂ حق
چنیں سخن نہ شنیدیم از زبان کسے

یک جوے بیش نیرزد بہ من ایقان کسے
کہ نہ ممنون عمل آمدہ ایمان کسے

نیست راسخ چو عمل کار چہ آید از دست
ایں نہ دردیست شود رفع ز درمان کسے

چوں سخن جملہ سخن باشد و محروم عمل
چہ بود جہل دریں حال و چہ عرفان کسے

فعل اصلاح دگر ۔ ردِّ عمل چیز دگر
کاش واضح شود ایں راز بہ وجدان کسے

داغ اعمال نہ شوید عرق پیشانی
عظمت عدل نہ شد خجلت عصیان کسے

ضدِّ جذبات تو در بلبل و گلچیں بنگر
وجہ تسکین کسے باعث حرمان کسے

وجہ شادی ست زر و ہم سبب بربادی
بیں کہ یزدان کسے آمدہ شیطان کسے

دورِ چرخ است جہانگیر ۔ گرفتیم ۔ مگر
ہست دشوار کسے ۔ جان من ۔ آسان کسے

اندریں دہر چہ افراط و چہ تفریط بود
ہست تقلیل کسے وجہ فراوان کسے

آنچہ بینم ہمہ آئینہ صفت در پیشت
کہ نیم ہاجئے شخصے نہ ثنا خوان کسے

در گریباں نہ کشیدند سرِ خویش و لے
بہ جنون دست فشردند بہ دامان کسے

خطِ تقدیر شود یا نہ شود حک ۔ لیکن
حسن تدبیر ہمانا ست در امکان کسے

من کہ شیدائے فضائے چمن دل باشم
نظرم را نہ فریبد گل و ریحان کسے

بارے در سال چو یک روز طلب کرد زمہر
بہتر از یاد مرا غمزۂ نسیان کسے

بسکہ درویش غیوریم بہ دنیا کیفیؔ
سر گرانیم ز بار غم احسان کسے

خوشا شخصے کہ آں یزداں پرست است | چہ انساں است کو انساں پرست است
یکے وید و پُراں را حلقہ در گوش | یکے انجیلؔ یکے قرآں پرست است
جنون خود پرستی ہست حاوی | دگر ہر کس کہ ہست آساں پرست است
پئے اغراض نفس ایماں فروشند | یک از مانیست کو یزداں پرست است
بہ ما ایماں شدہ مطلب پرستی | چساں گویم فلاں ایماں پرست است
کسے درد وطن در دل ندارد | دریں جا ہر کس این و آں پرست است
کجا بہر وطن دل چاک گردد | ترا دست جنوں داماں پرست است
نگر آں ساکنان پارۂ خاک | کہ ہر جاپ این چنیں جاپاں پرست است
پرستار وطن ہر فرد افرنج | ہر ایرانی کہ ہست ایراں پرست است
چساں برکند ترک آں کہنہ جامہ | بہ تجدید عمل القاں پرست است
چہ از وطنیت آنہا سرائی | کہ ہر انگریز انگلستاں پرست است
پرستار وطن ہر قوم زندہ | نہ کس جاناں پرست و جاں پرست است

ز دین و ملت کیفیؔ چہ پرسی
فدائے ہند ہندستاں پرست است

یا ز صفت نہ ذات را برقع صد حجاب دہ | یا نظر دل مرا لمعۂ طور تاب دہ
پردۂ راز برفگن حسن ازل نمایہ خلق | بزم نظارہ کن بپا بادۂ شیخ و شاب دہ
حسن ادائے خاص را اذنِ صلائے عام کن | شرح طلب نہ شرح کن حاشیہ بر کتاب دہ
زخمہ بزن و بہ رقص آر تار رگِ روان دہر | ز آتش نغمۂ قدس تاب بہ این رباب دہ
قلب سکوں گرفتہ را بسملِ تیغ ناز کن | ہستیٔ پر جمود را لذت اضطراب دہ
قطرۂ پست مایہ را افسر موج بحر ساز | ذرۂ خاک تیرہ را تابش آفتاب دہ
آنکہ بہ زعم رہبر ند کمتر رہزناں نیند | سالک راہ صدق را دیدۂ انتخاب دہ
حب بیت وطن شود رگ رگین دین ما | ہندیاں را بہ عشق ہند رغبت انتساب دہ
سوز محبتِ وطن در سر کفر و دیں فگن | در دل شیخ و برہمن لذت پیچ و تاب دہ
برکت اجتماعیت بخش بہ ما یگاں یگاں | از خط نفس و ذات خویش طاقت اجتناب دہ
ریخ برادر وطن تا عمر خویشتن [illegible] | نغمہ حسن ہستی کہ [illegible] جواب دہ

سرد شدہ است در دلاں شعلہ الفت وطن   دامن پاک زن بر آں خصمت التہاب دہ
آنچہ غم جہاں زداست در تہ کوثر صفاست
کیفیؔ مست عشق را جرعۂ زاں شراب دہ

دانم نہ ابتدائے تو نے انتہائے تو   بیروں زِ حد طاقت انساں ثنائے تو
کے پا بہ دیر و کعبہ گزار د فدائے تو   تا آشنائے ہر دو جہاں آشنائے تو
از ماسوا شدہ دل بے مدعا غنی   کونین ہیچ و پوچ بہ پیش گدائے تو

رانم کنوں زحضرت انساں یکے سخن   اے آں کہ کس نہ یافت زشان علائے تو
تا کے بہ راہ عشق زنی سر چو گمرہاں   ہشدار رہزنے نہ بود رہنمائے تو
علم و یقیں زتاب عمل پختگی نہ یافت   مہر و وفائے تست چو جور و جفائے تو
ہاں ہوشدار تا نہ تصرف کند ترا   اے دوست ایں مجاز حقیقت نمائے تو
بالید خوں بہ جبہ پئے خونبہا روی   خون جگر ملائے کہ گشتہ غذائے تو
جنگ حیات نیست عزیزم چو فرش گل   در پیش ہفتخواں و قضا در قفائے تو
صدق و خلوص حادی نیت بود اگر   دریابد آستان اجابت دعائے تو
شرط است تا نہ تنگ شود مطمح نظر   خلق جہاں است چشم براہ ولائے تو
از آب گنگ و زمزم از نیساں چہ شست و شو   آئینہ دار طور دل پر صفائے تو
خود را مکن اسیر کمند قنوطیت   انداختند طرح دو عالم برائے تو
عزم بلند دار و رہ صدق پیش گیر   تا سرمہ چشم مہر شود خاک پائے تو
حقا کہ ہیچکارہ و ناچیز نیستی   گیرد زمانہ رنگ زرنگیں ادائے تو
تا فرض خویش را نہ کنی طعمۂ اجل   پوشیدہ است راز بقا در فنائے تو
تار نفس بہ رقص در آرد بہ ساز نو   یک زخمۂ بہ بربط جادو نوائے تو
بانگے زن و بہ وجد بیار اہل دہر را   نقارۂ خدا است یقیناً صدائے تو
کیفیؔ تو شادزی کہ مسیحائی مے کنی
شورست روح را سخن جانفزائے تو

دیدم آں جلوهٔ حسنے که نه دیدست کسے — وه چه حسنے که مثالش نه شنیدست کسے
حرم و بتکده را چوں نه گزارم پس پشت — رشته در گردنم افگند و کشیدست کسے
همه لافست که از شیخ و برهمن شنوی — آں مقامیست که نزدش نه رسیدست کسے
آمدے از شب هجراں سحرِ وصل پدید — گرد آں شمع چو پروانه تپیدست کسے ؟
باج نیکو ز بداں نیکئے نیکاں گیرد — حُر همیں است که از فوج یزیدست کسے
ایں هم از لوث دوئی گو نه منزه باشد — نه به تسلیم و رضا هم نه گزیدست کسے
ظاهر آباد نه با صاحب باطن ارزد — بیهُده خاک بسر جامه دریدست کسے
سر چرا در سر اعدام تمنّا کردی — پا بزنجیر ز محبس نه رهیدست کسے
هر که از سوز دروں سوخت ید بیضا یافت — ماند از فیض محبّت نه تهیدست کسے

کیف ایں بیخودی از کیفیؔ سرمست بپرس
مثل او لذت ایں مے نه چشیدست کسے

راحت جاں فتنه سامانی هنوز — در دل و از دیده پنهانی هنوز
ذره ذره آئنه دارِ جمال — آشکارا راز پنهانی هنوز
مایهٔ هستی دل و دل نذر تو — تا نه پنداری که ارزانی هنوز
جاں ز بند عیش و غم آزاد گشت — در خور صد گونه احسانی هنوز

حالت دیر و حرم خواهی چه دید — مدعی کفر و ایمانی هنوز
دل رهین یاس و جاں وقف سکوں — ایں چنیں ذوقِ تن آسانی هنوز
خود شناسی هست از خود رفتگی — تو نه آئی خود که میدانی هنوز
کار فرماهست در حشمت که بود — سحر ایں هنگامهٔ فانی هنوز
تو نه حاشا که اهل درد عشق — در پئے تاثیر و درمانی هنوز
مے شناسی صومعه را از حرم — شاد زی یارا مسلمانی هنوز

حلّ راز عشق مے خواهی ز عقل
دم مزن کیفیؔ که نادانی هنوز

خنده بر صحرا زند کاشانه ام — خانه پرداز ست ویرانی هنوز

حرفم بہ عندلیب گلستاں ترانہ ایست — طبع شگفتہ خندۂ گل را بہانہ ایست

دانم کہ لخت قلب جگر را بہانہ ایست — آہ و فغاں سکون دلم را بہانہ ایست

دارم بہ گوش پنبہ ز سوز و گداز دل — شور نشور کم ز صدائے چغانہ ایست

تسبیح نذر مغبچہ۔ پا پاخ رہن مے — بنگر چہ سحر کارئے جام مغانہ ایست

زاہد بیا بہ بادہ و مطرب ندیم شو — اندیشۂ قیامت و عقبیٰ فسانہ ایست

بر شاخ آہو است برات حزیں دلاں — فردا در امر وصل یکے شاخسانہ ایست

زاہد بہ بزم جام نگیری چرا بہ دست — کم ظرفی۔ آرے۔ معذرت عاقلانہ ایست

انیست خشت خم پئے بالیں۔ بشنو در راز — خیر سر و عمامہ و ریں۔ زاہدا۔ نہ ایست

چشمت چو ہست داغ دل خویش را نژدہ — پارینہ داستاں گل و نرگس فسانہ ایست

تا آں حبیب شوخ و تغافل منش نہ کرد — چشمم ز نور نامہ منور۔ زمانہ ایست

افزود فصل گل تپش جوشش عندلیب — از چوب گل جنون ورا تازیانہ ایست

چشمے بہ حال وار و بکن آنچہ کردنی است — اے دوست ذکر و نوحۂ ماضی فسانہ ایست

کن ترک یاس و رحل دل امید را لبساز — مرغ حبیب را بہ ہوا آشیانہ ایست

عشقت چہ صادق است چہ مشکل کشود کار — صد چاک دل بہ گیسوئے پر پیچ شانہ ایست

قدر عیار علم چہ خواہی ز ناشناس — در دہر جنس علم و ہنر را بہانہ ایست

قایل بہ صدق و نیکئے رنداں نہ زاہد است — گر ایں تجاہل است۔ بلے۔ عارفانہ ایست

قدر و قبول اہل کمال است بعد مرگ — ایں ہم۔ عزیز من۔ رہ و رسم زمانہ ایست

حرف از کمال جوہر کیفی چہ می زنی
آرے در اہل صدق و صفا آں یگانہ ایست

دلشب از داغ درون نور چراغم دادند — وا ز رہ منزل دلدار سراغم دادند

داغ دنبخالہ دل لالہ و گل را ماند — رد کش روضۂ رضوانست کہ باغم دادند

کوئے اغیار و سر کوچۂ یار ست یکے — قلب بر کند ز شہر و سر راغم دادند

اثر کیفر کردار ہمنے دانی چیست — غم مخور اہل جہاں را کہ چرا۔ غم دادند

سالہا رفت کہ یک قطرہ نہ شد ارزانی — یاد ایام کہ لبریز ایاغم دادند

مدح پیمانہ ساقی چہ سرایم کیفیؔ
کہ ز شادی و غم دہر فراغم دادند

ساقیا رطلِ گراں دہ در خمار افتادہ ام   از غمِ دنیا و عقبےٰ زیر بار اُفتادہ ام
از کفِ افسوس یاراں دستگیری مشکل است   من برنگِ سبزہ دریائے چنار افتادہ ام
خاکسارم گو بہ ظاہر نسبت اعلیٰ مراست   مثلِ آب جوز تیغ کوہسار افتادہ ام
جوہرِ ذاتم بہ میزانِ فلک سنگین شد   تاز چشمِ اعتبارِ روزگار افتادہ ام
استوارم لیک زِ آشوب زماں ایمن نیم   سایہ بر آبم ز سرو جوئبار افتادہ ام
راحت و رنج دو عالم محو گردیدا نہ دلم   تا من از تیرِ نگاہ تو شکار افتادہ ام
کیستم جز و معطل اندریں کون و فساد   قطرۂ بر ساحلِ ایں رود بار افتادہ ام
زاہدا جذب و کشش دارد چہ خاک میکدہ   بار بار استادہ گشتم بار بار افتادہ ام
مشک در تا تارِ کیفیؔ کے ہمی ارزد بہ ہیچ
قدر من افزود تا دُور از دیار افتادہ ام

اگر شیخ و برہمن طعنہ زن دارم چہ غم دارم   کہ با خود لطف ربِّ ذوالمنن دارم چہ غم دارم
بہ مجلس حرفِ حق را کے مقیّد میتواں کردن   بہر رگ چند زنجیر و رسن دارم چہ غم دارم
چہ شد گر در قفس کردند کہ از داغِ غمِ الفت   شگفتہ در دلِ خود صد چمن دارم چہ غم دارم
چہ وصل و ہجر با معشوق ہستم حاضر و غائب   مہیّا در تصوّر انجمن دارم چہ غم دارم
جنوں گر شورشِ انگیزد بگوہاں ایے محابا باش   نہ یک جائے رفو در پیرہن دارم چہ غم دارم
نہ ارزد با من ایں حرف خنک از مدعی کیفیؔ
کہ در دل گرمیِ حُبِّ وطن دارم چہ غم دارم

ببند دیدہ کہ آں ہست کفر و ایماں بیں   نظارۂ کہ جہاں دیدہ است کم آں بیں
بہ کُنہِ حق نرسیدہ ز علم مے لافند   بہ خیرگی و دلیریٔ نکتہ چیناں بیں
شدند خاک رہِ عشق و مدعیٔ بہشت   نیاز کیشیٔ آناں و ناز ایناں بیں
فرا رسیدہ نہ با آں جمال و جلوہ فروش   درازدستیٔ دعویٔ کوتہ بیناں بیں
بیا بہ بیشم و باز از گدازِ عشق ملاف   نہاں بہ پردۂ چشمم ہزار طوفاں بیں
ہزار برقِ تپاں ست بند در سینہ   درآ بہ دل تپشِ عشق و سوزِ پنہاں بیں

بہ حسن نرگس و ریحاں چہ میفروشی دل   فگن بہ سینہ سر طرفہ نر گلستاں بیں
شگاف و چاک دل خستہ کے توانی دید   نگاہِ تست ہمیں چاک جیبؑ داماں بیں
چہ شکوہ سنجی زبیگانگاں بیا کیفی   چہا نہ با تو ستم کردہ اند خویشاں بیں

یکے نہ ماند مگر ابتیانہ کیفی را
سخن سرا است بہ حرف اسیر و سلماں بیں

نیست آساں بہ رہِ عشق تو قرباں بودن   ناز ہر موئے تن آید نہ رگ جاں بودن
شغل عشاق ہمیں است کہ از خود رفتن   در تصور ہمہ محویت و شاداں بودن
ہست در قعر فنا گوہر محبوبئے خلق   نیست آساں بخدا یوسف کنعاں بودن
نقش کن صورت جاناں بہ نگین دلِ خویش   تا مپندار کہ سہل است سلیماں بودن
چہ دہد صرفہ بہ بیمار تو اعجازِ مسیح   باید از بندۂ تو بندۂ احساں بودن
جامہ شد جملہ قبا جوشش جنون است ہنوز   کاشش بودے پئے ہر چاک گریباں بودن
طرہ بر طرہ کشودہ و نہ دے رفت ز دست   از خم زلف بیا موز پریشاں بودن
عشقِ ایمان من و حسن مرا دیں باشد   اندریں حال چہ کافر چہ مسلماں بودن

کیفی در محفل رنداں سخن از عقل مراں
کاندریں حلقہ نہ زیباست بدنیساں بودن

من نہ از گفتۂ بہماں و فلاں مے گویم   آنچہ دارم بہ دل خویش ہماں مے گویم
اے بسا من سخن از راز بخود مے رانم   داوری ہائے جہاں را بہ جہاں مے گویم
آنچہ گویم شنو از گوشِ دل و باز مپرس   کہ چہ گویم۔ بہ کجا۔ با چہ کساں مے گویم
در دل آئینہ جو ہر صفتم جلوہ نما   آنچہ از حال تو پیدا است ہماں مے گویم
سر کنم زمزمۂ عشق و محبت شب و روز   نہ حدیث غم و اندوہ و فغاں مے گویم

ہندیم حُبّ وطن ہست سرورم کیفی
ایں سخن گرچہ بہ حرف صفہاں مے گویم

بیا ساقی بکن سرشارم امشب   بے از رنج و دنیا زارم امشب
بہ بر تنگ آمدہ دلدارم امشب   مثال بختِ خود بیدارم امشب
بہ دستم آفتاب و در بر آں ماہ   چہ پروائے مہ و خورد دارم امشب

۷ اکتوبر ۱۹۱۸ء

۲ مارچ ۱۹۱۹ء

بہ دست افتاد از فیض تصوّر ۔ سواد خُلّخ و فرخارم امشب
شنود آویزۂ گوش ملائک ۔ حکایت از صنم بنگارم امشب
بروئینہ ہست احوالِ رنداں ۔ بہ ساقی کار خود بسپارم امشب
بود ذکر صنم سلطان اذکار ۔ بہ نزد و ہر دور از کارم امشب
خدا با بُت بہ کفر ایماں سپردم ۔ معاذ اللہ چہ مسلک دارم امشب
جہاں تاریک در چشم سیہ بخت ۔ چرا امروز را نشمارم امشب
ز کرب ہجر جانم بر لب آمد ۔ نشاید آں مسیحا را۔ رم امشب
بہ نور ایں شب ز یاد از لیلۃ القدر ۔ درخشد مثل مہر اشعارم امشب

غزل گویم بہ طرز تازہ کیفی
نہ عذر ضیق فرصت آرم امشب

عیاں پنہاں چہ قیرم قارم امشب ۔ من ایماں گو بہ دیرم دارم امشب
بیا پیر مغاں رطل گراں دہ ۔ ز بار رنج زیرم زارم امشب
نہ دارم رنگ شوق و بوئے اُمید ۔ دریں گلزار خرم خارم امشب
نہ بعد از مرگ ہم مہر از دہن رفت ۔ فتادہ با نکیرم کارم امشب
صنم در خانہ در پیمانہ بادہ ۔ نشود شوق دگیرم یارم امشب
رہا کردم ز مکر دہات دنیا ۔ گہر بر مرگ مبرم بارم امشب
شدہ غرقاب چشم تر فلک را ۔ ازیں ابر مطیرم طارم امشب
جواب صاف یار و نامۂ شوق ۔ یک از یک بنگرم بنگارم امشب

ز ابر طبع کیفی گوہر علم
بریں فرخندہ بیرم بارم امشب

بیا ساقی بدہ گردش بہ محفل جام و مینا را ۔ بدر کن از دل رنداں غبار رنج و دنیا را
چہ رنج دہر ایں بازیچہ اطفال را ماند ۔ بزن یک جام و از سر پاک بر کن فکر عقبےٰ را
گراید گر بہ بالا خوانی ایں چرخ فرومایہ ۔ بیفگن در تہ تحت الثریٰ عقد ثریا را
چہ وقت خوش قدح برکش ز دست ساقی مہوش ۔ غم دنیا و دیں از خطۂ مے نطری شدہ ما را
تصرّف بر حواس خود نیش شرط بادہ پیمائی است ۔ دہد ساقی نہ ایں پیمانہ وسن بادہ پیما را

جنوری ۱۹۱۹ء

سویدا مے شود ہر قطرۂ خوں در تن عاشق — چہ دانی منزلت اے چارہ گر ایں جوشِ سودا را

چو ذوقِ درد مضرابے پئے تارِ نفس آمد — پذیرد کے مریضِ عشق از عیسے مداوا را

گرت چشمِ بصیرت ہست دریک ذرہ دریابی — تجلائے کہ سر در پائے خود افگند موسے را

در آشوبِ تمنائی کہ آزادی ازاں خواہی — ہنوز اندر قفس دانند مرغ رشتہ برپا را

میسر شد کسے را پئے سپردن در رہِ الفت — ز پا از پنجۂ مژگاں برآرد خار صحرا را

بخود چوں در زند خود را ز دُرِّ شہوار مے گردد — کمال قطرہ افزوں مے کند توقیر دریا را

جہاں داریست و لداری حکومت قبضہ بر دلہا — نشاید مدح را کیخسرو و اسکندر و دارا

ترا معجز بیاں گفتن سزد اے کیفی خوش گو
کہ در یک کوزہ کردی آب رکنا باد و جمنا را

شہید خنجر ناز تو بیغداد انند — نثار گردۂ کوئے تو شہر یار انند

نگاہ مست تو دارد عجب اثر اے شوخ — کہ بے خبر ہمہ از خویش ہوشیار انند

ترا حیا و مرا ضبطِ عشق شد غماز — زبان حال شناسا چہ پختہ کار انند

بہ آہ و گریۂ عاشق فلک ہم آہنگ است — حریف جذب دل خستہ باد و بار انند

بگوشِ آں گل رعنا صدائے من چہ رسد — چو من بہ باغ نوا سنج صد ہزار انند

مسلم است کہ ہست اضطراب ضد سکوں — اسیر عشق ازیں راہ بیقرار انند

وفورِ نور جمالش حجاب چشم گشت — خوشا کساں کہ طلبگار پردہ دار انند

کجائی ساقی مہوش بیا و حلقہ بزن — کہ مست ساغر دل جملہ میگسار انند

بیا بہ بزم نما جلوہ ہائے حسن ازل — ز شوق چشم براہت امیدوار انند

نہ ارزد ایں کہ تو ساغر کشیدی بر سر شیخ — ببیں غریق غم بادہ خوار ہستند

بہ بزم ساقی ما بیں کہ طرفہ یکرنگیست — بہ حالتے ہماں مستاں و ہوشیار انند

مگر بود کہ نہ آہنگ من یکے نہمند — ز قید کعبہ و دیر آنکہ رستگار انند

منم نہ کیفی جام مغاں کہ مست الست
ز زنگ مستیم آگاہ راز دار انند

جولائی سنہ ۱۹۱۹

دل و جان بیقرارم تپید از غم جدائی — سزد ار ز مہر روئے بہ مریض خود نمائی

ز غمِ تو سوختہ جانم شب و روز در فغانم — کہ ز قید عشق عاطل تو دہی مرا رہائی

ہمہ تن غبار گشتم بہ رہت نثار گشتم — بہ ہوائے آں کہ گاہے سر رہگذار آئی

نہ ہجوم رنج ہجراں شدہ کار من بہ پایاں — چہ عجب وصال یابم بہ کشاکشِ جدائی

بُت من کشیدہ قامت دل و جاں فدائے قامت — ہمہ زاہداں غلامت کہ تو شانِ کبریائی

ہمہ فخر و بے نیازی ہمہ غمزہ عشوہ سازی — من و عجز و راستبازی تو و ناز و کج ادائی

تو زِ صدقِ دل دور گشتی ز ریا نفور گشتم — بتو زاہدا مبارک رہ و رسم پارسائی

تو ز دیر چوں گسستی بہ حرم دل از چہ بستی — نہ ایں راز بر تو واشد کہ خدا است در خدائی

ہمہ رندِ میگساراں ز زمانہ رستگاراں — رو لائے دوستداراں زِ خلوص آشنائی

در میکدہ کشودند بہ گردِ ہے بار دادند
بہ دروں خرام کیفیِ کہ تو یار باصفائی

بہ من اے روزگار من چہ کردی — جدا کردی ز یار من چہ کردی

مرا کردی فراموش از دلِ خویش — بت غفلت شعار من چہ کردی

خنابستی چرا شام شب وصل — چہ کردی اے نگار من چہ کردی

جدا کردی صبا از کوئے جاناں — تو با مشت غبار من چہ کردی

بہ رشک عارضت صد چاک دامانت — بہ گل اے گلعذار من چہ کردی

ندانستی عیار عشقش افسوس
تو با کیفی زار من چہ کردی

دار فتنہ کردم جادو مقالے — ہر دل عزیزے یوسف جمالے

لیلیٰ لقائے شیریں ادائے — بیضا ضیائے فرخندہ حالے

غنچہ دہانے ابرو کمانے — موئے میانے شیریں مقالے

لطفیست باشد گرآں بہ پہلو — نقل و شراب و جام سفالے

شرمم بگیرد چوں بر لب آید — اے جان جاناں دارم سوالے

دلِ خوش کن اے شیخ از شاہد و مے — وہم است حور و کوثر خیالے

زاہد چہ گوشہ کیفی بہ وحشی
مست است ہر کس در ہر خیالے

قصیدہ مسدّس دُعائیہ

۱۹۲۱ء

آپ ریاست کشمیر میں اسسٹنٹ فارن سکرٹری تھے۔ مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ بہادر والئے ریاست آپ کے ذوق شاعری سے واقف تھے۔ ایک روز دربار میں ارشاد ہُوا کہ کچھ اپنے شعر سنائیں۔ آپ حیران ہوئے کہ کیا سنائیں اور افسروں نے اور بر چپک دی کہ ہاں حضور بہت اچھے شاعر ہیں۔ آخر عرض کیا کہ کل عرض کروں گا۔ مدح کہنی نہ ہوئی، اپنے مذاق کے اشعار کا پسند ہونا غیر ممکن۔ آخر سوچ سوچ کر یہ قصیدہ مسدّس دعائیہ کہا۔ اور اگلے دن حکم صادر ہونے پر دربار میں عرض کیا جو بہت پسند کیا گیا۔

ہمالہ جب تلک سایہ کئے بھارت کے اوپر ہو — اور اس کا تاج سر برف گُہر افشاں کا زیور ہو
رواں گنگوتری سے گنگ جب تک اس زمیں پر ہو — صفات صاف جب تک اسکی ہر قلب مکدّر ہو
ترے رُتبے کی عظمت کوہ عالی فر سے برتر ہو
تری دریا دلی فیاضیٔ دریا سے بڑھ کر ہو

زمین ہند جب تک انتخاب ہفت کشور ہو — اور اُس میں برج کا خطّہ پریم اور عشق کا گھر ہو
بسا جب تک کہ دِل میں برج باسی کے منوہر ہو — صدا مرلی کی مرہم جب تلک زخم جگر پر ہو
ترا نام مبارک خلق میں ہر اک زباں پر ہو
عقیدت کا تری دل میں ہر اک انسان کے گھر ہو

ہے قدرت کا رکن آفاق میں کرتار کی جب تک — رعایا میں وفاداری رہے سرکار کی جب تک
کرے نظم ممالک مشورت دربار کی جب تک — کرے ہنگامہ آرائی چمک تلوار کی جب تک
ترے سیف و قلم کے زور سے دُنیا مسخر ہو
تو ہو دربار کی زینت تو طاقت بخش لشکر ہو

گہر جب تک سمندر میں ہو آب و تاب گوہر میں — درخشانی ہو جب تک لعل میں اور لال پتھر میں
ڈلک الماس میں ہو اور دمک ہو سیم اور زر میں — دُر و الماس و لعل و زر ہوں جب تک بحر اور بر میں

ترا خلق حمیدہ نوعِ انسانی کا زیور ہو
تری نیکی کے جوہر سے مزیّن ہفت کشور ہو

نوید شادمانی لائے ساون کی گھٹا جب تک — دلوں کو گدگدائے موسم گل کی ہوا جب تک
لگائے آگ سینے میں پپیہے کی صدا جب تک — حواسوں پر کرے قبضہ نزاکت کی ادا جب تک

ترا قابو میں دل ہو اور قبضہ سب دلوں پر ہو
ترے قدموں پہ نقد جاں رعایا کا نچھاور ہو

رہے انصاف پر قائم اصول داوری جب تک — رفاہِ خلق پر مبنی ہو شانِ سروری جب تک
ہو زیبِ تاجِ سلطانی رعایا پروری جب تک — ہو طاقت حکمرانی کی عدالت گستری جب تک

عدالت میں ترا نامِ مبارک سب سے بڑھ کر ہو
الٰہی غیرتِ کسریٰ ہو تو رشکِ جد ہشتر ہو

رہے راجا میں جب تک عدل پرجا میں وفاداری — رہے نازل شہ عادل پہ جب تک رحمتِ باری
حکومت کا رہے دنیا میں سکہ جب تلک جاری — کرے تلوار جب تک سرکشوں کے سر پہ گلکاری

تری تلوار کا رخشاں زمانے بھر میں جوہر ہو
مؤیّد تیری طاقت سے ہمیشہ ملک قیصر ہو

اڑائے بلبلوں کے ہوش کلیوں کی چٹک جب تک — وہ کھل کر اپنی پھیلائیں گلستاں میں مہک جب تک
کنول کی آنکھ میں ہو دلفریبی کی چمک جب تک — چمن میں جان ڈالے آتشِ گل کی بھڑک جب تک

یہ پھلواری ترے پرتاپ سے تازہ ہو اور تر ہو
بہارِ جاودانی کا یہ مرکز اور منظر ہو

رہے سایہ فگن جب تک کہ ابر اس جوفِ اخضر میں — چھپائیں بجلیاں منہ جب تلک بادل کی چادر میں
ہو جب تک کشمکش سائنس میں اور برقِ مضطر میں — فلک سے کھینچ لائیں صاحبِ ایجاد اسے گھر میں

ترے نورِ خصائل سے جہاں سارا منور ہو
تری نام آوری کے رعد سے گوشِ عدو کر ہو

دل عشاق درد و سوز الفت کا ہو گھر جب تک رہے گلزار داغوں سے مجنوں کا جگر جب تک
رہے ہم پہلوئے دردِ جگر جذب و اثر جب تک گداز دل کا چمکے قلب دلبر میں اثر جب تک
چبھا ہر ایک سینے میں تری الفت کا نشتر ہو
ہمیشہ نقدِ دل پائے مبارک پر نچھاور ہو

وصالِ حق کا رہبر معرفت اور گیان ہی جبتک بیبیک اور تیاگ سے بھگتی ہے اور عرفان ہے جبتک
کرم نشکام مکتی کے بدن کی جان ہے جب تک فنائے نفس میں ہست بقا آسان ہے جب تک
ترا ہر کام خلقت میں ہمیشہ فیض گستر ہو
تری ذاتِ مبارک محوِ سودِ خلق داور ہو

پروئے اوس موتی جب تلک تارِ رگِ گل میں صبا کرتی رہے جب تک کہ شانہ زلفِ سنبل میں
بھرا ہو جب تلک سوزِ فغاں منقارِ بلبل میں ہو مینا بزم میں جب مینا میں مُل اور نشہ ہو مُل میں
نشے سے جاں نثاری کے بھرا تیری ہر اک سر ہو
ترے حق میں دعائے خیر ہر اک کی زباں پر ہو

بصارت جب تلک ان نرگسوں سے آئے حیرت میں سمائے جب تلک کون و مکاں چشمِ بصیرت میں
نہاں جب تک عرض کی ذات ہو جوہر کی صورت میں عیاں اہلِ نظر کو جب تلک وحدت ہو کثرت میں
وحید عصر ہو تو خلق میں تیرا نہ ہمسر ہو
صفت میں تیری یکتائی و بے ہمتائی مضمر ہو

دلوں پر ہو نگاہِ ناز کی غارت گری جب تک رسیلی آنکھ سے پیدا ہو سحر سامری جب تک
ہو زیبا حسن اور خوبی کو شانِ دلبری جبتک ہو عشق و حسن میں برپا یہ جنگ زرگری جب تک
دل صافی ترا عشقِ حقیقی سے منور ہو
صفا ہو کیش تیرا تو حواسوں پر مظفر ہو

بھرے جب تک شعارِ مہر رنگ اس گل میں ریحاں میں شگفتہ ہر سحر غنچے ہوں جب تک صحن بستاں میں
فغاں بلبل کی جب تک چاک ڈالے گل کے داماں میں کرے جاں پروری جبتک کہ بوئے گل گلستاں میں
شمیمِ خلق سے تیرے مشامِ جاں معطر ہو
نفوسِ پاک سے تیرے شگفتہ قلب مضطر ہو

رہے جب تک تابش خورشید و بدر و کعبہ پر یکساں — محل اور جھونپڑی پر ہے برابر بارش باراں
تعصب جب تلک ہے دید ضعف ملت و ایماں — ہے جب تک خدمت حق خدمت مخلوق میں پنہاں
کرم تیرا بلا تمیز ملت ہر کسی پر ہو
مسلماں اور ہندو تیری نظروں میں برابر ہو

رہے حسن اور موسیقی کا گھر جب تک کہ اندر اس — رہے کیلاس جب تک یوگ تپ اور دھیان کا مسکن
سدرشن چکر جب تک گھور پاپوں کا رہے دشمن — فدا بھگوان پر جب تک کہ بھگتوں کا رہے تن من
مہیا ہے عشق بھگوت تیرے دل میں نور گستر ہو
ہمیشہ کام میں ہو ہاتھ اور من میں منوہر ہو

نظیر باغ جنت ہے لقب کشمیر کا جب تک — دل کشمیر پر قبضہ رہے رشی پیر کا جب تک
روان عدل و نصفت نام ہو رگھبیر کا جب تک — رہے ضرب المثل اجلال لچھمن بیر کا جب تک
تو سورج بنس میں اس طرح تاہا نام آور ہو
کہ اجرام فلک میں جس طرح سلطان خاور ہو

رہے مشہور عصمت اور ست میں جانکی جب تک — رہے اہنسا تا خلق کو ناردمی جب تک
کرے اہل جہاں پرہمن کی پرکھا لکشمی جب تک — خزانے علم و حکمت کے لٹائے سرستی جب تک
مساعد ہو ترا اقبال تیرا بخت یاور ہو
دعاگو کیفی احقر ترا اے بندہ پرور ہو

دیکھو نوٹ ۲ صفحہ ۲۷۸

تو نے پایا ہی نصیبوں سے مربی وہ خدیو — جس کی ہمت پھینکتی ہی چرخ ہفتم پر کمند
حضرت آصف سکندر سطوت افلاطوں خرد — ہی جہانداری میں جس کا نام عالم میں بلند
اس کی ہی جوہر شناسی ۔ باہذاقی کا ثبوت — ہو گیا ہی مشورے کے واسطے تجھ کو پسند
بخشتا ہی حیدرآباد اس کو مامن اور پناہ — ہند میں ہوتا ہی جس ذی علم پر دروازہ بند

تاریخ طبع دیوانِ منشی مظہر حسن صاحب مظہر دھولانوی اہلکار

عدالت منصفی امبالہ

آپ مصنف کے دوست محمد خضر کے والد تھے

چھپا ہے خوب ہی دیوانِ مظہر
کھلا گلہائے معنی کا چمن ہے

جو بات اس کی ہے وہ چبھتی ہوئی ہے
بیاں میں جانے کیسا بانکپن ہے

مضامیں دل میں چٹکی لے رہے ہیں
عجب بانکا ترا طرزِ سخن ہے

غزل ہے یا غزالِ دشت خوبی
رباعی ہے کہ چوکھتی کی دلھن ہے

نزاکت اور باریکئے مضموں
کمر معشوق کی ہے یا دہن ہے

جو مضموں ہے وہ کھُب جاتا ہے جی میں
بُت معنی پہ کچھ ایسی پھبن ہے

کہو تاریخ کیفی از سرِ جوش
کلامِ شاعرِ شیریں سخن ہے

تعج = ۳   ۱۹۴۵ ب

تمام شد

باہتمام لالہ موتی رام مینیجر مفید عام پریس واقع چیٹر جی روڈ لاہور میں چھپا
اور لالہ رام لال سوری بک سیلر نے انار کلی لاہور سے شائع کیا۔

صحت نامہ کیفیات

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۱۳	حیران جو	حیران ہو جو	۱۷۴	۱۱	عزم	عزم میں
۶	۶	مادیات	عادیات	״	۱۵	نازداد	نازو ادا
۶	۲۵	پھونک	پھونک	۱۷۷	۱۲	ساعقہ	صاعقہ
۲۷	۵	زغم	زعم	۱۸۰	۸	سکندر کو	سکندر نے
۲۷	۵	ستھر	ستھرا	۱۸۱	۱۶	گُنّہ	گُنہ
۳۶	۲۱	تخفظ	تحفظ	۱۸۵	۱۰	آب و گُل	آب و گل
۴۱	۴	رلط	ربط	۱۸۶	۴	اس	اسی
۵۳	۱۴	اس کنارے	اس کے کنارے	״	۱۵	کان	کی کان
۵۵	۷	ڈیم اور	ڈیم پر اور	۱۸۹	۴	کرُب	کرب
۵۵	۸	مرے کا	مرے گا	۱۹۱	۵	برس کو	برس کر
۵۷	۳	لوں	ہوں	״	״	کا	کا کہ
۶۷	حاشیہ ۳	دلاں دی باگاں	دلادیاں دی اگاں	۱۹۲	۱۱	بڑھاتا	بڑھا
۷۲	۱۷	اس فصل کے	اس فصل کے ہیں	״	۲۱	کوس	کومل
۸۳	۱۱	ہندسے	ہندسی	۱۹۳	۱۲	غلت	عِلّت
۸۵	״	سینیے	سفینے	״	۱۶	میں	میں ہے
۱۰۰	۹	کہتے	کہتے	۱۹۵	۱۴	آسوب	آشوب
۱۱۱	۱۲	پیٹ	بیٹھ	۱۹۶	۲۰	صفار	صغار
۱۱۳	۱۶	نو	تو	۱۹۷	۱۲	حشم ولے	حشم ولے ہیں
۱۱۴	۱۳	دکھلایا	کھلایا	۱۹۹	۱۲	ہے	رہے
۱۱۸	۱۴	آیا ہو	آیا ہوں	۲۰۰	۱۰	زندگی	زندگی و
۱۱۸	۱۸	موئٹ	موئی	۲۰۱	۱۴	کس کس	کس کس کو
۱۲۳	۱۲	تغیّر	تغییر	۲۰۸	۱۵	گھٹایا	گھٹایا
۱۲۳	۱۷	سالنسا	سالنسا	۲۱۸	۱۹	ہوئی	ہوئیں
۱۲۵	۱۲	جنچا	جنچا	۲۲۳	۱۳	قمری	کمری
״	۱۵	ہوَ	ہوُا	۲۲۷	۱۰	دکھلائی	دکھائی
۱۲۷	آخری	اطمینان و رفرصت	اطمینان و فرصت	۲۲۸	۱۱	عربد	عربدہ
۱۳۲	۶	امریکہ میں	امریکہ میں ہیں	۲۳۳	۲۱	افکار	اوگار
۱۵۶	۵	طر	گھر	۲۳۶	۱۲	نطفی	لفظی
۱۶۹	۲۲	تقاسے	تقاضے	۲۴۹	۱۴	قصید	قصیدہ
۱۷۲	آخری	نہ جائے	نہ جائے گی	۲۵۰	۲۰	فلک	فلک

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۶۱	۱	مطلع ثالث	مطلعِ ثالث
۲۶۷	۳	ہیں	نہیں
〃	۱۷	ایک	یک
〃	۲۰	بخدا	نجد
۲۷۶	۲	کارروان	کاروان
〃	۲۱	باکمال	باکمالی
۲۷۹	۷	اصفحان	اصفہان
۲۸۰	۵	اگردن	گردن
۲۸۳	۷	تیشۂ اگر	تیشۂ گرترا
۲۸۴	۵	بتنکد	بتکدہ
۲۹۰	۱۹	پیدا ہو	ہو
۲۹۵	۹	در	کبھی در
۳۲۴	۱۰	کانپتی	کانپی
۳۲۸	۱۴	کی ہم	کی طرح ہم
۳۲۹	۱۹	پروہ جان	پہ وہ جاں
۳۳۰	۱۶	مشّاط	مشّاطۂ
۳۳۲	۱۲	کی	حق کی
۳۳۶	۱۳	حاضر ہی	حاضر
۳۳۷	۸	نہیں	پانی
۳۴۷	۴	شہسا الگ	شہدا الگ
۳۴۸	۱۸	در دندوں	دُرِ دنداں
〃	۲۰	حرریں	حوریں
۳۴۹	۴	ہی ہو	ہی
〃	۸	چاسئے	پائے
〃	آخری	ہے	کہیے
۳۵۰	۲۰	لاتا ہی	آتا ہی
۳۵۲	۱۲	مرس	امرس
〃	〃	دروزہ	دو روزہ
۳۵۵	۱۱	قاضی	قاصی
۳۶۰	۲۳	کی گنجدمت	کی خدمت
۳۹۳	۱۶	سرہاں	ہاں سر
۳۹۹	۱۴	کے	کی
۴۰۲	۴	قدیں	قدس
۴۰۷	۱۳	دکھیو	دیکھوں
۴۱۰	۲۱	کہا	کہہ
۴۲۹	۱۳	کئی پہلے	پہلے کئی
۴۳۵	۴	پڑھے	پڑھے لکھے
۴۴۱	۱۰	تجھے	ہی تجھے
۴۴۷	۱	آنکھوں	آنکھوں میں
۴۴۸	۳	والی کا	والی نہ
۴۵۱	۱۱	ہوئی	ہوئی ہی
〃	آخری	زغم	زعم
۴۵۵	۴	تغیّر	تغییر
۴۶۲	۱۷	ثعبت	بعثت
〃	۲۰	مرہ	حرا
۴۶۵	۸	وہاں زخم	دہانِ زخم
۴۶۷	۱۰	اے کاس	اے کاش
۴۷۳	۲۱	بہی	بھی
۴۷۵	۱۷	مل دمیں	مل دِل میں
۴۷۶	۶	جسے	جس سے
۴۸۰	۱۶	ردلیف	ردیف ی
۴۸۱	۱۴	کوہ گراں سے	کوہِ گرانِ
۴۸۵	۱۲	پوچھوں	پوچھو
۴۸۹	۹	کسلئے	کسیے
۴۹۱	۱۷	بباہ	بباد
۴۹۶	۲۰	دارالمجن	دارالمحن
۴۹۷	۱۱	لانست	لافست
۵۰۳	۳	افتادم	افتادہ ام
〃	۴	افتادام	اُفتادہ ام
۵۰۴	۶	نا	تا
۵۰۷	۷	رولائے	زولائے
۵۱۰	۹	کُل	گُل